چند قلمکار

فیض احمد فیض ۔ جگن ناتھ آزاد ۔ پطرس بخاری ۔ رام لعل ۔ ڈاکٹر تاثیر ۔ جیلانی بانو
ڈاکٹر اسد اریب ۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ ۔ سلیم تمنائی ۔ زیڈ اے بخاری

مدیر اعلیٰ
فیض احمد فیض

غالب

چند موضوعات

اقبال کا شاہین ۔ علامہ اقبال حیدرآباد دکن میں ۔ انگلستان اور اقبال
مہ و سال آشنائی ۔ تابوت ۔ کلچرل اکیڈمی ۔ پیپلز اوپن یونیورسٹی
بالکل نئی [illegible] ۔ میرے کتب خانے میں کیا محفوظ ہے ۔ تبصرے ۔ خطوط ۔

بخدمت مسعود احمد برکاتی صاحب

۳۱۲/

سہ ماہی

غالب

مدیر اعلیٰ

فیض احمد فیض

بانی و صدر ادارۂ یادگارِ غالب

مدیر

مرزا ظفر الحسن

معتمد ادارۂ یادگارِ غالب

جولائی تا ستمبر ۱۹۷۶ء

جلد ۲ [redacted]
شمارہ ۳ } ساتواں شمارہ

ادارۂ یادگارِ غالب
غالب لائبریری
ناظم آباد، کراچی - ۱۸

ادارۂ یادگار غالب

غالب لائبریری

پوسٹ بکس ۲۲۶۸ دوسری چورنگی ناظم آباد کراچی

ٹیلی فون

۶۸۲۷۸۹

(مدیر کی سکونت گاہ)

اس شمارے کی قیمت : [redacted] 15/

رجسٹری اور ڈاک کا خرچ خریدار کے ذمے

مرزا ظفر الحسن مدیر و ناشر نے کتب پرنٹرز اینڈ پبلشرز لمیٹڈ ایم اے جناح روڈ میں چھپوا کر ادارۂ یادگارِ غالب، غالب لائبریری سے شائع کیا۔

فہرست

اداریہ

کہتا ہوں سچ کہ ....

چار سو سولہ صفحات کا فیض نمبر نکالنے کے بعد تھکن نہیں تازہ توانائی کے ساتھ ساتواں شمارہ پیش کر رہا ہوں۔ فیض نمبر کے متعلق مجھے ناظرین کے خطوط کا انتظار ہے۔

اس مرتبہ آپ کو دو نئے سلسلے نظر آئیں گے (۱) "بالکل نئی کتاب" (۲) "کس کے کتب خانے میں کیا محفوظ ہے؟"۔ ان کے جاری رہنے کا تمام تر انحصار مصنفین اور نجی کتب خانوں کے مالکوں پر ہے۔ میں ان سے اشتراک کی اپیل کرتا ہوں۔ مشفق خواجہ اپنی غیر معمولی ادبی مصروفیات کی وجہ سے اس بار "پرانے شاعر، نیا کلام" کی قسط تیار نہ کر سکے جس کے لیے ہم دونوں معذرت خواہ ہیں۔ نئی کتابوں اور رسائل پر تبصرے اور ناظرین کے خطوط غیر متوقع ضخامت کی وجہ سے پچھلے شمارے میں شامل نہ کر سکنے کی بھی آپ سے معذرت کرنی ہے۔

ہندوستان سے رام لعل، جیلانی بانو، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، جگناتھ آزاد اور سلیم تمنائی نے اپنی تخلیقات بطور خاص جریدہ غالب کے لیے روانہ کی ہیں جس کے لیے میں ان دوستوں کا شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر اسد اریب نے میری استدعا پر پیپلز اوپن یونیورسٹی پر مضمون تیار کیا ہے جو بہ اعتبار موضوع بالکل پہلا مضمون ہے۔

۱۹۷۷ء کے پہلے دو شماروں کی ضخامت کچھ کم آٹھ سو صفحات تھی اس لیے موجودہ شمارہ مقابلتاً کم ضخامت کا نکالنا پڑا۔ اشتہارات کی کمی، کاغذ کی مہنگائی، دیگر مالی وسائل کا فقدان ایسے اسباب ہیں جن پر کوئی نئی بات لکھنے کی گنجائش نہیں آپ ان سے ضرور واقف ہوں گے۔

یہ جریدہ ادارۂ یادگارِ غالب اور غالب لائبریری کا ترجمان اور صحت مند ادب کا نقیب ہے۔ ہم مسلسل کوشش کرتے رہیں گے کہ اپنے فرائض بہ حسن و خوبی انجام دیں۔

ظفر الحسن

جواں فکر　　جواں سال　　جواں ہمت

جاوید جبار

کے رنگین اردو فلم

مسافر

پاکستان کی پہلی انگریزی فلم

بیانڈ دا لاسٹ ماؤنٹین

ان دو اردو انگریزی فلموں نے ثابت کر دیا

کہ

- کراچی میں اچھی فلمیں بنائی جا سکتی ہیں
- اسٹوڈیو میں عکس بندی کے اصول سے انحراف ممکن ہے
- ایسی کامیاب فلموں کا مغربی دنیا میں تصور بھی ممکن نہیں
- فلم میں پلاٹ ہی سب کچھ نہیں ہوتا
- معاشرے میں جو موجود ہے وہی فلم میں پیش کرنا چاہیئے

جاوید جبار

نے بالکل نیا اور جرأت مندانہ تجربہ کیا ہے۔ ایسے تجربات کی حوصلہ افزائی سے ہی ہماری فلمی دنیا میں صحت مند اور ترقی پسند انقلاب لایا جا سکتا ہے ورنہ یہ صنعت پرانی لکیر پیٹتی رہے گی۔

ادارہ نیا دور کا رعنا لب

اوراقِ فیض

تصوّر

فیض احمد فیض

فیض نے جولائی ۱۹۷۶ء کے قیامِ روس کے چار ہفتوں میں نثر کی ایک کتاب مہ و سالِ آشنائی لکھی ہے جو سوویت روس کے مختلف دوروں کی یادوں کا مجموعہ ہے۔ پہلے باب "تصوّر" کا ابتدائی حصّہ پیشِ خدمت ہے۔ م ط ح

۱۸ء، ۱۹ء، ۲۰ء، صرف زمانہ یاد ہے صحیح مہ و سال کا اندازہ اس عمر میں کس کو تھا۔ بچپن کی سب سے پرانی دھندلی سی یادیں۔ پہلی عالمگیر لڑائی ختم ہو چکی ہے۔ ایک جانب انگریز حکمران اور ان کے دیسی حاشیہ بردار جشنِ فتح منا رہے ہیں، سڑکوں پر رنگین جھنڈیاں لگائی جا رہی ہیں، توپیں دغ رہی ہیں، بینڈ باجے اور فوجی سوار گشت کر رہے ہیں۔ دوسری طرف قومی آزادی کی تحریک شروع ہو چکی ہے۔ آئے دن جلسے، جلوس، نعرے "جو بولے سو نہال ست سری اکال" "نعرۂ تکبیر اللہ اکبر" "قومی نعرہ" "بندے ماترم" "ٹوڈی بچہ ہائے ہائے" "آزادی ہمارا پیدائشی حق" بڑے بڑے لیڈر پھولوں سے لدی ہوئی گاڑیوں میں شہر سے گزر رہے ہیں۔ یہ موتی لال نہرو ہیں، یہ محمد علی شوکت علی ہیں، یہ ابوالکلام آزاد ہیں یہ بابا کھڑک سنگھ ہیں، یہ ڈاکٹر کچلو ہیں، کئی جگہ خوش آمدید کے لیے دروازے سجائے گئے ہیں اور کوچہ و بازار میں تماشائیوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہیں۔ آج ترکوں کی کسی فتح کی خوشی میں شہر چراغاں ہو رہا ہے تو کل کسی لیڈر کی گرفتاری میں سارے شہر میں

ہُو کا عالم ہے۔

انھیں یادوں میں کہیں گڈمڈ اخباروں کی شہ سرخیاں ہیں اور یہ اخبار بیچنے والوں کا غوغا ہے "روس میں زارشاہی کا تختہ اُلٹ گیا" "لینن نے مزدور طبقے کی حکومت قائم کرلی" "سُرخ انقلاب آگیا"۔ جگہ جگہ لوگوں میں چہ می گوئیاں ہو رہی ہیں۔ ہمارے گھر کے دیوان خانے میں، اسکول کے اسٹاف روم میں، محلے کی مسجد میں ہر جگہ ایک ہی تذکرہ ہے۔ یہ روسی انقلاب کیسے ہوا، کیونکر ہوا، کیا انقلابی فوجیں ہندوستان پہنچ کر ہمیں بھی آزاد کرالیں گی؟ مزدوروں کسانوں کی حکومت کیسی ہوتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ

جب ابا کچہری چلے جاتے تو گلی محلے کے لوگ باگ جو ہمارے گھر کے آس پاس دکان یا کاروبار کرتے تھے اس گھر کے بیرونی چبوترے پر آ جمع ہوتے جہاں ابا کے موکلوں کے لیے بینچ اور مونڈھے وغیرہ پڑے ہوتے تھے۔ کوئی گاہک آگیا تو جلدی سے اُسے نپٹا کر پھر آ بیٹھے۔ اللہ دیا پہلوان، چراغ دین تیلی، اللہ رکھا قصاب، خوشیا حجام اور ان کے یار دوست گھنٹوں ملکی اور غیر ملکی سیاست پر گپ لڑاتے رہتے۔ "ارے بھئی کچھ سنا ہے مہاتما گاندھی اور محمد علی شوکت علی نے مل کر اعلان کردیا ہے کہ ایک سال کے اندر اندر سب انگریز، لاٹ، کمشنر، ڈپٹی کمشنر نکال دیے جائیں گے اور ان کی جگہ ہمارے لوگ لگائے جائیں گے۔" "اور بھئی یہ بھی تو سنا ہے کہ غازی کمال پاشا کی فوجیں انگریزوں کو کھدیڑ کر افغانستان کی طرف آرہی ہیں۔" "ہاں ہاں روسی فوجیں بھی تو ان کے ساتھ مل گئی ہیں۔ روس کے بادشاہ زار کا تختہ تو اُلٹ گیا ہے نا۔ وہاں کوئی لیڈر پیدا ہوا ہے۔ لینن، اس نے مزدوروں کی فوج بنائی ہے، بادشاہ کو بھگا کر سب روپیہ پیسہ لوگوں میں بانٹ دیا ہے۔" "اور مزدوروں کا راج بھی بنا دیا ہے۔" "شاباش بھئی شیر دے پتر" "یار اپنے آغا صفدر سے کہو وہ بھی کوئی ایسی ترکیب لڑائیں کچھ ہمارا بھی بھلا ہو۔ (آغا صفدر شہر سیالکوٹ کے سیاسی لیڈر تھے) "کوئی ایسی ترکیب لڑ جائے تو مزہ آجائے۔ یہ سامنے والے ساہوکار لالہ ہرجس رائے کا مال بکے تو ہم سب کے وارے نیارے ہو جائیں۔"

روس، لینن اور انقلاب کی بات اُن بھولے بسرے دنوں میں پہلی بار کان پڑی تھی

اور اب کچھ اندازہ نہیں کہ ہمارے طفلانہ ذہن نے ان کے بارے میں کیا تصور باندھا ہو گا۔ پھر ہم ذرا بڑے ہو کر اسکول میں پڑھنے لکھنے اور دوسری دلچسپیوں میں کھو گئے اور یہ سب کچھ بھول بھال گئے۔

کئی برس کے بعد سرزمین روس کی ایک اور تصویر ذہن میں ابھرنے لگی (سوویت یونین کے نام سے ابھی ہم پوری طرح آشنا نہیں تھے) یونیورسٹی میں ایم اے کی ڈگری کے لیے انگریزی ادب اور خاص طور سے اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا ادب میرا مضمون تھا۔ انگریزی ادب کے ساتھ ساتھ اس عہد کے باقی یورپی ادب کا مطالعہ بھی لازمی تھا۔ کچھ ہم شوقیہ بھی اِدھر اُدھر کی کتابیں پڑھتے رہتے تھے اور یوں روس کے کلاسیکی ادب سے تعارف ہوا۔ چنانچہ گوگل، پشکن، دوستوئیفسکی، ترگنیف، ٹالسٹائے، چیخوف، باری باری سے سب کو بہت ڈوب کر پڑھا اور پرانے روس کی پوری دنیا نظر میں گھوم گئی۔ بے زبان اور بیکس کسان، عیاش اور خود پسند امراء، دل پھینک نوجوان اور عاشق مزاج محبوبائیں، قلاش انقلابی نوجوان اور افیمچی، دانشور، بے نور لکڑی کے گھروندے اور جگمگاتے ہوئے محلات، گھنے جنگل اور لق و دق میدان، صحرا اور دریا، جنگیں، معاشقے، سازشیں، رقابتیں، پرنس بولکونسکی، اینا کرینینا، ازتلوف، چچا وانیا، کراموزوف خاندان، ظلم اور اس کا توڑ، جبر اور جذبۂ بغاوت، اداسی اور رنگینی، نیکی اور بدی، ذلت اور شرافت فلم کے پردے کی طرح طرح طرح کے مناظر نظر سے گزرے۔ قسم قسم کے کردار، رنگ رنگ کے جذبات، معاشرے کی مختلف قوتوں میں مسلسل کشمکش اور پیکار کا عالم اور اس کے پس منظر میں ایک کلبلاتی ہوئی پراسرار سرزمین، نیم تاریک، نیم ویران اور یخ بستہ جس کی بسیط خاموشیوں میں وقفے وقفے سے کبھی خونخوار بھیڑیے ہونکتے تھے، کبھی رتیانہ گاڑی کی سریلی گھنٹیاں سنائی دیتی تھیں، کبھی سائبیریا روانہ ہونے والے مجرم قافلے کے ماتمی گیت فضا میں ابھرتے تھے اور اس دھرتی کے باسی، آشفتہ سر، جذباتی، دل گرفتہ لوگ خواستہ ناخواستہ کسی انجانی منزل کی جانب رواں تھے جو صرف بالغ نظر لوگوں پر عیاں تھی۔ پھر جس طرح پرنس اندریے بالکونسکی اس بم کو بے بسی سے دیکھ رہا تھا جس سے اس کے تنومند جسم کے پرخچے اڑنے والے تھے

اور کاؤنٹ کا ؤنٹ ڈِ یوئکن ایسی ہی بے بسی سے اپنا گھر لٹتا ہوا دیکھ رہا تھا اسی طرح ان لوگوں کا حکمراں طبقہ دنیا و مافیہا سے غافل اپنی معین تباہی کی جانب کھنچا چلا جا رہا تھا۔

کالج میں میرے دو چار اور ہم جماعت بھی اس سرزمین اور اس کے رہنے والوں سے اسی طرح مسحور تھے اور ہم لوگ گھنٹوں بیٹھ کر ان کلاسیکی کتابوں اور ان کے کرداروں کا تجزیہ کرتے رہتے۔ لیکن ہم اس پرانی دنیا میں اتنے کھوئے رہے کہ انقلاب کے بعد کی نئی سوویت دنیا پر ہم نے زیادہ توجہ نہیں کی البتہ اس دنیا کے وجود کا کچھ موہوم سا احساس ہمیں ضرور تھا۔ وہ اس وجہ سے کہ اس صدی کی دوسری دہائی کے آخر میں گلی کوچوں میں تو نہیں لیکن بعض نوجوان حلقوں میں لینن، سوشلزم اور انقلاب کا چرچا ہونے لگا تھا۔ برصغیر میں دہشت پسند تحریک کے عروج کے دن تھے۔ چٹاگانگ آرمری کیس، کاکوری ڈکیتی کیس، بھگت سنگھ، آزاد، شیر جنگ، گھر گھر یہی تذکرہ تھا۔ میرٹھ سازش وغیرہ کا ہم پہلے سے سن چکے تھے، بھگت سنگھ تحریک میں میرے دو تین قریبی دوست بھی شامل تھے اور ان کے سرغنہ خواجہ خورشید انور نے جو اب مشہور میوزک ڈائرکٹر ہیں ہوسٹل میں میرے کمرے کو اپنے خفیہ لٹریچر بانٹنے کا اڈا بنا رکھا تھا۔ یہ تحریریں بیشتر کارل مارکس، لینن اور انقلاب روس سے متعلق تھیں اور کبھی کبھار سرسری نظر سے میں بھی دیکھ لیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ قریب قریب ہر روز کبھی کوئی انقلابی پوسٹر کالج کے نوٹس بورڈ پر چسپاں نظر آتا تو کبھی روزانہ اخبار کی تہہ میں چھپا ہوا ملتا۔

اس تحریک کے زیر اثر قومی جلسے جلوسوں کا رنگ بھی بدل گیا۔ اب ان میں سوراج اور بندے ماترم کی بجائے انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہوتے تھے اور

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

کی جگہ

"سرکٹانے کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے"

گایا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں شیخ عبداللہ نے کشمیر میں مہاراجا کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، ایک طالب علم نے سینٹ پال میں گورنر مانٹ مورینسی پر گولی چلائی، بھگت سنگھ

اور اس کے ساتھیوں نے اسمبلی میں بم گرایا اور کئی انقلابی اقدامات کی خبریں آئیں۔ ان سب باتوں کی وجہ سے انقلاب روس کے بارے میں بچپن کی یادوں کے کچھ نقوش دوبارہ اُبھر آئے لیکن ان پر دوستوئیفسکی اور ٹالسٹائی کی بنائی ہوئی تصویر ابھی تک غالب تھی۔

پھر اس تصویر پر دھیرے دھیرے ایک اور تصویر اترنے لگی

اب ہم تعلیم ختم کر کے روزگار کی تلاش میں تھے۔ عالمی کساد بازاری اور اقتصادی بحران کا زمانہ تھا۔ غلہ کوڑیوں کے بھاؤ بکنے لگا تھا اور بھوکے کسان دو وقت کی روٹی کی خاطر دھرتی ماتا سے ناتہ توڑ کر شہروں میں دربدر ہو رہے تھے، بیروزگاری کا انت نہ تھا اور ملازمت کا نشان مفقود، شریف ذلیل ہو رہے تھے اور عزت دار گھروں کی بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھی تھیں۔ صرف سرمایہ داروں اور ساہوکاروں کی چاندی تھی جو دونوں ہاتھوں سے حاجت مندوں کے اثاثے کے ساتھ ساتھ ان کی عزت اور غیرت بھی سمیٹ رہے تھے۔ جہاں تک مجھے علم ہے برصغیر کی سیاست پر اس بحران کے اثرات کا تفصیلی مطالعہ ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ اس مطالعے سے بہت سی سیاسی تحریکوں کے ابتدائی محرکات اور عوامل پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ اس بحران سے پہلے بدیسی سامراج اور قومی آزادی کا مسئلہ تو سب کی نظر میں تھا ہی اب نئے حالات نے قومی دولت کی تقسیم، امیری اور غریبی، مزدور اور سرمایہ دار، کسان اور زمیندار، بندگی اور خواجگی غرض کہ جملہ معاشی اور معاشرتی مسائل کا پہاڑ بھی سامنے لا کھڑا کیا اور ذی شعور لوگ اسے سر کرنے کی فکر میں سر کھپانے لگے۔ کسان سبھائیں بنیں، مزدور تحریک نے زور پکڑا اور قومی آزادی کے ساتھ ساتھ سوشلزم اور سماجی عدل و مساوات کے تقاضے بھی عام ہونے لگے۔

۱۹۳۵ء میں جب میں نے امرتسر کے ایک کالج میں پڑھانا شروع کیا تو نوجوان اساتذہ میں ان ہی مسائل پر بحث رہتی تھی۔ ایک دن میرے ایک رفیق کار صاحبزادہ محمود الظفر (مرحوم) نے ایک پتلی سی کتاب میرے حوالے کی اور کہا "تو یہ پڑھو اور اگلے ہفتے اس پر

ہم سے بحث کرو۔ لیکن غیر قانونی کتاب ہے اس لیے ذرا احتیاط سے رکھنا۔" یہ کتاب تھی کمیونسٹ مینی فیسٹو جو میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی اور ختم کرنے کے بعد دو تین بار پھر پڑھی۔ انسان اور فطرت، فرد اور معاشرہ، معاشرہ اور طبقات، طبقے اور ذرائع پیداوار کی تقسیم، ذرائع پیداوار اور پیداواری رشتے اور معاشرے کا ارتقا، انسانوں کی دنیا کے پیچ در پیچ اور تہ بہ تہ رشتے، ناتے، قدریں، عقیدے، فکر و عمل وغیرہ وغیرہ کے بارے میں یوں محسوس ہوا کہ کسی نے اس پورے خزینۂ اسرار کی کنجی ہاتھ میں تھما دی ہے یوں سوشلزم اور مارکسزم میں اپنی دلچسپی کی ابتدا ہوئی۔ پھر لینن کی کتابیں پڑھیں اور یوں لینن کے اکتوبر انقلاب اور اس کے انقلابی سرزمین سے واقفیت کی شدت سے طلب ہوئی۔ انقلاب کے بارے میں جان ریڈ کی کتاب ٹین ڈیز دٹ شوک دی ورلڈ پڑھی، وسط ایشیا کے بارے میں کنسٹنز کی کتاب ڈان اوور سمرقند مطالعہ کی اور پھر سوویت معاشرے کے بارے میں سڈنی اور بیٹرس ویب کی کتاب، ڈین ہیولٹ جانسن، ماریس ڈاب اور لندن کے لیفٹ بک کلب کی شائع کردہ دوسری کتابیں پڑھیں۔ ان سب کتابوں کا داخلہ اس وقت تک ممنوع تھا اور انھیں اپنے پاس رکھنا بھی جرم تھا اس لیے ان پر کوئی اور سرورق چپکا کر یا کسی آنے جانے والے کے ہاتھ منگوایا جاتا اور پھر یہ چوری چھپے ہاتھوں ہاتھ شائقین تک پہنچتیں۔ کتابوں کے علاوہ ہمارے ہاں دو تین بزرگ ایسے بھی تھے جو انقلاب کا ابتدائی دور اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ ایک تو ہمارے پرانے دوست فضل الٰہی قربان ہیں جن کے ساتھ ہم نے ٹریڈ یونین میں کام شروع کیا تھا۔ دوسرے دادا فیروز دین منصور (مرحوم) تھے جو بعد میں پاکستان کیمونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری بنے اور جن کے ساتھ جیل خانے میں بہت سا وقت گزرا، ان سے وسط ایشیا میں انقلابی جدوجہد کے قصے سنے جنھیں بیان کرنے کے لیے ایک الگ کتاب درکار ہے، پھر کچھ ترقی پسند نوجوان تعلیم ختم کر کے یورپ سے لوٹے جن میں سید سجاد ظہیر تھے، ڈاکٹر تاثیر تھے، زیڈ اے احمد تھے، بعد میں ملک راج آنند بھی کچھ دنوں کے لیے آ گئے تھے۔ یہ لوگ سوویت یونین گئے تو نہیں تھے لیکن یورپ میں بہت سے لوگوں سے وہاں کا آنکھوں

دیکھا حال سن چکے تھے اور اس بارے میں بہت سا لٹریچر بھی ساتھ لائے تھے۔ اس زمانے میں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم ہوئی اور سوویت انقلابی ادیبوں کی کتابیں نوجوان لکھنے والوں کا وظیفہ بن گئیں۔ گورکی، شولوخوف، الکسی ٹالسٹائے، الیا اہرن برگ اور جس جس کا بھی انگریزی ترجمہ دستیاب ہوا ذوق و شوق سے پڑھا گیا۔ سعادت حسن منٹو جو بعد میں اردو زبان کے بہت اہم افسانہ نگار بنے قریب قریب ہم عمر ہونے کے باوجود ان دنوں کالج میں رسمی طور سے میرے شاگرد تھے۔ رسمی طور سے اس لیے کہ وہ کلاس میں تو شاید ہی کبھی نظر آتے ہوں لیکن کالج بند ہونے کے بعد دوسرے چوتھے دن کسی نہ کسی روسی ادیب کی کتاب اور اپنا ترجمہ اٹھائے میرے ہاں بحث یا اپنے ترجمے کی ترمیم و تصحیح کے لیے آیا کرتے تھے۔

یہ سب کچھ پڑھ کر سن کر ہم نے اس دوسری تصویر میں رنگ بھرنے شروع کیے۔ ایک آزاد، غیر طبقاتی معاشرے کی تصویر جہاں کوئی سرمایہ دار نہیں کوئی جاگیردار نہیں اور زمیندار نہیں۔ نہ کوئی آقا ہے نہ کوئی بندہ نہ کوئی تلاشِ معاش میں سرگرداں ہے نہ فکرِ فردا میں گرفتار، جہاں مزدور کسان راج کرتے ہیں اور ہر معاملہ ان کی مرضی سے طے پاتا ہے۔

مزدور کسان راج سے ایک قصہ یاد آیا۔ چند برس پہلے کی بات ہے ہماری بیٹی سلیمہ لندن سے ماسکو کے راستے پاکستان جا رہی تھی اور مجھے ماسکو سے اس کے ساتھ روانہ ہونا تھا۔ اسی جہاز میں پاکستان کے کچھ ناخواندہ دیہاتی لوگ بھی سوار تھے جو انگلستان سے پاکستان واپس آ رہے تھے۔ ماسکو کے ایئرپورٹ پر ہمارے کچھ دوست ہمیں وداع کرنے کو آئے ہوئے تھے۔ ان سے رخصت ہو کر ہم جہاز میں سوار ہوئے، ساتھ کی نشست پر کوئی ایسے ہی دیہاتی بزرگ پہلے سے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے :

"آپ کوئی وزیر ہیں ؟"

میں نے کہا "نہیں"

"کوئی بڑے افسر ہیں ؟"

"نہیں"

"بزنس میں ہیں؟"

"نہیں"

"تو پھر اتنے لوگ آپ کو چھوڑنے کے لیے کیوں آئے تھے؟

میں نے بتایا "یہ سب لوگ اپنے پرانے دوست ہیں اس لیے آئے تھے۔"

"اچھا تو یہ کونسا ملک ہے؟"

"روس۔ اسے سوویت یونین بھی کہتے ہیں"

"یہاں کا بادشاہ کون ہے؟"

"یہاں بادشاہ کوئی نہیں ہے" میں نے کہا "اپنے بادشاہ کو تو ان لوگوں نے بہت پہلے ہٹا دیا تھا۔ اب تو یہاں مزدوروں کسانوں کی حکومت ہے۔"

"اوہو" بڑے میاں کچھ متاسف ہو کر بولے "ہم نے تو سنا تھا روس بہت بڑا اور امیر ملک ہے لیکن اگر یہاں کے حاکم بھی ہم جیسے مزدور کسان لوگ ہیں تو یہ بہت ہی غریب ملک ہوگا۔"

(باقی)

ویرا کے نام

تخلیق۔ ناظم حکمت — ترجمہ۔ فیض احمد فیض

اُس نے کہا آؤ
پھر اُس نے کہا ٹھہرو
مُسکاؤ کہا اس نے
مر جاؤ کہا اس نے

میں آیا
میں ٹھہر گیا
مُسکایا
اور مر بھی گیا

ازبکستان اور علامہ اقبال

سعداللہ یلداشیف
غالب لائبریری۔ ود سری چورنگی ناظم آباد کراچی

[اقبالیات کے سوویت محقق پروفیسر سعداللہ یلداشیف کچھ مدت کے لیے پاکستان آئے۔ ایک ماہ تک غالب لائبریری میں اقبال کا مطالعہ کرنے کے بعد لاہور چلے گئے جہاں علامہ اقبال پر کچھ مزید کام کیا۔ پروفیسر سعداللہ تاشقند کی لینن یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے پاکستان اور برصغیر کے ثقافتی اور ادبی ورثے پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے ازبکستان اور پاکستان کے ثقافتی تعلقات کو صدیوں کی روشنی میں دیکھا ہے اور ازبکستان میں اردو کے شاعروں اور ادیبوں خاص کر اقبال پر جو کام ہو رہا ہے اس کا ذکر کیا ہے]

ازبکستان اور پاکستان کے ثقافتی تعلقات صدیوں کی تاریخ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ دونوں ملکوں کے عوام کی تمدنی اور تہذیبی زندگی میں بڑی مشابہت ہے۔ اس تہذیبی رابطے کو بڑھانے اور وسعت دینے میں وسطی ایشیا کے بہت سے مفکروں عالموں اور شاعروں کا ہاتھ بھی رہا ہے۔ مثال کے طور پر امیر خسرو، ابوریحان البیرونی، مرزا الغ بیگ، مشہور ریاضی داں بادشاہ ظہیرالدین بابر، بڑا شاعر ذاکر جان فرقت وغیرہ۔ اس سلسلے میں

جو تحقیقی کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے اس سے یہ ثابت ہے کہ دونوں ملکوں کی تہذیبوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا ہے مثال کے طور پر مغلیہ دور کے فن تعمیر پر وسطی ایشیائی فنِ تعمیر کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ لاہور مغربی پاکستان کا مشہور مرکز ہے اس کا ذکر علامہ ابو ریحان البیرونیؒ نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ الہند" میں کیا ہے۔

پاکستان کے عوام کی طرح ازبکستان کے عوام بھی امیر خسروؔ، مرزا غالب جیسے شعرا پر فخر کرتے ہیں جو وسطی ایشیا سے تعلق رکھتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد ازبک عوام پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں میں زیادہ دلچسپی لینے اور اُن کا مطالعہ اپنی مادری زبان میں کرنے لگے ہیں۔ اس دوران بہت سے ازبکستان کے پاکستان شناسوں نے اردو کے بعض ادیبوں کی تصانیف کا مطالعہ کیا اور ان کے بارے میں تحقیقی مقالے لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی مثال کے طور پر سر سید احمد خاں، علامہ اقبالؔ، سعادت حسن منٹوؔ اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ پر مقالے لکھے گئے۔ ازبکستان میں اردو زبان، ادبیات، فن اور تہذیب تاشقند یونیورسٹی میں ابو ریحان البیرونی نامی ازبکستان کی سائنس اکیڈمی کے مشرق انسٹی ٹیوٹ میں پڑھائے جاتے ہیں اسی طرح فلاسفی انسٹی ٹیوٹ کا ایک شعبہ ہے جو مشرق کے افکار کے مطالعے کے لیے مخصوص ہے اس کا نام ہے "بیرونی مشرق کے فلسفیانہ افکار کے مطالعہ کا شعبہ" اس میں ہندو پاک کے مفکروں اور شاعروں کے بارے میں بھی تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ اردو زبان ازبکستان کے کئی اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ تاشقند میں سمرقند، بخارا، النوجوان، نمنگن، فرغنہ کے اسکولوں میں۔

سب کو معلوم ہے کہ اگلے سال یونیسکو کی قرارداد کے مطابق تمام دنیا میں بڑے ممتاز شاعر مفکر علامہ اقبالؔ کی صد سالہ سالگرہ منائی جائے گی جس کی مجھے بہت خوشی ہے۔ میں ایک ازبکی عالم اقبالؔ کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر تحقیقی کام کر رہا ہوں۔ ۱۹۶۶ء میں میں نے ازبک شاعر سیّار کے تعاون سے اقبالؔ کی تین نظموں کا ترجمہ کیا جو "سوویت ازبکستان" نام کے اخبار میں شائع ہوئیں۔ ۱۹۶۸ء میں اس اخبار نے میرا مضمون "مستقبل کا مدّاح" شائع کیا جس میں اقبالؔ کی شاعرانہ اور مفکرانہ عظمت سے روشناس کرایا گیا تھا۔ اسی سال

میں نے لینن کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر ایک کتابچہ شائع کیا۔ جس کا نام ہے " اقبال لینن کے بارے میں " اس کتابچے میں ان نظموں کا تجزیہ کیا گیا ہے جن میں اقبال نے لینن کا ذکر کیا ہے یا جن میں اکتوبر انقلاب اور اشتراکیت کا اثر نمایاں ہے۔ ۱۹۷۲ء میں ازبکستان کے سرکاری اشاعت گھر سے اقبال کی نظموں کا ایک مجموعہ چھپا ہے۔ اس مجموعے میں علامہ اقبال کی ۰۰ نظمیں ہیں۔ مثال کے طور پر انسان تصویر درد ہمالا مرزا غالب خدا اور انسان پرولتاریہ وغیرہ ازبک زبان میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ ازبکستان میں مرزا غالب کی طرح اقبال سے بھی دلچسپی بڑھتی جارہی ہے۔

اقبال کے فلسفیانہ نظریات کا ارتقاء

فیض

اقبال مرحوم کے فلسفیانہ نظریات کا ارتقاء تدریجی ہے انقلابی نہیں ہے۔ ان کے ابتدائی اور آخری افکار و خیالات میں ایک داخلی رابطہ اور تسلسل ہے جو ٹوٹنے نہیں پاتا۔ مختلف اوقات میں مرحوم شاعر نے جن نظریات کی تفسیر اور تشریح کی ہے ان میں اختلاف تو ہے۔ تناقض نہیں ہے۔ اقبال نے اپنی ذات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کی کیفیت بھی یہی ہے۔ ابتدائی کلام میں جن ذہنی الجھنوں اور جذباتی مسائل کا ذکر کرتے ہیں، جن کلفتوں اور مسرتوں، جس کرب یا سرور کا اظہار کرتے ہیں بعد کے کلام میں ان ہی کیفیات کی بازگشت بار بار سنائی دیتی ہے۔ اگر ہم اقبال کی نظر سے اقبال کو دیکھیں تو ہمیں اس شخصیت کے چند ایک پہلو بہت نمایاں نظر آئیں گے۔

(میزان ص ۲۵۵)

کتبِ اقبالیات

رفیع الدین ہاشمی
لیکچرار شعبہ اردو گورنمنٹ کالج سرگودھا

[۴۴صفحات کا ایک کتابچہ مندرجہ بالا عنوان کے تحت شائع کیا گیا ہے جس پر آئندہ اشاعت میں تبصرہ کیا جائے گا۔ یہاں فاضل مرتب رفیع الدین کا دیباچہ اقبال شناسوں اور اقبال کے محققین کے لیے بطور خاص نقل کیا جا رہا ہے۔ ادارہ]

اردو میں کتابیات (ببلیوگرافی) کی روایت کچھ زیادہ مستحکم نہیں ہے۔ اردو اور انگریزی میں علامہ اقبال پر اب تک تین کتابیات شائع ہو چکی ہیں (۱) کلید اقبال (اردو انگریزی) مرتبہ نذیر احمد (۱۹۶۲) (۲) ببلیوگرافی آف اقبال (انگریزی) مرتبہ عبدالغنی و خواجہ نور الٰہی (۳) اے ببلیوگرافی آف اقبال (انگریزی) مرتبہ کے اے وحید (۱۹۶۵ء)۔

ان میں سے موخر الذکر کتابیات نسبتاً مفصّل اور جامع ہے مگر اس کے بعد اقبالیات سے متعلق بہت سی کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب میں اقبالیات سے متعلق ایسی کتابوں کے حوالے جمع کیے گئے ہیں (الف) جو ۱۹۶۵ء سے پہلے شائع ہوئیں اور متذکرہ بالا کتابوں میں ان کا اندراج نہیں ہے (ب) جو ۱۹۶۵ء یا اس سے پہلے شائع ہوئیں مگر ان کا حوالہ کسی مطبوعہ کتابیات میں درج نہیں ہے۔ اگر درج ہے تو نامکمل یا غلط ہے۔ (ج) کسی کتاب کے اس ایک یا ایک سے زائد صرف ان ایڈیشنوں کا حوالہ جو کسی کتابیات میں موجود نہیں۔ اس طرح زیر نظر کتاب در حقیقت اقبال کی موجودہ مطبوعہ کتابیات کا تکملہ ہے۔ "کتبِ اقبالیات" کو صرف کتابی شکل میں مطبوعہ مقالات، مجموعہ ہائے مضامین اور رسائل کے اقبال نمبروں وغیرہ تک محدود رکھا گیا ہے۔ اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے متفرق مضامین سے تعرض نہیں کیا گیا۔ تمام حوالوں کو چند عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے البتہ آخر میں ایک ضمیمہ بھی شامل کر دیا گیا ہے جس میں ان کتابوں کے حوالے جمع کر دیے گئے ہیں جو متذکرہ بالا عنوانات کے تحت درج نہیں کیے جا سکے۔

پریس انفرمیشن بیورو۔ رزیڈنسی روڈ
سری نگر، کشمیر

پہلی قسط

جاوید نامہ

(سرینگر سے خاص جریدۂ غالب کے لیئے)

جگن ناتھ آزاد

جاوید نامہ پر جناب جگن ناتھ آزاد کی قابل قدر کتاب ۱۹۷۷ء میں شائع ہوگی۔ موصوف نے اس کا مکمل دیباچہ ازراہِ کرم ہمیں اشاعت کے لیے بھیجا ہے جو تا حال کہیں شائع نہیں ہوا ہے۔ یہ طویل اور فکر انگیز دیباچہ ایک سے زائد قسطوں میں شائع کیا جائے گا۔

"جاوید نامہ" اقبال کا شعری شاہکار ہے۔ جب یہ کتاب چھپی تھی تو علامہ سید سلیمان ندوی نے فرمایا تھا کہ اس وقت تک دُنیائے شعر میں فارسی کی زندۂ جاوید کتابوں کی تعداد چار تھی۔ اب ان کی تعداد پانچ ہوگئی ہے۔ اور وہ چار کتابیں ہیں مثنوی مولانا روم، شاہنامہ فردوسی، دیوان حافظ اور بوستان سعدی۔

"جاوید نامہ" اپنے اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے مثنوی مولانا روم کے علاوہ باقی تینوں مذکورہ کتابوں سے خاصی مختلف ہے۔ جہاں تک نظم کے تانے بانے کا تعلق ہے یہ مثنوی مولانا روم سے بھی بہت دُور ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے یہ البیغری ڈانٹے کی "ڈیوائن کامیڈی" سے زیادہ قریب ہے۔ ڈانٹے کی طرح اقبال کا بھی یہ رُوحانی سفر ہے۔ اس سفر میں اقبال (زندہ رُوذ) کی ملاقات فلکِ قمر، فلکِ عطارد، فلکِ زہرہ، فلکِ مریخ، فلکِ مشتری اور فلکِ زحل پر اور آسمانوں کے اس پار جس میں بہشت بریں بھی شامل ہے۔ رُوحانیت، تاریخ، ادب اور سیاست کی عظیم شخصیتوں مثلاً شیوجی مہاراج، گوتم بدھ، جمال الدین افغانی، منصور حلاج، غالب

قرۃ العین طاہرہ، نیٹشے، بھرتری ہری، ٹیپو سلطان (سلطان فتح علی خاں) ناصر خسرو علوی، شاہ ہمدانؒ، اور غنی کاشمیری سے ہوتی ہے۔ یہ تمام شخصیتیں نظم کی تشکیل و تکمیل میں اس طرح اقبال کا ساتھ دیتی ہیں کہ اقبال زندگی کے حقائق اور اسرار و رموز ان ہی کی زبان سے ادا کرتے ہیں۔ جس سے ان حقائق کے بیان کی دلکشی اور برجستگی میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

جہانِ خیر و شر میں روحِ انسانی کی ازلی اور ابدی کشمکش اور منزلِ مقصود کے قریب تر پہنچنے کی آرزو اس کتاب کا موضوع ہے۔ اس سلسلے میں متعدد مسائلِ حیات مثلاً روح اور جسم کا تعلق کیا ہے، انسان حیاتِ جاوداں کیسے حاصل کر سکتا ہے، بندے اور خدا کا باہمی رشتہ کیا ہے۔ مادی لذات کی کشش کس طرح ہماری روحانی اور دُنیوی ترقی کے رستے میں حائل ہوتی ہے۔ اقوامِ مشرق کو مغربی چیرہ دستی سے نجات پانے کے لیئے کیا کچھ کرنا چاہیئے، عصرِ حاضر میں مسلمانوں کی دینی اور دُنیوی بے راہ روی، دورِ غلامی میں ہندوستان کی حالتِ زار اور اس کا علاج، سوشلزم امپیریلزم، اور سرمایہ داری وغیرہ پر اقبال نے کہیں کھُل کر اور کہیں رمز و نکات کے پردے میں بحث کی ہے۔

"جاوید نامہ" کی تخلیق کے وقت اقبال کے سامنے لامکاں کے سفر کی عظیم ترین اور روشن ترین مثال معراجِ مصطفٰےؐ کی صورت میں موجود تھی۔ چنانچہ نظم کے آخری حصے میں اقبال نہایت دلکش انداز سے، ذاتِ حق کے حضور میں جاتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ بہشت بریں کے بعد پیرِ رومیؒ کی رہنمائی سے بے نیاز ہو گیا۔ کیونکہ حضورِ حق میں جذبۂ شوق تنہا ہی جاتا ہے۔ جیسے جبرئیل امین ایک خاص مقام تک پہنچ کے یہ کہہ کر رسول اکرمؐ سے الگ ہو گئے تھے کہ اب اس سے آگے میرا جانا محال ہے۔ اور وہاں سے حضوری تک فاصلہ رسول اکرمؐ نے تنہا طے کیا تھا۔

○

"جاوید نامہ" سے قبل اسی بحر میں اقبال کی دو طویل نظمیں موجود تھیں "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" لیکن یہ نظمیں تمثیلی انداز کی نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں اور "جاوید نامہ" میں ایک اور لطیف فرق یہ ہے کہ "جاوید نامہ" میں اقبال نے مثنوی کی مختصر بحر میں تنوع پیدا کرنے کے لیئے اسے جا بجا مختلف بحروں کی غزلوں اور نظموں سے مزیّن کیا ہے۔ جس سے بحیثیت مجموعی مثنوی کی دلکشی میں بڑا اضافہ ہوگیا ہے۔

○

"جاویدنامہ" کی تصنیف اقبال نے ۱۹۲۸ء میں شروع کی۔ تین برس میں یہ طویل نظم کمل ہوئی۔ ایک برس کے لگ بھگ کتاب کی طباعت میں صرف ہوا اور اور ۱۹۳۲ء میں یہ منظرِ عام پر آئی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر طویل ڈرامائی نظم لکھنے کا خیال اقبال کے دل میں ایک مدّت سے موجود تھا۔

یہ اس لیئے قرینِ قیاس نظر آتا ہے کہ "جاویدنامہ" کی پہلی نظم "مناجات" کے اوّلین اشعار ہی میں اقبال نے نظریۂ زماں کی بحث چھیڑ دی ہے۔ گویا "جاویدنامہ" کی ابتدا ہی اقبال نے نظریۂ زماں کے مباحث سے کی ہے۔ اور یہ نظریہ ایک زمانے سے اقبال کے لیئے خاصی اہمیت اختیار کر چکا تھا۔ مثنوی اسرارِ خودی " میں جو ۱۹۱۵ء میں چھپی اقبال نے نظریۂ زماں پر مفصّل بحث کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اگر ہم قریب قریب اسی زمانے کی ایک نظم "سیرِ فلک" کو بھی اپنے سامنے رکھیں تو یہ بات قدرے وضاحت کے ساتھ سامنے آجائے گی کہ اقبال اپنے نظریۂ زماں و مکاں کو لامکاں کے سفر کی صورت میں بیان کرنے کے لیئے راستوں کی تلاش میں تھے۔ اس نظم کے ابتدائی اشعار میں اقبال کہتے ہیں :۔

تھا تخیّل جو ہمسفر میرا ۔۔۔ آسماں پر ہوا گذر میرا
اُڑتا جاتا تھا اور نہ تھا کوئی ۔۔۔ جاننے والا چرخ پر میرا
تارے حیرت سے دیکھتے تھے مجھے ۔۔۔ رازِ سربستہ تھا سفر میرا

حلقۂ صبح و شام سے نکلا
اس پرانے نظام سے نکلا

"جاوید نامہ" اسی حلقۂ صبح و شام سے نکلنے کی ایک مربوط، مسلسل اور مفصّل داستان ہے۔

اس زمانے میں اگرچہ "جاوید نامہ" اپنی نظم کی موجودہ صورت میں تشکیل اقبال کے پیش نظر نہ بھی رہی ہو تو بھی اتنا یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ نہ صرف مباحث "جاوید نامہ" کسی نہ کسی انداز سے ان کے تحت الشعور میں پرورش پا رہے تھے بلکہ ان مباحث میں سے اہم ترین بحث — نظریۂ زماں و مکاں — پوری طرح اقبال کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ مسئلۂ زماں و مکاں کی اقبال کی نظر میں کتنی اہمیت تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اسے مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا سوال کہا ہے۔

○

"جاوید نامہ" میں حرکت بہ وادیٔ یرغمید کہ ملائکہ اور وادیٔ طواسین می نامند[۱] مسئلہ خیر و شر کی بحث میں ایک نہایت ہی اہم حصّہ ہے۔ میں نے ترجمے میں اس مقام پر طواسین[۲] کے مفہوم کو وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن خیال یہ ہے کہ ۱۹۱۷ء میں منصور حلاج کی تصنیف "کتاب الطواسین" سے اقبال کی دلچسپی کا سبب بڑی حد تک یہی ہوگا کہ وہ قرآن کے ان حروف مقطعات (طاسین) کا اپنی مجوزہ تصنیف "جاوید نامہ" میں بطریق استعمال کرنا چاہتے تھے۔ میرے اس خیال کو تقویت اقبال کے اس خط سے پہنچتی ہے جو انھوں نے ۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء کو علامہ سید سلیمان ندوی کو لکھا۔

○

"جاوید نامہ" کا ایک اور اہم حصّہ[۳] وہ ہے جس میں اقبال غالب کے ساتھ اپنی

---

[۱] فلکِ قمر [۲] واحد — طاسین [۳] مؤلف سے میری مراد ایڈیٹر کتاب الطواسین موسیو ماسینوں ہے جس نے فرانسیسی زبان میں طواسین کے مضامین پر حواشی لکھے ہیں۔ (اقبال)
[۴] فلکِ مشتری۔

بات چیت کے دوران یہ ایک سو سال سے زیادہ پرانی بحث کو کہ کیا خدا تعالیٰ حضور خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کی نظیر پیدا کرنے پر قادر ہے یا نہیں۔ از سر نو زندہ کرتے ہیں۔ اور یہی سوال غالب سے کرتے ہیں۔ یہ بحث ۱۸۲۰ء میں مرزا غالب کے دوست مولانا فضل حق خیر آبادی اور مولانا اسمٰعیل شہید دہلوی کے درمیان ایک مناظرے کی صورت میں ہوئی تھی۔ مولانا فضل حق کا کہنا یہ تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نظیر ممتنع الوجود ہے یعنی خدا کی ذات رسول اللہ کی نظیر پیدا کرنے پر قادر نہیں۔ مولانا اسمٰعیل شہید کا نظریہ یہ تھا کہ "لا نبی بعدی" کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظیر پیدا نہیں کرے گا لیکن وہ یہ نظیر پیدا کرنے پر قادر ہے۔

اب "جاوید نامہ" کے اس حصے کی مباحث کی روشنی میں اقبال کا ایک مکتوب ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے ۲۵ اپریل ۱۹۲۲ء کو سید سلیمان ندوی کو لکھا :۔

"حال کے ہیئت داں کہتے ہیں کہ بعض سیاروں میں انسان یا انسانوں سے اعلیٰ تر مخلوق کی آبادی ممکن ہے۔ اگر ایسا ہو تو رحمۃ للعالمین کا ظہور وہاں بھی ضروری ہے۔ اس صورت میں کم از کم محمدیت کے لیئے تناسخ یا بروز لازم آتا ہے۔ شیخ اشراق تناسخ کے ایک شکل میں قائل تھے۔ ان کے پاس اس عقیدے کی وجہ یہی تو نہیں تھی ؟"

اس سلسلے میں ۲۲ اگست ۱۹۲۲ء کا ایک اور مکتوب ملاحظہ کیجئے :۔

"زماں و مکاں و حرکت کی بحث اس وقت فلسفے اور سائنس کے مباحث میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ میری ایک مدت سے خواہش ہے کہ اسلامی حکماء اور صوفیہ کے نقطۂ نگاہ سے یورپ کو روشناس کرایا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا بہت اچھا اثر ہوگا ......

حضرت ابن عربی کے بحث زماں کا ملخص اگر عطا ہو جائے تو بہت عنایت ہوگی۔ آپ کے ملخص کی روشنی میں کتاب میں خود پڑھوں گا۔[۱]

پھر ۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء کے خط میں سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں :-

"مباحث شرقیہ" لاہور میں دستیاب نہیں ہو سکی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ زبان کے متعلق امام رازی کے خیالات کا خلاصہ قلم بند فرما کر مجھے ارسال کریں۔ میں اس کا ترجمہ نہیں چاہتا صرف خلاصہ چاہتا ہوں جس کے لکھنے میں غالباً آپ کا بہت وقت ضائع نہیں ہوگا۔"

○

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ زیر نظر دیباچے میں "جاوید نامہ" کو بحث کا موضوع نہیں بنانا چاہیے۔ بلکہ بات چیت کو ترجمۂ "جاوید نامہ" تک ہی محدود رکھنا چاہیے اس لیے صرف ایک اور چھوٹی سی بات کا ذکر کر کے میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

۳۰ جنوری ۱۹۳۱ء کے ایک خط میں اقبال پروفیسر خواجہ الف۔ ایم شجاع (ر۔ب۔ ولیم) کے نام لکھتے ہیں :-

"آخری نظم "جاوید نامہ"، جس کے دو ہزار اشعار ہوں گے ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ممکن ہے مارچ تک ختم ہو جائے۔ یہ ایک قسم کی ڈیوائن کامیڈی ہے۔ اور مثنوی مولانا روم کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس کا دیباچہ

---

[۱] اقبال کا یہ مکتوب "اقبال نامہ" جلد اوّل میں موجود ہے۔ مقام حیرت یہ ہے کہ اس میں اقبال لکھتے ہیں :

"میرے لکچر آکسفورڈ یونی ورسٹی چھاپ رہی ہے۔ اور ترجمہ نیازی صاحب نے ختم کر لیا ہے۔ اس کی طباعت عنقریب شروع ہوگی۔"

حالانکہ مذکورہ لکچر اقبال نے ۱۹۲۸ء میں مکمل کئے۔ اور آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے ۱۹۳۴ء میں چھپے (غالباً اس خط پر تاریخ غلط چھپی ہے ۱۹۲۸ء ہونا چاہیے۔ اس صورت میں بھی یہ خط میرے مذکورہ خیال کی تردید نہیں کرتا۔)

بہت دلچسپ ہوگا۔ اور اس میں غالباً ہند و ایران بلکہ تمام دنیائے اسلام کے لیے نئی باتیں ہوں گی۔ ایرانیوں میں حسین ابن منصور حلاج، قرۃ العین ناصر خسرو علوی وغیرہ کا نظم میں ذکر آئے گا۔ جمال الدین افغانی کا پیغام مملکت روس کے نام ہوگا۔۔۔۔۔"

لیکن ۱۹۳۲ء میں جب "جاوید نامہ" چھپی تو مذکورہ دیباچہ کہیں نظر نہ آیا میرے پاس اس وقت "جاوید نامہ" کا مبارک علی ایڈیشن (۱۹۴۷ء) ہے۔ یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ پہلا ایڈیشن میں نے ۱۹۴۳ء میں اورینٹل کالج لاہور کی لائبریری سے لے کر پڑھا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس میں بھی دیباچہ نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے کہ نثر میں دیباچہ ہو۔ اور اس وقت مجھے اس کا خیال نہ آرہا ہو۔ لیکن جو کچھ مجھے یاد ہے وہ یہ ہے کہ شروع میں دیباچے کے طور پر مندرجہ ذیل دو اشعار تھے۔

خیال من بہ تماشائے آسماں بودہ است
بدوش ماہ و بہ آغوش کہکشاں بودہ است
گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمن ماست
کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بودہ است

اور یہ دونوں اشعار "زبور عجم" کے ہیں۔ اس سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ اگرچہ اقبال نے "جاوید نامہ" کی ابتدا ۱۹۲۸ء کے آخر یا ۱۹۲۹ء کے شروع میں کی لیکن دراصل ان کا جذبۂ شوق اور فکر رسا ایک مدت سے اس نظم کی تیاری میں مصروف تھے۔

اقبال

اپنی غریب قوم کے عام افراد اور خاص طور سے نوجوانوں سے جب بھی خطاب کرتے ہیں تو اُن کی ذات کا ایک اور جذباتی پہلو واضح ہوتا ہے۔ یہ جذبہ ایک بہت ہی پُرخلوص مشفقانہ پیار کا جذبہ ہے۔
فیض

مطبوعہ آج کل دہلی ۱۵ جنوری ۱۹۴۷ء

اقبال کا شاہین

مغیث الدین فریدی

اقبال کی جدّت طرازی نے اردو و فارسی دونوں زبانوں کو اسالیب و موضوع کے علاوہ نئی نئی تمثیلات کی دولت بھی فراوانی کے ساتھ عطا کی ہے۔ وہ شخص جو نظامِ قدرت میں بھی ندرت اور تنوع دیکھنا چاہے اور رات دن کی یکسانیت سے اُکتا کر خدا سے کہہ دے ؎

طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

وہ اردو فارسی کی تمثیلات، بلبل، کبک، طاؤس وغیرہ کا محتاج کیوں رہتا۔ یہ اُس کے زبردست جذبۂ تخلیق کا فیض ہے کہ اس نے اپنے پیغام کی وضاحت اور اپنے بلند مقاصد کی تشریح کے لیے شاہین، شہباز اور عقاب کی تمثیلات سے کام لیا۔ یہ تینوں چیزیں بالکل اچھوتی نہیں ہیں۔ اردو فارسی میں اکثر جگہ ان کا ذکر آیا ہے۔ لیکن اقبال نے ان کے ذریعے جس مقصد کی وضاحت کی ہے اس مقصد کی اہمیت نے ان تمثیلات کی وقعت بڑھا دی۔

اردو کے اساتذۂ قدیم کے کلام میں شاہین کا ذکر جس حیثیت سے کیا گیا ہے وہ کچھ ایسی مضحکہ خیز ہے کہ شاہین کے نام سے نفرت ہونے لگی ؎

مرغ عصیاں اڑ کے صید باز رحمت ہو گیا
دنگ شاہین ترازوئے عدالت ہو گیا

تیر سے تیرے کوئی طائر نہ چھوٹا دہر میں
رہ گیا تو ایک شاہین ترازو رہ گیا

چھپ رہا ہے قفسِ تن میں جو ہر طائرِ دل
آنکھ کھولے ہوئے شاہینِ نظر کس کا ہے

یا شاہباز کے بیے حضرت آتش فرماتے ہیں

تو نے زلفوں کو اُلجھ پڑنے سے منڈوایا جو یار
شاہبازِ حُسن بے بازو نظر آیا مجھے

یہ اور اس قبیل کے متعدد اشعار اردو کے دواوین میں ملتے ہیں۔ فارسی میں خواجہ حافظ فرماتے ہیں

شہپر زاغ و زغن شایانِ قید و بند نیست
ایں کرامت قسمتِ شہباز و شاہین کردہ اند

مگر اقبال کے کلام میں شاہین کا ایک خاص تصوّر ملتا ہے جو اُن کے مخصوص تصوّرِ خودی کا تابع ہے "شاہین ایک بلند پرواز، تیز نظر، تنومند، جفاکش، غیور اور بلند فطرت پرندہ ہے۔" اقبال اس کی جملہ خصوصیات میں سے خونریزی کے عنصر کو حذف کر کے پیش کرتے ہیں اور یہی ان کے نزدیک صحیح مردِ مومن کا کردار ہے۔

بلند فطری اور ذوقِ عمل ــــــ یہ تصوّر ان کے ہاں اس قدر تابناک ہے کہ جب وہ شاہین کی زبان سے اس کی سیرت بیان کرتے ہیں تو وہاں بھی خونریزی کا شائبہ تک نہیں آنے دیتے۔ شاہین کہتا ہے ؎

بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں کہ شاہین بناتا نہیں آشیانہ

اقبال کے مسلک میں شباب تن آسانی اور تن پروری کا نام نہیں ہے بلکہ سخت کوشی اور اپنے لہو کی آگ میں جلنا شباب کی صحیح تعریف ہے ؎

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقابِ سال خورد اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر　　وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

اقبال صوفیا کے سلف کی تعلیم نفیِ خودی سے بیزار ہے۔ وہ قوم کی پستی اور زوال کا سبب اسی غلط تعلیم کو قرار دیتا ہے "مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید کا سبق" دینے والے کو وہ گوسفندانِ گوسفندانِ قدیم کے لقب سے یاد کرتا ہے اور اپنے زبردست جذبۂ تخلیق کی مدد سے خودی کو ایک نہایت ارفع و اعلیٰ درجہ عطا کرتا ہے۔ اس حکیمانہ بصیرت، فلسفیانہ استدلال اور شاعرانہ اندازِ بیان خودی کے لفظ سے عزور و خود پسندی کا مفہوم چھین کر اُسے احساسِ نفس یا تعینِ ذات کے معنی پہنا دیتا ہے۔ اس کے نزدیک استحکامِ خودی، اپنے طبعی ماحول سے جنگ کرنا اور فطرت کو اپنا مطیع بنانے کی کوشش کرنا ہے اور جب وہ قوم کے نوجوانوں میں خودی کا احساس نہیں پاتا تو خدا سے دعا کرتا ہے ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے　　پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے　　مرا نورِ بصیرت عام کر دے

جدید طریقۂ تعلیم سے اقبال سخت متنفر تھے۔ تہذیبِ جدید اور تقلیدِ فرنگ کے فیض سے وہ قوم کے نوجوانوں کو بے عمل، بزدل اور غلام دیکھ کر اُن اداروں اور تعلیم گاہوں کے ذمہ دار حضرات کو ان کے فرائض کا احساس دلاتے ہیں ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے　　سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

بعض مغرب زدہ حضرات اقبال کی مقاصد آفرینی کے مضمون کو برگساں کے جوشِ حیات اور ارتقائے تخلیق کا عکس بتاتے ہیں حالانکہ ان دونوں کے نقطۂ نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ برگساں نے نفسِ انسانی کی تخلیقی صلاحیت کو مادّی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے لیکن اقبال کے نزدیک نفسِ انسانی کی تخلیق کا محرک روحانی جذبہ ہوتا ہے۔ اقبال کی مقاصد آفرینی خالص روحانی ہے اور اُس تہذیبِ نفس کی مرہونِ منت ہے جو مذہب و اخلاق کی بنیاد ہے۔ یہی تہذیبِ نفس جب اقبال کے سامنے مردِ مومن کا تصور پیش کرتی ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو　　فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور　　کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

اقبال نطشے کا شاگرد ہے اس وجہ سے کہ وہاں بھی اُسے اپنے نقطۂ نظر کی تائید ملتی ہے۔ نطشے بھی استحکامِ خودی چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اس کے لیے قلبِ مومن و ناغشِ کا فراست کہتا ہے۔ وہ رومی کا اس لیے مدّاح ہے کہ رومی عقل سے زیادہ عشق پر ایمان رکھتا ہے اور یہی اقبال کا مسلک ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ہنوز

مگر اس کا عشق اس سے مختلف ہے۔ وہ ایسا عشق چاہتا ہے جو جذبۂ تسخیر جذبۂ تخلیق اور جذبۂ ارتقا کے کامیاب امتزاج کا نتیجہ ہو۔

نہ دارد کار با دوں ہمتاں عشق　　تدروِ مردہ را شاہیں نہ گیرد
عقاباں را بہائے کم نہد عشق　　نہ دواں را با زاں سرد ہر عشق
نگہ دارد دل را خویشتن را　　ولیکن از کمینش بر جہد عشق

اقبال کے نزدیک عشق زندگی کی اعلیٰ ترین تخلیقی استعداد ہے۔ مگر اس کے لیے بیدار دل کی ضرورت ہے ؎

نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے　　شکار مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں

اقبال کو جمود سے نفرت ہے۔ وہ کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں حرکت اور عمل کا جذبہ بیدار کرنا چاہتا ہے اور جب ہندوستان کی غلامانہ ذہنیت سے مسلمان کو متاثر دیکھتا ہے تو کس انداز سے نشتر زنی کرتا ہے ؎

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں　　اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

خودی کی سعیٔ پیہم روح کو اندرونی اور وجدانی طور پر اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے تیار کرتی ہے اور یہ مقاصد کی روشنی مستقبل کی تصویر کو حال کے آئینے میں پیش کر سکتی ہے مگر اس کے لیے جس ہمتِ بلند کی ضرورت ہوتی ہے اس کی تعلیم اقبال یوں دیتا ہے :

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں　　نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے　　اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر　　تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

قرآنِ پاک میں جگہ جگہ اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ انسان اپنے اعمال و افعال کا ذمہ دار خود ہے (لیس الانسان الا ما سعی یا لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت) کی تفسیر اقبال بڑے دلچسپ پیرائے میں یوں کرتا ہے۔ جب ابوالعلا معرّی کو بُھنا ہوا تیتر پیش کیا گیا تو اس نے تیتر سے یوں کہا

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو ۔۔۔ دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے نظارے
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ۔۔۔ ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اسلام نے انسان کے تصوّر اور ارادے کو آزاد رکھا ہے تاکہ ہر شخص اپنی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لاسکے۔ اقبال اسی تعلیم کو اپنے الفاظ میں یوں سناتا ہے ؎

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر ۔۔۔ چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ۔۔۔ ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسلام نے جو مردِ مومن کا معیار پیش کیا ہے اس پر جب مسلمان پورا نہیں اترتا تو اقبال اُسے غیرت دلاتا ہے ؎

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے ۔۔۔ تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری ۔۔۔ تری آنکھوں میں بےباکی نہیں ہے

اسی بےباکی اور بلند ہمتی کی تعلیم دیتے ہوئے اقبال قوم کے ہر فرد میں خود اعتمادی غیرت اور بلند آہنگی پیدا کرنا چاہتا ہے ؎

جینے کا جگر چاہیئے شاہیں کا تجسّس ۔۔۔ جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش و فرہنگ

علم و عقل سے زیادہ اقبال عشق کا پرستار ہے۔ وہ خشک فلسفیانہ مسائل سے ہمیشہ بیزار رہا ہے۔ محض فلسفے کو وہ زندگی سے دوری کہتا ہے۔

بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور ۔۔۔ حکیم سرِ محبت سے بے نصیب رہا
پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار ۔۔۔ شکارِ زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا

علامہ اقبال حیدر آباد دکن میں

سلیم تمنائی
دودھ پیر مکان عیدگاہ میسور (۱)

خاص جریدۂ غالب کے لیے

(داستانِ از دکن آوردہ ام کا ایک باب)

دکن دیس میں صبح صبح ریل رکی۔ قلی قطب شاہ کی چہیتی بیگم بھاگ متی کی چہیتی سرزمین۔ ڈاکٹر اقبال نے دیکھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر، طلبا اور معززین شہر کے ساتھ سوم نچے ایک قطار میں کھڑے علامہ موصوف کا ترانہ ملی چھ

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا

خوش الحانی سے پڑھ رہے ہیں [۱]

حضرت اقبال کے لیے دکن دیس نیا نہیں تھا۔ ۱۹۱۰ء کے سارے منظر ابھی آنکھوں میں تھے۔ جیسے کل کی بات ہو۔ "شکریہ" اور "گورستانِ شاہی" جیسی نظمیں اس سفر کی یادگار تھیں۔ تاجدارِ دکن میر محبوب علی خاں سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ ہوتی بھی تو کچھ دن بعد ہوتی۔ مگر علامہ اقبال کے بندھے بندھائے پروگراموں میں اتنی گنجائش کہاں تھی کہ ٹھہر جاتے [۲] پھر حضرت اقبال کا یہ سفر بلا مقصد بھی تو نہ تھا۔

---

[۱] روزنامہ اسلام ۱۹۲۹ء بہ نیرنگِ خیال اقبال نمبر، ذکر اقبال

[۲] ... میں حیدرآباد میں چند ... اور رہتا تو مجھے یقین واثق ہے کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام مجھے ضرور شرفِ باریابی بخشتے ... میرا سفر حیدرآباد بلا مقصد نہ تھا۔
(اقبال کا خط عطیہ بیگم فیضی کے نام)

اب پورے انیس سال بعد علامہ اقبال اسی ہرے بھرے سانونے سونے دکن دیس میں تھے، ہاتھوں ہاتھ لیے گئے اور مہمان خانۂ شاہی[1] میں پہنچائے گئے۔ اب معزز مہمان کو دیکھنے، سننے اور کچھ پانے، خاص و عام[2] آتے رہے۔

سلیم صاحب! مدیر الکلام نے فرمایا، حضرت اقبال سے گفتگو کرنے اور آپ کے زریں خیالات سننے میں لیکچروں سے کہیں زیادہ مزا اور لطف آتا تھا۔ اور وہ تمام باتیں جو صرف لیکچروں کے سننے سے بخوبی سمجھ میں نہیں آتی تھیں (اور جو شکوک سامعین کے دلوں میں باقی رہ جاتے تھے) وہ ڈاکٹر صاحب سے گفتگو کے دوران حیرت انگیز طور پر اپنے صحیح معنو میں منوّر ہو جاتیں..... یہ باتیں ایسی دل چسپ اور مفید ہوا کرتی تھیں کہ سامعین دنگ رہ جاتے کہ اب تک ہمارے خیالات کیا تھے اور درحقیقت کیسے ہونے چاہیئے۔"

حضرت اقبالؔ پارس ہی نہیں تھے، سونا بھی تھے، کندن بھی۔ ایک ذات میں ان دونوں صفات کا ملن عجیب ہے۔ مگر اقبالؔ کی شخصیت اس سے بھی کچھ اونچی ہی تھی اور بلند تر۔ کتنے ہی مسائل علامہ موصوف کے سامنے پیش کیے جاتے اور حل ہو جاتے۔ مذہب سیاست، زبان اور نہ جانے کون کون سے مسائل۔ مولانا محمد صالح مصنف "قرآن اور اقبالؒ" ا۔ تحریک قرآن" کے سلسلے میں نواب نذیر یار جنگ بہادر کے ہمراہ ملے۔ اور تعارف

---

[1] بذریعہ تار (قیام بنگلور میں) یہ خبر ملی کہ علامہ مدظلہ کے قیام کے لیے جناب حیدر نواز جنگ دام اقبالہ وزیر فینانس نے "دلکشا" میں انتظام فرمایا ہے۔
(مدیر الکلام کا خط مطبوعہ روزنامہ الکلام بتاریخ ۵؍جنوری ۱۹۲۹ء)

[2] "ڈاکٹر صاحب کی ملاقات کے لیے حیدرآباد سے بہترین اور لائق ترین اصحاب تشریف لاتے ہیں۔ گھنٹوں مختلف دل چسپ سیاسی، مذہبی اور معاشرتی ابواب پر گفتگو ہوا کرتی ..... کل جنوری ۱۵؍۱۹۲۹ء کو جناب ڈاکٹر صاحب نے سرامین جنگ بہادر اور دیگر افسران شاہی سے ملاقات کی اور نواب حیدر نواز جنگ کے ہاں لنچ (Lunch) تناول فرمایا۔ (سید غوث محی الدین مدیر الکلام کا ایک خط مطبوعہ ۱۹؍جنوری ۱۹۲۹ء)

کے بعد قرآن کا اوّلین مقصد قرآن مجید کی تعلیم معنی و مطالب کے ساتھ عام اور لازمی کرنا بیان کیا گیا[۱]۔

ڈاکٹر اقبال نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے تعلیم یافتہ نوجوانوں پر ایک نظر ڈالی پھر اپنا کمبل ٹھیک سے اوڑھتے ہوئے مولانا سے فرمایا "مولوی صاحب[۲]! آپ کی تحریک سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، مگر پہلے یہ بتایئے۔ قرآن پڑھائے گا کون؟

" ڈاکٹر صاحب! بے شک حقیقی معنوں میں قرآن کے پڑھانے والوں ہی کی کمی ہے جس دن یہ کمی پوری ہوئی۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ مگر آپ مجھے قرآن[۳] قرآن کرنے دیجیے کیونکہ آپ کے حسبِ منشا قرآن پڑھانے والے بھی قرآن ہی سے پیدا ہوں گے[۴]۔

مولانا محمد صالح صاحب کے ایک شاگرد عزیز نے ایک لطیفے کی گنجائش نکال ہی لی یعنی دوسرے دن مولانا نے شائع شدہ لٹریچر ان شاگرد عزیز کے ہاتھ روانہ فرما کر تحریک سے متعلق لگے ہاتھوں رائے بھی طلب کرنی چاہی۔ لیکن شاگرد نے خود حضرت اقبال کو بھی قرآنِ مجید کی تعلیم و تبلیغ کی دعوت دے دی۔

حضرت اقبال نے مسکرا کر فرمایا۔ ہاں جی! پہلے میں آپ کے استاد سے قرآن پڑھ لوں پھر ایسا کروں گا[۵]۔

بہادر یار جنگ اور دوسرے مخلص سیاسی رہنماؤں سے ہندوستان کی آزادی مسلمانوں کے حقوق، حیدرآباد کی کامن ویلتھ میں ایک آزاد ملک کی حیثیت[۶] سے شرکت

---

[۱] روزنامہ الکلام ۱۹۲۹ء

[۲] [۳] قرآن اور اقبال

[۴] قرآن اور اقبال

[۵] قرآن اور اقبال

[۶] "حیدرآباد اور اقبال" کے مصنف نظر حیدرآبادی نے صفحہ ۱۹ پر "مذاہب عالم کے سیاسی جائزے" اور "اقبال کا سیاسی زمانہ" کے مصنفین اور بہادر یار جنگ کا حوالہ دے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وغیرہ پر حضرت اقبال اپنے جچے تلے خیالات کا اظہار فرماتے اور ان صحبتوں کو غنیمت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کو تحریر کیا ہے کہ:

"جب اقبال گول میز کانفرنس کے لیے جاتے ہیں اور ہندوستان کے آئینی مستقبل اور اس کی سیاسی الجھنوں کا حل صوبوں کی مکمل آزادی اور ان کو براہ راست وزیر ہند کے تحت کر دینے کی اسکیم کی شکل میں پیش کرتے ہیں تو اس وقت بھی وہ حیدر آباد کو فراموش نہیں کرتے ہیں۔ بہادر یار جنگ سے روایت ہے کہ ان سے خود اقبال نے کہا تھا کہ گول میز کانفرنس کے دوران نجی طور پر وزیر ہند اور انگلستان کے دوسرے مدبرین سے حیدر آباد کے آئینی موقف کے بارے میں گفتگو کرتے رہے اور انھیں اپنے دلائل سے قائل کر دیا کہ حیدر آباد کو اس کے مقبوضہ علاقوں کی واپسی کے ساتھ مقبوضہ جاتی درجہ دے دینا چاہیئے تاکہ وہ اپنی آزاد حیثیت میں کامن ویلتھ کی تقویت کا باعث ہو۔ لیکن بد قسمتی سے خود حیدر آباد کے وفد کے سربراہ اکبر حیدری نے اس کی مخالفت کی اور مخالفت کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ ایسا عمل قبل از وقت ہوگا اور ممکن ہے اس اقدام سے ہندو جماعتیں ایجی ٹیشن کریں اور دوسری اور ریاستیں بھی ایسے ہی مطالبات پیش کر دیں۔"

لیکن مولانا غلام رسول صاحب مہر جو گول میز کانفرنس میں ڈاکٹر اقبال کے ساتھ رہے، ۲۶ ستمبر ۱۹۶۱ء کے ایک کرم نامے میں جو راقم کے نام ہے، تحریر فرماتے ہیں:

"یہ صحیح نہیں کہ علامہ مرحوم نے گول میز کانفرنس میں حیدر آباد کے متعلق کوئی خاص اور امتیازی تجویز سوچی تھی جو سر اکبر حیدری کے اختلاف کے باعث بروئے کار نہ آسکی۔ ایسا نہ کوئی موقع تھا نہ گول میز کانفرنس میں ایسی تجویزیں پیش ہو سکتی تھیں بلکہ میرے علم کی حد تک مسلم مندوبین کے باہمی مشوروں میں بھی ایسی کوئی بات نہ آئی اگرچہ اس قسم کی آرزوئیں مختلف قلوب میں موجود ہوں۔ پھر بھی یہ ظاہر ہے کہ ریاستہائے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

جان اور فائدہ اٹھا زبانِ اردو کا مسئلہ ہی اٹھایا جاتا اور یہ گزارش بھی نہیں ہوتی کہ علامہ اقبال ترقی اردو پر کچھ اور زیادہ زور دیں[1]۔

ڈاکٹر صاحب بات کی تہہ تک پہنچ جاتے اور فرماتے[2]:

"اس وقت میرے مخاطبین نہ صرف ہندوستانی مسلمان ہیں بلکہ ساری دنیا کے، اگر میں اپنے خیالات اردو میں ہی ظاہر کرنے لگوں تو میرے پیغامات ہندوستان سے باہر کثیر التعداد مسلمانوں تک کیسے پہنچ سکیں گے۔ اس لیے ایسی زبان اختیار کرنی پڑی جو دنیا بھر میں عموماً بولی جاتی ہے۔ پس فارسی اور عربی اس مقصد کے لیے بہ نسبت اردو کے زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہیں۔

شاعر کا شعر کہنا اور سنانا عام بات ہے۔ ایک حقیقت ہے، رونے اور گنگنانے کی طرح، سننے والا شاید شاعر یا اس کی پرچھائیں دیکھ کر دُم دبا کر بھاگ جائے مگر شاعر شعر سنانے سے باز نہیں آتا۔ کبھی کسی سے سننے کے بہانے ایک کے مقابلے میں چار سناتا ہے۔ بس چلے تو یہ دیوانہ سارا دیوان سنا دے۔

حضرت جوش ملیح آبادی دارالترجمہ کے ناظم تھے۔ آپ کے حسنِ انتظام سے ۵ ارجنوری کی شب مہاراجہ کشن پرشاد کی حویلی میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا، جب ڈاکٹر صاحب سے اصرار ہوا اور مہاراجہ کشن پرشاد نے بھی فرمایا کہ "سنا دیجئے نا اقبال صاحب مگر خواص کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ آپ نے صاف انکار کر دیا۔ اصرار

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ہند اپنا ایک خاص مسلک بالاتفاق طے کر چکی تھیں۔ نواب حمید اللہ خاں مرحوم والیٔ بھوپال اس زمانے میں ایوان ریاستہائے ہند کے چانسلر تھے۔ ان کی موجودگی میں متفقہ طور پر طے کردہ مسلک کے خلاف کوئی فرد کون سی تجویز پیش کر سکتا تھا؟ نیز اس کی منظوری کا کون سا موقع تھا؟

[1] روزنامہ الکلام ۹ ۱۹۲ء [2] مدیر الکلام کا خط (مطبوعہ ۹ جنوری) قارئین الکلام کے نام

بڑھایا تو فرمایا: "Fools! I want to give an empire and you want poetry from me?"

۱؎ میری زندگی کا ماحصل از ۔۔۔ رغوث محی الدین مدیر الکلام مطبوعہ مفید وار قوم بنگلور لیکن آپ کے خط مورخہ ۱۹ر جنوری ۷۹ء میں تحریر ہے کہ:۔

یہاں کے چند شعراء نے ایک مشاعرے میں ڈاکٹر صاحب کو صدر بنانے کی تجویز کی اور اکثر اصحاب نے ڈاکٹر صاحب کو مجبور بھی کیا لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ: (نادانو! میں تمہیں سلطنت دینا چاہتا ہوں اور تم مجھ سے شاعری چاہتے ہو) علامہ مرحوم سے منسوب ان الفاظ سے یہ گمان غالب ہوتا ہے کہ وہ روایت (جس کا ذکر نظر حیدرآبادی نے "اقبال اور حیدرآباد" میں) کیا ہے کہ اقبال حیدرآباد کو کامن ویلتھ میں ایک آزاد ملک کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے تھے اور جس کی تفصیل راقم نے صفحہ ۲ کے حاشیے میں دے دی ہے شاید صحیح ہی ہو اور علامہ اقبال نے اسی کی جانب شاید اشارہ کیا ہو۔ مگر بزرگ محترم حضرت غلام رسول مہر مرحوم نے راقم کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا تھا کہ:

اگر علامہ مرحوم سے ان الفاظ کا انتساب درست ہے تو ان کا مطلب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ میں مسلمانوں میں مملکت آرائی کے اوصاف و خصائص مہیا کر رہا ہوں ایک بلند نصب العین کے لیے والہانہ اقدام کی دعوت دے رہا ہوں اور ع

از حدیث دلبری خواہد زمن

پروفیسر سید محمد حیدرآبادی میرے غریب خانے بھائی سید مبارز الدین صاحب رفعت کے ساتھ تشریف لائے ترکشن پرشاد شاد کی حویلی والے مشاعرے کا ذکر فرماتے ہوئے دو اور دلچسپ واقعات سنائے۔

صاحب موصوف نے اپنے قیام لاہور (شاید پروفیسر عبداللہ چغتائی نے لاہور والا واقعہ سنایا تھا (ختم)) میں ان دلچسپ واقعات کو سنا تھا۔

۱۔ حضرت اقبال جب جانے انگلستان سے وطن لوٹ رہے تھے اسی جہاز میں

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

ڈاکٹر اقبال کی معرکۃ الآرا تقاریر

علامہ اقبال کی تقریر نہ مولوی کا وعظ تھی اور نہ لیڈر کی شعلہ بیانی۔ بلکہ فہم و فراست کا گہرا دریا۔ بظاہر ایک وصاف چشمہ نظر آئے مگر جب غوطہ لگائیں تو اتھاہ سمندر۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ریاست حیدر آباد کے ایک شہزادے بھی تھے۔ ڈاکٹر موصوف کے پاس پہنچے اور کوئی غزل یا نظم سنانے کی فرمائش کی۔ شہزادے کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب کہ اقبال نے "نہ جی" کہہ کر انکار فرما دیا۔ اور شہزادے نے دوسری تجویز پیش کی کہ اُن سے اُن کے اشعار سنے جائیں، اس تجویز اور اصرار پر انکار فرماتے ہوئے کہا کہ شعر سنیں گے نہ سنائیں گے۔

۲۔ دوسرا دلچسپ واقعہ ملاحظہ ہو۔

علامہ اقبال کا شاید اسور دالج میں نیا نیا داخلہ ہوا تھا۔ بچے کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آ جاتے ہیں۔ آپ کی شخصیت نے وہاں بھی رنگ جمایا اور کالج ان کی شعر گوئی سے بھی خوب واقف ہو چکا تھا۔ یہ خبر سر عبدالقادر تک بھی پہنچی۔ وہ ان دنوں مخزن شائع کر رہے تھے، اقبال لے اور ان کے ہو رہے۔ خلوص و محبت کی کرامات ہیں یہ، جب بھی کوئی نئی نظم ہوئی وہ شیخ صاحب کے گھر جاتے۔ آواز دیتے۔ کبھی اتفاق سے وہ دکان میں موجود نہ ہوتے تو ان کا معصوم صاحب زادہ آکر کہتا کہ ابا تشریف نہیں رکھتے، کچھ دیر بعد واپس ہوں گے۔ آپ کو بٹھائے رکھنے کو کہا ہے۔ وہ اقبال کو بٹھا کر جانا چاہتا کہ اقبال حکم لگاتے کہ بیٹھ جاؤ۔ وہ بے چارہ بیٹھ جاتا۔ پھر فرماتے کہ سن! "جی" کے سوا اور کیا جواب ہو سکتا تھا، اب حضرت اقبال اپنی نئی نظم سنانے لگتے، شاید ترنم سے۔

مہاراجہ کشن پرشاد اور شہزادے کی درخواست پر نہ ہو رہی ہے اور ادھر بچے کو زبردستی شعر سنائے جا رہے ہیں۔ مدراس میں طلبا نے درخواست کی تو بلا عذر سنا دیا۔ یتیم خانہ مدراس کے یتیم بچوں کا سوال آیا تو انکار نہ کیا اور یتیموں کا بھی بھلا ہو گیا۔

حضرت اقبالؔ نے تین معرکۃ الآرا تقاریر[۱] کیں جسے سن کر فلسفی دم بخود تھے، دانشوروں کے دانتوں تلے انگلیاں دبی تھیں اور عوام محوِ حیرت۔

لوگ کبھی کبھی سمندر کی تہہ تک پہنچ تو جاتے ہیں مگر سوائے چند موتیوں کے، سمندر کی دولت سمیٹ نہیں پاتے اور نہ اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ دولت کیا ہے، کس صورت شکل میں ہے۔

۱۷ جنوری ۱۹۲۹ء کو حسین و جمیل، دل فریب و نظر فریب باغ عامہ میں عوام کا ہجوم تھا۔ سر اکبر حیدری[۲] کی صدارت میں ایک عظیم الشان جلسہ[۳] منعقد ہو رہا تھا۔ حضرت اقبال نے دو گھنٹوں تک مذہب اسلام پر پُر زور تقریر فرمائی"[۴]

سیر و تفریح

حیدرآباد شہر کی سیر کے بعد سر اکبر حیدری نے "سلاطین قطب شاہیہ کے مزار اور گولکنڈہ کے تاریخی قلعہ کی سیر کرائی۔ اس سیر میں روزِ روشن کے علاوہ شبِ ماہ بھی شامل تھی اور بقول سر شیخ عبدالقادر" ایسی شبِ ماہ جس میں بادلوں کے چاند کے سامنے آنے جانے سے نور و ظلمات میں لڑائی ٹھن رہی تھی۔ ایسے شاعرانہ جذبات کے نشو و نما کے لیے اس سے بہتر زمین اور اس سے بہتر آسمان اور کیا ہوگا؟

جہاں شاعر کی آنکھوں نے ٹھنڈک محسوس کی وہاں "شکریہ[۵]" ادا ہوگیا اور جہاں دل پر چوٹ لگی وہاں "گورستانِ شاہی[۶]" کی تخلیق ہوگئی۔

---

[۱] ۱۵، ۱۶، اور ۱۷ جنوری ۱۹۲۹ء کو ڈاکٹر اقبال نے جامعہ عثمانیہ میں انگریزی میں لیکچر دیئے۔ (روزنامہ الکلام ۱۹۲۹ء)

[۲] [۳] [۴] میری زندگی کا ماحصل۔ از سید غوث محی الدین، مدیر الکلام مطبوعہ ہفتہ وار قوم بنگلور۔

[۵] [۶] یہ دونوں نظمیں اسی سیر کی مرہونِ منت ہیں۔

آٹوگراف

حضرت اقبال اپنے ساتھیوں کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ جناب ممتاز الدولہ بہادر تشریف لائے اور درخواست کی کہ یتیم خانے تک قدم رنجہ فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب کو جب اس بات کا پتہ چلا کہ بانی اور مہتمم بھی آپ ہی ہیں تو خوش ہوئے۔ غریبوں اور بچوں سے پیار پیغمبرانہ صفت ہے۔ معصوم یتیم بھی، اقبال کی کمزوری کی بہترین مثال تھے۔ پنجاب کے علاوہ جنوبی ہند میں بھی یہ مثال نظر آتی۔

حضرت اقبال کا شگفتہ موڈ دیکھ کر ممتاز الدولہ نے آٹوگراف بک پیش کی، اقبال نے قلم اٹھایا۔ آٹوگراف بک سنبھالی اور یار دوستوں نے غور سے دیکھا کہ اقبال کا قلم رواں دواں ہے۔

"آپ جانتے ہیں سلیم صاحب" مدیر الکلام نے فرمایا، کہ ڈاکٹر صاحب نے کیا رقم فرمایا ہے؟ آپ نے انگریزی میں یہ عبارت تحریر فرمادی:

Books are dead things. Living expirience alone is the Source of Knowledge.

(یعنی کتابیں مردہ چیزیں ہیں۔ زندہ تجربہ ہی سرچشمۂ علم ہے)

"اس عبارت کو دیکھ کر میرا دل پھڑک اٹھا۔ مدیر الکلام نے فرمایا، اور میں نے جواباً عرض کر دیا کہ:

"Doctor! That is why I followed you."

(اسی لیے تو میں آپ کے ساتھ ہوں کہ فیض ہم نشینی سے کچھ حاصل ہو جائے)

ــــہ مدیر الکلام سید غوث محی الدین مرحوم نے اپنے ایک خط (مطبوعہ ۲۰ جنوری ۱۹۲۹ء) میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

تاجدار دکن سے ملاقات

۱۸ جنوری ۱۹۲۹ء ڈاکٹر اقبال آصف جاہی دستار اور بگلس کے بغیر حضور نظام کے حضور پہنچے اور رموزِ بے خودی کا ایک نسخہ گزرانتے ہوئے ایک فارسی نظم[1] پیش کی۔ اور حضور نظام کے اس بیش بہا ہیرے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جس کی خبر انہیں حکیم اجمل خاں نے دی تھی۔ تاجدارِ دکن نے فوراً حکم صادر فرمایا اور اقبال نے اس چمکتے دمکتے آنکھوں کو چکا چوند کرنے والے حسین مادّی یدِ بیضا کو دیکھا اور شکریہ ادا کیا۔[2]

" اقبال صاحب! حضور نظام نے فرمایا" ہم سالِ گزشتہ دہلی آئے تھے۔ دہلی سے لاہور نہایت قریب ہے۔ لیکن آپ ہماری ملاقات کے لیے تشریف نہیں لائے؟

" حضور! اقبال نے جواب میں فرمایا۔" اقبال تو ہمیشہ آپ کے ساتھ ہی رہتا ہے لیکن یہ جسمانی اقبال اُن دنوں بیمار تھا۔ اس لیے حاضر خدمت نہ ہوسکا۔ اسی سہو کی تلافی کے لیے اب ڈیڑھ ہزار میل کا سفر طے کرکے حاضر خدمت ہوا ہے۔"[3]

---

[1] اے مقامت برتر از چرخِ بریں ۔۔۔ از تو باقی سطوتِ دینِ مبیں
از تو مارا صبح خنداں شام ہند ۔۔۔ آستانت مرکزِ اسلامِ ہند
دوشِ ملّت زندہ از امروزِ تو ۔۔۔ تابِ ایں برقِ کہن از سوزِ تو
بندگان ہستیم ما تو خواجۂ ۔۔۔ از پئے فردائے ما دیباچۂ
گوہرم را شوخیش بے باک کرد ۔۔۔ تا گریبانِ صدف را چاک کرد
پیش سلطاں ایں گہر آوردہ ام ۔۔۔ قطرۂ خونِ جگر آوردہ ام

(نیرنگ خیال۔ اقبال نمبر ۲۹ء)

[2] بقول قاضی عبدالحمید۔ در رسالہ 'اُردو' اقبال نمبر،

[3] میری زندگی کا ماحصل۔ از سید غوث محی الدّین مدیر الکلام

"آپ قبول فرمائیں تو ہم آپ کو اسٹیٹ کا وزیر قانون بنا دیں۔"

"حضور! اقبال نے شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا" آپ اقبال کو آزاد ہی رکھیں تو بہتر ہوگا اس قسم کی سرکاری ذمہ داریوں کی تکمیل کے لیے میں اپنے آپ کو موزوں نہیں پاتا"[۲]

خدا حافظ

حضور نظام نے شاداں و فرحاں اقبال کو رخصت کیا اور حضرت اقبال ۱۶ جنوری[۳] کو اپنا جنوبی ہند کا سفر ختم کر کے بمبئی کے راستے لوٹ رہے تھے۔ چودھری محمد حسین ساتھ تھے اور پروفیسر عبداللہ چغتائی بیدر تشریف جانے اور وہاں بہمنی[۴] اور بریدشاہی حکمرانوں کے شکستہ مزاروں پر عبرت کے دو آنسو بہانے اور کھنڈروں کو دیکھنے کے لیے حیدرآباد میں ٹھہر گئے۔

علامہ اقبال جیسے معزز مہمان کا خیر مقدم کرتے ہوئے جہاں آنکھوں نے ٹھنڈک محسوس کی تھی اور دل خوشی سے بلیوں اچھلا تھا۔ آج وہی آنکھیں بھر آئی تھیں اور دل مغموم تھے۔

۲ـ "میری زندگی کا ماحصل" از سید غوث محی الدین مدیر الکلام۔

یادش بخیر: حیدرآباد دکن میں "یوم اقبال" تزک و احتشام سے منایا گیا۔ اس موقع پر سر اکبر حیدری کی کوششوں سے حضور نظام دکن نے توشہ خانے سے ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں ایک ہزار روپے کی رقم چیک کی صورت میں روانہ کی۔ ڈاکٹر اقبال نے چیک لوٹاتے ہوئے ذیل کا قطعہ سر اکبر حیدری کے نام لکھا:

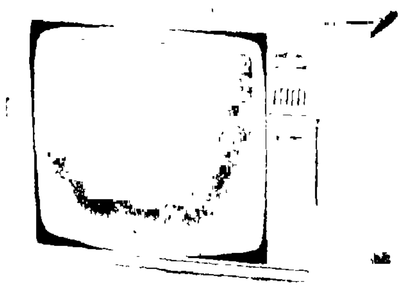
تھا یہ اللہ کا فرماں کہ شکوہِ پرویز — دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر — حسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا سرِ دوش — کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات
غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول — جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

۳ـ تازیانہ (ہفتہ وار) ۱۹۲۹ء

۴ـ علامہ اقبال کے سفر کے دلچسپ حالات از ممتاز حسن بسمل۔ مطبوعہ ہفتہ وار تازیانہ لاہور ۱۹۲۹ء۔

جدید ٹیکنالوجی کا حاصل

نیا فلپس آل ٹرانسسٹر ٹی وی سیٹ



فلپس

۲۰ انچ اور ۲۴ انچ آل ٹرانسسٹر ماڈل بمعہ سلائیڈنگ کنٹرول اور ٹیپی دراز

فلپس کے نئے ٹی وی ماڈل ، عظیم یورپی فلپس اداروں کے فنی کمالات کا نتیجہ ہیں

فلپس ہالینڈ کی ڈائرکٹ وژن پکچر ٹیوب

فلپس ڈنمارک کی ایجاد الیکٹرانک میومیٹک چینجز

فلپس سوئٹزرلینڈ کے ڈیزائن کیئے ہوتے خاص پرزے

فلپس جرمنی کا بجلی کا نظام

فلپس سویڈن سے ٹیلیویژن لہروں کی اعلیٰ انتخابی صلاحیت

فلپس انگلستان کا صوتی نظام اور سلائیڈنگ کنٹرول سسٹم

فلپس آسٹریا کی مایہ ناز ایجاد "نغمہ"

فلپس ٹی وی خریدنے کے آپ مستند گارنٹی اور بعد از فروخت سروس کی ضمانت بھی حاصل کرتے ہیں۔

فلپس — دنیا بھر اور پاکستان میں بھی سب سے زیادہ فروخت ہونے والا ٹی وی سیٹ

ادیبوں کے خطوط

بنام

عطیہ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

محفوظات غالب لائبریری

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

پطرس بخاری

پاکستان پرمننٹ ڈیلی گیشن

اقوام متحدہ نیویارک

۷ر نومبر ۱۹۵۰ء

عزیزی و محبی - سلام مسنون

ابھی ابھی ایلس (ایلس فیض) کا خط ملا جس سے آپ کی اہلیہ محترمہ کے انتقال کا علم ہوا۔ عین مصروفیت کا زمانہ ہے۔ اسمبلی کا اجلاس روزانہ ہوتا ہے۔ اجلاس گاہ ۲۵ میل دور ہے۔ صبح جاتے ہیں۔ رات کو ساڑھے سات بجے لوٹتے ہیں۔ یکلخت ارادہ کیا کہ آپ کو تار دوں۔ کسی زمانے میں تار مستعدی اور جذبہ فرمائی کی علامت تھا۔ کاروبار کے سلسلے میں اتنے تار بھیجے ہیں کہ ان کی حقیقت کھل گئی ہے۔ اور تار کاہلی اور اتمام حجت کی ایک ترکیب معلوم ہونے لگا ہے۔ اس لیے اتوار (یعنی آج) کا انتظار کیا تاکہ آپ کو خط لکھ سکوں جو صدمہ

آپ کو پہنچا ہے اس کے متعلق میں کیا بات ایسی کہہ سکتا ہوں جو پامال اور بے معنی نہ ہو گئی ہو لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ایک مرتبہ نہیں سو مرتبہ آپ کے گھر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ آپ کی بے فکری، آپ کی ضیافتیں، آپ کی مجلسیں انھیں کے طفیل تھیں۔ نہ معلوم آپ پر اب کیا گزرے گی۔ یقیناً آپ کو بار بار ایک ایسا خلاء محسوس ہوتا ہوگا جس کو آپ کسی طرح پر نہیں کر سکتے۔ میری ہمدردی بیکار ہے۔ تاہم اگر اس سے آپ کا غم ذرہ بھر بھی کم ہو جائے تو مجھے اطمینان ہوگا۔ خدا اُن کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور خدا آپ کی زندگی کا انتظام آپ پر آسان کرے۔ مرنے والے مر جاتے ہیں زندوں کا خیال نہیں کرتے۔

مہینہ بھر ہوا میں نے مستعدی کے ایک نادر لمحے میں ایلیں کو ایک طویل خط لکھا تھا۔ خیال تھا دوستوں کے دل کو اس سے دستک ہوگی۔ ایلیں سے کہا بھی تھا کہ خط احباب میں نشر کر دینا۔ اگر وہ آپ کی نظر سے گزرا ہے تو میری زندگی کا نقشہ آپ کو معلوم ہوگا۔ نئے ملک میں گھر بار کرنا خصوصاً اس عمر میں جب کہ عادتیں راسخ ہو چکی ہوں اور دل کا درجۂ حرارت تنزل پر ہو، ایک مہم ہے۔ بہرحال کچھ صورت سہولت کی پیدا ہو گئی ہے۔ صحت کے متعلق تشویش ہی اور تشویش سے زیادہ مصروفیت۔ یا انسان ڈاکٹروں کا ہو رہے یا زندہ رہنے کی کوشش کرے۔ دونوں باتیں مشکل سے یکجا ہوتی ہیں۔ ڈاکٹروں کی گود میں بیٹھے رہنا زندگی نہیں۔

معلوم ہوا شریف صاحب کراچی چلے گئے ہیں اور کرامت کی جگہ سراج نے لے لی ہے۔ نہ معلوم اس سے محکمۂ تعلیم کے حلقے میں کیا تبدیلیاں ہوں گی۔ ہاشمی صاحب کہاں ہیں۔ میرا سلام دیجیے گا۔ انشاءاللہ انھیں بھی خط لکھوں گا۔ ہو سکے تو مجھے کو الف سے آگاہ کیجیے۔ عابد، ہاشمی تاثیر اور دیگر احباب آج کل کس بحر میں شعر کہتے ہیں؟

حمیدالدین سے ایک مفصل ملاقات ہوئی تھی لیکن یہ اب دو مہینے پرانی بات ہے۔ ذرا اسمبلی کا کام ہلکا ہو لے تو پھر اُن کے دل کا حال سنوں گا۔

آپ کو خطوں کی اتنی ضرورت نہ ہوگی جتنی مجھے ہے۔ سالک کو میرا پیار اور سلام کہیے گا۔ انھیں بھی خط لکھا ہے۔

خاکسار

بخاری

۵۸ نودھی۔ وڑنی دہلی ـــ **ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر** ـــ ۲ راکتوبر ۱۹۴۵ء

جانِ برادر

بھائی آنکھیں ترس گئی ہیں۔ تم تو کالجوں کی چھٹیوں میں آزادیوں میں رہتے ہو اور پھر دہلی آنے کے وعدے بھی کرتے رہتے ہو۔ مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ مجھ سے وعدہ تک بھی نہیں ہوتا اور غیروں سے بھی ایفا نہیں کرتے۔ سفر بہرصورت سفر ہے لاہور سے امرتسر گئے یا دہلی گاڑی میں بیٹھ گئے تو ایک ہی بات ہے۔ اچھا محبت نہیں ہوتی تو سبز دوپٹہ ہی سہی، تصویر ہی سہی خط ہی سہی۔

آج کل تمھارے گیت اور نظمیں ریڈیو پر اکثر سنتا ہوں (شاید تم ترقی پر ہو یا میرے شوق کی شدت زوروں پر ہے) دل کو بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تمھیں ان کا ڈھب آگیا ہے۔

کل عبدالرحیم صاحب برادر خورد عبدالرحمٰن چغتائی نے تمھارا ایک پازیب کی جھنکار والا گیت دکھایا۔ فلمی گیت! کیا کہنے۔ سالک سچ کہتا ہے کہ "اب ایک دوسرے کو ہم عمر نوآموز نہ سمجھا کرو۔ اب ہم اساتذۂ کرام میں سے ہیں۔ ہم نہیں تو اور کون ہے؟" تم نے خوب گیت لکھا ہے۔ اور تمھیں یہ سن کر تعجب ہوا کہ تم نے کہا کہ "تاثیر کے پاس یہ گیت وغیرہ گئے تو وہ کہے گا ہٹاؤ تبسم وغیرہ کو۔ وہ کیا ہے۔ اگر تبسم یہ سمجھتا ہے کہ تاثیر تبسم کو یہ سمجھتا ہے اور غیروں کے سامنے اس طرح ذکر کرتا ہے تو پھر تبسم اسی قابل ہے۔

جانِ تاثیر میں تو دوستوں کا درباری قصیدہ خواں ہوں جس طرح سلیم عرفی کا تھا درباری اور سچا۔ مجھ سے یہ سوءِ ظن۔

یاد رکھو۔ سرمایہ دار سے معاملہ ہمیشہ کھرا اور واضح رکھنا چاہیئے۔ سرمایہ دار خواہ تاثیر ہو یا تبسم۔ حفیظ ہو یا چغتائی۔ اور سرمایہ دار کی دوستی کو ذاتی معاملات میں دخل انداز (نہ) ہونے دو۔ اگر چغتائی سے دوستی ہے اور ان کے لیے ہر گیت اور مکالمے لکھے ہیں تو دوستی کی وجہ سے محبت بڑھ جانی چاہیئے کیونکہ پیسہ تو آخر کسی اور نے دینا ہے۔

دوست اگر دلال ہے تو وہ دوست کی قیمت بڑھائے گا اس لیے رقم مقرر کرو اور رعب سے
اور پھر "دوست" کا لفظ ہم تم کتنوں کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ لہٰذا یوں ہی محمل
کا فرش دیکھ کر مفت میں شلوار ڈھیلی نہ کر دو۔ گھاس ہو یا قالین اپنی قیمت نہ گراؤ۔ شوق رئیسی
نہ فرماؤ۔ میں نے جی کھول کر تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ تبسم ہی مناسب گیت لکھ سکتا ہے
(قوسین کا ایک جملہ حذف کر دیا گیا ہے۔ ادارہ) اور زور دیا ہے کہ مکالمہ وغیرہ تبسم سے با ربط
کراؤ۔ پھر میرے پاس آؤ میں ایک آدھ نیا سین لکھ دوں گا اور فلمی فنی اعتبار سے نظر ڈال لوں
گا۔ لیکن اصلی کام تبسم ہی کے بس کا ہے۔ اس لیے بھائی جان ڈٹ جاؤ، چھا جاؤ اور دوست
کو گالیاں دینے کی بجائے تحسین باہمی سے کام لو اور احتیاط کرو کہ میں یا تم سرمایہ داری کے حیلوں
میں نہ آ جائیں۔

میں نے ان کی کہانی کی پلاٹ بنا دی ہے۔ ایک نیا کردار تخلیق کیا ہے۔ ایک جاندار
جذباتی فضا اور محل استوار کر دیئے ہیں۔ ان کی کہانی ہی کو ڈھال کر، ایک بے جان ٹوٹی پھوٹی
کمزور کہانی کو ڈراما بنا دیا ہے۔ یہ تھا جائز دوستانہ مشورہ۔ اس کے بعد اس کو سنبھالنا یہ ان کا
کام ہے مگر یہ ان کے بس کا روگ نہیں۔ اگر نزاکت سے کام نہ ہوا تو ہر چند میں نے ہر چیز سمجھا دی
ہے معاملہ بگڑ جائے گا۔ اس لیے محنت درکار ہے اور محنت مزدوری سے ہوتی ہے اور مزدوری
مزدور کا حق ہے۔ فاکتبوہ پر عمل کرو۔ عہد نامہ لکھوا لو، نقد مزدوری لو اور اس خط کو رازِ باہمی
کی مد میں ڈال دو۔

شرماؤ نہیں، میری طرح اُن سے صاف بات کرو کہ یہ محنت مزدوری کا معاملہ (ہے)
فیم تم بیٹھے ہو۔ مکالمہ لکھو۔ اور پھر مکالمہ لے کر عبدالرحیم کیوں آئے تم کیوں نہ آؤ۔ ہم دونوں
فیصلہ کریں۔ بچیوں کو بچوں کو سلام اور پیار۔ اندرون خانہ آداب

تمھارا چاہنے والا
تاثیر

پینڈل اسٹون روڈ
لنڈن ایگ (۱۷)

ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر

۲۹ جولائی ۱۹۵۰ء

برادرم تبسم۔ اسلام علیکم

ایک ہی شعر دہراتا رہتا ہوں۔

صنم کدوں میں اُجالے نہیں رہے کہ جو تھے
کہ اب وہ دیکھنے والے نہیں رہے کہ جو تھے

بس ہم بوڑھے ہوگئے۔ مگر یہاں کی جوانی بھی ڈھل گئی ہے۔ عباس (غلام عباس) روز ملتا ہے۔ حفیظ جاوید سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔ یوں بہت چہل پہل ہے لیکن کرس (مسز تاثیر) آکسفورڈ میں ہے اور بچے مری میں ہیں دل لاہور میں ہے، بدن یہاں ہے روح نہ جانے کہاں ہے۔

برٹش میوزیم میں روز جاتا ہوں۔ ایک آدھ مزے کی چیز نظر پڑی ہے لیکن

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں

وہ جو انڈیا آفس تھا وہاں ہمارے خزانوں کے انبار ہیں۔ دیمک قدر دانی کر رہا ہے تم اسٹڈی لیو لے کر یہاں کیوں نہیں آتے۔ تمھارے مصرف کا بے اندازہ مال ہے۔ بچوں کو پیار۔ احباب کو سلام۔

مخلص تاثیر

---

۱۰ اے کلفٹن، کراچی ۶
ٹیلی فون ۔۔ ۵۳۲۶

زیڈ اے بخاری

۳۰ جون ۱۹۷۴ء

قبلہ

صبح آپ کا ٹیلی فون آیا۔ زمانے کی نیرنگیاں ہیں اور کیا کہا جائے۔ بہرحال آپ کا کرم کہ آپ نے اتنی زحمت اٹھائی۔

خداوندان ریڈیو نے کانفرنس کے اجلاس کی تاریخ بدل دی ہے اب ۲۲ کی بجائے تیس کی ہے چنانچہ اب میں ۲۹ کو یہاں سے فلائٹ نمبر ۳۰۴ سے روانہ ہوں گا اور تین بجے لاہور پہنچوں گا۔ وہاں آدھ گھنٹہ ٹھہرتا ہوا پشاور روانہ ہو جاؤں گا۔ پہلی جولائی کو فلائٹ نمبر ۳۰۹ سے لاہور ہوتا ہوا کراچی آؤں گا۔

اللہ آپ کو خوش رکھے۔ خاکسار

بخاری

کلفٹن کراچی

دوسرا خط

۲۳ جولائی ۱۹۷۴ء

قبلہ سلام مسنون

اقبال کی ایک مشہور غزل ہے۔

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش

اس غزل کا آخری شعر ہے

صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

اس شعر کے معنی میں سمجھ نہ سکا رہبری فرمائیے۔

اب غالب کی بابت کچھ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں۔

تا بشوید نہاد ساز وسخ
گشت گرما بہ ساز از دوزخ

اس غزل میں فرماتے ہیں

در سخن کار بر قیاس مکن
ترش گردد ترش نہ تلخ تلخ

گویا غالب نے ترش بسکون ورم کو درست مانا ہے حالانکہ اہل فرہنگ تُرش بالضم

دوکو درست تسلیم کرتے اور سکون درم کو غلط۔ یہ کیا معمہ ہے اللہ کرے آپ مع الخیر ہوں۔ کبھی اغیار سے فرصت ہو تو دو حرف خیریت کے لکھ بھیجا کیجیے۔ کوئی نئی غزل کہی ہے؟ مجھ کو اس سے محروم نہ رکھیے۔ والسّلام

خاکسار

ذوالفقار

کلفٹن کراچی

تیسرا خط

۱۴ اگست ۱۹۷۴ء

قبلہ اسلام علیکم

میرے خط کا جواب بلکہ خطوں کا جواب آپ کے ذمے ہے۔ جن امور کا میں نے جواب طلب کیا تھا یہ ہیں۔

(۱) ذخیرہ کو وطیرہ لکھنے کا کوئی جواز ہے؟

(۲) اقبال کے اس شعر کے معنی کیا ہیں؟

صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

(۳) غالب نے اس شعر میں ترش (رے ساکن) کو درست مانا ہے

در سخن کار بر قیاس مکن
ترش گردد ترش نہ تلخ تلخ

اس کا جواز کیا ہے؟ آپ سے نہ پوچھوں تو اور کس سے پوچھوں۔ آپ ہی کو میں استاد مانتا ہوں اور مانتا رہا ہوں۔

اللہ کرے آپ مع الخیر ہوں۔

بچوں کو پیار

خاکسار

ذوالفقار

کلفٹن کراچی

چوتھا خط

۱۲ ستمبر ۱۹۷۴ء

قبلہ تسلیمات

اللہ کرے آپ خیریت سے ہوں اور اگر آپ مجھ سے خفا ہوں تو خفگی دور کر دیجیے۔ مجھ سے کیا خفا ہونا۔ گنگارے کی اینٹ ہوں نہ جانے کب گر جاؤں۔

مگر آپ اگر خفا ہیں مجھ سے تو کس بات پر؟ میں تو خادم ہوں اور رہوں گا۔ میری حالت آپ دیکھ گئے تھے۔ آپ کو رحم مجبور نہیں آئے گا۔ آپ اور اتنے کٹھور۔

خیریت کا طالب اور نابودہ گناہ کا مجرم

اور معافی کا خواست گار

خاکسار

ذوالفقار

ادیبوں کے خطوط

غالب لائبریری میں خطوط کا ایک خاص شعبہ ہے جس میں اکابرینِ ادب کے خطوط محفوظ کیے جاتے ہیں۔ پوری احتیاط کے باوجود خط افراد کے گھروں میں محفوظ نہیں رہ سکتے۔ ہر خط ایک درِ نایاب ہے جسے حفاظت سے رکھنا چاہیئے۔ اب تک لاکھوں خطوط ضائع ہو چکے ہیں۔ جو بچ گئے ہیں اور آپ کی تحویل میں ہیں غالب لائبریری کو عطا کیجیے۔

تابوت

(لکھنؤ سے خاص جریدہ غالب کے لیئے)

رام لعل

اا-۳۹-آر-ملٹی اسٹوری چار باغ

لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

شہر کے ایک بہت بڑے ہوٹل کے ہرے بھرے لان پر ریتا کنڈیلوال اور سجو چترویدی کتنی دیر سے بیٹھے بیئر پی رہے تھے۔ یہ ان کا ہر روز کا مشغلہ تھا۔ ریتا ٹی وی کے سخت تھکا دینے والے ماحول سے فرصت پاتے ہی چترویدی کو فون کر دیتی یا چترویدی ہی اپنے اخبار کے آفس سے اسے اپنے پروگرام کے بارے میں بتا دیا کرتا تھا۔ ایسا اتفاق نوبت کم ہی ہوتا تھا کہ سجو چترویدی خود آکاش وانی کے سامنے پہنچ کر اسے اپنی گاڑی میں پک اپ نہ کر سکتا، جب کبھی ایسی نوبت آبھی گئی تھی تو ریتا رات کے گیارہ بارہ بجے کے بھی بعد خود اس کے فلیٹ پر پہنچ گئی تھی۔ وہ اتنی ہمت تو رکھتی ہی تھی کہ اس قدر رات گئے بھی اسے کرزن روڈ سے گریٹر کیلاش جاتے ہوئے ذرا ڈر نہیں لگا تھا۔ کوئی واقعہ ہونا ہوتا ہے تو وہ یوں بھی ہو کر ہی رہتا ہے، اس میں اس کا گہرا وشواس تھا، صرف ایک ہی بار ایک ٹیکسی ڈرائیور نے ایک سنسان جگہ دیکھ کر گاڑی روک لی تھی اور وہ چھیڑ خانی پر اتر آیا تھا لیکن نوبت ابھی زبردستی کی چوما چاٹی تک ہی پہنچی تھی کہ اچانک پیچھے سے دو اور ٹیکسیاں آتی ہوئی دکھائی دے گئی تھیں۔ اس کے چیخنے چلانے کی آواز سن کر وہ لوگ اس کی مدد کرنے کے لیئے رک گئے اور انھوں نے ڈرائیور کی خوب ٹھکائی کرنے کے بعد ریتا کو اس کی منزل مقصود پہ بھی بحفاظت پہنچا دیا تھا —

مجموعی طور پہ سجو ایک اچھا ہی آدمی تھا مصیبت کے وقت ہی اس کے آڑے آیا تھا۔ جب وہ اپنے پتی کو چھوڑ دینے کے بعد پٹنہ جا رہی تھی تو اسی سفر میں سے چند

آرٹسٹ مل گئے تھے۔ دو لڑکے اور تین لڑکیاں انھوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ ناٹک وغیرہ اسٹیج کیا کرتے ہیں وہ لوگ بھی اسے بہت اچھے لگے تھے کیونکہ کالج کے زمانے میں وہ بھی ڈراموں میں حصہ لیتی رہی تھی اس نے چاہا کہ اپنے ساتھ انھیں بھی اپنے ماں باپ کے پاس پٹنہ لے جائے جہاں وہ اپنے پتی سے الگ ہونے کے بعد ہمیشہ وہیں رہنے کے ارادے سے جا رہی تھی لیکن ان لوگوں کو تو کلکتہ پہنچ کر اگلے روز ہی ایک پروگرام پیش کرنا تھا۔ انھوں نے اسے بھی کلکتہ چلی چلنے کی دعوت دی تو وہ انکار نہ کر سکی۔ اس نے سوچا، یہی ٹھیک رہے گا۔ پتی کو چھوڑ کر میکے لوٹ جانے کا فیصلہ اس نے ایک بہت ہی اضطراری لمحے میں کر لیا تھا۔ اب وہ ماں باپ کے پاس جانے سے پہلے کچھ روز اطمینان سے سوچ بھی سکے گی اس کے ماں باپ بوڑھے ہو چکے ہیں اب تو وہاں اس کے بھائیوں اور بھابھیوں کا ہی اختیار چلتا ہے۔ وہ اب سب کے سب اس سے بے حد خفا بھی ہیں کیونکہ اس نے خاندانی روایات کو توڑ کر ایک کرسچین لیکچرار کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ وہ لوگ شاید اب بھی اسے معاف کر دینے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ اس کی ازدواجی زندگی کی ناکامی کی ساری ذمہ داری اسی پر ڈالیں گے جب کہ اس بحران کے لئے جمال مسیح ہی سراسر ذمہ دار ہے کیونکہ وہ بے حد قنوطیت پسند واقع ہوا ہے۔ ہر رات سونے سے پہلے وہ کچھ منٹ کے لئے ایک تابوت کے اندر ضرور لیٹتا ہے جو اس نے اپنے لئے خاص طور پر بنوا رکھا ہے تابوت میں لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے سینے پر کراس بناتا ہے اور ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کوئی دعا بھی مانگا کرتا ہے۔ اس کے بعد بے حس ہو جاتا ہے۔ اسے اس طرح مردے کی طرح پڑا دیکھ کر رتیا ڈر جاتی ہے۔ اگرچہ کچھ دیر بعد وہ جاگ اٹھتا ہے اور تابوت میں سے باہر آجاتا ہے تو پہلے کی طرح بالکل نارمل ہو جاتا ہے لیکن وہ بھلا نہیں پاتی کہ جمال مر جانے کے بعد ہی زندہ ہوتا ہے پتہ نہیں وہ زندہ ہوتا بھی ہے کہ نہیں ممکن ہے وہ حقیقی جمال مسیح کا محض بھوت ہی ہو۔ لیکن اس نے اپنے پتی سے کبھی کچھ نہیں پوچھا ۔۔ ہمت ہی نہیں پڑی اس کی۔ اس نے اسے ایک پر اسرار انسان ہی سمجھا لیکن وہ اس کی اس فریب عادت کی کیفیت بیان کر کے اپنے گھر والوں کے ساتھ بحث و مباحثہ کرنا مناسب نہ ہی غنیمت جانا کہ ڈراما آرٹسٹوں کے ساتھ کلکتہ میں کچھ روز رہ کر وہ خود کو ذرا متوازن

کر سکے گی۔ اب کچھ عرصہ بعد ہی گھر جائے گی وہ کلکتہ چلی گئی۔ ان لوگوں کے ساتھ بہت ہی معمولی ہوٹل میں رہتی رہی۔ وہ شاندار قسم کے ہوٹلوں میں پروگرام پیش کرتے تھے لیکن رہتے گھٹیا ہوٹل میں تھے۔ وہ درحقیقت کیبرے آرٹسٹ تھے، مونا، زرینہ اور رکم کم تینوں لڑکیاں قریب قریب سارے ہی کپڑے اتار کر اور ناچ ناچ کر اپنے جسموں کی نمائش کیا کرتی تھیں، ہارٹ میوزک کی دھنوں پر بہت ہی ہیجان انگیز طریقے سے، جسے دیکھ دیکھ کر نوجوان اور کئی بوڑھے تک خوشی سے چیخ چیخ کر داد دینے لگتے تھے لیکن یہ منظر اسے بہت ہی افسردہ بنا دیتا۔ تماشائی اپنی اپنی کھانے کی ٹیبلوں پر بیٹھے گوشت کی بوٹیاں نوچ رہے ہوتے۔ ہاتھ بڑھا بڑھا کر لڑکیوں کے تھرکتے ہوئے جسموں کو چھونے کی بھی کوشش کرتے۔ لڑکیاں ان کے ہاتھوں کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی پھسل جاتیں تو وہ کھسیانے ہو کر بھی خوشی سے نعرہ بلند کر دیتے۔ ریتا کو ایسا لگتا یہ وحشی رقص اس دنیا کا پہلا اور آخری رقص ہے۔ یہ نیم عریاں جسم اب آخری بار ناچ رہے ہیں۔ جس طرح اسٹیج کا دل دھڑکتا تھا اسی طرح اسے تماشائیوں کا اور پورے گردوپیش کا بھی دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

ان لوگوں کے ساتھ وہ صرف چند روز ہی رہ سکی تھی۔ وہ تو چاہتے تھے کہ وہ بھی ان کے ساتھ ساتھ رہ کر ڈانس کرنا سیکھے اور ان لڑکیوں کی طرح لڑکوں کے ساتھ بے تکلف بھی ہو جائے لیکن ایک روز اتفاق سے اسے ہیر ترویدی مل گیا جو وہاں جرنلسٹوں کی کل ہند کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے گیا تھا۔ ایک رات وہ بھی کیبرے دیکھنے کے لیے پہنچ گیا تھا۔ دونوں ایک ہی میز کے گرد بیٹھے تھے، اس نے کہا تھا دلی واپس جا کر میں اس بدعت کے خلاف ایک آرٹیکل لکھوں گا۔ ریتا کو ہیر ترویدی کے اسی رویے میں اپنے لیے راہ فرار نظر آئی تھی۔ اس نے ریتا کی طرف دوستی کا بھی ہاتھ بڑھایا تو اس نے اسے ٹھکرانا مناسب نہ سمجھا۔ بلکہ اسی کے ساتھ دلی نا پھر واپس پہنچ گئی۔ جہاں سے وہ گھبرا کر بھاگی تھی لیکن اب وہ ایک مشہور جرنلسٹ کے ساتھ تھی۔ جس نے اسے اپنے خاص رسوخ سے ٹی۔ وی پر سروس دلا دی تھی، رہنے کے لئے ایک وومن ہاسٹل میں جگہ بھی مہیا کر دی تھی اور اس سے بڑی باقاعدگی سے ہر روز ملتا بھی رہتا تھا۔ وہ دو سال سے اس کی داشتہ ہی تھی لیکن اس آزاد زندگی کو ہی اب وہ اپنا مقدر سمجھ چکی تھی۔

اس میں بھی کچھ خوشیاں تھیں، کچھ اطمینان تھا۔ سب سے بڑا اطمینان یہ تھا کہ اسے تلاش کرنے کی کسی نے کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے پتی نے نہ ہی اس کے ماں باپ نے، سب ہی نے اسے بھلا دیا تھا، یہ بھی ٹھیک ہی تھا انہیں ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا تب ہی وہ بلا روک ٹوک یہ زندگی بتا سکتی تھی جو اس کے لئے ایک کارنامے سے کم نہیں تھی جترویدی نے اسے ایک بہترین ماحول دے رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ گھوم پھر کر اس نے زندگی کے کتنے نئے نئے شعبے، نئے نئے رخ اور رویّے دیکھ لیئے تھے۔ حکومت کیسے کی جاتی ہے، سیاسی اور ثقافتی پارٹیاں کیسے بنائی جاتی ہیں، الیکشن کیسے لڑے جاتے ہیں، نودولتوں کو سیاست میں کیسے گھسیٹا جاتا ہے، روپیہ کہاں کہاں سے آتا ہے اور کتنے ہاتھوں میں ہوتا ہوا کہاں کہاں تک پہنچ جاتا ہے، جو لوگ قومی اعزازات و انعامات کے اہل بھی نہیں ہوتے، انھیں اچانک کیسے سامنے لاکر کھڑا کر دیا جاتا ہے! اب تو وہ اتنی تیز فہم ہوگئی تھی کہ اخبارات میں چھپی ہوئی ایک ایک خبر کے پیچھے چھپے ہوئے چہروں تک کو پہچان لیتی تھی ایسے بہت سے لوگوں کو وہ بہت قریب سے دیکھ چکی تھی۔ ان کی باتیں بھی اپنے کانوں سے بارہا سن چکی تھی اور پوری طرح جان چکی تھی کہ آدمی زیادہ تر اقتدار اور روپے کا ہی بھوکا ہوتا ہے انہی کے حصول میں وہ سیدھے ہاتھوں ناکام رہتا ہے تو پھر سیاست میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہمارے یہاں جمہوریت کا ڈھانچہ اسقدر کمزور ہے کہ اس میں کوئی بھی گھس سکتا ہے۔ رتیا کے لیئے دیش کی اکنومی، پولٹکس اور جرنلزم کے گہرے اثرات سے متعلق ساری واقفیت بجو جترویدی کی ہی دین تھی۔ وہ اس کی بے حد احسان مند تھی لیکن اس کے اندر کسی گوشے میں جترویدی کے خلاف ایک نفرت بھی جنم لے چکی تھی جسے وہ جان بوجھ کر دبا دیتی تھی وہ نفرت کو ابھرنے کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

کئی روز پہلے اس کے سامنے جترویدی نے اپنی بیوی کا ذکر کیا تھا۔ شوبھنا جترویدی ایک مدت سے ایک دوسرے شہر میں رہ رہی تھی۔ جہاں وہ بچوں کا ایک اسکول چلاتی تھی۔ وہ اپنے بچوں کو بھی اپنے پاس رکھ کر ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کر رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی بجو اب جرنلزم کا پیشہ چھوڑ کر اسی کے پاس چلا آئے کیونکہ اس کا اسکول اب اتنا بڑا ہو چکا ہے

کہ اس سے اکیلے سنبھالے سنبھلتا نظر نہیں آتا۔ اس کے علاوہ ان کے بچے بھی بڑے ہو چکے ہیں جن کی شادی بیاہ کے بارے میں بھی سوچنا سمجھنا ضروری ہو گیا ہے۔ ریتا کنڈیوال سمجھ گئی تھی کہ چترویدی ایک الجھن میں یقیناً مبتلا ہو چکا ہے۔ یہ الجھن ایک آزاد زندگی کو خیرباد کہہ کر فیملی فولڈ میں لوٹ جانے کی ہی ہے جس سے وہ ایک مدت سے بچھڑا ہوا ہے اس سے وہ ایک ہی صورت میں مکتی پا سکتا ہے کہ وہ اپنی بیاہتا پتنی کے پاس ہی واپس چلا جائے۔

آج اس نے مسز چترویدی کا پھر ذکر کیا اور ریتا کی طرف ایسی ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے جاننا چاہتا ہو وہ کیسا ردعمل دکھاتی ہے! ریتا اسے کوئی جواب دینے کی بجائے اداس ہو گئی اور اس کے سگریٹ کیس میں سے ایک سگریٹ لے کر پینے لگی اور ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

لان پر اور بھی بے شمار لوگ تھے جو یہاں وہاں مختلف میزوں پر بکھرے ہوئے بیٹھے ٹھنڈی ٹھنڈی بیئر پینے اور باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی ان کے چہرے بھی دلکش تھے اور لباس بھی۔ پچھلے کئی برسوں میں ہندوستان میں لباس کے معاملے میں جیسے ایک انقلاب سا آ گیا ہے اسی لباس کی وجہ سے کم خوبصورت لوگ بھی بے حد دلکش نظر آتے ہیں۔ اس نے بجو کی طرف دیکھا جس نے گردن تک اپنے بال بڑھا رکھے ہیں۔ اس کی گھنی مونچھوں اور لمبی لمبی قلموں کے درمیان اس کا بہت کم چہرہ دکھائی دیتا ہے جو اب بیئر کی کئی بوتلیں اندر انڈیل لینے کے بعد بے طرح چمک رہا ہے اس کی رنگ برنگی بشرٹ کے گریبان میں سے اس کے سینے کے گھنے بال باہر جھانک رہے ہیں۔

ریتا نے اپنے لباس پر بھی نگاہ ڈالی۔ آج وہ صرف بلاؤز میکسی ہی پہن کر چلی آئی ہے اس کے بال کھلے ہوئے ہیں جو کچھ تو اس کی پیٹھ پر بکھرے ہوئے ہیں اور کچھ اس کی گردن کے آس پاس جھول رہے ہیں۔ وہ خود بھی یقیناً بے حد پرکشش ہے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کتنے لوگوں نے اس کی اور بڑی للچائی ہوئی نظروں سے تاکا ہے۔ اس سے قد میں دو ایک انچ چھوٹا یہ ادھیڑ جرنلسٹ بھی جو اس کے جسم کی ایک ایک گولائی سے واقف ہو چکا ہے

لیکن اس کے باوجود اپنی آنکھوں میں مردوں کی ازلی بھوک لیئے اس کی طرف تاک رہا ہے۔
لیکن اس کی نظروں میں ایک اطمینان بھی ہے کیونکہ وہ جانتا ہے جب چاہے گا اسے اپنے فلیٹ میں لے جائے گا رات کے کسی پہر میں اپنی موٹر میں بٹھا کر اسے اس کے ہاسٹل کے گیٹ پر چھوڑ آئے گا اسے یقین ہے وہ اس کی اس حد تک ملکیت بن چکی ہے۔

اچانک بجّو نے ایک اور بوتل کا آرڈر دے دیا اور کہا" مجھے ایسا لگتا ہے، تیل والا بہت دیر سے آئے گا اور جب تک وہ آ نہیں جاتا ہم اسی کے خرچ پر پیتے ہی رہیں گے"؛ یہ کہہ کر وہ بے اختیار ہنسنے لگا۔ جب وہ کسی سے اس طرح بیزار ہو اٹھتا ہے تو اسے کوسنے کی بجائے اس پر اسی طرح ہنسنا شروع کر دیتا ہے۔

ریتا نے پوچھا" یہ تیل والا کون سا نیا جانور ہے؟ کیا ہم واقعی اسی کے انتظار میں یہاں بیٹھے ہیں؟"

"ہاں، میں نے اسے اسی جگہ آ کر ملنے کے لیئے کہہ دیا تھا۔ اس وقت وہ جونیئر چیمبر ز کی میٹنگ میں پروونشیئل اور سنٹرل منسٹری کے لوگوں کے ساتھ مونگ پھلی کے بھاؤ اور ٹرانسپورٹ کے مسائل پر گفتگو کر رہا ہوگا میرے پاس آئے گا تو راجیہ سبھا کی ممبری کے مسئلے پر بات کرے گا۔ تم دیکھنا!" وہ پھر ہنس پڑا اور بیرے کے ہاتھ سے بوتل لے کر گلاس بھرنے لگا۔

"لیکن راجیہ سبھا کا ممبر بننے کے لیئے وہ تم سے کیوں بات کرے گا؟" ریتا کنڈلیوال نے اپنے لہجے میں خود ہی ہلکی سی انگنت محسوس کر لی اور پھر خود ا سنبھل کر مسکرا بھی دی۔ "کیا تم واقعی اس کی کچھ مدد کر سکو گے؟"

"کیوں نہیں!" وہ فوراً بولا " میں اس کے لیئے سب کچھ کر سکتا ہوں، میرے پاس دماغ ہے اور بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ رابطے ہیں، اسے تو صرف اپنی بلیک کی کمائی کا روپیہ ہی خرچ کرنا ہوگا!"

ریتا اندر ہی اندر پھر کھول گئی لیکن اس نے اور کچھ نہ پوچھا وہ چپ ہی رہی لیکن یہ سوچ کر اسے حیرانی ضرور ہوئی کہ آج وہ چترویدی کی باتوں پر بار بار برہمی کیوں محسوس کر رہی ہے اس سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا! اس نے جلدی جلدی دو تین گھونٹ حلق کے نیچے اتارے

اور ایک اور سگریٹ سلگا کر اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اب وہ اسکی ہر بات کو بلا حجت تسلیم کرے گی، وہ چاہے کچھ بھی کہے!

چترویدی اسے اپنی طرف متوجہ پاکر بولا "آج وہ خوب شراب پیئے گا، پھر ہمیں ڈنر کے لئے لے جائے گا۔ اس کے بعد وہ کیبرے دیکھنے بھی ضرور جائے گا۔ سالا کیبرے پر تو جان ہی دیتا ہے!

کل صبح احمد آباد سے ٹرنک کال پر ہی پوچھ رہا تھا، کون کونسے ہوٹل میں کیا کیا چل رہا ہے؟"

"اور تم نے اسے سب بتا بھی دیا!" ریتا کے لہجے میں کچھ برہمی پیدا ہو گئی۔

ہاں ہاں، سب کچھ بتا دیا، مجھے تو معلوم ہی رہتا ہے۔ ہمارے یہاں روز ہی ان پروگراموں کے بارے میں چھپتا رہتا ہے" وہ بڑی بے تکلفی سے ہنستے ہوئے بولا۔

ریتا نے اس بار اپنی آنکھوں سے غصّے کو چھپایا نہیں بلکہ اس کی طرف سیدھی نظر سے ایک ٹک تاکا۔ چترویدی بھی اس کی طرف دیکھتا اور مسکراتا رہا پھر وہ قدرے آگے کو جھک کر بہت آہستہ سے بولا "میرے دلی چھوڑنے کے امکان پر تم کچھ اداس ہو گئی تھیں۔ میں واقعی چلا گیا تو تم مجھے کر کے بہت روؤ گی۔ میں جانتا ہوں، میں چاہتا تھا تم کچھ کہہ سن کر اپنے دل کی بھڑاس نکال ہو تو اچھا ہوتا، اسی لیے میں نے موضوع بدل کر تمہاری اداسی کو ختم کر دینے کی کوشش کی ن سنو، یہ اداسی اچھی نہیں ہے ہمیں تو حقیقت پسند ہونا چاہئیے۔ کیا نہیں؟ بلکہ اسطرح چو، اگر میں اچانک مر جاؤں تب کیا ہوگا؟ تب بھی تو تم تنہا رہ جاؤ گی؟ رہ جاؤ گی نا! ں کے بعد دو چار روز رو دھو کر اپنے آپ صبر کر لو گی۔ میں دوسرے شہر چلا گیا تب بھی ہنا ہی کرنا!"

چترویدی نے کہا "لیکن تمہارے مستقبل کے لیئے میں نے ایک اور بات بھی سوچ ی ہے۔ میں اپنے بجائے تمہیں ایک اور دوست دے کر جاؤں گا، وہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے گا، مجھ سے بھی زیادہ۔ اسے میں اچھی طرح جانتا ہوں، وہ بہت دولت مند ہے۔

تمہیں ہاسٹل میں سے نکال کر ایک فلیٹ لے دے گا۔ جانتی ہو وہ کون ہے ؟ وہ ملکھٹکیا ہے ، تیل والا جو تھوڑی دیر میں آنے والا ہے ۔ اس سے مل کر تم یقیناً خوش ہو گی !"

ریتا اور کچھ نہ سن سکی ، فوراً کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی ۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے ! تمہارے دل میں میرے لئے اتنی ہی عزت تھی ! مجھے معلوم نہیں تھا تم اسقدر گر جاؤ گے ۔"

" سنو تو ریتا ! بیٹھ جاؤ ذرا ۔ پہلے میری پوری بات سن لو " اس نے ریتا کا ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھانے کی کوشش کی لیکن اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا ۔ کہا " میں اب کچھ نہیں سننا چاہتی اسی وقت واپس جاؤں گی !"

وہ وہاں سے تیزی سے چل دی ۔ چترویدی کو حیران و پریشان سا چھوڑ کر ۔ اچھا ہوا وہ اس کے پیچھے پیچھے نہیں آیا ورنہ وہ اسے سب کے سامنے تھپڑ بھی لگا دیتی ۔ ہوٹل کے احاطے میں سے نکل کر وہ سڑک پہ آ گئی ۔ اس کے اندر جو نفرت ایک عرصہ تک دبی رہ گئی تھی وہ اب پوری طرح باہر آ گئی تھی ۔ ہر آدمی ایک خاص حد تک ہی اچھا ہوتا ہے ۔ اس کے بعد وہ کچھ بھی ہو سکتا ہے !

لیکن یہ اس کا برتاؤ ہے ! وہ خود اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکتا تو کسی اور کو سونپ دینا چاہتا ہے ! وہ کسی کی پراپرٹی نہیں ہے ! کسی کو حق ہی کیا ہے کہ اس کے بارے میں ایسا سوچے !

وہ غصے میں کھولتی اور کڑھتی ہوئی سی چلتی رہی ۔ بہت دور تک پیلتی گئی ۔ پیدل ہی ، پیدل چلتے چلتے وہ تھک بھی گئی ۔ پھر بھی چلتی رہی ، کتنی لمبی سڑک نکل گئی ۔ پھر ایک اور سڑک آ گئی ۔ اس کے بعد ایک اور ۔ پھر بھی وہ رکی نہیں ، وہ خود کو جیسے سزا دے رہی تھی ۔ خود کو اذیت پہنچانے کے موڈ میں تھی ۔ میں نے اتنے لمبے عرصے تک ایسے آدمی پہ اعتبار ہی کیوں کیا ! میرے اندر جب اس کے خلاف نفرت پیدا ہو ہی گئی تھی تو اس نفرت کو میں نے دبائے کیوں رکھا ! اب تو مجھے اپنے آپ سے بھی نفرت ہو رہی ہے ۔ پتہ نہیں وہ کتنے میل تک چل چکی تھی ۔ چلتے چلتے گیارہ نمبر سے زیادہ ہو چکا تھا

پھر بھی شہر ختم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ابھی تک اسی شہر کے اندر ہی بھٹک رہی تھی یا اس کے اندر بسے ہوئے ایک دوسرے شہر کے اندر! یہ شہر بھی بہت بڑا لگ رہا تھا۔ ایسا بھی معلوم ہونے لگا تھا اس اندر والے شہر کی کوکھ میں ایک اور شہر بھی موجود ہے پتہ نہیں وہ اس بیوہ چکر سے کبھی نکل بھی سکے گی!

اچانک وہ ایک مکان کے سامنے ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی اندر سے کچھ لوگ کسی کی ارتھی نکال کر لا رہے تھے۔ سفید کفن میں لپٹی ہوئی لاش کے پیچھے پیچھے ایک عورت بال بکھرائے بین کرتی ہوئی نکل آئی تھی۔ وہ ارتھی کی یاترا کو ہی روک دینا چاہتی تھی لیکن کئی عورتیں اسی کو ارتھی سے الگ کر لینے کی کوشش کرنے لگیں۔ ریتا کٹھ پتلی اک اور کھڑی یہ کشمکش دیکھتی رہی اسے غصہ بھی آتا رہا، یہ عورت اپنے آدمی کی لاش کو ٹھوکر مار کر پلٹ کیوں نہیں جاتی! اس آدمی نے اسے کونسا بڑا سکھ دیا ہوگا! پوری رفاقت کی مدت میں وہ اسے شاید سکھ کا ایک لمحہ بھی مشکل سے دے پایا ہوگا! پھر بھی وہ اسے روک رہی ہے یا شاید جدائی کے آخری لمحوں میں ستیہ وان کی ساوتری کا سوانگ ہی رچنا چاہتی ہے!

ریتا کے دل میں یک بیک اتنی نفرت بھر گئی کہ وہ ایک بھی لمحہ اور وہاں نہ رک سکی پاس سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی روک کر اس کے اندر جا بیٹھی۔ ٹیکسی اسے موت کے ناٹک سے آناً فاناً دور لے گئی۔ لیکن بعد میں اسے افسوس بھی ہونے لگا۔ اس نے کسی دوسرے کے اتنے بڑے المیے پر ایسا ردعمل کیوں دکھایا! اب اس کا دل بھی رفتہ رفتہ ایک دکھ سے بھرتا جا رہا ہے۔ ایک عجیب سے درد سے! اس درد کے دریا کو اور بڑھنے سے وہ روک نہیں سکے گی۔ ایسا کرنا ناممکن سا لگ رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں شاید اسی طرح وہ ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے ہی ٹریجڈی کے دریا کو پار کر لے گی۔ ٹیکسی والا بھی کتنے نازک لمحوں میں اس کا مددگار بن گیا ہے لیکن وہ اس سے کچھ پوچھے بنا ہی اسے لئے ہوئے چلا جا رہا ہے۔ پتہ نہیں کہاں! یہی ٹھیک ہے۔ جب وہ کہیں پر اپنے آپ رک جائے گا تو وہ آنکھیں بند کئے ہوئے ہی میٹر کے دام پوچھ لے گی۔ پھر اسے اور آگے بڑھ جانے کے لئے کہہ دے گی۔ اسے معلوم ہے اس کے پرس میں کتنے روپے ہیں انہیں کے مطابق

وہ آگے بڑھتی چلی جائے گی۔ پھر کسی ایک مقام پر وہ اتر جائے گی۔ وہاں سے پھر پیدل چلنے لگے گی لیکن آج وہ واپس نہیں جائے گی ایسے ہاسٹل میں کیوں لوٹ کر جائے جہاں قریب قریب ہر لڑکی کسی نہ کسی مرد کے جال میں گرفتار ہے۔ وہ سب جان بوجھ کر ہی فریب کھاتی ہیں اور چوکیدار کو ٹپ بھی دیتی ہیں تاکہ وہ انھیں فریب کھانے سے روکے نہیں!

آنکھیں بند کیے کیے ہی اس نے محسوس کیا ٹیکسی اب دھیمی ہو گئی ہے اور پھر رک بھی گئی ہے اس لیے رک گئی ہے کہ آگے جانے کے لیے اسے راستہ نہیں مل رہا ہے آگے ٹریفک ہی جام ہو گیا ہے۔ ٹھیک ہے، ابھی کچھ دیر میں ٹریفک کا اژدہا پھر رینگنے لگے گا۔ لیکن وہ کافی دیر تک آگے نہیں بڑھا اور اچانک اس کے کانوں میں ہارن کی آواز آئی اس کے بعد ٹیکسی والے کے ہنس پڑنے کی۔ وہ پوچھنے لگا۔ "میم صاحب! ماڈل ٹاؤن تو آ گیا۔ آپ کون سے سیکٹر میں جائیں گی؟"

اس نے حیران ہو کر آنکھیں کھول دیں، وہ سچ مچ ماڈل ٹاؤن کے گیٹ پر پہنچ چکی ہے لیکن اس نے ڈرائیور سے کہا کب تھا کہ اسے یہاں لے آئے! اس نے ذہن پر زور ڈالا، یاد کرنے کی کوشش کی۔ اسے پورا یقین ہے اس نے ڈرائیور سے کہیں بھی لے چلنے کے لیے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اپنے آپ ہی اسے یہاں لے آیا ہے لیکن وہ کوئی حجت بھی نہیں کرنا چاہتی اسے کرایہ دے کر چپ چاپ اتر جاتی ہے۔ ایک طرف چل پڑتی ہے۔ رات ہو گئی ہے۔ مکانوں اور بنگلوں کی روشنیاں جگمگا رہی ہیں۔ وہ اونچے اونچے کئی مکانوں کے درمیان چلتے چلتے ایک گلی میں ایک مکان کے سامنے رک جاتی ہے۔

دیوار پر لگی ہوئی کئی نیم پلیٹوں میں سے کسی ایک نام کو تلاش کرتی ہے اور پھر اوپر چلی جاتی ہے۔ اس فلیٹ کا دروازہ کھلا ہے۔ اس کی خوشبو سے پہچان کر ایک بوڑھا سا تبتی ٹیریر بھاگتا ہوا اس کے پاس آتا ہے کبھی قدموں میں لوٹتا ہے کبھی اچھل اچھل کر اسے دبوچ لینے کے لیے اوں کوں کوں کی آواز نکالتا ہے۔ ریتا جھک کر اسے اٹھا لیتی ہے اور اس کی سفید و کالی نرم نرم فر پر ہاتھ پھیرنے لگتی ہے۔ اسی وقت ایک کمرے سے ایک نوکر باہر نکل آتا ہے۔ وہ بھی اسے

پہچان کر بڑی حیرانی سے مسکرانے لگتا ہے۔ لیکن وہ دوسرے کمرے کی طرف بڑھ جاتی ہے۔ ڈرائنگ روم خالی پڑا ہے لیکن ایک طرف ایک میز پر وہسکی کی ایک بوتل اور کچھ گلاس قرینے سے رکھے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ ملے ہوئے ایک اور کمرے میں جاتی ہے۔ یہ بیڈ روم ہے۔ یہاں بھی کوئی نہیں ہے۔ اس کی نظر کارنس پر جا ٹکتی ہے۔ جہاں ایک ہی عورت کی مختلف فریموں میں کئی تصویریں سجی ہوئی رکھی ہیں، وہ ان کی طرف دیکھتی سی رہ جاتی ہے، یہ عورت کتنی حسین ہے! وہ اپنے اندر کہیں پر حسد کا جذبہ محسوس کرنے لگی ہے۔ کاش میں بھی ایسی ہی خوبصورت ہوتی! لیکن ان تصویروں کے درمیان یا آس پاس اس آدمی کی ایک بھی تصویر موجود نہیں ہے جس نے اپنی پسندیدہ عورت کی اتنی تصاویر سے اپنے بیڈ روم کو سجا رکھا ہے!

اچانک وہی نوکر پردہ اٹھا کر پوچھتا ہے "چائے لے آؤں، بی بی جی!"

ان لمحوں میں وہ واقعی بے حد تھکی ہوئی ہے وہ چائے پی سکتی ہے لیکن وہ اس کی طرف دیکھے بغیر ہی کہہ دیتی ہے "رگھو، میرے لئے ایک بڑا پیگ بنا کر لے آؤ۔"

رگھو ایک بڑا پیگ بنا کر لے آتا ہے۔ وہ تپتی ٹرے کو فرش پر اتارتے ہوئے پوچھتی ہے۔

"تمہارے صاحب کہاں ہیں؟"

"جی وہ ابھی یونیورسٹی سے لوٹ کر نہیں آئے۔ دوپہر میں بتا گئے تھے [illegible] صاحب کے ساتھ کوئی میٹنگ چلے گی، ویسے کہہ گئے تھے نو بجے تک اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ لوٹ آئیں گے۔ آتے ہی ہوں گے اب تو!"

وہ گلاس کو تپائی پر رکھ کر پلٹ جاتا ہے۔ ریتا چوڑے پلنگ پر بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ پینے لگتی ہے۔ پیتے پیتے اچانک جیسے اسے کچھ یاد آ جاتا ہے۔ وہ پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھنے لگتی ہے پھر ہاتھ بڑھا کر ایک خالی تابوت کو باہر کھینچ لیتی ہے، کتنی دیر تک اسے گھورتی رہتی ہے جو کسی قبر کی مانند گہرا اور خاموش ہے پھر وہ آئینے کے سامنے جا کر اپنے بال سنوارنے لگتی ہے، ہونٹوں پر لپ اسٹک لگاتی ہے، گالوں پر بھی تھوڑا سا پف کرتی ہے اور پھر اپنے کپڑوں کی شکنیں درست کرتی ہوئی اسی تابوت کے اندر جا کر لیٹ جاتی ہے۔ آنکھیں بند کر کے

سینے پر کراس بھی بنالیتی ہے اگرچہ مسیحیت پر اس کا ایمان نہیں ہے اس کے بعد وہ اپنی سانس روک لیتی ہے اسی حالت میں کئی منٹ تک پڑی رہتی ہے۔ اب اسے ایک عجیب سے سکون کا احساس ہونے لگا ہے۔ بے حد اطمینان بھی مل رہا ہے جیسے اب اسے ہر مصیبت سے، ہر قسم کے تناؤ سے نجات مل گئی ہو۔ وہ دل ہی دل میں کنفشن بھی کرلیتی ہے اور اپنے آپ کو اچانک روئی کے گالے کی مانند ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتی ہے۔ اس کے ذہن پہ اب کوئی بوجھ نہیں ہے اور یہ لمحے کتنے حیرت ناک ہیں اور کتنے خوشگوار ہیں اور حقیقتاً کتنے اہم بھی ہیں۔ انھیں لمحوں کی جستجو میں وہ کتنی دیر سے بھٹک رہی تھی۔

اچانک اس کے کانوں میں گیٹ کے اندر ایک موٹر کے داخل ہونے کی آواز آتی ہے۔ کچھ لوگ باتیں کرتے اور ہنستے ہوئے اترتے ہیں ان آوازوں میں کوئی ایک آواز یقیناً جمال مسیح کی بھی ہے۔ وہ سب آوازیں لمحہ بہ لمحہ اس کے اور قریب، اور قریب آنے لگیں ہیں۔ لیکن وہ بڑی عاجزی سے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھے، دم سادھے پڑی رہ جاتی ہے۔

بمبئی اُداس ہے

"آج کل یہاں صفِ اوّل کے شاعروں اور ادیبوں پر مایوسی سی چھائی ہوئی ہے۔ جاں نثار اختر چل بسے۔ کرشن چندر پر دل کا سخت دورہ پڑا ہے۔ ہسپتال میں ہیں اور پیس میکر کی مدد سے ان کو اب تک باقی رکھا گیا ہے۔ ساحر پر بھی یہ دورہ پڑا تھا کل (۲۰ اگست) تک ہسپتال میں تھے۔ اب گھر میں ہیں اور اپنی ساری مصروفیات بند کر رکھی ہیں۔ سردار (جعفری) پر بھی دورہ پڑا تھا لیکن وہ اب اچھے ہیں اور ان کا زیادہ تر وقت کرشن چندر کی تیمارداری میں گزرتا ہے۔ کیفی پر بہت پہلے فالج کا حملہ ہوا تھا۔ وہ اپنے علاج کے لیے کبھی یہاں اور کبھی کیرالا رہتے ہیں"

(بمبئی سے بھیجے ہوئے ایک خط موسومہ مدیر کا اقتباس)

کلچرل اکاڈیمی

حیدرآباد دکن سے خاص جریدہ غالب کے لیے

جیلانی بانو
۸-۰-۱۱ (اے) معظم پورہ حیدرآباد

چاروں طرف کلچر کے تحفظ کا شور اُٹھا تو میں نے اپنی جیبیں ٹٹول ڈالیں۔ جانے وہ خط کہاں گیا تھا جس میں اوشا نے مجھ سے کلچر کی جانب توجہ چاہی تھی۔ اس خط کو اوشا نے اپنے مخصوص اسٹائل سے لکھا تھا۔ اپنی قابلیت اور ذہانت کے تمام ڈیولپمینٹ لیے تھے۔ دنیا کے تمام فلسفیوں کے حوالے دیے تھے، اور ہر ممکن کوشش کی تھی کہ میں وہ بات سمجھ نہ لوں جو وہ کہنا چاہتی تھی۔

کیوں کہ میری اور اوشا کی دوستی بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی نوک سے زیادہ حسّاس رشتوں پر قائم تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوشا نے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کیا تھا اس لیے وہ ہر بیچ میں فلسفے کو گھسیٹ لاتی تھی، اور میں یونی ورسٹی میں لڑکوں کو پالیٹکس پڑھاتا تھا اس لیے اوشا سے بھی نہایت مدبرانہ انداز میں بات کرنا پڑتی تھی۔

ویسے اوشا بڑی خودسر اور خود مختار عورت تھی۔ اُسے فرسودہ رسموں اور غیر ضروری اخلاقی پابندیوں سے بڑی نفرت تھی۔ اسی اظہار کے لیے وہ تعلیم یافتہ روشن خیال مردوں سے بڑی جلدی بے تکلف ہوجاتی تھی۔ اسے سوسائٹی کے نمایاں اور غیر معمولی سائنس داں، شاعر ادیب اور دانشور پسند تھے۔ انھیں اپنے گھر بلا کر وہ شراب اور سگریٹ کی محفلیں جماتی۔ چھوٹے موٹے مشاعرے اور ادبی بحثیں ہوتیں۔ اوشا دنیا کے بڑے بڑے پریشان کن مسائل پر بات کر کے سب کو متفکر کر دیتی تھی۔

آپ اوشا سے مکمل تعارف اُس وقت تک حاصل نہیں کر سکیں گے جب تک میں اُس کے بارے میں آپ کو سب کچھ نہ بتا دوں۔ خاص طور سے یہ بات کہ اس نے اپنی شخصیت میں سے نسوانی امتیازہ کو کھرچ دیا تھا۔ وہ جان جان کر ہم سے اتنی بے تکلفی کا اظہار کرتی جس سے یہ نہ معلوم ہو کہ وہ عورت ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں جب بھی اوشا سے بے تکلفی کا اظہار کرنے بیٹھتا تو جانے کیسا کلف لگا تکلف اُبھرنے لگتا۔ گھبرا کے میں مزید انٹیلکچول بننے میں لگ جاتا۔ کیوں کہ جب انسان کا دماغ ٹھکانے پر نہ رہے تو یہی اس کی آخری پناہ گاہ ہے

اب ہم یوں باتیں کرتے تھے جیسے ہماری باتوں کے پیچھے غالب کے شعروں جیسے ہزاروں معنی پنہاں ہیں۔ اوشا اپنی ذہنی سطح کو بہت بلند خیال کرتی تھی۔ اس لیے اُسے معمولی کام اور معمولی انسان بالکل پسند نہ تھے۔ اسی ڈر سے وہ شعر نہ کہتی تھی کہ کہیں گھٹیا درجے کی شاعری نہ کر بیٹھے۔ کہانیاں اور ڈرامے نہیں لکھتی تھی کہ انھیں سمجھنے والے لوگ کہاں ہیں! وہ سارتر اور کامیو کے سوا کسی کو اس دور میں ادیب نہ مانتی تھی۔ اپنے سجے سجائے کاٹیج میں اکیلی رہتی۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ تو ہم میں سے کسی کو نہیں معلوم تھی لیکن عام خیال یہی تھا کہ اوشا شادی کے بعد شوہر کی اجارے داری کے خلاف ہے۔

رفتہ رفتہ اوشا کے ہاں ہم سب ادب، آرٹ، سائنس اور کلچر کے تنیہ بیوں کا جمگٹ ہونے لگا۔ شام ہوتے ہی سب اُدھر کا رُخ کرتے۔ اوشا کے دوستوں میں عورتیں کم تھیں۔ وہ کہتی تھی ابھی ہمارے ہاں عورتوں کی دماغی سطح بہت نیچی ہے۔ ہر عورت گھر محبوب اور بچوں کے سوا اور کچھ نہیں سوچتی۔ اس لیے اوشا گھر محبوب اور بچوں کے سوا اور ہر موضوع پر بحث کرتی اور پڑھتی۔ اس کا گھر قیمتی اور نایاب کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ہر موضوع پر پڑھ چکی تھی اور ہر مسئلے پر ایک خاص رائے رکھتی تھی۔ ہم سب اس کی قابلیت سے مرعوب تھے۔

اس نے ہم میں سے کسی سے یہ نہیں پوچھا کہ ہمارے کتنے بچے ہیں؟ ہمارا گھر کہاں ہے؟ شادی ہوئی ہے یا نہیں؟ اس معاملے میں اوشا بڑی فراغ دل تھی بلکہ وہ تو ہر معاملے میں سخی نظر آتی۔ اپنے گھر آنے والوں کی تواضع، مہنگی شراب اونچے قہقہوں اور قیمتی سگریٹوں

سے کرتی تھی۔

دن بھر کی تھکا دینے والی فضا سے نکل کر شام کو اوشا کے کاٹیج آؤ تو یوں لگتا جیسے ریگستان سے نکل کر کشمیر آ گئے ہوں۔ اِدھر تو اوشا اتنی دریا دلی دکھاتی اور اُدھر میرا یہ حال تھا کہ عادی مجرموں کی طرح بے فکری لادے رہتا۔ مگر ایک ایک لمحے کا حساب مجھے گیتا کو دینا پڑتا تھا۔

"آج اتنی دیر کیوں ہو گئی؟"

"کہاں گئے تھے ـــــ؟ وہاں کیا کیا ہوا ـــــ؟"

گیتا میری جیون ساتھی ہے اس لیے وہ میری زندگی کے ہر ہر گھنٹے میں شریک رہنا چاہتی ہے۔ اونہہ ـــــ نان سنس ـــــ میں اوشا کے ہاں جاتے وقت گیتا کے خیال کو بھی جھٹک دیتا تھا کیوں کہ تمام دانشور اپنی مصروفیتوں میں بیوی کے وجود کو نظر انداز کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی لیے اوشا کے ہاں مجھے گیتا کبھی یاد نہیں آتی۔ مگر آدھی رات کو جب میں نشے میں چور واپس آتا ہوں تو نیند میں مدہوش گیتا پر مجھے اچانک پیار آ جاتا ہے۔

کبھی کبھی اوشا کو دیکھ کر بھی جانے کیوں میں دوسری طرف دیکھنا بھول جاتا ہوں۔ حالانکہ اوشا تیس بتیس برس کی معمولی صورت شکل والی عورت ہے لیکن وہ جیسے طے کر چکی ہے کہ وہ دنیا کی لاثانی اور غیر معمولی عورت ہے۔ یا پھر ہماری نظریں اسے کم خوبصورت ماننے کو تیار نہیں ہیں۔

کبھی خیال آتا تھا کہ جب اوشا اتنی زبردست انٹلکچوئیل ہے تو وہ اپنے عورت نظر آنے پر اتنا اصرار کیوں کرتی ہے! وہ جان جان کر بہت کھلے گلے والی جرسی اور بہت تنگ پینٹ پہنتی ہے، اُس کی ساری کا پلّو کبھی سینے پر نہیں ٹکتا، وہ ہر آٹھویں دن اپنے بالوں کو سٹ کروانا نہیں بھولتی، نہایت نفاست سے میک اپ کر کے اور ایسے رنگوں کی ساریاں پہن کر ایسی خوشبو لگاتی ہے کہ ہر دن نئی نئی سی لگتی ہے۔ یوں بھی آپ نے غور کیا ہوگا کہ جن عورتوں سے ایک خاص فاصلہ رکھ کر ملنا پڑے تو وہ ہمیشہ نئی نئی سی لگتی ہیں۔

لیکن اوشا کا اصرار تھا کہ مجھ سے عورت سمجھ کر مت ملو۔

پتا نہیں ریاض صادق، بلبیر اور رام وغیرہ کا کیا حال تھا۔ لیکن میں جب اوشا سے باتیں کرتا تو مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ اس پر اوشا غصہ میں بھویں سیکڑ کے کہتی "اب تم گھر جاؤ گوپال، بیوی کا خون تمھارے ذہن پر سوار ہو چکا ہے۔

"یہ بات نہیں ہے اوشا۔" میں سٹپٹا جاتا۔

"میں اس بات پر غور کر رہا تھا کہ یو این میں یاسر عرفات کا لب و لہجہ ـــــــ

"چلو بھئی اٹھو۔ اب نیند آرہی ہے۔" بلبیر اوشا کی بندیا میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے کہتا

"ہاں بھئی اب اٹھنا چاہیئے بارہ بج گئے۔"

"مگر یاسر عرفات کے لہجے کا انداز۔۔۔۔۔؟

اور پھر ہم سب ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوتے۔

"گڈ نائٹ اوشا"۔۔۔۔۔

"گڈ نائٹ صادق ـــ گڈ نائٹ بلبیر ـــ گڈ نائٹ رام ـــ گڈ نائٹ گوپال۔

اخوہ ـــ تم لوگ میرے کمرے میں کتنی اسموکنگ کرتے ہو۔ دھوئیں کے مارے ساری رات میری آنکھیں جلتی ہیں۔"

وہ کچھ ایسے انداز میں آنکھیں ملتی رہی جیسے لگتا میرے سفر پر جاتے وقت کرتی ہے۔ ہم سب اونچے اونچے قہقہے لگاتے چوراہے تک آتے ہیں جہاں کاریں پارک کی جاتی ہیں وہاں سے اوشا کا کاٹیج صاف نظر آتا ہے۔

ابھی بتی جل رہی ہے ـــــ ہم سب اپنی کاروں میں بیٹھنے سے ایک بار اوشا کے روشن کمرے کی طرف دیکھتے ہیں۔

"یار کیا اوشا ساری رات لائٹ بند نہیں کرتی؟ بلبیر بظاہر لاپروائی سے یہ سوال کرتا ہے۔ مگر ہم سب شیطان خالص مردانہ انداز میں قہقہے لگاتے ہیں۔

پھر ہم سب نے مل کر ایک کلچرل اکاڈیمی کی بنیاد رکھی۔ اس کی سیکرٹری اوشا تھی اور اس کا آفس اوشا کا کاٹیج تھا۔ اب اوشا کے پھاٹک پر "ڈاکٹر مس اوشا مہتا" کے

علاوہ کلچرل اکاڈیمی کی ایک تختی اور لگ گئی تھی۔ ہر مہینے اکاڈیمی کا ایک جلسہ ہوتا ہے جس میں کسی نہ کسی اہم موضوع پر شہر کے دوسرے دانشوروں کو اظہار خیال کی دعوت دی جاتی۔ کبھی کوئی آرٹسٹ آتا اور کبھی کوئی سنگیت کار۔ پتا نہیں، کون کون آتا اور کیا کیا ہوتا تھا۔ ہمیں تو صرف اوشا کے ہاں بیٹھ کر اس کی آواز سننے سے مطلب تھا۔

مگر ہم دوستوں نے آپس میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس سے اوشا کے ساتھ کسی خاص دل چسپی کا اظہار ہوتا کیوں کہ ہم سب کے سب نہایت اعلیٰ دماغوں والے عظیم لوگ تھے جو اپنی تحریروں میں، تقریروں میں، شعروں میں اور خیالوں میں ایک ایسے سماج کی تخلیق کر رہے تھے جہاں عورت صرف دوست بھی ہوسکتی ہے۔

ہم میں سے اکثر دوستوں کا ایک ہی قصہ تھا۔ اپنے گاؤں میں ہم ابھی نویں دسویں کلاسوں میں تھے کہ ہمارے ماں باپ نے پیسے اور کھری ذات کے لالچ میں اپنے سے اونچے زمیندار گھرانوں میں ہماری شادیاں کر دیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جنس کے بارے میں ہم نے فرائیڈ سے کچھ سنا تھا نہ اردو شاعری پڑھی تھی۔ اور اس وقت تک ہماری بیویاں تین چار بچوں کی مائیں بن چکی تھیں پھر جب ہم سسرال کے پیسے سے یورپ کی بھاری بھرکم ڈگریاں لے کر لوٹے تو ہمارے بچے ہائی اسکول کا امتحان دے رہے تھے۔

اس لیے دل کا ایک کونا بالکل سونا تھا۔ غیر آباد۔ کنوارا۔

یہ ہم میں سے اکثر دانشوروں کا المیہ تھا۔

اب ہم اوشا کی دوستی بھلا کیسے چھوڑ سکتے تھے!

مجھے تو بعض وقت یوں لگتا ہے جیسے اوشا ہی زندگی کی ضرورت بن گئی ہے۔ اگر وہ کسی اور یونیورسٹی میں چلی گئی تو کیا ہوگا! ہماری کلچرل اکاڈیمی۔ ہمارے پیپرس، ہماری بحثیں! اوشا کے کمرے میں پھیلا ہوا سگریٹوں کا دھواں اور ساری رات سلگتا ہوا اس کے کمرے کا تنہا بلب۔؟

پھر کلچرل اکاڈیمی میری جان کا روگ بن گئی۔ یوں جیسے ایک دن بھی اکاڈیمی کے دفتر نہ گیا تو قیامت آجائے گی۔ اس مہینے اکاڈیمی کا جلسہ نہ ہوا تو ہندوستانی تہذیب کا بیڑا

غرق ہو جائے گا۔

اوشا کہتی۔ اس بار میٹنگ کی صدارت کے لیے ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے کو بلانا چاہیئے اور بلبیر پلین سے بمبئی کے دو دو چکر کرتا۔ میں ادھر ادھر سفارشی خطوط لے کر بھاگتا اور ہم اس ناممکن سوال کا جواب لیے اوشا کے حضور پہنچ جاتے۔

"دیکھا! اس بار کتنی کام یاب میٹنگ ہوئی! اوشا یوں فخر کے ساتھ کہتی جیسے سارا کیا دھرا اسی کا ہو۔ ہم سب بھی خوشی سے کھل اُٹھتے تھے۔ کیوں کہ کلچرل اکاڈمی واقعی شہر کے تمام ادیبوں اور دانشوروں کی توجہ کا مرکز بنتی جا رہی تھی۔

"اوشا، اب کے سیمینار کے انا گریشن کے لیے کامریڈ ڈانگے کو بلوائیں گے۔"

کوئی اپنی رائے پیش کرتا۔

"ہشت۔ اوشا اپنے لپ اسٹک رنگے ہونٹ سیکڑ کر کہتی" کلچرل اکاڈمی پر کسی سیاسی پارٹی کا لیبل نہیں لگنا چاہیئے۔"

اور دوسرے دن ہم سب اپنے اپنے دوستوں کے حلقے میں یہ بات دہراتے کہ کلچرل اکاڈمی پر کسی سیاسی پارٹی کا لیبل نہیں لگے گا۔

لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ کلچرل اکاڈمی پر بلبیر کا لیبل نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ ہر مہینے کی میٹنگ کا سارا کام وہی نمٹاتا تھا۔ ہر کام کی ذمہ داری اُسی پر عائد کی جانے لگی۔ اس لیے رات کو ہم اوشا سے رخصت ہوتے تو وہ سب کو آنکھیں مل مل کر گڈ نائٹ کہتی، سوائے بلبیر سنگھ کے۔ کیوں کہ ابھی بہت سے دعوت ناموں پر نام لکھنا باقی رہ جاتا۔ بجٹ نامکمل پڑا ہے، مہمانِ خصوصی کا مسئلہ طے نہیں ہو سکا ہے۔ مجھے بلبیر کی طرف سے یوں بھی فکر لگی رہتی تھی کہ اس کی منگیتر ابھی تک امرت سر کے کسی گاؤں میں اس کے خواب دیکھ رہی تھی اور بلبیر اکیلا خوب گا ناگنگناتا پھرتا تھا۔

بیویوں سے آزاد مردوں پر جو ایک زندہ دلی اور خوش مزاجی چھائی رہتی ہے بلبیر اس سے سرشار نظر آتا تھا جب کہ میں خود چوہے کا دل رکھتا تھا۔ مصلحتیں، جھوٹ اور تصنع مجھے چاروں طرف سے گھیرے رہتے تھے۔

ایک رات بلبیر نے سب کے اٹھتے وقت کہا:

"آج کی ڈاک بھی تو دیکھنا ہے"۔

تب میں نے فوراً کار کی چابی میز پر ڈال کر کہا:

"تم سب جاؤ۔ آج کی ڈاک میں دیکھ لوں گا"

میں نے محسوس کیا کہ بلبیر کو میری بات اچھی نہیں لگی۔ اس نے اوشا کی طرف دیکھ کر نہایت سریلی آواز میں پوچھا۔

"تو پھر میں جاؤں اوشا۔؟

"گڈنائٹ ۔" اوشا نے اُٹھ کر بلبیر کا ہاتھ پکڑ لیا تو جیسے چھوڑنا بھول ہی گئی۔

رام، صادق، احمد سب چلے گئے۔ مگر بلبیر اور اوشا کے قہقہے بڑی دیر تک پھاٹک پر سنائی دیتے رہے، پھر اوشا اندر آئی، بڑی خوش خوش۔

"یہ بلبیر کتنا مگن رہتا ہے۔" اس نے دھم سے صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ سلگایا۔

"آج کی ڈاک میں کوئی اہم بات نہیں ہے۔" میں نے مایوسی سے ڈاک ایک طرف سرکا کے اوشا سے کہا۔

"ہاں خوش تو رہتا ہے مگر اب اس کے پتا شادی کے لیے بلا رہے ہیں۔ آخر کب تک اکیلا رہے گا؟

"یہ تو سچ ہے۔" اوشا نے دھواں اُگلا۔ "وہ کب تک اکیلا رہے گا۔؟"

"اور تم کیسے اکیلی رہ لیتی ہو۔؟" میں نے جانے کیسے آج یہ بات کہہ دی۔

"اکیلی۔؟" وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور میری طرف جھک کر آہستہ سے بولی:

"تم جو ہو۔ تم سب ۔ دہلی میں ممی اور پاپا ہیں۔ شکاگو میں بھیا ہیں۔ شملہ میں فیروز ہے۔"

"فیروز ۔ فیروز کون ہے ۔؟ میں نے اوشا کو غور سے دیکھا۔ لیکن اس نے جس انداز سے سگریٹ کی راکھ جھٹکی میں سمجھ گیا کہ فیروز کون ہے!

"اس کی بیوی شملہ کے کسی ریسرچ سنٹر میں کام کرتی ہے۔" اوشا نے سگریٹ کو دور

سے ایش ٹرے میں رگڑ دیا۔

"اچھا" میں نے یوں کہا جیسے اب فیروز سے میرا تعارف مکمل ہوگیا ہے۔

"مگر ہے بڑی تنگ نظر عورت۔ بے چارے فیروز کی زندگی اجیرن کردی ہے۔"

اور پھر میری زندگی اجیرن ہونے لگی۔ میں گیتا کے سلیقے اور حسن کی اب اٹھتے بیٹھتے تعریفیں کرنے لگا تھا' اس کے باوجود میری طرف سے اُس کے دل میں شک کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ پتا نہیں کس چغل خور نے اس کے کان بھر دیے تھے کہ اوشا سے میری عاشقی چل رہی ہے۔ اب وہ میری نقل وحرکت پر کڑی نگرانی کرنے لگی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دن اس نے صاف کہہ دیا کہ اوشا کے ہاں میرا جانا اسے اچھا نہیں لگتا۔

"نہ لگے"۔ مجھے اچانک بے حد غصہ آگیا۔

"میں بھی اپنے ہر کام میں تمھاری دخل اندازی برداشت نہیں کرسکتا۔"

باہر جاتے وقت میں نے طے کرلیا تھا کہ اب دو تین دن تک گھر نہیں آؤں گا تاکہ گیتا کو میری ناراضگی کا اندازہ ہوسکے۔

شام کو منہ لٹکائے میں اوشا کے ہاں پہنچا تو وہاں پہلے سے بلبیر اپنی منحوس صورت لیے موجود تھا۔ اوشا بھی بڑی فکر مند سی نظر آرہی تھی۔ پریشانی کے مارے اس نے آج شام ہونے کے باوجود نائیٹی اتار کر ساری نہیں پہنی تھی۔ یوں ہی بیٹھی' کہیں کہیں سے کھل جانے والے بدن کو ڈھانپ ڈھانپ کر بلبیر کے سگریٹ سے سگریٹ جلاتی رہی۔

مسئلہ یہ تھا کہ بلبیر کے ماں باپ نے اسے زبردستی بلا کر شادی کردی تھی۔ اب اتنی جاہل لڑکی کے ساتھ ڈاکٹر بلبیر سنگھ کی بسر کیسے ہو' جو ہر وقت بلبیر کی کتابیں جلانے کی دھمکی دیتی تھی۔

اوشا نے اس کے سامنے بہت سے حل رکھے۔ گاؤں میں پٹک کر آجاؤ۔ چھوڑنے کی دھمکی دو۔ پڑھانے کی کوشش کرو۔

ایسی فضا میں اپنا مسئلہ میں کیا چھیڑتا! بس چپ چاپ کاغذ سامنے پھیلائے کلچرل اکاڈمی کے مستقبل پر غور کرتا رہا۔

شام کو گھر پہنچا تو گیتا اپنے میکے جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ بڑی خوشامدوں کے بعد اسے روکا۔ میرے دل کی ساری گرہیں کھل چکی تھیں۔ پھر بھی جانے کیوں میں گیتا کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ شاید بچوں کا خوف ہو۔ اوم اب میرے ساتھ یونیورسٹی جانے لگا تھا واپسی میں وہ بشیر باغ کے چوراہے پر کہتا۔

"پپا مجھے یہاں اتار دیجیے۔ اب آپ تو سکندرآباد جائیں گے نا؟"

"ہاں۔ نہیں تو۔ (سکندرآباد میں اوشا رہتی تھی)

"نہیں۔ آج کلچرل اکاڈمی میں کوئی کام نہیں ہے۔ میں جلدی گھر آجاؤں گا۔" میں اوم کو اتار کے بڑی شرمندگی سے کار آگے بڑھا لیتا۔

پھر اچانک بشیر کلچرل اکاڈمی سے غائب ہو گیا۔ کئی بار ہم نے دیکھا کہ وہ اپنی بہت خوبصورت تیز طرار بیوی کے ساتھ ڈالڈا کا ڈبہ سنبھالے کار میں سوار ہو رہا ہے۔ ہمیں دیکھ کر دور ہی سے "ہیلو" پر اکتفا کر لیتا تھا۔

اوشا نے سنا تو بہت غصے میں آئی۔

"میں تو ایسے آدمی کو شوٹ کردوں۔ کوئی تک ہے کہ اتنا جینیس انسان اور ایک جاہل لڑکی کے اشاروں پر ناچ رہا ہے۔ تم سب مرد باہر سے بڑے آزاد خیال بنتے ہو۔ مگر ہو وہی قدامت پسند۔ وہ ہم پر سگریٹ کا دھواں اُگل کر بولی۔

چنانچہ میں نے اندر سے بھی آزاد ہونے کا ثبوت دینا چاہا۔

پھر ایک شام جب میں اوشا کے ساتھ بیٹھا پی رہا تھا تو اداسی جانے کہاں سے مجھ پر ٹوٹ پڑی اور میں نے روتے روتے فرش پر بیٹھ کر اوشا کے پیر چھوتے ہوئے کہا "مجھے بچاؤ اوشا۔" میں مر جاؤں گا۔ گیتا مجھے دھیرے دھیرے زہر دے کر مار رہی ہے۔"

"سیدھے بیٹھو گوپال۔" اوشا نے اپنے پاؤں سمیٹ کر مجھے صوفے پر بٹھا دیا اور پھر گلاس کا آخری گھونٹ ختم کر کے بولی۔

"تم سب مڈل کلاس کے مرد رونا جانتے ہو۔ خودکشی کر سکتے ہو۔ لیکن اتنی بغاوت نہیں کر سکتے کہ جو عورت پسند نہیں ہے اس کے ساتھ رہنے سے انکار کردو۔

میں نے بھی غور کیا کہ یہ تو بہت آسان کام ہے جو میں نہیں کر سکتا۔ پتا نہیں کیوں ہم اپنی بیویوں سے بندھے رہنا چاہتے ہیں؟

اس رات تقریباً دو بجے اوشا نے مجھے جگا دیا۔ وہ ابھی تک پیے جا رہی تھی اور سگریٹ اس کے ہاتھ میں جل رہا ہے۔ پھر اس نے میرا کوٹ اور کار کی چابی تھماتے ہوئے کہا:

"اب تم گھر جا کر سوؤ۔ بہت رات ہو گئی ہے۔ گیتا کو نمک مرچ لا کر دو ورنہ تمہاری بھی ہنڈیا پھیکی رہ جائے گی۔"

تقریباً دو ہفتے کے بعد میں کلچرل اکاڈمی کے آفس پہنچا تو اوشا بہت غصے میں تھی۔

"تم سب کے سب بہت لاپروا ہو۔ تم لوگ اپنے کلچر کے تحفظ کے لیے کچھ نہیں کر سکے۔ کچھ سن رہے ہو! انڈیا میں فاشسٹ طاقتیں کلچر، سائنس، آرٹ ہر چیز کو تباہ کیے ڈال رہی ہیں۔ اس موضوع پر ہمیں بھی تو ایک سیمینار کرنا چاہیے!

اس آنے والی تباہی کے آثار اوشا کے چہرے پر صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی ساری کا پھیکا رنگ، میک اپ کے بغیر سونا چہرا اور اس کے بدن کی جاگتی ہوئی جولانی ہر چیز جیسے چپ چاپ سی تھی۔

میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"اب یہاں کوئی نہیں آ رہا ہے۔ میں تم لوگوں کے بغیر اکیلی کیا کروں! آئندہ میٹنگ فاشزم کے خلاف کرنا ہے۔ اس کی بڑی اہمیت ہے۔ آخر ہمارا کلچر۔

میں نے دیکھا اوشا سچ مچ بے حد پریشان سی اداس سی نظر آ رہی تھی۔

"کلچر کا تحفظ میں کروں گا اوشا۔" میں نے پہلی بار اس کے کاندھے پر سر رکھ کر اسے تھام لیا۔ "تمہارے سارے کام ہو جائیں گے۔ تمہیں معلوم ہے میرے ساتھ کیا ہوا؟ گیتا نے خودکشی کر لی تھی۔"

"کیا ــــــ؟ وہ اچھل پڑی اور مجھے دور ڈھکیل دیا۔

"ہاں ــــــ اس رات کو جب میں تمہارے ہاں سے گیا تو گیتا میرے تکیے کو سینے سے لگائے بستر پر سو رہی تھی۔ اس کے پاس بیئر کا خالی گلاس رکھا تھا اور نیند کی گولیوں کی خالی

ڈبیہ پڑی تھی۔"

"ارے ـــــ ! پھر ـــــ ! اوشا بے حد پریشان تھی۔

"بس چند منٹ کی دیر ہو جاتی تو گیتا ختم تھی۔ اتفاق کی بات ہوئی کہ ہاسپٹل کے ایمرجنسی وارڈ میں ہر چیز تیار ملی۔" اس سے آگے کی بات مجھ سے کہی نہیں جا رہی تھی۔

"مگر آخر کیوں ــــ؟ اوشا نے سگریٹ سلگا کے پوچھا

"کہتی ہے آپ میری طرف سے لاپروا ہو گئے ہیں۔ میں اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی۔" میں نے بات کی شدت سے رک رک کر کہا

"ہونہہ ــــ اب اوشا کو غصہ آنا شروع ہوا۔

" یہ عورتیں شوہر کا ایک ہی مصرف سمجھتی ہیں کہ ان کے سامنے بیٹھا رہے۔ ان کی بلا سے ساری دنیا میں آگ لگ جائے۔

" نہ صرف سامنے بیٹھے بلکہ ان سے اپنے عشق کا اظہار بھی ہر وقت کرو۔ ورنہ ان کا جینا بیکار ہے۔" میں نے پہلی بار مسکرانے کی کوشش کی۔

چند منٹ خاموشی رہی۔ پھر اوشا نے سگریٹ مسل کر ایش ٹرے میں پھینکا اور چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بہت آہستہ سے پوچھا۔

"کیا تم بھی گیتا کو چاہتے ہو گوپال ــــــ؟

سگریٹ میری انگلیوں میں دیا کانپ رہا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اوشا کی بات کا جواب انکار میں دوں۔ مگر گیتا کی موت کا خوف میرے اعصاب پر سوار تھا۔ اگر گیتا مر جاتی تو ــــــ؟ یہ بھیانک سوال میرے سامنے ہر وقت کھڑا تھا۔

اوشا نے سر جھکا لیا۔ جیسے اپنی بات کا جواب سن لیا ہو۔ پھر وہ آہستہ آہستہ جیسے اپنے آپ سے کہنے لگی۔

"گیتا کتنی حساس ہے۔ تمہاری اتنی سی لاپروائی برداشت نہیں کر سکی! اصل بات یہ ہے گوپال کہ تم نے اسے کوئی دکھ جو نہیں دیا ہے۔ وہ بے چاری کیا جانے مرنے کا وقت کب آتا ہے!

میں سمجھ گیا کہ اب اوشا فلسفہ کی طرف مڑ رہی ہے۔

دوسرے دن اوشا کا فون آیا۔

"جلدی آؤ۔ سبھدرا جوشی کا خط آیا ہے۔ انھوں نے میٹنگ میں آنے کا وعدہ کیا ہے"

مگر میں نہیں جا سکا۔

تیسرے دن پھر اوشا کا فون آیا۔

"اگلی میٹنگ کب کرنا چاہیئے ـــ؟"

میں نے وعدہ کیا کہ شام کو آؤں گا مگر شام کو اوم کی برتھ ڈے تھی۔

چوتھے دن ڈاک سے اوشا کا جو خط آیا اس میں کلچر کے نام پہ اس نے میری توجہ چاہی تھی۔

بس میں فوراً خوبصورت جملوں کی تلاش میں لگ گیا تاکہ فلسفے اور شاعری میں ڈوبے ہوئے اس خط کا جواب دے سکوں۔

پانچویں دن اوشا نے مجھے پھر فون کیا۔

"آج مجھے بے حد زکام ہو رہا ہے گوپال۔ سارے بدن میں درد ہے۔ صبح سے میں نے کچھ نہیں کھایا ہے۔"

ہم شاپنگ کو جا رہے تھے، گیتا میرے پاس کھڑی تھی، میں اوشا سے کیا کہتا اس وقت؟ سوائے اس کے کہ ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں جاتیں!

چھٹے دن کوئی مجھ سے فون پر کہہ رہا تھا کہ اوشا مر گئی۔ اس نے خودکشی کر لی ہے۔'

میں گھبرایا ہوا اس کے کاٹیج پہنچا۔

اوشا اپنے بستر پر، اپنے ہی تکیے کو باہوں میں دبائے مر چکی تھی۔ اس کے سرہانے بیر کا خالی گلاس رکھا تھا۔ پاس ہی نیند کی گولیوں کی خالی شیشی پڑی تھی اور اس کے کمرے کا بلب جل رہا تھا۔

مجھے شرمندگی ہوئی کہ اپنے کلچر کے تحفظ کے لیے کچھ نہ کر سکا۔

۱۹۷۶ء میں ایسی ہی زیرِ طبع یا زیرِ تصنیف کتابوں کا تعارف ارسال فرمایئے

بالکل نئی کتاب

کون سی؟ کس کی؟ کب تک؟

مہ و سالِ آشنائی

فیض احمد فیض ایک کتاب لکھ رہے ہیں بلکہ لکھ چکے ہیں، نظرِ ثانی کر رہے ہیں اور توقع ہے کہ ۱۹۷۶ء کے ختم سے پہلے شائع ہو جائے۔ پہلا باب تقور، دوسرا تعارف، تیسرا مناظر، چوتھا داغستان، پانچواں مکالمے اور چھٹا منظومات و تراجم۔ یہ ان کی یادوں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۱۸ء سے شروع ہوتی ہیں جب کہ پہلی بار انھوں نے سنا کہ زارشاہی ختم اور روس میں مزدور راج قائم ہوا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں روسی ادیبوں اور شاعروں سے اوّلین ملاقات لاہور میں ہوئی جب وہ ترقی پسند مصنفین کی دعوت پر پاکستان آئے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں دہلی میں ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں کچھ پرانے، در، ند نئے روسی ادیبوں سے ملے۔ ۱۹۵۸ء میں تاشقند کی ایفرو ایشیائی کانفرنس کے سلسلے میں روس کا پہلا دورہ کیا، تجدید ملاقات ہوئی، چند اور نئے ادیبوں اور شاعروں سے دوستی ہوئی۔ اس کے بعد کئی بار روس گئے ہر مرتبہ مختلف مقامات کی سیر کی، ادب پاروں کا مطالعہ کیا، ادیبوں سے تبادلۂ خیال کیا، کچھ انھیں دیا کچھ ان سے حاصل کیا۔ لوگوں کا رہن سہن دیکھا گاؤں بھی گئے، شہر بھی گھومے

جو دیکھا وہ لکھا۔ داغستان کے مشہور شاعر رسول حمزہ کے گاؤں اور داغستان کے دوسرے دیہاتوں کے متعلق کہتے ہیں ان کی "وضع قطع کچھ کچھ ہمارے ضلع ہزارہ کے بعض دیہات سے ملتی جلتی ہے۔ پتھر یا لکڑی کے یک منزلہ مکان، بل کھاتی ہوئی سنگ بستہ گلیاں، بیچوں بیچ ایک پتلی سی شفاف آبجو اور گھروں سے ملے ہوئے مختصر سیب، خوبانی اور شفتالو کے باغات، ہر گھر کی صورت ایک بند قلعے کی سی ہے، چاروں طرف اونچی پتھر کی دیوار جس میں نہ روزن ہے نہ دریچہ۔ صرف ایک صدر دروازہ جسے صدر کی بجائے عقبی دروازہ کہنا چاہیئے اس لیے کہ وہ عام طور سے گلی یا بازار کے بجائے مکان کے پہلو یا عقب میں کھلتا ہے۔ مکان میں داخل ہوں تو پہلے ایک ڈیوڑھی، اس سے نکل کر صحن یا باغ اور پھر یک رویہ رہائشی کمرے"۔ اس کے بعد فیضؔ لکھتے ہیں: "یہاں کے مرد ہاتھ ملاتے ہیں تو یورپی لوگوں کی طرح انگلیوں سے انگلیاں نہیں ملاتے، پہلوانوں کی طرح پنجہ کشی کرتے ہیں اور دست و بازو کی خیریت مطلوب ہو تو اس معاملے میں ذرا چوکنا رہنا چاہیئے"۔ فیضؔ اپنے ان دوروں میں روس کے ادیبوں کے علاوہ یورپ، ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے بہت سے اہلِ قلم سے ملے کیونکہ ان کے خیال میں ماسکو "دنیا بھر کے ادیبوں اور دانشوروں کا بین الاقوامی مسافر خانہ ہے" اور وہاں کس کس سے کتنی بار ملاقات ہوئی اور کیا کیا باتیں ہوئیں اگر یاد کرنے بیٹھوں تو غالباً بقیہ عمر اسی میں گزر جائے گی"۔ ترکی کے شاعر ناظم حکمت متوطن ماسکو سے شاعری کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی تو ناظم نے کہا "فارم یا ہیئت کے بارے میں پہلے بھی میں نے کسی سے کہا تھا کہ اس کی صورت تو کسی حسینہ کی ساقِ سیمیں پر ریشمی جراب کی سی ہے جو ساقِ سیمیں کے حسن میں تو اضافہ کرے لیکن خود زیادہ نمایاں نظر نہ آئے۔ اس پر میں نے حسرتؔ موہانی کا شعر سنایا اور بہت داد پائی۔

رنگِ قبا سے مل گئی خوبیٔ جسمِ نازنیں
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

فیضؔ کی یہ کتاب ان کی یادوں اور مشاہدات کا مجموعہ ہے۔

فیض اور مخدوم

مرزا ظفرالحسن پاک و ہند کے ان دو ممتاز شاعروں کی زندگی، فکر اور تخلیقات پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ ۱۹۷۶ء کی آخری سہ ماہی تک شائع ہو جائے گی۔ مخدوم محی الدین پاکستان کے ادبی حلقوں میں بہتر تعارف کے مستحق تھے، فیض احمد فیض کی زندگی کے حالات سے اہلِ ہند ناواقف ہیں۔ یہ کتاب دونوں ملکوں کے ادب دوستوں کے لیے معلومات آفریں ہوگی۔ پہلے باب تالیفِ نسخۂ وفا میں مرزا ظفرالحسن لکھتے ہیں" دونوں میرے دوست ہیں، میں نے دونوں کے سایۂ محبت میں زندگی کے قرینے اور اُسے برتنے کے سلیقے سیکھے ہیں اس لیے جی چاہا کر اپنے مشاہدات کی روشنی میں یادوں کی ایک محفل منوّر کروں۔ شاید اس محفل کا کوئی چراغ آئندہ لکھنے والوں کو کسی منزل کی جانب پہنچنے میں کوئی مدد دے سکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دونوں ہم عصر ہیں، شاعر ہیں، ہم عمر ہیں، ہم مشرب ہیں اور ان کے سیاسی افکار میں کافی مشابہت ہے۔ دونوں ترقی پسند تحریک اور اس کی تنظیم سے وابستہ اور وفادار رہے ہیں، دونوں کے کئی احباب مشترک ہیں جن میں چند ممتاز شخصیتیں مرحوم ہو چکی ہیں اور چند آج بھی دنیائے ادب میں منفرد حیثیت رکھتی ہیں اور انھوں نے بھی فیض اور مخدوم کی طرح زبان و ادب کی آبرو میں اضافہ کیا ہے"۔ گھر کا مذہبی ماحول جس میں دونوں کی اوّلین تربیت ہوئی مزاج میں بعد المشرقین کہ ایک ہمہ وقت دل لگی باز اور ہنسوڑ، دوسرا ہمیشہ سے کم سخن اور حلیم الطبع، فیض قابلِ رشک حد تک صاحبِ علم، مخدوم ناقابلِ تقلید صاحبِ عمل دونوں کی نثری اور منظوم تخلیقات اور خصوصاً شعری فکر میں مماثلت و مغائرت غرض ہر اس قاری کے لیے اس کتاب میں مفید اور دلچسپ مواد شامل ہوگا یا ہونا چاہیئے جسے فیض اور مخدوم دونوں کی زندگی کے حالات اور فکر و فن سے شغف ہے۔

تحریکِ آزادی میں اردو کا حصہ

ڈاکٹر معین الدین عقیل نے کراچی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کے لیے ۱۹۷۵ء میں مقالہ لکھا جو اب کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ مقالہ نگار کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ غیر منقسم ہندوستان کی تمام تحریکاتِ آزادی ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں جن کی انتہا تحریک پاکستان اور نقطۂ اختتام پاکستان ہے۔ کتاب میں پانچ ابواب ہیں۔ پہلا باب انگریزوں کی آمد سے شروع اور تحریکِ پاکستان پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرے باب میں حبِ وطن پر مبنی ادب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرا باب ۱۷۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک کی مدت تک اردو شاعری، نثر اور افسانوی ادب، اردو صحافت اور سیاسی اور قومی موضوعات پر مشتمل ادب کے تجزیے پر مشتمل ہے۔ پہلے معرکۂ آزادی سے قیام پاکستان تک کے قریب قریب تمام امورِ ادب اور ان کے تاریخی متعلقات کا تذکرہ چوتھے باب میں پوری تفصیل اور اپنے تمام تنوع کے ساتھ کیا گیا ہے۔ علی گڑھ تحریک، تحریک ردِ عیسائیت، سودیشی تحریک، تحریکِ اتحادِ اسلامی، ہوم رول تحریک، تحریکِ خلافت اور ترقی پسند تحریک کے علاوہ اس میں ان تمام اردو تحریروں کا ذکر ہے جن کا تعلق آزادی سے ہے۔ مثلاً خود نوشت سوانح عمریاں، سوانحی کتابیں، روزنامچے، سفر نامے، مکتوبات، خطبات، فتاوی پانچویں باب میں مقالہ نگار کا نظریہ ہے "برِعظیم کی سیاسی تحرکات دراصل مسلمانوں نے شروع کی تھیں۔ اردو ہر تحریک کی بنیادی ضرورت تھی۔ یہی زبان تھی جس نے انھیں سیاست میں سرگرم رکھا۔" اسی باب میں لسانی تنازعات کا تذکرہ بھی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عقیل لکھتے ہیں "ایسے ہندو جو قومی احیاء کے جذبے کے تحت اردو دشمنی پر اتر آئے تھے مسلمانوں کو ہم خیال بنانے اور اپنی تحریکات کو کامیاب کرنے کے لیے اردو کو استعمال کرنے پر مجبور تھے۔"

کتاب کے آخر میں حواشی دیے گئے ہیں اور فہرست اسناد حوالہ بھی۔ مجموعی طور سے معلومات آفریں کتاب ہے۔ ایک طرف اس میں ڈاکٹر عقیل کا تحقیقی اور تنقیدی مزاج پوری طرح نمایاں ہے دوسری طرف اس سے بہت سے ذیلی موضوعات سجھائی دیتے ہیں جن پر مزید کام کے لیے یہ کتاب ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

چند قدیم اخبارات اور رسائل

(کلکتہ سے خاص جریدہ غالب کے لیے)

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

(۲۱) ای اشوک نگر ریجنٹ پارک، کلکتہ (۷۰۰۰۴۰)

[بہت سے احباب سے تقاضے جاری ہیں کہ وہ اپنے کتب خانوں کی نایاب یا کمیاب کتابوں اور رسائل کے تعارف تحریر فرمائیں تاکہ علم ہو سکے کہ کس کے کتب خانے میں کیا محفوظ ہے۔ بڑی خوشی ہے کہ اس سلسلے کا اوّلین مضمون شانتی رنجن بھٹاچاریہ صاحب نے کلکتہ سے ارسال فرمایا ہے جس [illegible] ادارہ سراپا سپاس ہے۔ امید ہے کہ دوسرے احباب [illegible] فرمائیں گے۔ بھٹاچاریہ صاحب کے اس سلسلے کے باقی [illegible] بعد کے شماروں میں شامل کیے جائیں گے۔ م ظ ح]

میرے گھریلو کتب خانے میں اس وقت اردو، انگریزی، بنگلہ اور دیگر چند زبانوں کو ملا کر لگ بھگ تین ہزار کتابیں ہیں اور اُن میں اندازاً اردو تصانیف کی تعداد ۲ دو ہزار ہے۔ غالباً آپ یہ سمجھیں کہ میں ایک دولت مند آدمی ہوں اور میرے یہاں ایک بڑا لائبریری ہال ہے جہاں یہ سب کتابیں خوبصورت الماریوں میں سجی سجائی رکھی ہیں۔ جی نہیں۔ میں ایک عام سرکاری ملازم ہوں اور میرے گھر

کھانے والے افراد بھگوان کی کرپا سے آٹھ ہیں۔ ایک آدھے کچے اور آدھے پکے مکان کا مالک ہوں جس میں صرف تین کمرے ہیں اور میرے لیے صرف ایک کمرہ ہے جو نہ صرف میرا اور میری شریمتی جی کا بیڈ روم، شو روم، ڈریسنگ روم، ریسٹ ہاؤس، گسٹ ہاؤس وغیرہ ہے بلکہ میری لائبریری بھی ہے۔ اب اندازہ لگایئے میری لائبریری کیسی ہوگی؟ کچھ لائبریری میرے پلنگ کے نیچے ہے، جھانک کر دیکھئے کتابوں اور رسالوں کے کئی بنڈل باندھے ہوئے ملیں گے۔ اس کے علاوہ اس کونے میں، اس طاق پر، جہاں کہیں بھی جگہ ملی، کتابیں اور رسائل کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں اور یہی میری لائبریری ہے۔ لیکن ہاں ایک شوق ہے جس کی بنا پر اس طرح ان تمام چیزوں کو دل سے لگاتے ہوتے برسوں سے ان کی حفاظت کر رہا ہوں اور تاحیات کرنے کا ارادہ بھی ہے۔ میرے ادیب دوست اکثر مجھ سے سوال کرتے ہیں فلاں کتاب یا رسالہ آپ کی لائبریری میں ہے؟ ہاں یا نہیں میں جواب بھی دیتا ہوں اور کتنے ساتھیوں کو فرداً فرداً ان کی تفصیل بھی بھیجتا ہوں جو موجود ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ میرے اس کتب خانے کی کوئی فہرست کتب بھی نہیں ہے لہٰذا جب کوئی سوال کرے تو کئی دن تو تلاش لینے میں صرف ہوجاتے ہیں اور اس کے بعد جواب دینا پڑتا ہے۔ سوچا اور کئی بار سوچا کہ کسی طرح ایک فہرست تیار کر ڈالوں۔ یہ کام آج تک نہیں کر سکا۔ خیر دیکھیے کب ہو پاتا ہے لیکن میری اس لائبریری میں جو سینکڑوں اخبارات اور رسائل ہیں ان میں سے ایسے اخبارات و رسائل کا ذکر یہاں کرتا ہوں جو ۱۹۴۷ء یعنی تقسیم ہند سے قبل کے ہیں۔ میرے خیال میں ان میں سے بیشتر اگر آج نایاب نہیں ہیں تو کم یاب ضرور ہیں میرا ارادہ ہے کہ تین چار مضامین مزید لکھوں تاکہ ادب دوستوں کو کچھ فائدہ پہنچ جائے۔

روزنامے

۱۔ عصر جدید۔ کلکتہ : بنگال سے جتنے روزنامے نکل رہے ہیں۔ ان میں سب سے قدیم روزنامہ "عصر جدید" ہے جس کا سال اجرا ۱۹۱۸ء ہے۔ تقسیم ہند

سے قبل یہ اخبار مسلم لیگ کا ترجمان تھا۔ جناب شائق احمد عثمانی اس کے مالک و مدیر تھے جو مسلم لیگ کے سرگرم رکن تھے۔ مولانا عبدالجبار وحیدی جو کلکتہ ضلع مسلم لیگ کے ستون تھے شائق احمد عثمانی کے گہرے ساتھی تھے اور آپ نے بھی "عصر جدید" کے لیے بہت کچھ لکھا ہے۔ حتیٰ کہ کئی اداریے بھی ۱۹۴۶ء کے ڈائرکٹ ایکشن میں مولانا وحیدی شہید ہو گئے۔ میرے یہاں اس اخبار کے ۱۹۴۲ء ماہ جنوری کے ۲ شمارے آج تک محفوظ ہیں جو کہ خود آج "عصر جدید" کے دفتر میں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ اُن دنوں یعنی ۱۹۴۲ء میں اس اخبار کے مدیر ابوالمظفر اختر عشروی تھے۔

۲۔ مسلم گزٹ۔ کلکتہ

غالباً ۱۹۲۵ء سے نکلنے لگا تھا۔ میرے یہاں جلد نمبر ۱۲ یعنی جون ۱۹۲۶ء کے چند شمارے ہیں۔ اس کے مدیر محمد اسحاق امرتسری تھے اور پروپرائٹر حکیم محمد رحمت اللہ۔ یہ گزٹ خود کو "مسلم حقوق" کا محافظ قرار دیتا تھا۔ ۸۲ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ آج کے دور میں بھی اردو کے ایسے اخبارات نہ ہونے کے برابر ہیں جو لکھنے والوں کو معاوضہ دیا کرتے ہیں لیکن اُس دور میں "مسلم گزٹ" اپنے لکھنے والوں کو معاوضہ دیا کرتا تھا جیسا کہ اُس کے قواعد وضوابط میں کہا گیا ہے۔ "افسانے اور علمی وسیاسی اقتصادی مضامین اگر وہ ادارہ کی نظر میں بہترین ثابت ہوں تو ادارہ کی طرف سے اُس کا معاوضہ بھی مصنفین کی خدمت پیش کیا جائے گا۔ جس کا فیصلہ بذریعہ خط وکتابت یا بالمشافہ سے ہو سکتا ہے۔"

محمد اسحاق امرتسری، بنگال کے نامور عوامی شاعر اشک امرتسری مرحوم کے سب سے بڑے بھائی ہیں اُن کے منجھلے بھائی ضیاء الدین مرحوم شانتی نکیتن میں پروفیسر تھے۔ اسحاق صاحب نے کلکتہ سے ایک ادبی ماہنامہ "ماہ تمام" بھی جاری کیا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔

ہفتہ وار

۱۔ سولہ آنہ۔ ہوڑہ

سنہ اجرا ۱۹۳۱ء۔ جلد نمبر ۱ کے تین اور جلد نمبر ۲ کے دو شمارے میرے پاس ہیں۔ اس ہفتہ وار کے ایڈیٹر جناب زاہد حسین جوہر غازی پوری تھے۔ اس کے سرورق پر یہ شعر ہوتا تھا۔

وہی عاقل وہی ہے فرزانہ
جس کی ہر بات ہو سولہ آنہ

۲۔ ہند۔ کلکتہ

اس مشہور ہفت روزہ کے مدیر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے اور یہ ہفتہ وار ۱۹۴۴ء میں نکلا تھا۔ جلد اوّل کے تین شمارے میرے یہاں رہ گئے ہیں۔ اس کے صفحات عام طور پر ۲۲ ہوتے تھے۔

۳۔ "الہلال" اور "البلاغ" کلکتہ

یہ دو جریدے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ بیسویں صدی میں اردو صحافت کا تصور کرتے ہی مولانا ابوالکلام آزاد اور اُن کے جاری کیے ہوئے ان دو ہفتہ وار اخبارات ("الہلال" ۱۹۱۲ء اور "البلاغ" ۱۹۱۴ء) کا نام ذہن میں اُبھر آتا ہے۔ میرے یہاں "الہلال" کے چھ اور "البلاغ" کے دو شمارے محفوظ ہیں۔

پندرہ روزہ

۱۔ نقیب۔ پھلواری شریف، بہار

یہ پرچہ ہر عربی ماہ کی ۵ اور ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا تھا۔ میرے یہاں جلد نمبر ۸ کے چند شمارے ہیں جو ۱۹۴۰ء کے ہیں۔ اس کے ایڈیٹر صغیر الحق ناصری ہیں اور یہ برقی مشین پریس مراد پور بانکی پور پٹنہ سے چھپ کر پھلواری شریف سے شائع ہوتا تھا۔ قیمت فی پرچہ ایک آنہ درج ہے۔

چند گلدستے

۱۔ دردِ دل

اس کا سنہ اجرا ۱۳۳۶ھ ہے۔ یہ جبل پور سے شائع ہوتا تھا۔ اور اس کے مدیر کلیم جبلپوری تھے۔ اس گلدستے کے سرورق پر یہ شعر ہے:

بیمارِ دردِ دل کو ہے ارمانِ دردِ دل
اور کیوں نہ ہو کہ درد ہے درمانِ دردِ دل

رسالہ نکالنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے پہلے شمارے (یکم رمضان المبارک ۱۳۳۶ھ) میں لکھا گیا ہے ———— "قومی نظموں کے مختلف مجموعے شائع ہوتے اور آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ہمیں نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اِس قومی خدمت کی آڑ میں حقیقت میں طائرانِ نقود کو اپنی دامِ حرص میں لانا مقصود ہوتا ہے اور صرف چند صفحات کے رسالہ کی قیمت اس کی حیثیت سے کئی گنا زیادہ رکھی جاتی ہے۔ انجام یہ ہوتا ہے کہ ہر حیثیت کا شخص ان سے مستفیض نہیں ہو سکتا...... یہ نفرت انگیز اصول ہمارے اس خیال کا محرک ہوا کہ ایک ایسا سلسلہ قائم کیا جائے جس میں تمام قومی نظموں کو جگہ ملے اور قیمت بالکل واجبی صرف صرفہ کے لحاظ سے رکھی جائے۔"

رسالے کے پہلے شمارے کے صفحات ۴۶ ہیں اور اس میں حسبِ ذیل شعرا کی نظمیں ہیں۔ آغا حشر کاشمیری، علامہ شبلی، چودھری دلورام کوثری، ظفر علی خاں، ڈاکٹر اقبال، نیاز فتح پوری، حسرت موہانی، شفق عماد پوری، عبدالله نیاز، رعب شاہجہ

جواہر ناتھ ساقی دہلوی، حافظ محمد یعقوب اوج گیاوی، غلام بھیک نیرنگ، اکبر الہ آبادی، خلیق دہلوی، شوق قدوائی لکھنوی، عالم علی بجنوری، عبد العزیز شوق ڈاکٹر سعید احمد سعید، مولانا حالی، غلام رسول مہر پھولپوری، مولوی محمد علی بی۔ اے، امام الدین حافظ اور کلیم جبلپوری۔ کئی شعرا کی تین تین یا اس سے زیادہ نظمیں بھی ہیں۔ مثلاً اقبال اور نیاز فتح پوری کی تین تین اور ظفر علی خاں کی چھ نظمیں ہیں۔

۲۔ رسالہ "سیارہ" لکھنو کا گلدستہ "سلک مروارید"۔ یہ نثر پبلشر جناب منشی نواب علی

سال درج نہیں ہے۔ اس گلدستے کے سرورق پر یہ شعر ہے:

سب سے جدا روش مرے باغ سخن کی ہے
بو باس ہر چمن سے نئی اس چمن کی ہے

پیش لفظ میں ایڈیٹر نے لکھا ہے۔ "ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ نظموں کا مجموعہ زبان کی کوئی بہت بڑی خدمت ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس رسالے کے ذریعے سے آپ کو مختلف سخنوروں کا دل آویز کلام مل جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس مجموعے میں گل و بلبل کے افسانے نہیں ہیں یہ پاکیزہ نظموں کا گلدستہ، سادگی، جوش و حقیقت سے بھرا ہوا ہے۔ ملٹن کی نگاہوں سے دیکھیے تو اصلی شاعری اسی کا نام ہے" —— اس گلدستے میں بھی چند ایسے شعرا ہیں جن کی تین چار نظمیں شامل ہیں۔

۳۔ گلدستہ "بہار عید" کلکتہ

یہ گلدستہ جس میں عید کے سلسلے کی نظمیں ہیں۔ ہر سال صرف عید سے قبل ہی شائع ہوتا تھا۔ اس کے مرتب شیخ ارادت علی دیوبندی تھے جو کلکتہ میں رہتے تھے۔ میرے یہاں جولائی ۱۹۱۹ء کا گلدستہ ہے۔ اس گلدستے کے صفحات ۴۸ ہیں۔

ماہنامے

۱۔ نورِ بصیرت۔ کلکتہ

میرے یہاں جو شمارہ محفوظ ہے وہ جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۲ ماہ اگست ۱۸۸۴ء کا ہے۔ سائز ۵ x ۹ اور صفحات ۳۲ ہیں۔ ہر صفحہ پر ۱۹ سطریں ہیں۔ اس شمارے کے اداریے سے جو "مقدمہ نورِ بصیرت" کے عنوان کے تحت ہے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس رسالے میں کیسے کیسے مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ ایڈیٹر پروفیسر سید محمد عبدالغفور شہباز رقم طراز ہیں:

"یہ ماہنامہ اردو رسالہ نورِ بصیرت نام، دو جزو پر، ماہ جولائی ۱۸۸۴ء سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس میں التزاماً چار رنگ کے مضامین درج ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے ایک مضمون متعلق "علم ادب" کے ہوتا ہے جس میں انشاپردازی مغربی اور عبارت آرائی مشرقی کی گنگا جمنی کیفیت نظر آتی ہے۔ پھر ایک مضمون متعلق "علوم و فن" کے ہوتا ہے جس میں علوم جدیدہ اور فنون قدیمہ کی تحقیقاتیں نشر و شکر ہوتی ہیں۔ پھر ایک مضمون متعلق "فن تمدن" کے ہوتا ہے جس میں بعض معرکۃ الآراء اور ضروری پولٹیکل مسائل پر مدبرانہ رائے دی جاتی ہے۔ آخر میں ایک مضمون متعلق "فن تاریخ" کے ہوتا ہے جس میں قوموں کے تنزل اور ترقی کے اسباب، تمدن و شائستگی کے آثار توحش و ناشائستگی کی برائیاں بیان ہوتی ہیں اور مغربی تاریخ نویسی کا مشرقی تاریخ نویسی سے حکیمانہ مقابلہ کیا جاتا ہے اور بعض نادر و نایاب تواریخ کی کتابوں کا ترجمہ یا خلاصہ بھی درج ہوتا ہے۔"

اس رسالے کی اہمیت اس لحاظ سے بہت زیادہ ہے کہ اس دور میں جب کہ اکثر و بیشتر اردو رسائل محض گلدستے ہوتے تھے اور اُن میں شعر و شاعری کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا، صرف مضامین نثر پر مشتمل ایک رسالہ جاری کرنا شہباز کا واقعی جرأت مندانہ ترقی پسندانہ اور قابلِ قدر اقدام رہا ہے۔ میری نظر سے اس سے قبل شائع ہونے والا اردو کا کوئی خالص نثر کا ماہنامہ نہیں گزرا ہے جس کی بنا پر میں اسے اردو کا پہلا ماہنامہ قرار دیتا ہوں۔ ایسے گلدستے یا ماہنامے ضرور نکلے جن میں نظم کے ساتھ چند

ادبی نثری مضامین رہے ہیں لیکن "نور بصیرت" صرف نثر کا پرچہ ہے اور ساتھ ہی علمی ادبی رسالہ بھی۔

۲۔ شباب اردو۔ لاہور

اس مشہور ادبی رسالے کا مکمل فائل بابت ۱۹۴۶ء میرے یہاں ہے۔ مدیر اعلیٰ خان احمد حسین خاں کے علاوہ اس کے ادارۂ تحریر میں قلندر علی خاں، ملک برکت علی وِلّی، خواجہ محمد حیات امین اور حصّۂ نسواں کے لیے محترمہ خورشید سلطانہ صاحبہ کے نام شامل ہیں۔ یہ ماہنامہ خورشید سلطانہ صاحبہ کی ملکیت تھی جسے خان نظر احمد خان کریمی پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کرتے تھے۔ عام طور پر اس رسالے کے صفحات ۸۰ ہوتے تھے۔ اس کے ۱۹۴۶ء کے فائل میں ایک خاص نمبر بھی ہے جس کے صفحات ۱۵۲ ہیں۔ یہ ماہ اگست و ستمبر کا مشترکہ شمارہ ہے۔

۳۔ نیرنگ خیال۔ لاہور

اس ادبی رسالے کی اہمیت پر اظہار خیال کی چنداں ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ اردو کا ادبی ذوق رکھنے والا اس سے بخوبی آگاہ ہے۔ میرے ہاں اس رسالے کی جلد نمبر ۱۲ یعنی ماہ جنوری ۱۹۳۶ء تا جلد ۲۶ دسمبر ۱۹۴۶ء تک کے کئی شمارے موجود ہیں لیکن کسی سال کا فائل مکمل نہیں ہے۔

۴۔ انجمن اسلام۔ لکھنؤ

جلد اوّل ۱۸۷۵ء کے دس شمارے موجود ہیں۔ اس میں انجمن اسلام کے جلسوں کی روداد چھپتی تھی۔ محمد امتیاز علی علوی صدر انجمن اسلام لکھنؤ اس کے مدیر تھے۔

۵۔ جامع الاحکام۔ لکھنؤ

یہ رسالہ باہتمام منشی چندلال مالک مطبع اودھ پریس لکھنؤ ۱۸۷۵ء میں شائع

ہوتا تھا۔ اس کے صفحہ اوّل پر درج ہے۔" ایک مہینے میں دو بار چھاپا جاتا ہے۔ پہلی اور پندرہویں کو جلوہ اشاعت پاتا ہے۔۔۔۔۔۔ قیمت بھی بہت مختصر ہے۔ فائدہ کے مقابلہ میں کمتر ہے۔ بارہ ورق سے حجم زیادہ نہیں، دس ورق سے کمی کا ارادہ نہیں۔"

۶۔ مراسلہ کشمیر۔ لکھنو

یہ مطبع نول کشور سے ۱۸۷۴ء میں شائع ہوتا تھا۔ اس کا اردو نام مراسلہ کشمیر ہے اور انگریزی میں "دی کشمیری پنڈٹ" درج ہے عام طور پر ہر شمارے کے صفحات ۴۰ تا ۵۰ ہوتے۔ میرے پاس ۱۸۷۴ء کے ۲۰ شمارے ہیں۔

۷۔ انوار الاخبار۔ لکھنو

۱۸۷۶ء اس کے آخر میں درج ہے:

" یہ اخبار عشرہ وار چھپتا ہے۔ ایک پرچہ گلدستہ شعراء اور دو پرچے اخبار ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ صحبت مشاعرہ کے بعد دس دن تک غزلوں کے آنے کا اور بھی انتظار ہوگا پھر درج نہ ہوسکیں گے۔"

۸۔ المومن۔ کلکتہ ۱۹۲۳ء

ہندوستان میں مومن برادری اور مومن تحریک کے سلسلے میں کئی رسالے نکلے ہیں۔ اور اب بھی نکلتے ہیں۔ لیکن "المومن" ہندوستان میں مومن تحریک کا پہلا رسالہ ہے جو آغاز ۱۹۲۳ء میں بطور سہ ماہی نکلا اور اس کے بعد ۱۹۲۴ء سے بطور ماہنامہ نکلتا رہا۔ اس کے ایڈیٹر جناب محمد یحییٰ مومن رہے ہیں۔ یہ رسالہ ۲ ہمبر بنیا پوکھر روڈ کلکتہ سے نکلتا رہا ہے۔

۹۔ سہاگ۔ لاہور

جاری شدہ ۱۹۴۱ء۔ خواتین کا مشہور رسالہ تھا۔ میرے ہاں ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۸ء کے کئی شمارے ہیں۔ اس رسالے کے زیادہ تر مضامین نظم و نثر خواتین کی تخلیقات ہی ہیں۔

۱۰۔ عکاس۔ کلکتہ

یہ فلمی رسالہ ۱۹۳۶ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کی اہمیت اس لحاظ سے مسلم ہے کہ یہ مکمل طور پر بہترین آرٹ پیپر پر شائع ہوتا تھا۔ میری نظر سے کوئی اور اردو رسالہ مکمل طور پر آرٹ پیپر پہ چھپنے والا نہیں گزرا ہے۔ ۱۹۴۱ء میں جنگ کے باعث آرٹ پیپر نہ ملنے کی وجہ سے اسے بند کر دیا گیا۔ سالِ اوّل کے صرف دو پرچے موجود ہیں۔ اس کے ایڈیٹر ایم' ایم بیگ عرف مسٹر نیمو تھے جن کا نام چھپتا تھا لیکن اصل میں اس کے مدیر کا پورا کام خالد مسعود صابری انجام دیتے تھے ۴۸ صفحات ہوتے اور قیمت ۶ پیسے۔

۱۱۔ زیب النساء۔ لاہور

سنہ اجراء ۱۹۴۴ء۔ سال اوّل کے چند شمارے موجود ہیں۔ اس کی ایڈیٹر محترمہ صغرا ہمایوں مرزا حیا صاجبہ رہی ہیں۔ عام شماروں کے صفحات ۶۴ ہیں اور یہ رسالہ باتصویر ہے۔

۱۲۔ حوّر۔ کلکتہ

بنگال سے خواتین کے لیے شائع ہونے والے رسائل میں حور پہلا رسالہ ہے۔ یہ بیگم قتیل انصاری کی ادارت میں شائع ہوتا تھا اور ماہ ستمبر ۱۹۲۲ء کو منظرِ عام پر آیا۔ اس کے پہلے شمارے میں "حوّر" کی تعریف میں علامہ جمیل مظہری کی ایک طویل

نظم ہے۔ یہ رسالہ کافی مشہور و مقبول رہا ہے۔ اس کے عام شماروں کے صفحات چالیس اور خاص شماروں کے سو ہوتے تھے۔ صرف دو عام شمارے محفوظ ہیں۔

۱۳۔ الواعظ۔ لکھنؤ کے حسب ذیل خاص نمبر ہیں:

۱۔ بعثت نمبر۔ یکم و ۸ر اکتوبر ۱۹۳۷ء صفحات ۶۰

۲۔ بعثت نمبر۔ جلد نمبر ۱ نمبر ۲۲، ۲۳۔ ستمبر ۱۹۳۸ء صفحات ۷۲

۳۔ محرم نمبر ۔ نومبر و دسمبر ۱۹۴۵ء صفحات ۷۲

۴۔ محرم نمبر۔ ″ ۱۹۴۶ء ″ ۹۸

۱۴۔ عالمگیر۔ لاہور

اس کے کئی عام شمارے اور تین سالنامے میرے یہاں ہیں۔ پہلا شمارہ ایک سالنامہ ہے جس پر سنہ درج نہیں ہے لیکن اُس کے ادارتی نوٹ میں درج ہے۔ "خدائے بزرگ و برتر کا ہزار ہزار شکر ہے کہ عالمگیر نے اپنی عمر کے پانچ سال ختم کر لیے اور یہ زیر نظر شمارہ خاص چھٹے سال کا پہلا نمبر ہے"۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۹۲۸ء کا سالنامہ ہے۔ یہ خاص نمبر عام رسالہ سائز سے بڑے سائز پر ہے اور اس کے صفحات ۱۹۲ ہیں جب کہ سالنامہ ۱۹۴۷ء کے صفحات عام رسالہ سائز کے ۱۲۸ ہیں۔

۱۵۔ جدید اردو۔ کلکتہ

بیسویں صدی میں بنگال سے جتنے ادبی رسالے شائع ہوتے ہیں ان میں سب سے لمبی عمر "جدید اردو" نے پائی ہے اور اس کی ادبی حیثیت بھی مسلم رہی ہے۔ اس رسالے کے ایڈیٹر بنگال کے نامور ترقی پسند شاعر پرویز شاہدی رہے ہیں۔ یہ ۱۹۳۷ء سے نکلنے لگا تھا۔ میرے یہاں اس رسالے کے ۲۲ شمارے مختلف سالوں کے ہیں لیکن کسی سال کا فائل مکمل نہیں ہے۔

شعبۂ اسلامیات
غالب لائبریری میں

غالب لائبریری میں ایک نیا شعبہ قائم کیا جا رہا ہے جس میں قرآن پاک اس کے تراجم، احادیث کے مجموعے فقہی مسائل پر قدیم و جدید کتابیں اور تاریخ اسلام اس شعبے کے بنیادی خزائن ہوں گے۔

پچھلے پانچ برس میں جو آٹھ ہزار کتابیں اور برصغیر کے ساڑھے سات سو رسائل کے بیس ہزار شمارے جمع کیے گئے ہیں ان کا نوّے فی صد حصہ اہلِ خیر کا گرانقدر عطیہ ہے۔ اندازاً آٹھ سو کتابوں کا شمار نادرات میں ہوتا ہے تقریباً پندرہ سو خاص نمبر ہیں جن میں دینی موضوعات پر بہت سے خاص نمبر جیسے خدا نمبر، رسول نمبر، قرآن نمبر، حج نمبر، زیارت نمبر وغیرہ شامل ہیں۔

شعبۂ اسلامیات

کو آپ کی مالی اعانت کے بغیر خوب تر بنانا ممکن نہیں کیونکہ ادارہ مزید مالی بار برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے۔

امداد کی صورت یہ ہے کہ آپ کم سے کم

پانچ روپے

کراس چیک یا منی آرڈر کے ذریعے ارسال فرما کر ممنون فرمائیں۔ کھاتہ نمبر ۲۲۴ حبیب بینک غالب لائبریری برانچ، ناظم آباد، کراچی ۱۸۔ پوسٹ بکس ۲۲۶۸ غالب لائبریری ناظم آباد، کراچی ۱۸۔

اپیل منجانب ادارۂ یادگار غالب (رجسٹرڈ ۲۷۲- ۱۹۶۹/۱۹۷۰ء)

پیپلز اوپن یونی ورسٹی

کیا ہے؟ اور کیسے ہے؟

ڈاکٹر اسد اریب
پیپلز اوپن یونی ورسٹی ۔ اسلام آباد

[یہ جامعہ نہ صرف پاکستان میں اپنی نوعیت کی پہلی اور واحد درس گاہ ہے بلکہ ایسے ادارے بہت سے ایشیائی ممالک میں مفقود ہیں۔ مملکتِ برطانیہ میں بھی اوپن یونیورسٹی کا تجربہ بس چند برس پرانا ہے۔ پیپلز اوپن یونیورسٹی کے طلبہ اور طالبات کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ درس و تدریس کے اس نئے اور انوکھے طریقے کی بابت اپنے تجربات اور تاثرات ارسال فرمائیں۔ ادارہ]

انسان اپنی فطرت سے علم کا پیاسا ہے، یہ صدیوں پرانی پیاس کیسے بجھے اور کون بجھائے؟ ہزارہا برس پرانے انسانی تہذیب و تمدن نے اس تشنگی کو دور کرنے کے لیے لاکھوں سبیلیں نکالیں، عہد قدیم کے روما اور یونان کی اکادمیوں سے لے کر آج کی جدید ترین دانشگاہوں تک، طلبِ علم اور تحصیلِ آگہی کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے مگر کمال شوق کا یہ عالم ہے کہ علم جتنا پھیلتا جاتا ہے، پیاس اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔

جدید دور کی تیز رفتار وقت اور ہمہ تن مصروف زندگی فاصلوں کی دُوری اور کاروبار زندگی کی بے ربطی ــــــ یہ سب ایسے مسائل ہیں جنہوں نے علم کی تحصیل کو اور بھی زیادہ دشوار بنا دیا ہے۔ لیکن حقیقتیں اپنی راہ خود نکالتی ہیں، طلبِ علم میں سہولت کی ایک راہ ایسی نکل آئی ہے کہ نہ اگلے وقتوں میں کبھی تھی اور نہ کبھی اُس کا تصور ہی کیا جاسکتا تھا۔ دراصل اس تصور کی تحریک نئی تعلیمی پالیسی سے ملی، اس پالیسی کے بین السطور ایک نئے تعلیمی اُفق کی جھلک تھی، موجودہ حکومت نے اس اُفق سے ایک نیا سورج اُبھارا۔ یونی ورسٹی ایکٹ مئی ۱۹۷۴ء کی رو سے پیپلز اوپن یونی ورسٹی (P.O.U) ظہور میں آئی۔ اصل میں یہ اُن بالغوں کے دل کی مراد تھی جو تحصیل معاش کے ساتھ ساتھ باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے آرزومند تھے۔ ان میں سے کچھ استاد تھے، کچھ کسان اور کچھ صنعتی کارکن۔ گویا اب یہ سب لوگ اپنا کام کاج چھوڑے بغیر اپنی تعلیمی ضرورتیں پوری کرسکیں گے۔ ان میں سے بیشتر وہ لوگ ہیں جو متمدن شہروں، اور تعلیمی سہولتوں سے مستفید علاقوں سے دور ہیں، یا کچھ ایسی خواتین اور افرادِ خانہ ہیں جو امورِ خانہ داری میں مشغول رہتے ہیں، اور باقاعدہ تعلیم کے لیے وقت نہیں نکال سکتے۔ اوپن یونی ورسٹی ایسے لوگوں کے لیے تعلیمی سہولتیں عام کرے گی، مفید اور نفع بخش تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے قومی وسائل کو بروئے کار لائے گی۔ تب ایک نیا تعلیمی معاشرہ اُبھرے گا۔ ملازم پیشہ افراد، گھریلو خواتین، ہنرمند، کسان اور صنعتی مزدور، پیپلز اوپن یونی ورسٹی سے کماحقہٗ فائدہ اٹھاسکیں گے۔

پاکستان کی یہ جدید ترین یونی ورسٹی ملک کی تمام دانش گاہوں سے (بہ اعتبارِ مزاج) بالکل مختلف ہے۔ یہ طریقِ تعلیم کی عام رسموں اور رائج الوقت تدریسی رواجوں کو توڑتی ہے۔ اس کا عملی خاکہ تمام صوبائی اور قومی یونی ورسٹیوں سے علیحدہ ہے۔ یہ خاکہ سب سے الگ بھی ہے اور سب سے انوکھا بھی۔ یہ یونی ورسٹی جیسا کہ اس کے نام (اوپن) سے ظاہر ہے، سب کے لیے کھلی ہوئی ہے۔ یہ کسی عمارت میں محدود نہیں۔ اور نہ کسی ایسے فاصلے پر واقع ہے جو حدِ نظر یا پیمانہ احساس میں لایا جاسکے۔ پاکستان کا ہر گھر اس یونیورسٹی کا لکچر روم ہے، جہاں بھی آپ ٹیلی ویژن رکھ لیں، وہیں کلاس روم بن جاتے اور جہاں

ریڈیو لگالیں وہیں کلاس لگ جاتے۔ ہماری درسی تاریخ کا یہ ایک بالکل اچھوتا تجربہ ہے۔ تعلیم کی یہ ایک نئی طرز ہے اور اس طرز تعلیم کے کئی امتیاز ہیں۔ علم اور زندگی کا رشتہ ابدی ہے۔ زندہ انسانوں سے طلب علم کی خواہش چھینی نہیں جاسکتی۔ بے علم قومیں نہ طاقت ور ہوسکتی ہیں اور نہ خوشحال۔ عہد جدید کی اقتصادی خوشی اور سیاسی طاقت کا بیشتر مدار علوم و فنون پر مکمل تصرف حاصل کرنے سے ہے۔ علم کی تحصیل ایک ایسا اجتماعی تقاضہ ہے جس پر کسی بھی دوسری ضرورت کو فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ علم زندگی کے ساتھ ساتھ ہے۔ جب تک ہم زندہ ہیں، علم کی پیاس باقی ہے۔ انسان کی فطرت کے اس عظیم الشان پہلو کی طرف حکیم کونین جناب رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی یوں اشارہ فرمایا تھا:

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَى اللَّحْدِ ۝

"ماں کی گود سے قبر کی گود تک علم حاصل کرتے رہو"

علم اور زندگی کے اس دائمی رشتے کو پیپلز اوپن یونیورسٹی نے اپنا نصب العین بنایا ہے۔ اس لیے حدیث پیغمبر کے یہ لفظ یونیورسٹی کا نشان امتیاز بن گئے ہیں اگر کبھی یونیورسٹی کے انتظامی دفاتر میں آپ کا آنا ہوا تو آپ دیکھیں گے کہ کھڑکیوں اور دروازوں پر پڑے ہوئے آرائشی پردے بھی اُطْلُبُوا الْعِلْمَ کے نقش و نگارش سے اس آفاقی تصور کی گواہی دے رہے ہیں۔

دنیا کی تمام یونیورسٹیوں نے تعلیم کو عام کرنے کی مفید کوششیں کی ہیں۔ مگر ہمارے ملک میں اب تک کوئی ایسا اچھا انتظام نہ تھا۔ حد تو یہ ہے کہ تعلیم بالغان کا بھی کوئی پروگرام ہماری کسی یونیورسٹی کے پیش نظر نہ تھا۔ تعلیم کے تقاضے جتنے بڑھ رہے تھے تعلیم اتنی ہی مشکل ہوتی جارہی تھی۔ علم کا حاصل کرنا آسان نہیں رہا۔ خاص طور پر تعلیم کی جز وقتی سہولتوں کا فقدان ہو گیا تھا۔ پیشہ ور، ہنرمند اور صنعتی شعبوں میں کام کرنے والے لوگ جب تک اپنے اپنے کام بالکل ترک نہ کر بیٹھیں باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کرسکتے۔ بعض صورتوں میں اگر یہ تعلیمی سہولتیں حاصل ہوئیں بھی تو کم از کم فنی تعلیم اور سائنسی مضامین کی سند تو از بس

کر شکل تھی لیکن پیپلز اوپن یونی ورسٹی نے اطلاقی سائنس، ریاضی، باغبانی اور مرغبانی جیسے مفید اور اہم کورسوں کا بطورِ خاص اہتمام کیا۔ اور یہ امر قومی تقاضوں کی روشنی میں بے حد ضروری بھی تھا۔ فی زمانہ مفید، با مقصد اور عملی تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ مگر یہ تعلیم صرف مکتبی FORMAL ہو کے رہ گئی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی تھی کہ تعلیم کو غیر مکتبی INFORMAL بنا کر عامۃ الناس تک گھر گھر پہنچا دیا جائے۔ اوپن یونیورسٹی نے مکتبی تعلیم کے اس پرانے جال کو یکسر توڑ دیا اور حصولِ تعلیم کا نیا تانا بانا دیا۔ ۱۹۷۶ء کا سال شروع ہو چکا ہے۔ یونیورسٹی کے کورسوں کا باقاعدہ اجرا ہونے والا ہے۔ اب ہر شخص کو ہر طرح کی تعلیم کا دروازہ کھلا ہوا ملے گا۔ اوپن یونی ورسٹی کے قیام کا بنیادی مقصد تعلیم کو عام کرنا ہے۔ خاص طور پر عوام کا وہ طبقہ جسے علم حاصل کرنا چاہیئے اور کاروباری مصروفیتوں اور مکتبی تعلیم کی عدم سہولتوں کی بنا پر تعلیم حاصل نہیں کر سکتا۔ اب اوپن یونیورسٹی کے جدید ترین تعلیمی ذریعوں سے تعلیم حاصل کر سکے گا۔ بالغوں کی تعلیم کا یہ وسیع تر منصوبہ، قومی معیشت پر یقیناً مثبت اثرات ڈالے گا، سائنسی اور فنی تعلیمات کے نتیجے میں پیداوار، محنت، اور بہتر منصوبہ بندی میں اضافہ ہوگا اس یونی ورسٹی کے ملک گیر نظامِ تعلیم کی بدولت ملک میں خواندگی کا تناسب بھی بلند ہوگا، اور واقعاً ایسا ہی ہونا چاہیئے کیوں کہ اوپن یونی ورسٹی کے اس منصوبے پر قومی دولت کا ایک معتد بہ حصہ صرف ہو رہا ہے۔۔

اوپن یونیورسٹی کے بارے میں یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ یونی ورسٹی، ملک کے مروّج نظامِ تعلیم کے برخلاف کوئی نیا نظامِ تعلیم لے کے آئی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس یونی ورسٹی سے مروّج تعلیمی نظام کو آگے بڑھانے کے لیے ایک طاقت ور محرک کا کام لیا جائے گا۔

پیپلز اوپن یونی ورسٹی کے نمایاں خدوخال

یونی ورسٹی کی مرکزی عمارت زیرو پوائنٹ ZERO POINT سے اوپر طرف کوئی آدھ میل کے فاصلے پر اسلام آباد کے H/8 سیکٹر میں واقع ہے۔

پیپلز اوپن یونیورسٹی کا دائرہ کار پورے ملک تک پھیلا ہوا ہے۔

یونیورسٹی کی تدریس کا انحصار مکتوبی مواد CORRESPONDENCE پر ہوگا۔ یونی ورسٹی اپنے مکتوبی مواد کو موثر بنانے کے لیے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو بطور معاون استعمال کرے گی۔

طالب علم ایسے بالغ ہوں گے جو عام طور پر معیشت کے مختلف شعبوں میں مصروف عمل ہوتے ہیں۔ یونی ورسٹی پورے ملک کے لیے ہوگی۔ اس لیے امکان ہے اس کے طالب علموں کی تعداد ہماری قومی اور صوبائی یونیورسٹیوں کے طالب علموں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہو، اور لاکھوں تک پہنچ جائے۔

مقررہ نصاب کی نگرانی نصابی دیکھ بھال کی جماعتیں (Course teams) کریں گی یونی ورسٹی نے نصابی نگرانی اور نصابی تدوین کرنے والی جماعتوں کا تقرر کر دیا ہے، یہ اہلِ علم نہایت تندہی، ذمہ داری اور تیزی سے نصاب مرتب کر رہے ہیں۔

وہ اسباق جو ٹیلی ویژن یا ریڈیو سے نشر ہوں گے، وہ ہفتہ وار، یا پندرہ روزہ ہوں گے۔ اس عرصے کو بوقت ضرورت کم و بیش بھی کیا جا سکے گا۔ یونی ورسٹی کی تین سندیں ہوں گی۔ سرٹیفکیٹ۔ ڈپلوما اور ڈگری۔

ملک کے مختلف موزوں مقامات پر یونیورسٹی اپنے تعلیمی مرکز study centre بھی قائم کرے گی جہاں ٹیلی ویژن اور ریڈیو سیٹ بھی موجود ہوں گے۔ یہ مرکز ایسے اساتذہ کی زیر نگرانی کام کریں گے جو پیپلز اوپن یونی ورسٹی سے ریفریشر کورس بھی مکمل کر چکے ہوں گے مگر ان مراکز میں سب طلبہ کی حاضری ضروری نہیں البتہ یہ امر ضروری ہوگا کہ مرکز کے نگراں اساتذہ تمام طلبہ کی تعلیمی حالت سے باخبر رہیں۔ اس طرح کے تعلیمی اور امتحانی مرکز مقامی تعلیمی اداروں کے تعاون کے بغیر چونکہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لیے یونیورسٹی مقامی تعلیمی اداروں کو اپنا معاون بنائے گی۔ یونیورسٹی کے آخری امتحانات بھی انھیں مراکز میں ہوں گے۔

اس یونیورسٹی میں داخلے کی شرائط نہایت نرم ہوں گی۔ رجسٹریشن کے لیے صرف اس بنیادی اہلیت کا ہونا لازم ہوگا جو متعلقہ اختیاری نصاب کے لیے ضروری ہے۔

رجسٹریشن کی شرائط

یونی ورسٹی کے کسی کورس میں داخلے کی شرط یہ ہے کہ امیدوار کی عمر کم از کم اٹھارہ سال ہو۔ ابتدائی کورس کے لیے رجسٹریشن بہتر ہوگی۔ البتہ بنیادی درمیانہ اور ڈگری کورس کے لیے حسبِ قواعد رجسٹریشن ضروری ہے۔ ہر کورس کے آغاز سے تقریباً ایک ماہ پیشتر رجسٹریشن کا اعلان ریڈیو ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعے عام کیا جائے گا۔

رجسٹریشن فارم کا حصول

رجسٹریشن فارم یونی ورسٹی سے براہ راست حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مزید برآں یونی ورسٹی کے رسالے (یو۔ ایم P O) کے ساتھ بھی یہ فارم منسلک ہوگا۔

یو (P O ایم) بک شاپ اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد سے نقد یا منی آرڈر کے ذریعے ادائیگی کرکے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس رسالے کا زر سالانہ دس روپے ہے اور ایک پرچے کی قیمت ایک روپیہ ہے۔

کورس کی تفصیلات اور مختلف امیدوار کی

مدارج کے کورس :	بنیادی اہلیت :
۱۔ ابتدائی کورس	۱۔ صرف خواندہ ہونا کافی ہے۔
۲۔ بنیادی کورس	۲۔ ثانوی درجے تک تعلیم ہو۔
۳۔ درمیانہ کورس	۳۔ پیپلز اوپن یونی ورسٹی کا بنیادی کورس پاس ہو۔
۴۔ ڈگری کورس	۴۔ پیپلز اوپن یونی ورسٹی کا درمیانہ کورس پاس ہو۔

تکمیل کی مدت :

یونی ورسٹی کی جانب سے ڈپلوما یا ڈگری کورس مکمل کرنے کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں۔ اس طرح طالب علموں کو کورسوں کے انتخاب وغیرہ میں بھی پوری آزادی حاصل ہوگی (GENERAL EDUCATION) عام تعلیم کے لیے جو بنیادی، انٹرمیڈیٹ اور ڈگری کے کورس ہوں گے اُن کی مدت تکمیل فی کورس، ۲۴ ہفتے ہوگی۔

بہت سے کورس

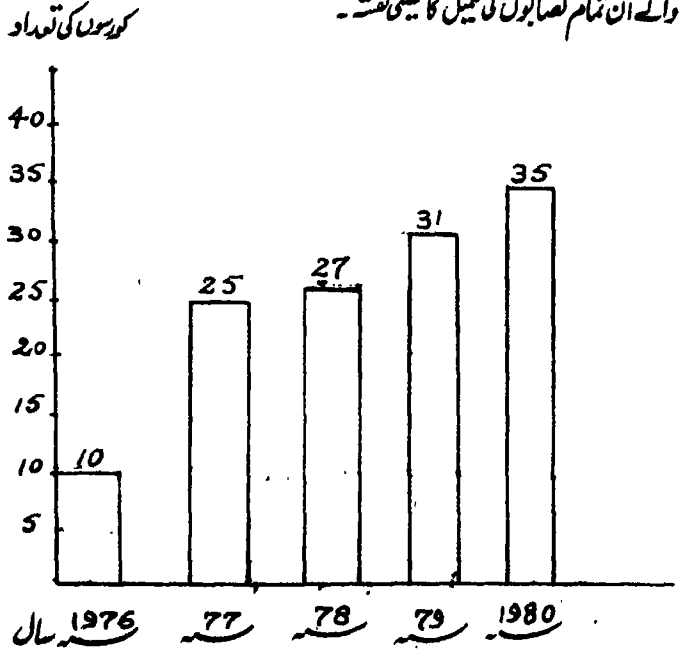
کسی ایک کورس کی کامیاب تکمیل پر امیدوار کو یونیورسٹی کا کورس سرٹیفکیٹ دیا جائے گا درمیانہ درجے کے ایسے چھ سرٹیفکیٹ حاصل کرنے پر درمیانہ کورس کا ڈپلوما دیا جائے گا۔ اس طرح ڈگری کے چھ کورس سرٹیفکیٹ کے بعد پیپلز اوپن یونیورسٹی کی بی اے کی ڈگری دی جائے گی۔

پیپلز اوپن یونی ورسٹی نے ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۰ء تک کے تعلیمی منصوبے میں جن کورسوں کی تکمیل کا منصوبہ بنایا ہے، ان میں سے چند یہ ہیں :

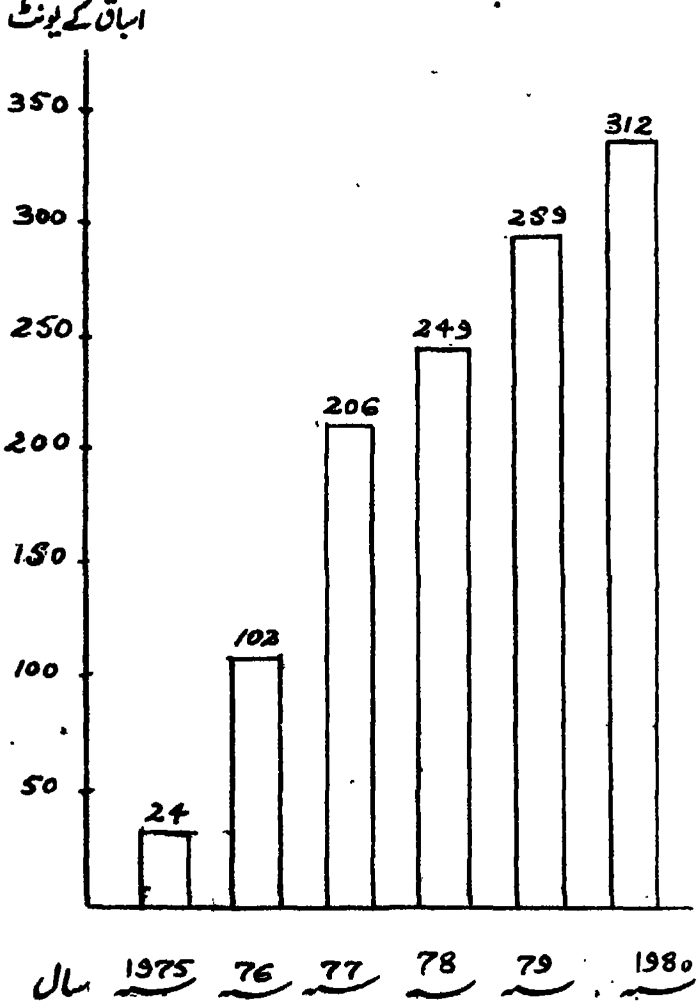
نوعیت علم	نام مضمون	درجہ
نیچرل سائنس :	۱۔ مربوط سائنس	بنیادی
	۲۔ جدید ریاضیات	بنیادی
سوشل سائنس :	۱۔ سوشل اسٹڈی	بنیادی
	۲۔ پاکستان اسٹڈی	انٹرمیڈیٹ
زراعت :	۱۔ زرخیز مٹی اور کھاد	بنیادی
	۲۔ سیم و تھور	انٹرمیڈیٹ
	۳۔ غذا	بنیادی
	۴۔ مرغبانی	انٹرمیڈیٹ

فنی تعلیم	۱۔ ٹیوب ویل میکنک	بنیادی
	۲۔ آٹوموبائل ٹکنالوجی	انٹرمیڈیٹ
ہوم اکنامکس	۱۔ غذا کا تحفظ	بنیادی
	۲۔ غذائیت	انٹرمیڈیٹ
	۳۔ بچوں کی نگہداشت	بنیادی
	۴۔ تیمارداری	انٹرمیڈیٹ
تعلیم	۱۔ تعلیمی نفسیات	بنیادی
	۲۔ منصوبہ بندی اور حسنِ انتظام	انٹرمیڈیٹ

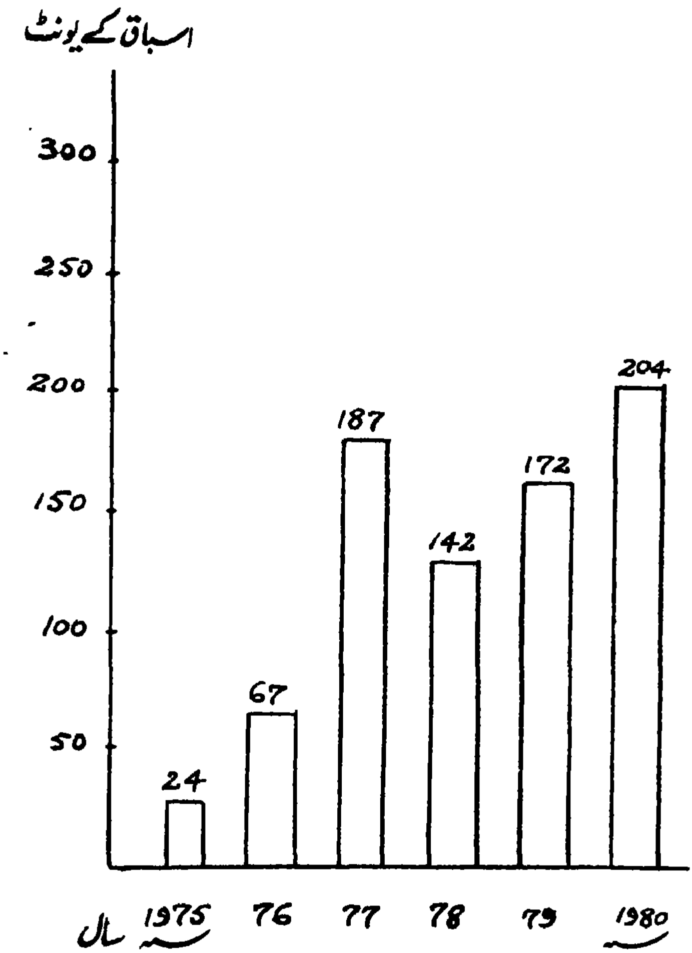
اوپن یونی ورسٹی جن نصابوں کو پڑھائے گی، ۱۹۸۰ء تک پیش کیے جانے والے اُن تمام نصابوں کی تکمیل کا تخمینی نقشہ۔



ریڈیو کے ذریعے پیش کیے جانے والے
اسباق کا نقشہ۔



ٹیلی ویژن کے ذریعے پیش کیے جانے والے
اسباق کا تخمینی نقشہ :



مختلف قسم کے بہت سے کورس تیار بھی کیے جا چکے ہیں، جو کورس وسط ۱۹۷۶ء سے شروع کیے جا سکیں گے۔ اُن کی تفصیل یہ ہے:

کورس کا نام	درجے کا نام
اردو	بنیادی
اسلامی دینیات	بنیادی
انگریزی	بنیادی
پیمائش و جائزہ	درمیانہ
ریاضی	بنیادی
سائنس	بنیادی
عربی	ابتدائی کورس ۱۹۷۵ء سے شروع کیے جا چکے ہیں۔
غذائیات	درمیانہ
مرغبانی	بنیادی
معاشرتی علوم	بنیادی
نفسیات	درمیانہ

ذریعۂ تعلیم، زبان

مندرجہ بالا کورسوں کا ذریعۂ تعلیم اردو ہوگا۔

فیس

ہر کورس کی فیس دس روپے ماہوار ہوگی۔ یہ فیس رجسٹریشن کے وقت پیشگی وصول کی جائے گی۔ تمام طلبہ کو کتابی (تحریری) مواد از خود خریدنا ہوگا۔

زرعی، فنی و سائنسی کورس لینے والے طالب علموں کے لیے گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک سے دو ہفتے تک، عملی کام کا انتظام کیا جائے گا۔ لیبارٹری کا سامان استعمال کرنے

والے اِن طلبہ کو ضروری اخراجات بھی خود برداشت کرنے ہوں گے۔

یونٹ (اسباق کے کل حصے)

ایک وقت میں ایک طالب علم ایک یا دو کورس لے سکے گا۔

ہر کورس ۱۴ تحریری (مکتوبی CORRESPONDENCE) یونٹوں پر مشتمل ہوگا۔ تمام یونٹ (اسباق) پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن اور ٹیلی ویژن کے اشتراک سے پیش کیے جائیں گے۔ اگر ضروری سمجھا گیا تو بعض یونٹ دوبارہ بھی نشر کیے جائیں گے۔

یونی ورسٹی سے ملحق دو متحرک اور فعال ادارے روز و شب' قومی تقاضوں کی تکمیل میں سرگرم عمل ہیں۔ ان میں سے ایک ادارہ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اور دوسرا ادارہ' انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لنگوجز ہے۔

۱۔ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن

یونیورسٹی کے مجوزہ نصابوں کی تکمیل کا ذمہ دار ہے یونیورسٹی کے اس نصابی مرکز میں ریاضیات تعلیمی نفسیات' تعلیمات' عمرانیات' تاریخ' شماریات' منصوبہ بندی' مرغبانی' زراعت' صنعتی تعلیم اور سائنسی علوم کے متخصصین کی ایک بڑی جماعت کام کر رہی ہے۔ جدید علوم کے یہ ماہرین' اوپن یونی ورسٹی کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کے ذمہ دار ہیں۔ اب تک یونی ورسٹی کے زیر اہتمام جو ریفریشر کورس ہوئے ہیں اُن کی کامیابی بھی انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کی مرہون منت ہے ریفریشر کورسوں کے علاوہ' یونی ورسٹی نے دو بڑی Educational workShop قائم کی ہیں:

پہلی ایجوکیشنل ورکشاپ : ۱۰ر جولائی ۱۹۷۴ء تا ۳۰ر جولائی ۱۹۷۴ء

دوسری ایجوکیشنل ورکشاپ : ۱۲ر ستمبر ۱۹۷۵ء تا ۳۰ر اکتوبر ۱۹۷۵ء

ایجوکیشنل ورکشاپ Educational workShop' تعلیمی ٹکنالوجی کی ایک جدید اصطلاح ہے اس اصطلاح کا ایک سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ علم اور اس کے مقاصد

کے فروغ میں جدید ٹکنالوجی کو بھی استعمال میں لایا جائے۔ چنانچہ اوپن یونی ورسٹی کی پہلی ورکشاپ اسی یقین کا اعادہ تھی۔ یونیسف (UNICEF) نے اس کا انتظام کیا اور حکومت جاپان نے سرمایہ فراہم کیا۔

اوپن یونی ورسٹی نے پہلی بار یہ ایجوکیشنل ورکشاپ قائم کرکے پاکستان کی تعلیمی فضا میں ایک نیا تجربہ کیا۔ یہ تجربہ خوشگوار بھی تھا، اور نہایت مفید بھی۔ لہٰذا ایک اور تعلیمی ورکشاپ کا انتظام کیا گیا۔ اوپن یونیورسٹی کی دوسری تعلیمی ورکشاپ ریڈیو پاکستان، ٹیلی ویژن اور بی بی سی (BBC) کے باہمی تعاون سے بے حد کامیاب رہی، بی بی سی کی تعلیمی نشریات کے ماہرین ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے سینئر پروڈیوسر اور اوپن یونی ورسٹی کے اساتذہ کو، باہمی افہام و تفہیم کا سنہری موقع ملا۔ ریڈیو اور ٹی وی کے ماہرین نے تعلیمی نشریات Educasting کے سلسلے میں اپنا نقطۂ نظر اور طریق کار بیان کیا، اور ان فنی مسائل کا ذکر کیا جو تعلیمی نشریات کے سلسلے میں پیش آسکتے ہیں۔ اس طرح کی ورکشاپ دراصل درس و تدریس کا ایسا مقررہ وقفہ ہے، جس میں شریک کارکنوں کو نظری اور عملی تعلیم کے دونوں پہلوؤں پر مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں، چنانچہ ان ورکشاپوں میں، کلاس روم کے ساتھ ساتھ ریڈیو، اسٹوڈیو کے ذریعے بعض پروگرام مکمل طور پر نشریاتی مراحل سے بھی گزارے گئے۔ چونکہ اوپن یونیورسٹی کی تعلیم کا ایک بڑا ذریعہ ریڈیو بھی ہے، اس لیے یونیورسٹی کے اساتذہ کو ریڈیو کے نشریاتی تقاضوں کا سمجھنا بھی ازبس ضروری تھا، چنانچہ ان دونوں تعلیمی ورکشاپوں کے ذریعے اوپن یونی ورسٹی کے اسی اہم مقصد کی تکمیل کی گئی۔

۲۔ انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لنگویجز:

اوپن یونی ورسٹی کے زیر انتظام ایک عظیم الشان ادارے کا نام ہے۔ اوپن یونی ورسٹی کے اس ادارے میں، دنیا کی تمام زندہ اور فعال زبانوں کی تعلیم دی جارہی ہے، پاکستانی عساکر کی ایک بڑی تعلیمی ضرورت بھی اس ادارے نے پوری کی۔ اب ملک سے باہر جاکر ان زبانوں کی تعلیم حاصل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں رہی۔ ملک ملک کے لوگ خود یہاں آکر

اپنے اپنے ملک کی زبانیں پڑھاتے ہیں' اس انسٹی ٹیوٹ میں فرانسیسی' مصری' ترک' چینی' جرمن عراقی' سودی' ایرانی اور روسی اساتذہ بھی کام کر رہے ہیں اپنے اپنے ملک کی زبانوں کو پڑھا رہے ہیں' پڑھنے والے لوگوں میں بھی بہت سے غیر ملکی ہیں' اردو پڑھنے والے لڑکے' لڑکیوں میں شمالی کوریا' چین' سعودی عرب اور نائجیریا کے طالب علم ہیں۔

پیپلز اوپن یونی ورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لنگوجز میں زبانوں کے جو شعبے کام کر رہے ہیں اُن کی تفصیل یہ ہے :

اردو۔ فارسی۔ عربی۔ ہندی۔ روسی۔ ترکی۔ فرانسیسی۔ جرمن۔ انگریزی۔ چینی۔

جو کوئی دانشمند شخص اسلام آباد آئے' اسے پیپلز اوپن یونی ورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لنگوجز کو ضرور دیکھنا چاہیئے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ' اسلام آباد کے H/9 سیکٹر میں' ایک چھوٹا سا کرۂ ارض ہے' یہاں پہنچ کر ایسا لگتا ہے جیسے پورا عالم اس ایک عمارت میں سمٹ آیا ہو۔ رنگ رنگ کے لوگ طرح طرح کی زبانیں بولتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس پُرشکوہ انسٹی ٹیوٹ کی احمر و ابیض عمارتیں مختلف اقوام کے اشتراک عمل کا مظہر تو ہیں ہی' خاص طور پر یونی ورسٹی کی سفری بسوں کا منظر بھی دیدنی اور شنیدنی ہوتا ہے۔ ان بسوں میں ملک ملک کے استاد اور طالب علم ایک جگہ یوں سمٹ آتے ہیں جیسے گواہی دے رہے ہوں کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔ ان طالب علموں میں کچھ باہم عربی بولتے ہیں' کچھ چینی ترکی اور کوریائی' کچھ فارسی بولتے ہیں' کچھ فرانسیسی' روسی اور جرمن۔ یہ سب کے سب (ماسوا چند ایک کے) باہم انگریزی بھی بولتے ہیں' مگر ان کے درمیان عوامی رابطے کی زبان اردو ہی ہوتی ہے۔

واقعیت اور مثالیت کیا ہے؟

وقار احمد رضوی
سی ۹۲ اسٹاف ٹاؤن جامعہ کراچی

واقعیت اور مثالیت ادب کے دو اہم رکن ہیں۔ واقعیت کو انگریزی میں (REALISM) اور مثالیت کو (IDEALISM) کہتے ہیں۔ واقعیت ایک دقیق لفظ ہے۔ اس کے کثیر معنی ہیں اور یہ REALISM حقائق ثابتہ سے اتصال قوی رکھتا ہے۔ حقیقت ثابتہ یا حقیقت مسلمہ ہی کا نام واقعیت ہے۔ واقعی ادیب و فن کار وہ ہے جو فطری اوصاف بشری پیش کرے جیسا کہ وہ عام زندگی میں دیکھتا ہے۔ اس کے برعکس مثالیت ان اوصاف کو پیش کرتی ہے جو شاذونادر ہیں۔

تمام ادیب اس بات پر متفق ہیں کہ وہ انتخاب واقعات چاہے کیسے ہی کریں لیکن وہ حقائق کو اس طرح بیان کریں کہ ان سے عقل و شعور کو غذا ملے۔ ادب میں انشائے نصوص کامل واقعی ذاتیت یا حقیقت اور مثالیت کا مجموعہ ہوتی ہے۔ یہ چیز ادب کو اس بات سے محفوظ کر دیتی ہے کہ ادب تقلید محض یا زندگی کی نقالی بن کر رہ جائے۔

کوئی شئے فی نفسہٖ بُری نہیں ہوتی۔ ہر شئے میں ایک حُسن ہے یہاں تک کہ بدصورتی میں بھی ایک حُسن ذاتی ہے۔ کسی شے کا قبح عمل سے ہے ذات سے نہیں۔ چیز بُری اس لئے ہے کہ ہم اسے بُرا بناتے ہیں۔ سیّئات و عمل اضافی ہیں۔ اس لئے کسی شئے کا قبح بھی ایک اضافی عمل ہے ذاتی نہیں۔

تنقید میں لفظ واقعیت دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک واقعیت وہ ہے جو مثالیت کے مقابلے میں آتی ہے۔ واقعیت سے مراد اشیاء کی ایسی تصویر کشی کرنے سے ہے جیسا کہ وہ واقع میں نہیں۔ مثالیت تفسیر معانی اور اقتراح حقائق کو کہتے ہیں۔ مثالیت کشف اسرارِ حقائق سے بحث کرتی ہے اور واقعیت بیانِ حقائق کا نام ہے۔

واقعیت کا دوسرا مفہوم وہ ہے جو معنیٔ خیال یا خیالیت کے مقابلے میں آتا ہے۔ اس واقعیت سے مقصود یہ ہے کہ ادیب موجودہ زندگی کے عام حقائق اور ان مشکلوں کی ترجمانی کرے

جو زندگی سے بھر پور ہوں۔ ماضی کی طرف خیال دوڑانا اور عجیب و غریب چیزوں کو ظاہر کرنا یہ خیالیت ہے۔ واقعیت حال سے بحث کرتی ہے اور خیال کا تعلق ماضی سے ہے۔

واقعیت اور مثالیت میں اس فرق سے قطع نظر جو وضع اول (معنی اوّل) میں بیان ہوئے خود واقعیت کے ان دونوں معنی میں منافات حقیقی یا بالکل تضاد نہیں ہے۔ یہ دونوں ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں۔ موجودہ حقائق بھی آسکتے ہیں اور ان کی صحیح تصویر کشی بھی کی جا سکتی ہے۔ بیان حقائق (واقعیت معنی اول) اور حال سے بحث (واقعیت معنی ثانی) ان دونوں کا اجتماع ایک جگہ ممکن ہے۔

ایک افسانہ نویس اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ وہ طبیعتِ انسانیت اور اس کے مختلف عواطف کا مطالعہ کرے۔ پھر روزمرّہ کی زندگی کے حوادث کو پیش کرے اس طور پر کہ وہ عناصرِ انسانیت غیرت و حمیّت، شجاعت و خلوص کی تصویر و تمثیل ہو۔ روزمرّہ کی زندگی سے بحث کرنا یہ واقعیت کے معنی ثانی ہیں۔ اس میں حال کا ذکر ہے اور غیرت و حمیت، شجاعت و خلوص یہ بیانِ حقائق ہے۔ جو واقعیت کے معنی اوّل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ واقعیت کے دونوں معنی ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں۔ لیکن افسانہ نویس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان حقائق سے کچھ کا انتخاب اس طرح کرے کہ اس کا کوئی معقول نتیجہ بھی برآمد ہو سکے۔

اسی طرح ادیب و شاعر اس بات کی قدرت رکھتے ہیں کہ وہ مناظرِ فطرت، آثارِ حیات اور حوادثِ زندگی کا مطالعہ کریں۔ پھر ان کو اس طرح بیان کریں کہ وہ ان حوادث کے لئے خواصِ حِسّی کی تصویر ہو۔ یہ خیالیت ہے۔ اقتراحِ حقائق کو موثر انداز میں ادا کرنا اس طور پر کہ وہ کشفِ اسرار حقائق بن جائے یہ ممکن ہے اور ادیب اس پر قادر ہے۔

جس طرح ادب میں واقعیت کے گذشتہ دونوں معنی ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں اسی طرح خیالیت (خواص حِسّی کی تصویر) اور مثالیت (کشفِ اسرار حقائق) دونوں ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں۔ نیز واقعیت، خیالیت اور مثالیت یہ تینوں بھی ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں۔

ادب خالد کے لئے عنصر مثالی یا مثالیت بھی ضروری ہے۔ ادب قیّم واقعات و حقائق سے گزر کر ذہن کو کسی اونچی سطح کی طرف لے جاتا ہے ذہنی ارتقاء کی نشو و نما، افکار کی گہرائی اور اندرونی احساس سے ہوتی ہے۔ یہ افکار و عواطف، نظم، مقالات افسانہ و ناول میں ملتے ہیں۔

جو کسی ادیب کی الہامی طاقت، کاوش عقل، شعور صادق اور تجربات کی صحت سے لکھے جاتے ہیں۔
اس نگارش میں کسی تصنع اور بناوٹ سے کام نہیں لیا جاتا۔ ادیب ان اصناف ادب کے ذریعے
بیان حقائق اور اشیا و معانی کی تفسیر پیش کرتا ہے۔

مثالیت یا اقتراحِ حقائق میں کبھی ادیب سے غلطیاں بھی سرزد ہوتی ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ
مثالیت کے کچھ نقائص بھی ہیں اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب مثالیت، خیال میں ڈوب جائے اور عقل سے دُور ہو کر
غیرِ معقول بن جائے۔

۲۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ مثالیت ادیب کو مجبور کرتی ہے کہ وہ دوسرے مثلین کی نقل
محض کرے۔ اس میں تجدد نہ ہو اور نہ وہ اپنی عقل کو دخل در انداز کرے۔ تقلیدی مثالیت ادیب
اور فطرت کے درمیان حائل ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں ادیب اپنی نظر سے نہیں دیکھتا۔ حالانکہ
فطرت حقیقی معانی کا مصدر اوّل ہے۔ فطرت سے ہی حقائق خالدہ پیدا ہوتے ہیں۔

۳۔ مثالیت کی تیسری لغزش یا نقص یہ ہے کہ وہ ادیب اور فن کار کو اس کے عہد اور ماحول
سے دور لے جائے اور گذشتہ آثار عظیم کو، ماضی یا تقلیدِ اسلاف میں باندھ دے۔ جب کہ
ادب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس مادۂ حیات کی تصویر کشی کرے جن کو ادیب نے خود دیکھا ہے
نہ اس زندگی کو جس کی اس کے غیر نے دیکھا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ادب کو واقعی اور عملی زندگی
سے قریب ہونا چاہیئے۔

مثالیت کی طرح واقعیت میں بھی کچھ معائب یا کمزور پہلو ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ ادیب اہم عناصر کا انتخاب نہ کرے بلکہ گھٹیا اخلاق اور سطحی معانی کو لے
اور فن کار ان سطحی حقائق کی تصویر کشی میں بے کار اپنا وقت ضائع کرے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ ادیب، حقائق کی باریکیوں کو تلاش کرنے اور ان کے استیعاب
میں پڑ جائے۔ فلسفیانہ موشگافیاں اور عالمانہ طرزِ گفتگو اختیار کرلے۔ اس کا نتیجہ یہ
ہوگا کہ اگر ادیب حقائق کی تفسیر عالمانہ انداز میں کرے گا تو اس کے فن میں حرارت عاطفہ،
جمال خیال اور معنویت کی بلندی نہیں آئے گی۔ اور جب فن میں جذبہ کا خون گرم اور خیال

کی رعنائی نہیں ہوگی تو فن کار کا فن زائل ہو جائے گا۔ اور اس کی فنی تفسیر کشی اچھی نہیں ہوگی۔

۳۔ واقعیت کا تیسرا کمزور پہلو یہ ہے کہ وہ رذائل کی تصویر کشی کرنے لگے۔ رذائل کو موضوع بحث بنانا، واقعیت کی غلطی ہے۔

یہ سب ادیب کی لغزش گاہیں ہیں جن سے مفر نہیں۔ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ادیب کو بڑی محنت، ریاضت اور تندہی سے کام لینا چاہیئے۔

دوسری واقعیت (واقعیت کے معنی ثانی) جو خیالیت کے مقابلے میں آتی ہے اور حال سے بحث کرتی ہے وہ اسی قسم کی غلطیوں کی آماجگاہ ہے۔

اور وہ یہ کہ واقعیت، ادبیت دلکشیت سے خالی ہو۔ اس میں واقعات کو جوں کا توں بیان کر دیا گیا ہو۔ ایسی واقعیت روعت حیات نہ ہونے کی وجہ سے ایک قسم کی مظلوم داستان گوئی ہوگی۔ اس کا ادب سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ جیسے پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی مثنوی "بہارت درپن"۔

جب ادیب، موجودہ حوادث زندگی کے اسرار و جمال کی تصویر کشی سے قاصر ہوتا ہے تو وہ بغلیں جھانکنے لگتا ہے اور غریب و نادر قصوں کو بیان کرتا ہے۔ بناوٹی جذبات کو لیتا ہے اور شکوہ الفاظ کا سہارا ڈھونڈھتا ہے۔

مرادفات کا کثرت سے استعمال، قدرت علی الکمال کا مظاہرہ کرنا، مسجع مقفیٰ عبارتیں لکھنا۔ یہ سب ایسے ہی ادیب کی خصوصیات ہیں جیسے فسانہ آزاد اور طلسم ہوشربا۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ ادیب کے لئے لازم ہے کہ وہ حقائق کی سچی تصویر کشی کرے۔ جس میں اس کے خون جگر یا خلوص کی آمیزش ہو۔ ادیب جس قدر زندگی کے حقائق کا احاطہ کرے گا اسی قدر اس کے فن کی قیمت بڑھے گی۔ لیکن یہ بیان حقائق، نقل دقیق یا تقلید محض نہ ہو بلکہ واقعات کی ایک تمثیل و تفسیر ہو۔

ادب میں واقعیت کے کچھ بھی معنی ہوں لیکن واضح باد کہ ادب کی قدر و قیمت اسی بات میں مرکوز ہے کہ وہ تفسیر قوانین حیات اور انسانی طبائع کی تصویر کشی کے لئے زندگی کے حوادث و تجارب کو اپنا وسیلہ بنائے۔ صرف نقالی کا نام واقعیت نہیں بلکہ اس میں اصلیت ہونا چاہیئے۔ کوئی ادب، مثالیت یا کشف اسرار حقائق سے خالی نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے ادیب

واقعیت اور مثالیت کا مجموعہ ہوا۔

اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ قدر، ایجادِ شئے سے پہلے ہے۔ قضا ر ایجاد شئے کا مقارن ہے۔ وجودِ شئے سے پہلے ذہنی تصور جس کو منصوبہ بندی یا پلاننگ کہا جا سکتا ہے۔ یہ قدر ہے۔ قدر، وجود ذہنی ہے۔ قدر کے مطابق، وجود فعلی کا نام قضا ہے۔ اس لحاظ سے زندگی کے حقائق، قدر ہیں کیونکہ وہ ایجادِ شئے یا ادب سے پہلے نہیں اور بیانِ حقائق یا واقعیت در کشف اسرار حقائق یعنی مثالیت قضا نہیں کیونکہ یہ دونوں چیزیں ادب میں قدر (حقائق) کے مطابق ادبی فنیت کے وجود فعلی کو جنم دیتی ہیں۔

وجودِ حقائق کی غرض و غایت ہے کشفِ اسرار —— اور یہی کشفِ اسرار، قدر کا درجہ رکھتی ہے۔ جہاں تک وجود ذہنی کا معاملہ ہے، یہ کشفِ اسرار، بیانِ حقائق پر مفہوم کے لحاظ سے مقدم ہے۔ لیکن بیان کے اعتبار سے موخر ہے۔ مقدم ہے باعتبارِ وجود ذہنی اور موخر ہے باعتبار وجود ذہنی۔ اس لئے کشفِ اسرار حقائق کو قدر کا درجہ اور بیانِ حقائق کو قضا کا مرتبہ دے سکتے ہیں۔

نئی کتابیں

تبصرے

تاریخ تناولیاں

سید مراد علی

۵۸ صفحات
قیمت مجلد ۴ روپے
غیر مجلد ۳ روپے

تبصرہ نگار: معین الدین عقیل

اے ۴۲/۴۳ ڈی کورنگی کراچی ۳۱

ناشر: مکتبہ قادریہ، لاہور

سلطان سبکتگین اور محمود غزنوی کے حملوں کے نتیجے میں غزنی کے درۂ تانال سے اعوان، پٹھان اور سادات کے سیکڑوں خاندان مردان اور سوات کے علاقوں میں آ کر آباد ہوگئے تھے۔ درۂ تانال کی مناسبت سے اس علاقہ کا نام "تناول" پڑگیا اور یہاں آباد ہونے والے خاندان "تناولی قوم" کے نام سے موسوم ہوئے۔ پیشِ نظر کتاب سید مراد علی، علی گڑھی منشی سرحد چوکی دربند، ضلع ہزارہ نے انگریزی ملازمت کے دوران ۱۸۷۵ء میں تحریر کی تھی۔

اس کتاب کا بیشتر حصہ سردار پائندہ خاں کے عہد پر مشتمل ہے۔ اس کے دور کا اہم واقعہ سید احمد شہید کی تحریک جہاد ہے، جو ہندوستان گیر جذبہ جہاد پر مبنی تھی لیکن اس کا فیصلہ کن مرحلہ اسی علاقہ میں پیش آیا۔ سردار پائندہ خاں کے بعد سردار جہانداد خاں اس

کا وارث ہوا جو نومبر ۱۸۵۸ء تک متمکن رہا۔ پھر ۱۸۷۰ء اس کتاب کے سال تصنیف تک محمد اکرم خاں، سردار مدد خاں وغیرہ حکمراں رہے۔ اس دور کا ہندوستان بلکہ برعظیم سیاسی اعتبار سے بڑے فیصلہ کن مراحل سے گزر رہا تھا۔ اصلاحی اور انقلابی تحریکیں اُبھر رہی تھیں اور حکومت کے خلاف بغاوتیں ہو رہی تھیں۔ اس برعظیم میں یہ بات قریب قریب طے پا چکی تھی کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اپنی فوجی طاقت کے بل پر مختلف غیر اسلامی قوتوں کے عروج کو روک سکے اور ایک مستحکم حکومت کا قیام عمل میں لا سکے۔ غیر مسلموں کا تسلط اور بڑھتے ہوئے قدم مسلمانوں کے وجود ہی کو ختم کر دینے کے درپے تھے۔ اس کے باوجود اس وقت مسلمانوں ہی میں خود غرض عناصر اپنی سرگرمی سے باز نہ آئے۔ انگریزوں کا سیاسی اثر بنگال کے علاوہ شمالی ہند کے دوسرے حصّوں میں بھی تیزی سے بڑھ گیا تھا اور برطانیہ برعظیم میں ایک بالادست قوت بن چکا تھا اور کوئی ایسی ریاست یا فرماں روا نہ تھا جو اس کی بالادستی کو دعوت مقابلہ دے سکتا۔ لیکن شاہ عبدالعزیزؒ نے جو اپنے والد شاہ ولی اللہ کی فکر اور تعلیمات سے بہرہ مند تھے، برعظیم کو 'دارالحرب' قرار دیا۔ ان کے خیال میں مسلمان اب ایک ایسے علاقے میں زندگی بسر کر رہے ہیں جس پر اقتدار سے انھیں محروم کر دیا گیا ہے اور انگریزوں کی حکومت میں مسلمان پوری آزادی سے فرائض مذہبی انجام نہیں دے سکتے اس لیے ان کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے لیکن چونکہ مغل شہنشاہ بے بسی کی حالت میں انگریزوں کا وظیفہ خوار ہو گیا تھا اور مسلمانوں کی کوئی علیحدہ منظم تحریک نہ تھی اس لیے اس فتوی کا کوئی فوری عملی نتیجہ نہیں نکلا تاہم اس نے ایک انقلابی تحریک کو جنم دیا جس کا مقصد حکومت الٰہیہ کا قیام تھا۔ یہ سیّد احمد شہید کی تحریک جہاد تھی۔ اس جہاد کا رُخ سر دست پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف تھا جس کے مسلمانوں پر ظلم کرنے اور ان کی مذہبی آزادی میں خلل انداز ہونے کی خبریں عام تھیں۔ انگریزوں کا رویہ بظاہر مگر مصلحتاً غیر جانبدار رہا۔ کیونکہ اس جہاد سے انھیں ہندوستان کی دو طاقتوں کے ختم ہو جانے یا کمزور ہو جانے کی توقع تھی جس کے بعد وہ فاتح اور مفتوح دونوں پر آسانی سے غلبہ پا سکتے تھے۔ پنجاب کی سکھ حکومت سے جنگ کا فیصلہ کافی غور و خوض کے بعد کیا گیا تھا۔ سکھوں کی حکومت ظالم تھی اور اسلام اور مسلمانوں سے انتہائی تعصب

رکھتی تھی۔ ان کی حکومت کا بڑا حصہ ان علاقوں پر مشتمل تھا، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اپنی حکومت کو شمال مغرب میں پٹھانوں کے وطن پر وسعت دینے کا عمل سکھوں کی طرف سے برابر جاری تھا۔ مجاہدین کا عزم یہ تھا کہ مسلم اکثریت والے علاقے اور پٹھانوں کی مملکت کو آزاد کرا لیا گیا تو مزید سرگرمیوں کے لیے یہ علاقہ ایک مرکز بن جائے گا۔ اس عزم کے تحت مجاہدین نے سکھوں کے خلاف جہاد شروع کیا۔ جہاد کی تفصیلات سے اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ سید احمد شہید اور ان کے رفقا کی شہادت کے بعد بھی یہ تحریک ختم نہیں ہوئی بلکہ ان کے بچے کچھے دیگر رفقاء اور پیروؤں نے اس کو بیسویں صدی کے اوائل تک جاری رکھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اس تحریک سے وابستہ مجاہدین پیش پیش رہے۔ اس کی ناکامی کے بعد شمال مغربی سرحدوں میں ان کی انگریزوں سے براہِ راست جھڑپیں شروع ہو گئیں انگریزوں نے ۱۸۴۵ء میں سکھوں کو شکست دے کر پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا۔ انگریزوں کے اس نئے اقتدار کا نتیجہ یہ تھا کہ اب تحریک مجاہدین کا براہِ راست تصادم انگریزوں سے ہو۔ ابتداءً انگریز اس پر کچھ زیادہ فکرمند نہ ہوئے کیونکہ رنجیت سنگھ مجاہدین کے ساتھ جنگ میں مشغول تھا لیکن جب سکھوں کی حکومت ختم ہو گئی تو اس قسم کی تحریک کا جاری رہنا کچھ اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ پنجاب اور صوبہ سرحد میں انگریزوں اور مجاہدین کے درمیان جھڑپوں کا مستقل سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۸۵۲ء سے ۱۸۵۷ء تک اور پھر ۱۸۶۷ء اور ۱۸۶۸ء میں انگریزوں سے مجاہدین کی باضابطہ فوجی مہموں کا ذکر ریکارڈ پر موجود ہے۔ یہ آخری بڑی مہمیں تھیں جن کی تفصیلات معلوم ہوئی ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی بیسویں صدی کے اوائل تک، ریشمی رومال کی تحریک کی تفصیلات دریافت ہونے سے، مجاہدین کی انگریز دشمن سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ انگریزوں کے لیے یہ صورتِ حال ہمیشہ پریشان کن رہی چنانچہ وہ، اپنی روایتوں کے مطابق، مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جو مسلمانوں میں جوشِ جہاد کم کرنے کی سعی کرنے لگا۔ تحریک مجاہدین کی مختلف پہلوؤں سے مخالفت۔ اور تحریکِ قادیانیت اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان سے وابستہ افراد نے جہاد کے خلاف مختلف وقتوں میں فتوے دیے اور مجاہدین کو کبھی وہابی اور کبھی کافر قرار دیا۔ فتوؤں کے ساتھ ساتھ اس مقصد

کے لیے کتابیں بھی تصنیف کرائی گئیں جن پر انعام واکرام کی بارش ہوتی تھی۔ اب پیشِ نظر کتاب کی تصنیف کا مقصد دیکھیے۔ اس کی روشنی میں صحیح رائے خود قائم ہوتی ہے مصنف تمہید کے صفحہ ۳، ۴ میں لکھتا ہے:

ص ۳ - "امابعد سید مراد علی بن سید عنایت علی قدیم متوطن شہر کوئل عرف علی گڑھ وارد ضلع ہزارہ و محرر چوکی دربند ضلع مذکور خدمت میں ارباب علم و ہنر اور قدر دانانِ تاریخ و سیر کے عرض کرتا ہے کہ ہمیشہ سرکار انگریزی مربی اور مروج علوم گوناگوں کی تھی اور ہے'۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سررشتہ تعلیم ممالک مغربی و شمالی و پنجاب سے حسب منشاء سرکار مصنفوں کو معقول انعام عنایت ہوتے۔ حسب دلخواہ قدردانی ہوئی۔ اسی طرح صاحب رجسٹرار یونیورسٹی کالج لاہور نے تصنیف و تالیف کی رغبت دلائی، انعام و صلہ کا وعدہ فرمایا۔ ماہ اکتوبر ۱۸۷۲ء میں راقم حروف

ص ۴ - بہ صد علاقہ تنزل پر مامور کیا گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کتاب تاریخ تناولیاں نام کو چار باب میں بہ تفصیل آئندہ مرتب کیا۔ اُمید ہے کہ عموماً کل ممالک اور خاص اس ضلع اور اضلاع قریبہ کے طالب علم اس کے مطالعے سے حظ وافر اٹھائیں گے۔ علم تاریخ میں دلچسپی کا محاورہ درست ہوگا مگر جب تک کہ میری تصنیف خدام یا احترام نواب فریدوں فر دارا افسر سکندر بخت جمشید تخت صاحب سیف و علم داور گردوں حشم جامع کتاب تجارت اوس جناب مسٹر آرایچ ڈیوس صاحب بہادر لیفٹیننٹ گورنر ممالک پنجاب دام اقبالہ و اجلالہ کی نظر کیمیا اثر سے گزر کر خلعت قبول نہ پائے ہرگز مقبول نہ ہوگی۔ کیونکہ مقولہ قدیم ہے الناس علی دین ملوکھم۔ بہرحال فضل خدا سے امید ہے کہ حضور ممدوح نظر عاطفت مبذول فرما کر میرے تحفۂ حقیر کو منظور فرمائیں گے اور دعاگو سے دولت صلہ اور جائزہ شاہانہ سے محروم نہ رہے گا۔ خاتمہ اس تاریخ کا بماہ مئی ۱۸۷۵ء عہد دولت مہد، عادل زماں، نوشیروانِ جہاں، رعیت پرور داد گستر جناب مسٹر واٹرفیلڈ صاحب بہادر دام نوالہٗ ڈپٹی کمشنر ضلع ہزارہ میں ہوا۔"

اس وقت کے ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال میں انگریزوں کا مطمحِ نظر اور مصنف کی مرقومہ تمہید سے کتاب کے مندرجات اور اس کی تصنیف کے مقاصد پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ اس سے ایک اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انگریزوں نے اپنی مطلب براری کے لیے، مصنف کی چاپلوسی پر یقیناً اسے خطیر انعام و اکرام سے نوازا ہوگا۔ اس کتاب کی اشاعت سے انگریزوں نے ان علاقوں میں ضرور فائدہ بھی اٹھایا ہوگا۔ "جہاں کہ ایک ایک مورچے کو سر کرنے کے لیے انھیں ایک ایک صوبے کی پوری آمدنی صرف کرنی پڑتی تھی۔"

موجودہ اشاعت کے تعارف نگار اور حاشیہ نگار نے کتاب کے مندرجات پر نہ صرف کلی اتفاق کیا ہے بلکہ اپنی اپنی تحریروں میں، جو شاملِ کتاب ہیں، کسی طور پر بھی مصنف سے پیچھے نہیں ہیں۔ مثلاً تعارف نگار کے یہ جملے: (صفحہ ۲)

۱۔ "۱۸۳۰ء میں سید احمد بریلوی اور مولوی اسمٰعیل دہلوی نے پشاور، مردان اور سوات کی مسلم آبادی کو بزورِ شمشیر محکوم بنا کر سردار پائندہ خاں کو پیغام بھجوائے اور خود مل کر بھی بیعت کی دعوت دی۔ جب وہ بیعت پر تیار نہ ہوا تو سید صاحب نے اس پر کفر کا فتویٰ لگا کر چڑھائی کر دی۔"

۲۔ "اس (پائندہ خاں) نے ..... سکھوں سے مدد لے کر سید صاحب کے لشکر پر حملہ کر دیا اور انھیں علاقہ چھوڑ کر بالاکوٹ کی طرف جانے پر مجبور کر دیا۔ غالباً مسلمانوں اور سکھوں نے مشترکہ طور پر تعاقب کر کے سید صاحب اور اُن کے لشکر کو بالاکوٹ میں تہس نہس کر دیا۔"

اور حاشیہ نگار کا یہ کہنا کہ :۔

"غیور پٹھانوں کی بیوہ لڑکیوں سے یہ مجاہدین جبراً نکاح کر لیتے ہیں۔" (صفحہ ۵۰)

اخلاقی اور ذہنی کم مایگی کی مثالیں ہیں۔

کتاب کی حالیہ اشاعت کا مقصد بھی تناولی قوم کی تاریخ سے زیادہ تحریک مجاہدین کی مخالفت ہے۔ ورنہ "تعارف نگار" اور "حاشیہ نگار" کتاب کے تمام مندرجات کو اپنے موضوع سے نظر انداز کر کے محض تحریک مجاہدین کو نشانہ نہ بناتے۔ اگر تناولی قوم کی تاریخ مرتب کرنا

ان کا مقصد ہوتا تو آج کی تحقیقات کے مطابق اور آج کی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کوئی تحقیقی اور سائنٹفک تاریخ مرتب کرائی جا سکتی تھی۔ اس اشاعت کو کوئی علمی اور تاریخی دریافت یا مثبت کام نہیں کہا جا سکتا۔ گو کہ اسے "حقائق" کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش قرار دیا گیا ہے لیکن ایسے حقائق" انگریزی عہد میں انگریزی مفادات کی خاطر بڑی شد و مد سے منظرِ عام پر آتے رہے ہیں جنہیں راسخ العقیدہ ذہن اس وقت بھی اور اب بھی مکروہات ہی سے تعبیر کرتا ہے۔

۶۷ صفحات قیمت بارہ روپے
سنگ میل پبلیکشنز
لاہور

سیدانِ بادشاہ گر

ترتیب و تہذیب
ڈاکٹر سید صفدر حسین

تبصرہ نگار معین الدین عقیل ۵۶۳ ڈبی کو رنگی کراچی ۳۱

ڈاکٹر صفدر حسین خاصی معروف و مشہور شخصیت کے مالک ہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں ان کی متعدد تصنیفات و تالیفات منظرِ عام پر آئی ہیں۔ اور ان کی ہر نئی تصنیف ان کی متعدد نئی تالیفات کے طویل اشتہار سے بھی آراستہ ہوتی ہے۔ جن سے ان کی کاوشوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ زیرِ نظر تالیف "سیدان بادشاہ گر" سادات بارہہ سید حسن علی خاں اور سید حسین علی خاں کے تذکروں پر مشتمل ہے۔ مرتب نے اسے "تاریخ فرح بخش" مولفہ محمد فیض بخش کاکوروی کی بنیاد پر مرتب کیا ہے لیکن فی الحقیقت یہ دیگر کتابوں جیسے 'ماثر الامراء' منتخب اللباب' "سیر المتاخرین" وغیرہ کے اقتباسات و اندراجات پر بھی مشتمل ہے۔ ابتداء میں صفحہ ۵۵ تک مرتب کا ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ بارہہ کے سید برادران کے تاریخی سیاسی کردار اور ان سے منسوب احوال و نتائج کو نئے سرے سے متعین کیا جائے اور اپنے طور پر کوشش کر لی جائے کہ جو احوال و اعمال ان سے منسوب ہیں ان کا رد کیا جا سکے۔

مقدمے میں ابتداً سادات بارہہ کی ہندوستان آمد اور ان کے سیاسی عروج کا تذکرہ ہے اور چند کتابوں سے محض ایسے اقتباسات دیئے گئے ہیں جو سادات بارہہ کی تعریف و

توصیف میں ہیں۔ پھر ہر دور میں ان کی ممتاز شخصیتوں کی ایک فہرست درج کی گئی ہے جو ۱۳ تا ۳۰ صفحات پر محیط ہے۔ فہرست کے بعد ایک شعر کے ساتھ "خلاصۂ کلام" تحریر کیا گیا ہے وہ شعر یہ ہے سے

حقیقت آج تہ خاک سے ابھرتی ہے　　　زباں فریب مورخ پہ طنز کرتی ہے

اس شعر سے ان کے آئندہ موضوع بحث کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بعد کے تمام صفحات میں یہی کوشش کی گئی ہے کہ سید برادران کے کردار کو بے داغ اور ستھرا بنا کر پیش کیا جائے۔ کیونکہ ــــ مرتب کے مطابق ــــ سادات بارہہ کے دشمناں اعظم یعنی محمد امین خاں تورانی اور نظام الملک کے خاندان کے حاشیہ نشینوں، چاپلوسوں اور نمک خواروں نے حد درجہ بے بنیاد، بے محل اور متعصبانہ الزامات تراشے ہیں اور سوا دو سو سال تک تاریخی حقائق کو مسخ کیا ہے۔ "چنانچہ مرتب کے خیال کے مطابق ــــ" برعظیم کے مسلمانوں کی عمارت اقتدار کو منہدم کرنے میں سید برادران شریک نہیں تھے بلکہ نظام الملک اس کا سبب تھے" (ملاحظہ فرمایئے مرتب کا مقدمہ صفحہ ۳۸) اس مقام پر مولانا مناظر احسن گیلانی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے ان خیالات پر جو سلطنت مغلیہ کے زوال کے ضمن میں انھوں نے سید برادران کے تعلق سے بیان کیے تھے، سخت تنقید کی گئی ہے۔ ساتھ ہی مرزا بیدل کو بھی درج ذیل قطعہ لکھنے پر سخت مطعون کیا گیا ہے سے

دیدی کہ چہ بادشاہ گرامی کردند　　　صد جور و جفا از رہ خامی کردند

تاریخ چو از خرد بجستم فرمود　　　سادات بوئے نمک حرامی کردند

پھر جذباتی جیس بیس سے "بچ کر" مرتب نے وہ نتائج تحریر کیے ہیں جو بعد میں سید برادران کے نہ ہونے سے سلطنت مغلیہ کو پہنچے۔ مقدمے کے بعد سید برادران کے ضمن میں وہ اقتباسات درج ہیں جو تاریخ فرخ بخش" اور "ماثر الامراء" وغیرہ سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ان اقتباسات میں کوئی انکشاف نہیں بلکہ یہ باتیں جو ان میں تحریر ہیں کسی کی نظر سے پوشیدہ نہیں اور خصوصاً مرزا بیدل کی نظر سے، جو اس دور کے چشم دید ہیں اور نہ مناظر احسن گیلانی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی نظر سے۔ کیونکہ

ان حضرات نے بھی اپنی بات انھیں مذکورہ تاریخوں سے مکمل کی ہے۔ اس کتاب کی قابلِ توجہ تحریر محض مقدمہ ہے۔ جس میں مرتب کی جذباتیت خاصی نمایاں ہے۔ وہ صفحہ ۸ پر اس سے احتراز کرنا چاہتے ہیں لیکن نہیں کر پائے۔ مرتب نے نظام الملک کے تعلق سے ڈاکٹر باسو کا ایک حوالہ دیا ہے جس میں وہ نظام الملک کے رویّے پر تنقید کرتا ہے۔ یہ اقتباس اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ اگر نظام الملک کا رویّہ بُرا ثابت ہو جائے تو خود بخود گویا سیّد برادران کا ستھرا اور معصوم کردار اُبھر کر آجاتا ہے۔ اسی طرح سے علاّمہ اقبال کا وہ مشہور قطعہ بے موقع نقل کرنا جو انھوں نے غلام قادر روہیلہ کے تعلق سے کہا تھا اور مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کا اقتباس تحریر کرنا جو "دکن کی سیاسی تاریخ" میں اورنگ زیبؒ کے وصیت نامے سے ماخوذ ہے مذکورہ سیّد برادران کے مثبت کردار کا ثبوت فراہم نہیں کرتے۔ پھر جس انداز سے مناظر احسن گیلانی اور ڈاکٹر قریشی پر تنقید کی گئی ہے۔ اس سے نقاد کی شخصیت کا سنجیدہ پہلو سامنے نہیں آتا۔ مرزا بیدل کی "ہرزہ سرائی" "مولانا گیلانی کے "متعصبانہ ملائی انداز" کے اظہار کے بعد ڈاکٹر قریشی کے ذہن کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے اور ان کی تحریروں میں "نسل، برادری، خاندانی پیشہ عقیدہ وغیرہ کے تعصبات" تلاش کیے گئے ہیں۔ اگر کسی فن پارے پر تنقید کی جارہی ہو تو فن کار کے ذہن کے مطالعے کے لیے اس کا سماجی، نفسیاتی اور موروثی پس منظر ضروری اور مفید ہوتا ہے لیکن جہاں تاریخی حقائق، ان کے ثبوت اور نتائج کی بات ہو، وہاں ان کا تذکرہ ذاتیات پر حملے کی صورت میں نری جذباتیت اور غیر سنجیدگی کا مظہر تو ہو سکتا ہے۔ دلیل اور تعقل کا اظہار نہیں۔

مرتب نے اپنے خیالات کے ثبوت میں بعض مورخین کے حوالے دیئے ہیں اور ان کی تحریروں سے اقتباسات بھی نقل کیے ہیں لیکن انھیں مورخین نے اگر سیّد برادران پر تنقید کی ہے یا ان کے کردار کے کسی قبیح پہلو کا تذکرہ کیا ہے تو اس کا ذکر ہی نہیں کیا گیا۔ نظام الملک پر تنقید کے سلسلے میں انگریزوں اور متعصب ہندوؤں کے اقتباسات تو دیے ہیں لیکن ان مورخین کی تحریروں کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا جنھوں نے اگر سیّد برادران کو برا نہیں کہا یا ان کی تعریف کی ہے تو ساتھ ہی نظام الملک کی بھی تعریف کی ہے۔ خافی خان کا متعدد مرتبہ حوالہ بھی

دیا ہے اور اس کی تاریخ سے اقتباسات بھی نقل کیے ہیں لیکن اگر وہ نظام الملک کی تعریف میں یہ کہتا ہے کہ "وہ شجاعت، کارطلبی، اصابت رائے اور اکثر کمالاتِ انسانی میں نادرالعصر تھا" (منتخب اللباب، جلد دوم ص ۶۹۱) تو اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ جہاں مطلب کی بات غلام حسین طباطبائی نے کی تو اسے نقل کر دیا گیا ہے۔ لیکن اگر ساتھ ہی وہ یہ کہتا ہے کہ "نظام الملک نے نادر شاہ کی حرص و طمع کو اکسا کر تباہ و برباد کر دیا" ("سیر المتاخرین" جلد دوم ص ۸۴۴) تو مرتب نے یہ خیال نہیں کیا کہ طباطبائی اور سعادت خاں، دونوں انھیں روایات کے پیرو تھے، جن کے سید برادران حامل رہے۔ محمود خاں منگلوری کی کتاب "تاریخ مملکت خداداد" سے بھی مرتب نے اقتباسات نقل کیے ہیں۔ گویا منگلوری بھی، جس طرح دوسروں کے لیے مستند ہیں، مرتب کی نظر میں بھی استناد رکھتے ہیں۔ لیکن جب وہ سلطنت کے اسقاط کے اسباب میں یہ کہتے ہیں کہ میر علی رضا اور میر غلام علی لنگڑا نے اپنے "مخصوص مذہبی مفادات" کی خاطر میر صادق کے پس پشت انگریزوں سے گٹھ جوڑ کر کے ٹیپو سلطان سے غداری کی تھی تو کیا یہ مرتب کے لیے یہ قابل قبول ہے؟

مغلیہ سلطنت کے زوال اور اس کے اسباب پر دو سو سال سے بحث جاری ہے۔ اس بحث کا جو خلاصہ ابھر کر آیا ہے وہ مسلمہ ہے کہ اورنگ زیبؒ کے بعد جو واقعات پیش آئے وہ ناقابلیت، کوتاہ بینی، خود غرضی اور غداری کی ایک داستان ہیں۔ بعد کے قریبی عرصے میں فی الحقیقت تین اشخاص، جن میں سے ایک ذوالفقار خاں اور دو بارہہ کے سید برادران تھے، اسلامی سلطنت کی عمارتِ اقتدار کو منہدم کرنے میں برابر کے شریک تھے۔ ان کے اعمال میں سے کوئی عمل ایسا نہ تھا جو خود غرضی اور غداری کے پست ترین محرکات سے ملوث نہ ہو۔ ان کی خود غرضی کو کم کرنے والا کوئی واقعہ تاریخ کے صفحات پر موجود نہیں ہے۔ ورنہ مرتب کتاب ہٰذا کو اقتباسات تلاش کرنے اور مدافعت کرنے کی ضرورت کبھی پیش نہ آتی ان سید برادران نے تو مملکت کے استحکام کی کوشش کرنے اور ان عناصر کا تعاون حاصل کرنے کے بجائے، جو مفید خدمت انجام دے سکتے تھے، سلطنت کو خانہ جنگی میں مبتلا کر دیا۔ اور ان لوگوں سے امداد طلب کی جنھوں نے حرص و طمع کی تسکین کے لیے دور دراز سے آ کر دہلی کو تباہ و برباد کر دیا۔ پھر مرہٹوں کو دارالحکومت میں آنے کی دعوت دی گئی اور دراصل

سادات بارہہ کی کوتاہ بینی سے ہی انھیں ملک پر اقتدار بھی حاصل ہو گیا۔

اپنے ذرائع اور اثر و نفوذ سے ایسی مزید کوششیں اور بھی ہو سکتی ہیں، بلکہ مرتب نے اس عزم کا اظہار مقدمے کی آخری سطور میں کیا بھی ہے۔ لیکن کیا تاریخی حقائق محض سادے صفحات ہوتے ہیں جن پر ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق لکھتا چلا جائے؟

مرے خدا مرے دل

مصنف: مجید امجد
مرتب: تاج سعید
قیمت پیپربیک ۱۲/۰ روپے
مجلد ۱۵/۰ روپے
مکتبۂ ارژنگ ظہیر آباد پشاور۔

تبصرہ نگار عتیق احمد
۱۹۵ (آر) بلاک نمبر ۱۵ دستگیر سوسائٹی کراچی

ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں کہ ماہنامہ 'قند' کے مدیر تاج سعید نے مجید امجد کے فن اور ان کی زندگی کے لازوال نقوش کو ہمیشہ اجاگر رکھنے کی خاطر 'ماہنامہ 'قند' کا مجید امجد نمبر شائع کیا تھا۔ یہ خصوصی شمارہ تمام ادبی حلقوں میں بڑی بڑی وقیع کاوش کے طور پر سراہا گیا تھا۔ ابھی یہ خصوصی شمارہ پیلا بھی نہیں ہوا تھا کہ تاج سعید نے مجید امجد کی اکسٹھ نظموں اور بیس غزلوں کا انتخاب 'مرے خدا' مرے دل' کے نام سے شائع کیا ہے۔ گویا تاج سعید نے مجید امجد ایسے گوشہ گیر اور صوفی منش شاعر کی 'زندگی اور فن' کو خراج عقیدت پیش کرنے کا عزم کیا تھا' یہ کتاب' اس عزم کی عملی شکل کا تتمہ ہے۔

مجید امجد کی شاعری کا آغاز برصغیر پاکستان اور ہندوستان کے بڑے تاریخ ساز دور یعنی اس صدی کی تیسری دہائی میں ہوا۔ اور چوتھی دہائی کے ختم ہونے ہوتے (یعنی ۱۹۳۸ء کے لگ بھگ) برصغیر کے ادبی حلقوں میں اس دور کی نوجوان نسل ظہیر کاشمیری' سلام مچھلی شہری' محمد صفدر' مختار صدیقی' اختر الایمان وغیرہم کے معروف ناموں میں اُن کا نام شامل ہونے لگا۔ ترقی پسند ادب اور تحریک سے بغض للّہی رکھنے والے گروہ اور اُس کے سرغنوں نے مجید امجد کی وفات پر بھی حسب منصوبہ بندی مجید امجد کی فکری افق کو اُن کے دور کے واضح سماجی' تہذیبی اور فکری اثرات سے کاٹ

ڈالنے کی سعیِ مسلسل میں خاصا دھندلایا اور انہیں "ذات" کی کال کوٹھری میں گہرا اتار کر اپنے اس کارنامے پر خاصی بغلیں بجائیں۔

شخصیت اور فن کشی کا وہ منصوبہ جس کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا ہے۔ "ذات کے نہاں خانے" "اندر کے آدمی" اور "تلاشِ ذات" وغیرہ کے ایسے ہی دو چار لایعنی لفظی گورکھ دھندے خالص فن کے نام پر ہر اُس جواب مضمون لکھنے والے کا زرمِ چارہ بنے ہوتے ہیں جو فن اور شخصیت کو لکھنے والے کے اپنے دور کے تاریخی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور فلسفیانہ پس منظر اور اُن کے اثرات کی روشنی میں سمجھنے کی محنت و کاوش کی نہ سکت رکھتے ہیں نہ صلاحیت نہ مزاج۔

یہ بات بہت سامنے کی ہے کہ مجید امجد نے نہ کبھی اپنی زندگی میں ترقی پسند ادب کی تحریک سے ناطہ جوڑنے کا دعویٰ کیا اور نہ ہی ترقی پسند ادیبوں نے انھیں اپنی صفوں کا فرد یا فن کار ہونے کا اعلان کیا، مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے کہ مجید امجد کی سوچ اور ان کے فن میں فلسفیانہ تفکر، خیال کی ندرت اور جدت اور ان کے یہاں ابہام اور لایعنیت سے دور رہنے کی شعوری رجحانات کا ترقی پسند ادیبوں نے ہمیشہ خیرمقدم کیا، چنانچہ ترقی پسند ادب کے نقیب رسالوں اور منتخب اور بہترین ادب کی انتھولاجیز میں ان کی شرکت ضروری سمجھی جاتی رہی۔ ظاہر ہے کہ ترقی پسند ادیب جو اپنی فن کی نظریاتی اساس کو مجروح نہ ہونے دینے کے سلسلے میں خاصے بدنام اور D اور G اور R ہونے پر "فن و شخصیت کش" منصوبہ بندوں کے مطعون ہیں، مجید امجد کا خیرمقدم ان کے نقطۂ نظر، فکر اور فن کی اُس اساس ہی کی بنا پر کرتے رہے جو ادب اور شعر کو ابہام، لایعنیت اور ذات کی کال کوٹھری کے اندھیروں کے ذاتی احوال اور فرسٹریشن کی داستان کی زیب و زینت نہیں بننے دیتی۔ ادب اور فن کے پروہتوں سے گزارش ہے کہ اگر زیادہ نہیں تو مجید امجد کی لاتعداد پرانی نظموں میں سے صرف 'کنواں'، 'نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب'، 'جہاں قیصر و جم ہیں'، 'درسِ ایام'، 'امروز' اور 'راتوں' کو ہی پڑھ لیں، تاکہ انھیں اپنے اس "دل پسند صوفی منش اور قلندر مزاج شاعر" کی نظریاتی اساس اور تفکر کی جھلک دیکھنے کی توفیق اور سعادت (شاید) حاصل ہو جائے اور اُن کے بعد کے کلام کا رنگ اور آہنگ سمجھنے میں تھوڑی بہت اُس روشنی کی جھلک نظر آ جائے جو ہمارے عہد کے ہر ذی شعور، حساس اور گرد و پیش سے باخبر فن کار کے نہاں خانہ ذات کو روشنی پہنچاتی رہتی ہے۔

مجید امجد کی شاعری کا جو انتخاب 'مرے خدا' مرے دل' کے عنوان سے تاج سعید نے چھاپا ہے۔ وہ اُن کے شاعرانہ مزاج، شعور اور اسلوب کا نچوڑ ہے۔ مجید امجد کی زندگی بھر کا شعری سرمایہ بہت زیادہ ہے۔ جس انداز سے اُن کے شاعرانہ ٹیلنٹ (TALENT) کا نوٹس لیا گیا ہے، اس میں تاج سعید صاحب کا حصّہ بہت بھرپور ہے' اور امید بندھ چلی ہے کہ اُن کے شعری سرمائے کے اور بھی انتخابات جلد ہی سامنے آئیں گے۔ موجودہ انتخاب ایسی نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے جن میں مجید امجد کی شخصیت اور فنّی شعور و اسلوب کی چھاپ گہری اور واضح ہے۔ بالخصوص اُن کی نظمیں میونخ، مشاہیر، دل کا پتھر، دیکھا اے دل، ثمرِ خون، ہوٹل میں، چہروں کی اقلیمیں، جویا، گوشۂ امن اور گدلے پانی، مجید امجد کو سمجھنے میں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔

غزل کے باب میں مجید امجد کے یہاں جو دھیما دھیما اور سُلگتا ہوا انداز اُن کی انفرادیت متعین کرتا ہے، زیرِ نظر انتخاب میں بھی اس انداز کی نمائندگی بڑی دقّتِ نظر کے ساتھ کی گئی ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

یہ ایک سانس حجیلوں میں بھری، جگنوں میں رچی\
اس اپنی سانس میں کون اپنا انت دیکھے گا

اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ\
میں اپنی زندگی انھیں دے دوں جو بن پڑے

راہیں دھڑکیں، شاخیں کڑکیں، اک اک ٹیس اٹل\
کتنی تیز چلی ہے اب کے دھول بھری دکھنا

کبھی کبھی جو ہمارے دلوں میں جھانکتا ہے\
کہاں وہ لمحہ زمانے کے محلوں میں ہے

مجید امجد کی شاعری کا یہ انتخاب معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے لائق اعتبار و اعتماد ہیں (البتہ کہیں کہیں کتابت کی اغلاط اس صاف ستھرے مرقع پر بدنما داغ بن کر چپک گئی ہیں۔ اُمید ہے کہ آئندہ مزید احتیاط پیش نظر رہے گی) اور تاج سعید نے اس انتخاب کو شائع کر کے نہ صرف اپنی ادب دوستی کی روایت کو مستحکم کر لیا ہے۔ کتاب اپنی ضخامت اور صوری ہیئت کے اعتبار سے مہنگی بھی نہیں ہے، ہر چند کہ سستی کتابوں میں بھی اس کا شمار نہیں کیا جا سکتا اور سستی کتاب آج کے دور میں ادب کے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا شاید بہت مہنگا سودا بھی نہیں ہے۔

جاذب آفاقی	**ہنوز**	صفحات۔ قیمت ۱۶ روپے مجلد ۲۰ روپے نیا دور، ۵، پیر کالونی کراچی

تبصرہ نگار شہزاد منظر دفتر روزنامہ مساوات کراچی

"ہنوز" جاذب آفاقی کا وہ شعری مجموعہ ہے جو اگرچہ پہلی بار منظر عام پر آیا ہے لیکن یہ ان کا پہلا مجموعہ کلام نہیں ہے۔ آج سے سترہ سال قبل ان کے قطعات کا پہلا مجموعہ "شب چراغ" کے نام سے طبع ہوا لیکن بعض وجوہ کی بناء پر شائع نہ ہو سکا اس اعتبار سے "ہنوز" کو ان کا دوسرا شعری مجموعہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا جس میں قطعات بھی ہیں غزلیں اور نظمیں بھی۔ ادبی حلقے اگرچہ جاذب آفاقی کے نام سے زیادہ واقف نہیں ہیں لیکن وہ گزشتہ تیس سال سے شاعری کر رہے ہیں۔ اس اعتبار سے انھیں نیا شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ لوگ ان کے نام سے زیادہ واقف نہیں ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنا کلام شائع کرنے سے جھینپتے رہے ہیں۔ اگر ان کا کلام باقاعدگی سے شائع ہوتا رہتا تو وہ اُن شاعروں سے کہیں زیادہ مشہور ہوتے جو چند سالہ شاعری کے بعد خود کو شاعر اعظم تصور کرنے لگتے ہیں۔

"اُن کی شاعری خصوصاً قطعات نگاری کس پائے کی ہے اس کا اندازہ پروفیسر محمد حسن عسکری کے پیش لفظ سے ہوتا ہے محمد حسن عسکری ایک عرصہ سے شعر و ادب کی دنیا سے الگ ہو چکے ہیں اور وہ شاید ہی کسی شاعر یا ادیب کی تخلیقات کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہیں لیکن

جاذب آفاقی اُن خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جن سے عسکری صاحب کے نہ صرف دیرینہ مراسم ہیں بلکہ جو اُن کی شاعری کے قدر دان بھی ہیں۔ عسکری صاحب کی قدر دانی سے جاذب آفاقی کی نہ صرف حوصلہ افزائی ہوئی بلکہ ان کی شاعری میں مزید حسن اور نکھار پیدا ہوا اور وہ زیادہ بہتر شاعری کرنے لگے۔

عسکری صاحب فن قطعہ نگاری کو زیادہ پسند نہیں کرتے ہیں اس لیے وہ اسے" لڑکپن اور عنفوان شباب کے نیم گرم جذبات کے اظہار کا ذریعہ سمجھتے ہیں اسی لیے انھوں نے اس بارے میں بہت کم لکھا ہے لیکن جاذب آفاقی کی قطعات نگاری نے انھیں گہرے طور پر متاثر کیا ہے اس لیے وہ ان کی شاعری کے بارے میں نہ صرف رطب اللسان ہیں بلکہ ان کے قطعات سے حوالے دے کر قارئین کو قائل کرنے کی کوشش بھی کی ہے اس لیے محمد حسن عسکری کا پیش لفظ پڑھنے کے بعد یہ ناممکن ہے کہ کوئی "ہنوز" کا مکمل مطالعہ نہ کرے۔ محمد حسن عسکری مصنف کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں" اگر میں نے آفاقی صاحب کے قطعات پہلے نہ پڑھے ہوتے اور مجھے یہ پتہ چلتا کہ قطعات کا ایک نیا مجموعہ شائع ہوا ہے تو شاید میں یہ کتاب پڑھنے کو تیار نہ ہوتا لیکن آفاقی صاحب کا یہ امتیاز ہے کہ انھوں نے ایک جمی جمائی روایت سے انحراف کر کے اس صنف کو پختہ جذبات اور وزنی خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے اسی لیے میں یہ دیباچہ اس احساس کے ساتھ لکھ رہا ہوں جیسے میں نے انتہائی چیز دریافت کی ہو۔

جاذب آفاقی کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے قطعہ نگاری کی مروجہ روایت سے انحراف کرتے ہوئے اپنا ایک علیحدہ اسلوب اور انداز اختراع کیا ہے ساتھ ہی خود کو کسی خاص موضوع کا پابند بھی نہیں کیا۔ انہوں نے آسان زبان میں پیچیدہ سے پیچیدہ مضامین بیان کرنے کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ جاذب آفاقی کی عمر اور تجربات کا نتیجہ ہے کہ ان کی بعض قطعات میں گہری فکر کا احساس ہوتا ہے جیسے انھوں نے فلسفیانہ انداز اختیار کیا ہو یا ان کی شاعری احساسات سے زیادہ غور و فکر سے تعلق رکھتی ہو لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری کی تمام تر بنیاد تجربات و مشاہدات پر ہے اس لیے وہ عملی زندگی میں جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اسے شاعرانہ انداز میں جذبات کی گہرائیوں کے ساتھ شعر کے قلب میں ڈھال دیتے ہیں۔ محمد حسن عسکری نے موجودہ اردو شاعری

ہیں ان کا درجہ متعین کرنے سے گریز کیا ہے اور انھوں نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہے کیوں کہ جاذب آفاقی پہلی بار پڑھنے والوں کے سامنے آرہے ہیں اس لیے انھوں نے ان کے متعلق کوئی دعویٰ کرکے قارئین کو گمراہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ محمد حسن عسکری کے خیال میں کسی شاعر کے متعلق سب سے پہلی اور ضروری بات دیکھنے کی یہ ہوتی ہے کہ اس کی شاعری شاعری ہے بھی یا نہیں۔ درجے کا سوال بعد میں آتا ہے۔" انھوں نے اپنے پیش لفظ میں صرف آفاقی صاحب کی شاعری کے مختصر تجزیے پر اکتفا کیا ہے۔ قارئین کا کام ہے کہ وہ ان کی پوری شاعری کا مطالعہ کرکے شاعر کے بارے میں کوئی رائے قائم کریں۔

مصنف: میر انشا اللہ خاں انشا دہلوی

کہانی رانی کیتکی

مرتبہ: ڈاکٹر مولوی عبدالحق
مولانا امتیاز علی خاں عرشی
سید قدرت نقوی

صفحات
قیمت چھ روپے
انجمن ترقی اردو پاکستان

تبصرہ نگار شہزاد منظر دفتر روزنامہ مساوات کراچی

اردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار رام لعل نے اپنی ادبی ڈائری میں اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ "اردو نے ابھی تک محمد جائسی کی اردو رسم الخط میں لکھی ہوئی پدماوت کو (جسے ہندی ساہتیہ نے اپنا رکھا ہے) اپنے ادب کا حصہ کیوں نہیں بنایا ہے جیسے رانی کیتکی کی کہانی (انشا اللہ خاں انشا) کو ہندی اور اردو دونوں نے اپنی اپنی زبان کی پہلی کہانی قرار دے رکھا ہے۔ رام لعل اس کی وجہ سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ہندی اور اردو دونوں کا ارتقائی زمانہ تھا لیکن دونوں سیاسی حالات کی وجہ سے ایک تہذیبی کنفیوژن کا شکار ہیں۔"

ملک محمد جائسی کی تصنیف "پدماوت" کو اردو ادب کا حصہ کیوں تسلیم نہیں کیا گیا جب کہ وہ اردو رسم الخط میں ہے اور رانی کیتکی کی کہانی کو کیوں اردو تصنیف تسلیم کیا گیا۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر اردو زبان و ادب کے محققین اور مورخین کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی" اردو کی ایک اہم تصنیف ہے جس کا سراغ لگانے اور اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کا سہرا بابائے اردو مولوی عبدالحق کے سر بندھتا

ہے۔ اس بارے میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں" اس داستان کا ذکر مدت سے سنتے آتے تھے لیکن ملتی کہیں نہ تھی۔ آخر ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" کی پرانی جلدوں میں اس کا پتہ لگا۔ مسٹر کلنٹ، پرنسپل لامارٹن کالج، لکھنو کو اس کا ایک نسخہ دستیاب ہوا تھا جسے انھوں نے سوسائٹی کے رسالے میں طبع کرادیا۔ ۱۸۵۲ء میں ایک اور حصہ طبع ہوا اور دوسرا حصہ ۱۸۵۵ء میں لیکن نظم بہت غلط چھپی تھی مجبوراً اس کی نقل میں نے رسالہ" اردو" (جلد ششم ماہ اپریل ۱۹۲۶ء) میں شائع کی اور جہاں تک ممکن ہوا اس کی تصحیح بھی کی۔ " اردو" میں شائع ہونے کے بعد میرے عنایت فرما جناب پنڈت منوہر لال زتشی ایم اے نے ازراہِ کرم اس کا ایک نسخہ جو کبھی لکھنؤ میں ناگری حروف میں چھپا تھا عنایت فرمایا۔ اس نسخے سے مقابلہ کر کے مزید تصحیح کی گئی۔"

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۳ء میں دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ کتاب کے تیسرے ایڈیشن کی اشاعت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے علمی و ادبی حلقوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔ مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ " سید انشا بلا کے ذہین اور طباع تھے اگر درباری صحبت اور ناروا شوخی و ظرافت انھیں بددل نہ کر دیتی تو وہ اپنا جواب نہ رکھتے۔ انھوں نے اپنی ذہانت اور جودت کو بری طرح خراب کیا۔ اس پر بھی ان کے کلام میں جو جدت، شگفتگی اور شوخی پائی جاتی ہے۔ وہ کہیں اور نہیں ملتی۔ اردو زبان پر انھیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ ایک اردو کیا ہندوستان کی کئی زبانیں ان کے گھر کی لونڈی تھیں۔ اس کا ثبوت ان کی مذکورہ تصنیف " کہانی رانی کیتکی کی" ہے جس میں انھوں نے یہ التزام کیا ہے کہ فارسی، عربی یا ترکی کا ایک لفظ بھی نہ آنے پائے چنانچہ پوری کہانی خالص ہندوستانی (اردو اور ہندی) میں لکھی گئی ہے۔ انشاء اللہ خاں انشا کا بلاشبہ یہ بہت بڑا کمال ہے۔

آج کے دور میں اس کتاب کی ادبی سے زیادہ لسانی اور تاریخی اہمیت ہے کیوں کہ اس کے مطالعہ سے ادبی لطف اس قدر نہیں آتے گا جتنا اس کے لسانی مطالعہ سے آئے گا۔ اس لیے اس کتاب کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ہمیں امید ہے کہ اردو زبان کے لسانی مطالعہ اور تجزیہ میں یہ کتاب بے حد معاون ثابت ہوگی۔

غزالاں تم تو واقف ہو

شاعرہ۔ ادا جعفری ۲۷۰ صفحات، قیمت ۱۲ روپے

مکتبہ فنون ۴۴ انار کلی لاہور

تبصرہ نگار۔ محسن بھوپالی ۴ ب۔ ۳ ش ناظم آباد کراچی۔

"غزالاں تم تو واقف ہو" ممتاز و منفرد شاعرہ ادا جعفری کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے "شہر درد" اور "میں ساز ڈھونڈتی رہی" کے نام سے شعری ادب کو دو اہم مجموعے دے چکی ہیں۔ تقریباً پچیس برس قبل جب ان کا پہلا مجموعۂ کلام آیا تھا تو پاک و ہند کے ادبی حلقوں نے قدرے تحیّر آمیز تپاک کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ اس وقت تک کم از کم اردو کے شعری ادب میں صنفِ نازک کو شعر و سخن کے میدان میں باقاعدگی سے تسلیم کرنے کی روایات نہیں پڑی تھیں چند ایک کا خال خال ذکر ملتا یا منتشر کلام پڑھنے کو ملتا تھا یا پھر اسلامی ریاستوں سے متعلق بیگمات کے ذوقِ شعری یا چند ایک قدیم دواوین کا تذکرہ ملتا تھا لیکن ادا جعفری نے اپنے پہلے مجموعے سے ہی نہ صرف یہ کہ ادب میں اپنا اعتبار قائم کر لیا تھا بلکہ شعری ادب میں صنفِ نازک کا مقام بھی۔ اور اس طرح بقول ضمیر جعفری ادا جعفری، ہمارے شعری ادب کی "خاتونِ اوّل" ہیں۔

ادا نے "ساز ڈھونڈتی رہی" سے زیرِ نظر کتاب "غزالاں تم تو واقف ہو" تک کا سفر نہایت استقامت کے ساتھ مسلسل فکری اور شعوری ارتقاء کی روشنی میں طے کیا ہے۔ وہ نہ اپنے مضامین کی تکرار کی مرتکب ہوئی ہیں اور نہ ہی موضوعاتی روایتی مضامین کی اسیر نظر آتی ہیں۔ یہ بات میں نے بطورِ خاص اس لیے لکھی ہے کہ چند ایک شعراء کو چھوڑ کر ہمارے صفِ اوّل کے بیشتر شعرا اپنے قائم کیے ہوتے دائروں ہی میں محوِ سفر نظر آتے ہیں شاید اس لیے بھی کہ اب ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ یا بہ الفاظ دیگر وہ اپنے "شعری امکانات" ختم کر چکے ہیں۔

ادا کے یہاں ہمیں موضوعات کی تازگی بھی ملتی ہے اور شعری سرشاری بھی۔ ان کے یہاں شعور کی مدہم لو پر تپ کر فکر کو ایک نیا روپ ملتا ہے۔ ان کا لہجہ کبھی کبھی اداس ضرور ہو جاتا ہے لیکن یاسیت زدہ نہیں ہے۔ اس لہجے کے پسِ پردہ رجائیت کی ہلکی ہلکی شعاعیں جھانکتی نظر آتی ہیں۔ مسجدِ اقصیٰ میں جو ان کی ہی نہیں بلکہ اردو ادب کی ایک اہم نظم ہے ہمیں یہی لہجہ کارفرما

نظر آتا ہے۔ "رنگ کے روپ ہزار" "اے مصحفِ سادہ" اور "دلِ ضدی ہے" ان کے اسی لہجے کی غماز ہیں جو کبھی دھیما ہو جاتا ہے اور کبھی تیکھا۔

ادا جعفری کی گرفت نظم اور غزل دونوں پر یکساں اور بھرپور ہے اور وہ ہر دو اصنافِ سخن کی مقبول شاعرہ ہیں۔ غزل میں زبان و بیان کی روایتی پاسداری کے ساتھ ساتھ وہ لفظوں کو نئی تراکیب اور نئی طرزِ ادا بھی دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

سب سے بڑا فریب ہے خود زندگی ادا   اس حیلہ جُو کے ساتھ ہیں ہم بھی بہانہ ساز

ہاتھ کانٹوں سے کر لئے زخمی   پھول بالوں میں اک سجانے کو

تم اس دیار میں انساں کو ڈھونڈتی ہو جہاں   وفا ملے تو یہ احساسِ مجرمانہ ملے

یارب مجھے بتا کہ مرے عہد کا مسیح   اپنی صلیب آپ کہاں تک اٹھائے گا

یہ کیسا جبر ہے حدِ نگاہ بھی تم ہو   نظر اٹھا کے جو دیکھوں نظر نہ آؤ مجھے

ہم اتنے دور کہاں تھے کہ پھر پلٹ نہ سکیں   سوادِ شہر سے کوئی صدا نہیں آئی!
بس ایک بار منایا تھا جشنِ محرومی   پھر اس کے بعد کوئی ابتلا نہیں آئی

لکھا گیا مجھے آوازِ خامشی کی طرح   خود اپنا عکس، بنوں سایۂ ہنر میں رہوں

"غزالاں تم تو واقف ہو" نہایت سلیقے سے شائع کیا گیا ہے۔ خوبصورت کتابت و طباعت اور صادقین کے حسین سرورق نے اسے مزید جاذبِ نظر اور جالبِ توجہ بنا دیا ہے۔

مصنف: حضرت عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ
مترجم: سید محمد فاروق قادری

فتوح الغیب

قیمت پندرہ روپے
المعارف ' گنج بخش روڈ لاہور۔

تبصرہ نگار مہدی علی صدیقی اسلامیہ کالج (شام) جگر مراد آبادی روڈ کراچی

فتوح الغیب کا یہ مجلد اور دیدہ زیب ایڈیشن عمدہ ترجمہ کی کمی کو بہ احسن وجوہ پورا کرتا ہے۔ جو لوگ تصوف سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لیے فتوح الغیب ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے لیکن راقم الحروف جیسے مبتدی اور قدرے بدعقیدہ لوگوں کے لیے بھی یہ کتاب ایک ایسی تصنیف ہے جو بدعقیدگی کے علاج کا موثر نسخہ ہے۔ تصوف ایسا علم اور مجموعہ اعمال ہے جو غالباً ہر عہد میں ایک نئے رنگ میں ظاہر ہوا۔ لیکن اگر تصوف کی بنیادی خصوصیات قرآن اور سنت سے ماخوذ اور تزکیۂ نفس کے ذریعے علم کی وسعت اور عمل کی پاکیزگی پر منحصر ہیں (اور یقیناً یہی صورت صحیح ہے) تو بیشتر زندہ صوفیوں کے احوال ظاہری اور مشہور و معروف ائمہ تصوف کی سوانح عمریوں نے تصوف پر اتنا گہرا پردہ ڈال رکھا ہے کہ ہماری بدعقیدگی کی ذمہ داری تنہا ہم پر نہیں رہتی۔ ذرا خیال فرمایئے کہ اللہ کے اسم اعظم کے ساتھ تعالیٰ یا جل شانہ' اور محمد رسول اللہ کے مبارک نام کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم کافی ہے مگر دوسرے صوفی بزرگوں کے نام کے ساتھ دو دو سطروں کے القاب' ان کے خرق عادت کے طور محیّر العقول کارنامے' ان کی ریاضت کے حیران کن واقعات' جن کی کوئی سند نہ قرآن میں ہے نہ سنت میں' حتیٰ کہ مرشدوں کی طرف سے تکلیفات فرائض اور سنت سے سبکدوشی کی اجازت' کیا کسی طرح قابل قبول ہو سکتی ہیں۔ اگر دھمال عبادت ہے اور قبور سے مرادیں ملتی ہیں اور ترک لذات حلال شروع روحانی ترقی کے ضامن ہیں تو ہندو سنیاسی بھی کافی حد تک راہ راست پر ہیں۔ ان نیرنگیوں کا پردہ فتوح الغیب کے مطالعے سے چاک ہوتا ہے۔ جس میں معیار عمل سنت رسول ہے اور احتیاط عمل قابل فہم طریقے پر تجویز ہوتی ہے۔ قرآنی آیات کے مفہوم اور منشا کو سمجھا کر حقائق ایمان و عمل کی تشریح کی گئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض مقامات ہم جیسے مبتدیوں کو مشکل معلوم ہوتے ہیں لیکن تشفی نہ ہونے کی وجہ ہماری ہی کم علمی محسوس ہوتی ہے مجھے تو سیرت شیخ عبدالقادر کا یہ واقعہ یاد ہے

کہ آپ نے اپنے ایک شاگرد اور مرید کو کوئی فرق عادت مشاہدہ کرا کر قائل نہیں فرمایا بلکہ صرف اس قدر پوچھا کہ اس نے آپ کی عرصہ دراز ہمراہی اور ہم رکابی کے باوصف کوئی ایک عمل آپ سے خلافِ سنتِ رسول سرزد ہوتے دیکھا۔ کیا یہ پابندی انسانی کمزوریوں کے مقابلے میں خود فرقِ عادت سے کچھ کم ہے۔ اس پاک راستے سے گریز، فرق عادت اور مافوق البشریت استعداد پر زور اور یہ اصرار کہ اللہ اپنے بندوں کو بعض طاقتیں عطا کرتا ہے اور وہ سب کچھ اپنی دعا سے کرالیتے ہیں ایسی بدعات کا دروازہ کھول دیتا ہے جو مذہب کو ازمنۂ وسطیٰ کی عیسائیت اور یہودیت کی روایات پسندی تک محدود کر دیتی ہیں۔ ان بدعات اور روایات پرستی ہی کو دیکھ کر تو مارکس نے کہا تھا کہ مذہب عوام کے لیئے افیون کا کام دیتا ہے۔ اللہ اسلام کے خدّام کو اس قسم کی تبلیغ اور عمل سے محفوظ رکھے۔

سید نظر زیدی — **گلشن اخلاق** — صفحات، قیمت بارہ روپے

ٹیکنیکل پبلیشرز، اردو بازار لاہور

تبصرہ نگار مہدی علی صدیقی

سید نظر زیدی صاحب نے دیباچے میں لکھا ہے کہ گو اسلام ایسے مذہب کی پیروی کا ادعا ہر مسلمان کو ہے مگر مسلمانوں کی اکثریت "مشرکوں سے زیادہ بے اصول اور بداخلاق" نظر آتی ہے۔ اس عیب کے دور کرنے کے لیے وہ نصیحت اور وعظ کے طریقے سے ہٹ کر اصول اخلاق کو تاریخ اسلام اور اسلاف کے مستند واقعات سے واضح کرنے کا فریضہ ادا کرنا چاہتے ہیں اور انھوں نے بڑی محنت سے پونے دو سو صفحات کی اس کتاب میں ایسے واقعات اور حکایات جمع کی ہیں۔ بے شک یہ بہت اچھی کوشش ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ اس کتاب میں "گلستان" جیسی سبق آموزی ہے نہ شیرینی مگر یہ بھی صحیح ہے سعدیؒ جیسا نابغہ صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ پھر بھی نہ صرف بچوں کے لیے بلکہ ایسے بظاہر بالغ مسلمانوں کے لیے جو تاریخ اسلام اور صحابہ رسولؐ کے حالات سے دور کا رسمی تعارف رکھتے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید رہے گا۔ اس سلسلے کو اور آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

کلامِ حیدری

صفر

قیمت - بارہ روپے
کلچرل اکیڈمی گیا بھارت

تبصرہ نگار عتیق احمد ۱۹۵ (آر) بلاک پندرہ دستگیر سوسائٹی کراچی ۳۸

"صفر" کلامِ حیدری کے سولہ افسانوں کے مجموعے کا نام ہے جسے کلچرل اکیڈمی، گیا (بھارت) نے ستمبر ۱۹۷۴ء میں شائع کیا ہے۔ کلامِ حیدری بھارت کی اردو افسانہ نگاری میں تقسیمِ ہندوستان کے بعد (بلکہ خاصے بعد) ابھرنے والے نئے افسانہ نویسوں میں ہیں، لیکن انھوں نے اپنی محنت اور تسلسل کے ساتھ لکھنے کی بنا پر بہت جلد اپنا نام اور مقام پیدا کر لیا ہے۔

زیرِ نظر مجموعے کے سولہ افسانوں میں ہیئت، اسلوب، افسانہ نگاری کے قدیم اور جدید تر طرزِ نگارش اور انتخابِ مواد کے اعتبار سے خاصا تنوع ہے۔ اس زاویہ سے کلامِ حیدری کی افسانہ نویسی کے فن پر وسیع نظر اور بدلتے ہوئے اسالیب سے اچھی واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً 'سنی' 'واپسی' 'اُدھار' 'اپنی آوازیں' اور 'کس کی کہانی' ہمارے یہاں کے عام مروجہ (جسے اب جدیدیت پسند نسل "لگی بندھی تکنیک" کہنے لگی ہے) انداز افسانہ نویسی میں لکھے گئے ہیں، اور باقی کی دس گیارہ کہانیاں جدید تر اسلوبِ نگارش برتنے کی کوشش کا پتہ دیتی ہیں ان (یعنی موخر الذکر) افسانوں میں تاثریت، رپورتاژ، مونولاگ (خود کلامی) رمزیت اور کہیں کہیں شعوری رَو کے تحت لکھے جانے والے افسانوں کی نئی چلتی تکنیک برتی گئی ہے۔ ایسے افسانوں کی مثال "عنابی کانچ کا ٹکڑا" "درد" "واپسی" "روشنی" "لا" اور "صفر" ہیں۔ جہاں ایک ہی افسانہ میں بیک وقت ایک سے زیادہ تکنیک کو برتنے کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ تمام موخر الذکر افسانہ نگار کی LOUD THINKING کے تسلسل کی مختلف کڑیاں ہیں جن کے توسط اور سہارے سے وہ اپنی گرد و پیش کی فضائیں موجودہ بھارت کی جدید نسل کے بدلتے ہوئے اندازِ فکر، رفتار و گفتار اور طور طریقوں کا مطالعہ اور تجزیہ کرتا ہوا ملتا ہے۔ چنانچہ اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ بھارت بھی "جدیدیت" کے اُس

عالمی بحران سے گزر رہا ہے جس میں فضا' انسان' انسانی قدریں' رسم و رواج کے پرانے سانچے اُکھڑے اُکھڑے اور بے سمت ہوتے جا رہے ہیں۔ (مثلاً صفر کی فضا)۔ اپنی زمین سے اس زندگی کی جڑیں ڈھیلی پڑتی جا رہی ہیں جو پرانے تہذیبی سرمائے کے چھتنار درختوں کو شادابی اور تازگی بخش غذا بہم پہنچا رہی تھیں۔ "عنابی کانچ کا ٹکڑا"۔ "بالو"۔ "بھیک"۔ "درد آمیز" اور "تلاش" اور "حادثہ" کی کرب آمیز اور کرب انگیز فضا کی ہمیت اور سمومیت نے یوں لگتا ہے کہ اپنے اندر بسنے والے گوشت پوست کے جیتے جاگتے کرداروں کو نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ سیاسی اور سماجی افراتفری اور اُتھل پتھل فضا نے سارے کرداروں کو بے رنگ و بو اور مسخ شدہ چہروں کا انبار بنا دیا ہے' جن کے گرد فکر و نظر کے خرابے آباد ہیں اور آندھیوں اور بحرانوں کے سیاہ جھکڑ چل رہے ہیں اور نہ آگے بڑھنے کا راستہ مل رہا ہے' نہ پیچھے کی طرف لوٹ جانے کے لیے سمت بدلنے کی سکت باقی ہے۔

مروجہ تکنیک میں لکھے جانے والے جن پانچ افسانوں کے طور پر نشاندہی کی گئی ہے اُن میں بھارت کی پرانی یا عمر رسیدہ نسل کے چہروں اور کرداروں پر سے نقاب اٹھایا گیا ہے' جو بدلے ہوئے حالات اور منقلب فضا سے بے خبر (بے نیاز نہیں) اپنی دنیا اُس دنیا میں مگن ہے' جس میں سیاسی اور تجارتی خود غرضیاں' نفع اندوزیاں اور ایک دوسرے کو اپنی راہ سے ہٹا کر سب کچھ بٹور لینے کے لیے صدیوں پرانی چالبازیاں اور مکر و فریب کی چالیں چلی جا رہی ہیں۔ (مثلاً "تلاش" اور "اپنی آوازیں" ہیں) یا پھر حصولِ زر اور حصولِ اقتدار کے لیے انڈین سول سروس کے امتحانات کی دُھن ہے (مثلاً واپسی)۔ ان میں سے ایک افسانہ "کس کی کہانی" ان پانچوں کہانیوں میں سب سے الگ ہے جو ہندوستان کی تقسیم کے بعد اُس مسئلہ سے متعلق ہے' جو دوسروں کے آر پار تقسیم ہو جانے والے خاندانوں میں بُعد اور جدائی سے پیدا ہوا تھا۔

اس طرح سے یہ مجموعہ موجودہ بھارت کی اُن تصویروں کا (بڑی حد تک) البم بن جاتا ہے جسے اس کے اندر بسنے والے حساس اور باشعور لکھنے والے نے بڑی محنت' دیانت داری اور جگر کاوی سے مرتب کیا ہے۔ اس البم کی ہر تصویر واضح' جاندار' متحرک اور اصل زندگی رنگ (یا بدرنگی)

اور خوشبو (یا بے بوئی) لیے ہوتے ہے۔

ان افسانوں کا خاص پہلو یہ ہے کہ جس طرح سے ہمارے یہاں جدید نسل کے لکھنے والے گرد و پیش کی مسموم فضا کو پورے انہماک اور بڑے ذوق و شوق سے چھوٹی سی چھوٹی جزویات کے ساتھ قلم بند تو کر دیتے ہیں لیکن اس بحران سے نکلنے کی کسی جدوجہد (یا کم سے کم کوشش ہی سہی) کا اشارہ تک نہیں کر پاتے۔ کلام حیدری کے افسانوں کو پڑھ کر بھی یہی احساس ہوتا ہے کہ بعارت میں بھی نئے لکھنے والوں کو یہی فکری crisis اپنی گرفت میں لیے ہوتے ہے۔ تاہم حالات سے باخبری اور تکنیک کے تجربوں کے لحاظ سے یہ مجموعہ اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔

خاک نشیں

مصنف مرزا ادیب ۱۴۴ صفحات دس روپے

تبصرہ نگار م ح نسیم ۲۶۹۔ این سمن آباد لاہور

اردو ڈرامے کی تاریخ بڑی مختصر ہے۔ اس مختصر مدت میں کوئی ایسے خاص نشیب و فراز بھی نہیں آئے۔ جن سے اس صنف ادب میں ہلچل پیدا ہوتی یا اسے دیگر جدید اصناف کی طرح امواج کی نوید ملتی ہے۔ جب اردو ڈرامے کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو سب سے پہلے جو نام اُبھرتا ہے۔ وہ آغا حشر کاشمیری کا ہے۔ ڈرامے کے مختصر سے ابتدائی دور میں بلندی پر پہنچنا اور پھر روایت بن جانا آغا حشر ہی کا کام تھا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اردو ادب میں فنِ تمثیل نگاری دفن ہو گیا تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ متاخرین نے اردو ڈرامے کی وہ خامیاں دُور کرنے کی بھی کوشش کی جو حشر کے دور میں خامیاں تصور نہیں ہوتی تھیں۔ فنِ تمثیل نگاری کو جن لوگوں نے اپنی محنت شاقہ سے جلا بخشی ان کی فہرست بڑی ہی مختصر ہے۔ اس فہرست کے پاکستانی حصے میں ایک نام بڑا ابھرتا ہے اور وہ ہے میرزا ادیب کا۔

میرزا ادیب سید امتیاز علی تاج سے اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ تاج کے زیادہ تر

ڈراموں کا پلاٹ یا تو غیر ملکی رہا ہے یا پھر اردو اور فارسی ادب میں وہی کہانیاں پہلے سے موجود تھیں۔ تاج کی اپنی تخلیقات بھی موجود ہیں اور یہیں میرزا ادیب ان سے منفرد ہیں۔ اگر حقیقت پسندانہ انداز میں اردو ڈرامے کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ حشر کے بعد میرزا ادیب نے اردو ڈرامے کو بہت کچھ دیا اور اردو کے ادبی سرمائے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

پاکستان میں اگر کسی ادیب نے صحیح معنوں میں ڈرامے کی خدمت کی ہے تو وہ میرزا ادیب ہیں۔ جن کی زندگی اس دشت کی سیاحی میں گزری ہے۔ وہ اب تک سیکڑوں ڈرامے لکھ چکے ہیں اور ابھی لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے افسانوں سے ڈراموں تک کا فاصلہ بڑی تیزی سے طے کیا، اور اب وہ صرف ڈرامے کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور ڈرامہ ان کا۔

میرزا ادیب کے تازہ ڈرامے دو مجموعوں کی صورت میں مارکیٹ میں آچکے ہیں اور ادبی حلقوں میں پسند بھی کیے گئے ہیں۔ یہ ہیں۔ پس پردہ اور خاک نشیں۔ خاک نشیں تازہ ترین مجموعہ ہے۔ اس میں تین ڈرامے شامل ہیں "خاک نشیں" "لفظ اسیر سا ز اور ستون" میرزا ادیب زندگی کی راہوں پر آنکھیں کھول کر چلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں جیتی جاگتی زندگی کی پرچھائیں ملتی ہیں ۔ ان کے کردار معاشرے کی زندہ حقیقی کردار ہیں انسان ہیں، خطاکار ہیں مگر انسانیت سے بے نیاز نہیں۔ ان کی کہانیاں لاکھوں افراد کی کہانیاں ہیں۔ ان کے ڈراموں کے مکالمے برجستہ اور فطری ہیں۔ ڈراموں میں پیش کردہ ماحول حقیقت سے قریب اور جدید نظریات کے عین مطابق ہے۔ ان کے کرداروں میں تصنع یا غیر فطری پن نہیں۔ اور وہ جعلی انسان محسوس نہیں ہوتے۔ خاک نشیں کے تینوں ڈرامے زندگی کے مسائل سے عبارت ہیں۔ ان مسائل پر اور زندگی کے نشیب و فراز پر مصنف کی نظر کس حد تک پڑی ہے اس کا جواب ڈرامہ "ستون" ہے۔ روزمرہ زندگی اور معاشرت کا انھوں نے کس حد تک احاطہ کیا ہے اور پنجاب کی دیہی زندگی، تعلیمی ماحول، دفتری حالات، اور فنون لطیفہ سے رغبت کا جو نقشہ ڈرامہ خاک نشیں میں کھینچا گیا ہے وہ صدائے حقیقت ہے۔

ڈرامے کے ماحول میں قاری خود کو اجنبی محسوس نہیں کرتا بلکہ خود تمثیل کا ایک کردار ہی تصور کرنے لگتا ہے۔ اور یہ مصنف کا کمال ہے۔ جدید ماحول میں فن کاروں کے شب و روز کس طرح گزرتے ہیں۔ فنون کس طرح ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور کیسے روزمرہ زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کو نقوش میں بھر لیتے ہیں۔ اسے لکیروں میں قید کر لیتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود زندگی کیوں ہار جاتے ہیں۔ ان سوالوں کا جواب "نغمہ اسیر ساز" میں ملتا ہے یہ ایک فن کار کا نغمہ ہے جو اس کے دل کے تار جھنجھنانے سے فضا میں رقص ہوتا ہے۔ یہ فن کار خود مرزا ادیب بھی ہو سکتے ہیں جو خونِ دل میں انگلیاں ڈبو ڈبو کر عجب ساز تمثیلیں لکھ رہے ہیں:

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

خاک نشین کے تین ڈرامے ہمارے ماحول ہمارے مزاج اور ہماری زندگی کی صحیح عکاسی کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کو میر کے بہتر نشتروں کی طرح متاثر کرتے ہیں۔ تمثیلوں کی زبان نہایت شستہ صاف ستھری اور عام فہم ہے۔ مگر عامیانہ نہیں۔ خیالات احساسات یا جذبات کو مرزا نے بڑی مہارت اور چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ ان کی زبان میں نغمگی ہے مکالموں میں موسیقی اور شعریت ہے۔ دلچسپی ہے تسلسل ہے مقصدیت ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ چونکہ انسانی ردِعمل اور کردار کے گرد گھومتے ہیں۔ اس لیے ان میں آفاقیت بھی ہے۔ خاک نشین کے ڈراموں کے لیے سرورق نوجوان آرٹسٹ ارشد کمال نے تیار کیا ہے جو سونے پر سہاگہ ہے سفید کاغذ پر خوبصورت چھپائی کے ساتھ مکتبہ عالیہ لاہور کی شائع کردہ یہ کتاب صرف دس روپے میں ہر لائبریری کی زینت بن سکتی ہے۔

جدید اردو ڈرامے کی ترقی میں اور ادبی ذوق کی بہ لئے خاک نشین بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس اہمیت کے پیش نظر قیمت کوئی حقیقت نہیں رکھتی ۔

ادارت حکیم یوسف حسن، سلطان رشک
۸ محمدی مارکیٹ نرنکاری بازار، راولپنڈی۔

۲۲۵ صفحات پندرہ روپے
اردو کانفرنس نمبر

نیرنگ خیال

تبصرہ نگار م ط ح

نیرنگِ خیال کا یہ ۵۲ واں سالِ اشاعت ہے اور پانچ سو چھپترواں شمارہ اردو کانفرنس نمبر ہے۔ ایک نسل جتنی مدت میں بوڑھی ہوتی ہے وہی اس قابلِ قدر جریدے کی عمر ہے جو بجائے خود ایک کارنامہ بلکہ ادارت طباعت اور اشاعت کے حالات کو دیکھتے ہوئے ایک معجزہ ہے۔ جرائد کی تاریخ میں نیرنگِ خیال کا بلند مقام متعین ہو چکا ہے۔ اس موضوع پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ زبان و ادب سے لگاؤ اور تعلقِ خاطر اس کا دیرینہ مسلک۔ زیرِ نظر شمارے میں اکابرین کے فکر انگیز مضامین اور معلوماتی مقالے، درس و تدریس، علاقائی زبانوں سائنسی علوم، ثقافت پر دلچسپ نگارشات اور ۲۳ تصاویر ہیں۔ اردو کانفرنس نمبر ہر لحاظ سے ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

ادارت اختر پراچہ۔ بدر پراچہ
دفتر ہمدم ہفت روزہ کوہاٹ

۲۰۸ صفحات دس روپے
اختر نمبر

ہمدم

تبصرہ نگار م ط ح

کوہاٹ کے ادیب، صحافی اور شاعر غلام حید اختر کے تعلق سے یہ اختر نمبر دس سال پرانا اور اگست ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا ہمیں اب دستیاب ہوا ہے تبصرے کا وقت مدت ہوئی گزر گیا مگر ہم یہاں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کوہاٹ جیسے دور دراز مقام پر بھی اردو دوستوں کی کوئی کمی نہیں۔ اس قسم کی اشاعتوں سے زبان و ادب کو فائدہ پہنچتا ہے اور متعلقہ عہد کی یادیں محفوظ ہو کر تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔

ایڈیٹر عبدالسمیع بوہیرے
جامع مسجد بلڈنگ بلاسس روڈ
بمبئی نمبر ۸

صبح امید

جلد ۳۹ شمارہ ۱۰ - ۱۱
زرسالانہ بارہ روپے
یہ نمبر دو روپے

تبصرہ نگار م ظ ح

غالب لائبریری ناظم آباد کراچی ۱۸

بڑے سائز کے سوا سو صفحات کا یہ شمارہ بہ اعتبار قیمت بہت سستا ہے ۱۹۳۶ء سے شائع ہو رہا ہے اور اس مدت میں اس نے کتنے ہی انقلاب دیکھے اور بار بار مالی بحرانوں سے گزرا ہوگا لیکن جیسا کہ ایڈیٹوریل میں لکھا ہے "چالیس سال کے اس عرصے میں کتنے ہی شاندار نکلنے والے پرچے ختم ہوئے۔ ان میں وہ بھی معاصر تھے جن کی پشت پر بڑی طاقت تھی۔ سرمایہ تھا اور پروپیگنڈا بھی۔ آج کی نسل تو شاید ان کے ناموں سے بھی واقف نہیں"۔ ہم 'صبح امید' کو اس کی چالیسویں سالگرہ پر مبارکباد دیتے اور اس کی درازی عمر کی دعا دیتے ہوئے اپنے اشتراک کا یقین دلاتے ہیں۔

ادارت شمیم احمد عتیق اللہ
پوسٹ بکس ۲۷۔ اورنگ آباد
ہند۔

غبار خاطر

۲۳۲ صفحات ۵ روپے
سالانہ چندہ ۲۰ روپے

تبصرہ نگار م ط ح

چوتھا شمارہ غبار خاطر کی ترقی کی نشاندہی کرتا ہے۔ یاد رفتگان کے عنوان سے ن م راشد کی یاد تازہ کرتے ہوئے عتیق اللہ نے ان کے شعری رویے پر مفید مضمون لکھا ہے۔ راشد کی تین نظموں کے علاوہ باقی کی ایک اثر انگیز نظم اور حسن فرخ کا نذرانۂ راشد شامل ہے۔ شمیم احمد کا مضمون جوگندر پال کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ ہے۔ مسز کرشنا پال نے جوگندر پال کے تعلق سے جو جھلکیاں جمع کی ہیں ان سے جوگندر پال کی پرکشش شخصیت کو تلاش کرنے میں سہولت ہوئی۔ دوسرے مشمولات بھی دلچسپ ہیں البتہ کتابت اور طباعت کی طرف زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

یونیورسٹیوں اور کالجوں کے رسائل

غالب لائبریری پہلا اور واحد کتب خانہ ہے۔ جہاں یونیورسٹیوں اور کالجوں کے رسائل نہ صرف محفوظ کیے جا رہے ہیں بلکہ انھیں نہایت اہتمام کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ ان کی ارغوانی رنگ کی جلد بنوائی جاتی ہے تاکہ وہ دوسرے رنگ کے مجلّد جرائد سے بالکل مختلف نظر آئیں۔

ہم یونیورسٹیوں کے محترم وائس چانسلر صاحبان اور کالجوں کے مشفق پرنسپل صاحبان سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنے اپنے اداروں کے جرائد کے زیادہ سے زیادہ شمارے عطا کر کے غالب لائبریری کو اور زیادہ معتبر اور موقر بنائیں۔ شکریہ

غالب لائبریری پوسٹ بکس ۲۲۶۸ ناظم آباد کراچی ۱۸

نامے مرے نام آتے ہیں

جوابات ڈاک کے ذریعہ ترتیب تاریخ وار اور جن خطوط پر تاریخ نہ ہو وہ آخر میں۔ بعض خطوط دیر سے موصول ہوتے ہیں یا موصول شدہ خطوط کی کتابت کے بعد اس لیے وصولی اور اشاعت کی تاریخ میں فصل ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مدیر

گورنمنٹ ڈگری کالج
لورالائی بلوچستان

خورشید احمد افروز

۲۵ر ستمبر ۱۹۷۵ء

مورخہ ۷/۹/۷۵ء کو ایک خط غزل کے ساتھ ارسال خدمت کیا تھا میں نے اس میں اپنی چند مجبوریوں کا ذکر کیا تھا۔ ابھی ایک دو دن گزرے ہیں کہ کوئٹہ سے میرے پاس کافی مواد پہنچا ہے اور کچھ افراد نے عید کے بعد مجھے اپنا کلام مع ترجمہ ارسال کرنے کی پیش کش کی ہے اس لیے انشاءاللہ عید کے بعد کے دونوں بلوچی مقالے لکھوں گا۔ اس وقت میرے پاس پشتو ادب کے بارے میں ایک مضمون موجود ہے (۱) پشتو اور اردو کا رابطہ۔ (۲) اردو اور علاقائی زبانوں کا ساتھ۔ یہ مضامین میں نے ابھی تک کہیں نہیں بھیجے ہیں۔

دوسرا خط

۳۱ر دسمبر ۱۹۷۵ء

بخاری نمبر موصول ہو گیا۔ آپ نے جس محنت، جانفشانی اور مہارت سے بخاری نمبر ترتیب دیا ہے وہ قابل داد ہے۔ اس سلسلے کا ایک مضمون نہ کہ کسی سے بخاری نہیں رطنے میں

پورے نمبر کی جان ہے۔ اتنی عجلت میں ایسا نمبر ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

۲۳ کشمیری بلڈنگ
مجاس روڈ جوگیشوری بمبئی ۲۵ نومبر ۱۹۷۵ء

آپ کا ۲۷ اکتوبر کا خط مجھے ۲۰ نومبر کو ملا۔ یہ معلوم کرکے بے حد خوشی ہوئی کہ فیض صاحب کی ۶۵ ویں سالگرہ منائی جانے والی ہے اور ان کے لیے ادبی ارمغان بھی تیار ہو رہے ہیں۔ آپ پسند فرمائیں تو میں سعدی کی غزلیات پر لکھوں۔ بہت دن ہوئے میں نے "فیض بمبئی میں" کے عنوان سے ایک مضمون غالب کے لیے روانہ کیا تھا۔ اس درمیان ہند وپاک کے رسل و رسائل میں پھر سے کوئی رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مضمون آپ تک پہنچا بھی کہ ڈاک کی نذر ہو گیا۔ اگست میں میری ایک کتاب "لکھنؤ کی لسانی خدمات" شائع ہوئی تھی۔ باوجود شدید خواہش کے وہ بھی میں آپ کو بھیج نہ سکا۔

دوسرا خط

۸ جنوری ۱۹۷۶ء

میں نے وعدے کے مطابق سعدی کی غزل پر لکھنا شروع کر دیا ہے جلد ہی آپ کو بھیج دوں گا سردار جعفری سے ذاتی طور پر نہ مل سکا البتہ فون پر ان سے بات چیت ہو گئی ہے وہ بھی اس ڈر سے کہ ان کا مضمون آپ تک پہنچ نہیں پائے گا اب تک کچھ لکھ نہ سکے تھے۔ میرے اطمینان دلانے پر لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔ وعدہ پورا ہوگا۔ ظ صاحب سے یونیورسٹی میں ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ میں نے آپ کے خط کا حوالہ دے کر انھیں ان کا وعدہ یاد دلایا ہے۔ مجھ سے بھی وعدہ کیا ہے کہ ضرور لکھیں گے۔ میں نے اپنے ایک باذوق دوست ایوب واقف سے سردار جعفری پر مضمون لکھنے کی درخواست کی ہے وہ لکھ رہے ہیں۔ میں نے "لکھنؤ کی لسانی خدمات" کی ایک کاپی آپ کے پتے پر پوسٹ کر دی ہے۔ دیکھیے وہ آپ تک پہنچ بھی پاتی ہے کہ نہیں۔ تلاش میں ہوں کہ

کوئی پاکستان جانے والا ملے تو دستی ہی بھیج دوں۔ کتاب کی یہاں کافی قدر ہوئی۔ اب تک آٹھ دس اچھے تبصرے شائع ہو چکے ہیں۔ کل ظ انصاری صاحب سے ملاقات ہوئی تھی معلوم ہوا کہ انھوں نے خسرو پر ایک مضمون آپ کو بھیج دیا ہے۔

اوپن یونیورسٹی
اسلام آباد

ڈاکٹر اسد اریب

۱۰ دسمبر ۱۹۷۵ء

پاکستانی ادب لاہور اور کراچی کے خانوں میں ضرور تقسیم ہو گیا ہے۔ لیکن کچھ لوگ ابھی ایسے ہیں جو ادب کی مجموعی رفتار ترقی سے باخبر ہیں۔ آپ کو بھلا کون نہیں جانتا اور آپ نے غالب کے سلسلے سے جو کچھ کیا ہے اس کی خبر کسے نہیں؟ میں آپ کو "مرزا غالب والے ظفر الحسن" کی حیثیت سے بخوبی پہچانتا ہوں۔ کراچی کی ادبی عدالتوں میں آپ کے دائر کردہ مقدمات کا مجھے اخبارات (خصوصاً جنگ) کے ذریعے علم ہوتا رہا۔ پھر آپ نے غالب لائبریری قائم کی، پھر جناب فیض نے آپ کو غالب شناس حلقے کا سرخیل قرار دیا۔ آپ کا سہاہی غالب دیکھتا رہتا ہوں۔ بخاری صاحب کو آپ نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ واقعی ان کا یہی حق تھا۔

تلاش غالب کے سلسلے میں سہ ماہی غالب کا اجراء نیک فال ہے۔ اس رسالے کو بک اسٹال سے خرید کر پڑھتا ہوں۔ پہلا شمارہ بھی تقریباً چھ ماہ قبل میرے [illegible] تھا شمس الدین فاروقی، مشفق خواجہ اور جناب فیض کے مضامین پسند آئے۔

۹ جی ایف ۶/۲ گیارہویں سڑک
اسلام آباد

اختر جمال

۲۴ دسمبر ۱۹۷۵ء

بخاری صاحب کی یاد میں جو مضامین لکھے گئے ہیں وہ بہت پسند آئے۔ ہم لوگوں (سننے والوں) کے لیے بخاری صاحب ایک آواز تھے اور وہ آواز زندہ ہے۔ بخاری صاحب کا مرثیہ پڑھنے کا انداز منفرد تھا۔ ان دنوں مصروفیت بہت زیادہ رہی اس لیے کچھ نہیں لکھا۔ ہاں مجھے ذرا سی فرصت مل جاتے تو میں وہ مضمون مکمل کر کے روانہ کر دوں گی جس میں فیض کے بچپن اور جوانی کی بعض دلچسپ یادیں اور باتیں ہیں۔ لیکن یہ میں ذرا اطمینان سے لکھنا

چاہتی ہوں۔ کہانی بھی کوئی نئی نہیں لکھی۔ فرصت ملتے ہی بہت سی چیزیں لکھنے کا ارادہ ہے۔ ہاں سبط حسن صاحب کی اور آپ کی ان بن کا پڑھ کر افسوس ہوا آخر کیا وجہ ہوئی؟

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

۲۔ ای
اشوک نگر کلکتہ (۷۰۰۰۴۰) ۲۶ر دسمبر ۱۹۷۵ء

چند دنوں پہلے بھائی مشفق خواجہ صاحب کا خط بھی آیا جس میں انھوں نے "غالب" کا ذکر کیا تھا۔ جس طرح آپ نے مضمون کے لیے لکھا ہے انھوں نے بھی غالب کے لیے لکھنے پر زور دیا۔ آپ کا خط آنے کے بعد سے سوچ رہا تھا کہ آخر کیا لکھوں؟ لیکن اچانک لکھنے کے لیے بہت کچھ مل گیا اور وہ دور نہیں بلکہ اپنے گھر میں۔ میں اپنے گھر کی کتابوں اور رسالوں کو صاف کر رہا تھا کہ دل نے کہا کہ اپنی اس گھریلو لائبریری کے سلسلے میں لکھ کر روانہ کر دوں۔ حساب لگایا تو دیکھا اٹھ مضامین اپنے گھر کی لائبریری پر لکھے جائیں تو اچھا خاصا کتاب بن سکتا ہے۔ لیکن اتنا وقت کہاں؟ بہر حال تین مضمون ہوئے ہیں اور تینوں آپ کو بھیج رہا ہوں۔

(۱) چند قدیم اخبارات اور رسالے (۲) جشن غالب اور اس کے بعد (۳) آزادی کے بعد مغربی بنگال کے اخبارات و رسائل کے چند خاص نمبر۔

اگر کراچی میں جناب مسلم ضیائی صاحب ہوں اور آپ سے ملاقات ہو جائے تو ان کو میرا سلام کہیے۔ کئی سال ہوتے ہیں اُن کا کوئی خط نہیں آیا۔ کیسے ہیں؟ بھگوان جانے۔ میرے لائق کوئی ادبی کام ہو تو لکھیے گا انجام دینے کی پوری کوشش کروں گا۔

عبدالسمیع بوبیرے

بلاسس روڈ بمبئی نمبر ۸ ۲۴ر جنوری ۱۹۷۶ء

صبح امید کے تعلق سے آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کے لیے ہم ممنون ہیں۔ غالب جنوری تا مارچ ۱۹۷۵ء ایک دو روز ہوئے ذریعے رجسٹری موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔ اچھا پرچہ ہے۔ تبادلے میں صبح اُمید جاری کیا جا رہا ہے۔ اگر ممکن ہو تو بمبئی تشریف آوری پر اپنے ادارے کی مطبوعات ضرور لایے صبح اُمید میں اُن پر تبصرہ کیا جائے گا اور ہم بھی اپنی مطبوعات تبادلے میں پیش کریں گے۔ صبح اُمید آپ کا اپنا پرچہ ہے ہم سے جو بھی

تعاون ہوگا آپ کے لیے حاضر ہے۔

ڈاکٹر یونس حسنی

۴۶ ادبی کالونی کراچی ۶ — ۲۹ جنوری ۱۹۷۶ء

غالب کا پہلا شمارہ نظر نواز ہوا تھا۔ ایسا معیاری صاف ستھرا اور اچھا پرچہ نکالنے پر بس دعا ہی دل سے نکلی تھی۔ توقع تھی کہ دوسرا پرچہ بھی ملے گا اور میں خود بھی حاضر محفل ہوں گا مگر نہ جانے کیوں آپ نے میرا نام اپنے ذہن سے نکال پھینکا۔ یہ چند سطریں صرف اس غرض سے لکھی ہیں کہ آپ کو اپنی یاد دلا سکوں۔ آپ جس خلوص اور لگن سے کام کر رہے ہیں اس سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

قدرت اللہ شہاب

مکان نمبر اکیس سٹرک نمبر دس
الف ۶ اسلام آباد — ۳۰ جنوری ۱۹۷۶ء

نوازش نامہ مورخہ ۲۲ جنوری موصول ہوا۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ ملازمت کے سلسلے میں میرا حال ہمیشہ نیمے دروں نیمے بیروں کا سا رہا اس لیے کوئی چیز بھی تو نہ نبھ سکی۔ باوجود خواہش اور کوشش کے ادارۂ یادگار غالب کی گرانٹ کا مسئلہ بھی خاطر خواہ حل نہ ہو سکا۔ ابتدائی کارروائی مکمل کر آیا ہوں۔ مزید یہاں پر پرسو کرتا رہوں گا۔ انشا اللہ۔

جریدۂ غالب کا شمارہ نمبر ے (۱) شوق سے پڑھا خاص طور سے صفحہ ۳ اور ۴۔ خسارے پر خسارے کے باوجود اس کام کو نبھائے جانا آپ ہی کا حصّہ ہے۔ لیکن تعجب کا بھی کوئی مقام نہیں۔ وہ غالب ہی کیا جس کا نام اور کام آتے ہی روپلے پیسے کی ریل پیل لگ جائے۔ لیکن یقین ہے کہ غالب کی طرح یادگار غالب کا انجام بھی خوش بختی پہ ہی ہوگا۔

فیض صاحب میرے محترم اور بزرگ ہیں۔ غالب کے فیض نمبر پر ضرور لکھوں گا۔ سست رفتار بہت ہوں۔ اگر تاریخ لگ جائے تو آسانی ہوگی۔ آپ اپنی سہولت دیکھ کر وقت مقرر فرما دیں اور اگر مناسب سمجھیں تو موضوع بھی۔

ناظر باغ کانپور (۲۰۸۰۰۱) **زیب غوری** ۲ر فروری ۱۹۷۶ء

کل برادرم فاروقی صاحب کی معرفت آپ کا موقر جریدہ غالب ملا۔ آپ کی نوازش ہے اور میں ممنون کرم۔ غالب ابھی زیر مطالعہ ہے لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ فیض صاحب کا نام محض ORNAMENTAL نہیں ہے۔ ان کے INEXTANSIBLE- و POTENTIAL کی حرارت غالب کے اوراق میں ہے۔ آپ کے غلام عباس سے میری ملاقات یہاں آہنگ کے تازہ شمارے میں ہو چکی تھی۔ ان کی شخصیت کے مختلف ابعاد کا آپ نے بڑا LUCID جائزہ لیا ہے اور ایک دلچسپ شخصیت کا بڑا ہی دلچسپ مطالعہ ہے۔ حمایت علی شاعر والے مضمون میں جہاں طنزیہ TWISTS پیدا ہو گئے ہیں لطف آگیا۔ گہرے پانی میں آپ آرام سے تیر لیتے ہیں۔ مزاح کی تنک آبی آپ کو راس نہیں آتی۔ حمایت علی کو تو آپ نے پیش کر دیا لیکن شاعر کہاں رہ گئے۔ پرچے میں مجموعی طور پر بڑے دلچسپ گوشے ہیں اور شعر و ادب کے ایک وسیع کینوس پر محیط ہے۔ آپ سے یہ تقاضا کیا جا سکتا ہے کہ غالب کی نسبت کو تازہ رکھتے ہوئے اس جریدے کے ایک آدھ صفحات مستقلاً غالبیات کے لیے مخصوص کر دیجیے (حالانکہ اس شمارے میں بھی اختر جمال کے رپورتاژ نے اس کمی کی بڑی حد تک تلافی کر دی ہے)۔ اس ضمن میں ایک سمت غالب کے انگریزی CONVER - SION کی بھی ہے جس پر ابھی تک معتدبہ کام نہیں ہو سکا ہے اور لوگ اس بھاری پتھر کو چوم کر کترا کے نکل گئے ہیں۔ کلام غالب کے تراجم جو اب تک میری نظر سے گزرے ہیں وہ ایسے نہیں کہ آپ اطمینان کی سانس لے سکیں۔ صرف بہت اچھی انگریزی اور بہت اچھی اردو جاننے سے کام نہیں چلتا۔ اردو شاعری کے رموز و نکات اور ایران سے غزل کے جائز ناجائز تعلقات اور پھر غالب ایسے GENIUS اور بدمعاش شاعر کے بیان کی لذت خدا کی پناہ۔ ان تمام محرکات کو انگریزی زبان کے قالب میں منتقل کرنے کے لیے فیض کے قلم کی گرفت چاہیے۔ فیض صاحب کی مصروفیت کے پیش نظر آپ اگر انھیں اس طرف رجوع نہ کرا سکیں تو کسی ایسی ہی ہمہ صفت شخصیت کی تلاش کیجیے۔ نہ مل سکے تو اللہ سے دعا

کیجیے۔ "ہم تو مجبور تھے اس دل سے" میں فیض صاحب کچھ نا گفتنی باتیں کہہ گئے ہیں کہ

جس میں جز صنعتِ خونِ سرِ پا کچھ بھی نہ تھا

ظفر اقبال اور شاہدہ حسن کی غزلیں بہت پسند آئیں۔

حسب الحکم "غالب" کے لیے اپنی چند غزلیں بھیج رہا ہوں۔ ان میں ایک "مناجات" بھی ہے جو عرب اسرائیل جنگ کے پس منظر میں ہے۔ اس کا حوالہ میں نے اس لیے نہیں دیا کہ اس مناجات کو اور وسیع تناظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے لیکن آپ ضروری سمجھیں تو اس کے پس منظر کا حوالہ دے دیں۔

احمد یوسف

ڈی۔ ۵۸ بی
ساؤتھ ایکس ٹینشن پارٹ (۱)
نئی دہلی (۹ ۴۔۔۱۱)۔

۱۴ فروری ۱۹۷۶ء

میں دلّی سے باہر گیا ہوا تھا۔ کل ہی واپس آیا ہوں۔ یہاں پہنچ کر ڈاک میں ایک بے حد خوبصورت رسالہ نظر آیا۔ یقین جانیے غالب نے متاثر کیا۔ مشمولات میں نے اِدھر اُدھر سے دیکھی ہیں جلد ہی اپنی رائے سے مطلع کروں گا۔ فی الوقت ایک تازہ افسانہ "آگ کے ہمسائے" بھیج رہا ہوں۔ آپ کے حکم کی تعمیل بہرحال ضروری ہے۔ خدا کرے آپ بخیر ہوں۔ فیض صاحب کو میرا سلام پہنچا دیں۔

یوسف ناظم

بمبئی

تاریخ درج نہیں

آپ کے سب تحفے ملے تھے اور میں نے رسید بھی بھیج دی تھی لیکن آپ نے لکھا تھا کہ فروری کے آخر میں یا مارچ کے شروع میں آئیں گے۔ اب ذرا سنہ بھی لکھ بھیجیے۔ ۷۵ء اور ۷۶ء کے فروری تو ختم ہو گئے۔ حضرت وحید نے شاید آپ کو میری نئی کتاب سائے اور ہمسائے بھیج دی تھی۔ اشفاق، مخدوم، ادیب، ڈاکٹر زور اور امجد حیدرآبادی سے متعلق خاکے اور مضامین آپ کو پسند آتے ہوں گے۔ اگر پسند نہیں آتے ہیں تو ہم دونوں میں سے کسی ایک میں اندرونی نقص ہے۔ آپ اپنی کتابیں کسی ذریعہ سے ضرور بھیجیے۔ جوگندر پال کو میں نے آپ کے پرچے دے دیے تھے۔ انھوں نے شاید خط لکھا ہو۔

اصل بات تو میں کہنا بھول گیا۔ یہ میرے دوست ہیں ایوب اولیاء ان کا نام ہے گجرانوالے کے رہنے والے ہیں۔ لندن میں رہتے ہیں اور ہندوستان میں انھوں نے خود کو بیا با ہے اس لیے آپ تصفیہ کیجیے کہ کیا ہیں اور بقول فیض ان کا "اچھا سا نام" تجویز کیجیے۔ لیکھک ہیں۔ حافظہ انھیں کی طرح درست ہے۔ دوستوں کا حلقہ دنیا کی طرح وسیع ہے آپ سے ملنا چاہتے ہیں اس لیے ملنے میں تکلف نہ کیجیے۔

اشفاق حسین کا تو انتقال ہو گیا۔ بے تکلفی، استغنا اور تندرست ہنسی کا ایک دور ختم ہو گیا اب حیدرآباد میں رہا کیا ہے۔ دسمبر میں میں گلبرگہ گیا تھا وہاں جشن سلیمان خطیب تھا۔ یہ حسن بھی آتے تھے، جگر بھی تھے اور زینت ساجدہ بھی تھیں اس دسمبر میں تو میں ریٹائر بھی ہو رہا ہوں۔ لیجیے ایک ہم بھی ریٹائر ہونے لگے۔

عظمیٰ بیکری پورٹ ڈکسن (این ایس)

اعجاز عظمیٰ

باٹو ہ جالالان پانٹائی ملیشیا۔ تاریخ درج نہیں

گزشتہ دنوں میں نے جگناتھ آزاد کا مقالہ بھیجا تھا اُمید کہ مل گیا ہو گا "اوراق" میں سہ ماہی غالب کا اشتہار نظر سے گزرا، اس کو منگانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ براہ کرم مطلع کریں کہ غیر ممالک میں سہ ماہی غالب کو منگانے کے لیے کیا زرِ مبادلہ دینا پڑتا ہے۔ پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کتنے کا بھیجا جائے۔ میری نظمیں و غزلیں ہندوستان کے ان چند ادبی رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں جنھیں میں براہ راست یہاں منگاتا ہوں۔ ملیشیا میں چونکہ کوئی اردو ایجنسی نہیں ہے اس لیے اردو کتابیں اور رسالے پڑھنے کے لیے ہندوستان و پاکستان سے منگانے پڑتے ہیں۔ ایک غزل غالب کے لیے ارسال خدمت ہے۔ اگر غالب کے معیار و مزاج سے ہم آہنگ ہو تو شریک اشاعت فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

بہتا ہوں میں پگھل کے انا کے الاؤ سے — اترو گے پار کس طرح کاغذ کی ناؤ سے
آؤ رخِ سفینۂ افکار موڑ دیں — ساحل تو ڈوبتا ہے مسلسل کٹاؤ سے
دل میں کدورتیں ہوں زباں پر سلام شوق — میں خوش نہیں ہوں ایسے کسی رکھ رکھاؤ سے
ہے رہروانِ شب کے لیے مژدۂ حیات — پھر خون رس رہا ہے مرے دل کے گھاؤ سے

اٹھا جو بزم ناز سے دل بیٹھنے لگا ۔ پارہ اٹھے گا گرمیٔ دل کے دباؤ سے

سونے کا خواب دیکھیے سونا کہاں نصیب ۔ پیتل بکا ہے شہر میں سونے کے بھاؤ سے

اعجاز مجھ سے برسر پیکار دل ہے کیوں ۔ پالا ہے میں نے جس کو بڑے لاڈ چاؤ سے

مرزا بنام مرزا

میاں ایک بات سنو۔ یہ جو تمھارے نام خط آتے ہیں ان پر قلم چلانے کی ضرورت ہے۔ اپنی طرف سے اضافہ نہ کرو صرف اختصار سے کام لو۔ ڈاک کے ذریعے جو جواب دیتے ہو ان میں مکتوب نگاروں سے التماس کرو کہ خطوط میں چند ایک ادبی نکات بھی بیان کریں، کچھ علمی مسائل بھی چھیڑیں، اپنے شہر کی دو ایک خبریں بھی بھیجیں جن کا تعلق ادب اور ادیبوں سے ہو اور مشمولات غالب پر تراجم کرا دو یا تحقیق کر خیال آرائی بھی کریں۔

میں نے سنا ہے غالب لائبریری میں اب تک ساڑھے سات ہزار کتابیں اور بیس ہزار رسالے جمع ہو گئے ہیں۔ ساڑھے چار سال میں مرکزی یا صوبائی حکومت کی کسی امداد کے بغیر آتی کتابوں اور رسائل کا جمع ہو جانا فقط تاثیر ہے مرزا غالبؔ کے نام کی۔ یہ فرمائش تو زیادتی ہو گی اور عملاً ناممکن بھی کہ اس سارے خزینے کی تفصیل شائع کرو۔ البتہ یہ ضرور چاہوں گا کہ ہر سہ ماہی یا ششماہی پر ان نادرات یا معرکہ آراء مطبوعات کی فہرست ضرور شائع کرو جو متذکرہ سہ ماہی یا ششماہی میں حاصل کرتے ہو یا کوئی عطا کرتا ہے۔

یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ تبادلے میں بھیجنے والے رسائل اور تبصرے کے لیے وصول ہونے والی کتابیں غالب لائبریری کی ملکیت ہو جاتی ہیں۔ اور ان سے تعلقے کتب خانے کے ناظرین استفادہ کرتے ہیں۔ اپنے ہم عصر ایڈیٹروں سے کہو کہ سالہا سال سے ان کے پاس جو کتابیں اور رسائل جمع ہو رہے ہیں اس کا تھوڑا سا ہی حصہ غالب لائبریری کو عطا کریں۔ ورنہ تم ان عطایا پر ان مدیروں یا رسائل کے نام کی مہر لگا کر محفوظ کر لو۔

بہ صد شکریہ

میرپور خاص شوگر ملز

دفتر: فوکس ویگن ہاؤس،
بومنٹ روڈ کراچی

ادارہ یادگار غالب کا اشاعتی منصوبہ

حسب ذیل چار کتابیں اس وقت تالیف و ترتیب کے مرحلے میں ہیں۔

نادرات غالب لائبریری

آٹھ ہزار کتابوں کے خزینے میں اردو فارسی عربی سندھی کی کوئی آٹھ سو کتابیں ایسی ہیں جن کا شمار نادر، نایاب اور کمیاب کتابوں میں ہو سکتا ہے۔ ان کتابوں کا مختصر تعارف متعلقہ محققین کے لیے یقیناً سودمند ہوگا۔

اشاریۂ غالب لائبریری

بیس بائیس ہزار شماروں اور پندرہ سو خاص نمبروں میں غالب اور اقبال پر اندازاً دو تین ہزار سے زائد مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ان مضامین کا اشاریہ دو الگ الگ جلدوں میں بعنوان (۱) اشاریۂ غالب لائبریری جلد اوّل غالب (۲) اشاریۂ غالب لائبریری جلد دوم اقبال زیر تالیف ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ غالب اور اقبال پر کام کرنے والے ادیبوں کے لیئے یہ دونوں اشاریئے مفید ہوں گے۔

اشاریہ کلام فیض

جہاں تک ہمیں علم ہے آج تک کسی شاعر کے کلام کا کوئی اشاریہ شائع نہیں ہوا ہے۔ کلام فیض کا یہ اشاریہ محققین فیض کے لیے ہر قسم کے حوالوں کے تعلق سے سہولت بخش ثابت ہوگا۔

ادارۂ یادگارِ غالب کی مطبوعات

(۱) دُودِ چراغِ محفل ۔ پیر حسام الدین راشدی ۔ اٹھارہ رُوپے
غالب کے معترضین، ملاقاتیوں، ہمنواؤں اور شاگردوں کا تذکرہ

(۲) پنج آہنگ ۔ مترجم محمد عمر مہاجر ۔ اٹھارہ روپے
غالب کے ایک سو ساٹھ فارسی خطوط کا ترجمہ

(۳) بزمِ غالب ۔ عبدالروف عروج ۔ پچیس روپے
غالب کے دو سو سے زائد شاگردوں، رشتہ داروں، حریفوں اور دشمنوں کا تذکرہ۔

(۴) غالب کا منسوخ دیوان ۔ مسلم ضیائی ۔ اٹھارہ روپے۔
غالب کے متداول دیوان کا کلام اور مسترد کردہ کلام ایک جگہ کر دیا گیا ہے

(۵) غالب نما ۔ ابن حسن قیصر ۔ سات رُوپے۔
غالب پر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۰ء تک کی مدت میں جو کچھ شائع ہوا اس کا اشاریہ

(۶) غالب، سب اچھا کہیں جسے ۔ پروفیسر کرار حسین ۔ پانچ روپے
غالب اور عہدِ غالب پر تنقیدی مقالہ۔

(۷) تا (۱۱) پروفیسر کرار حسین کی کتاب کے پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو اور بنگلہ تراجم۔

(۱۲) تماشائے اہلِ کرم ۔ مرزا ظفر الحسن ۔ پانچ روپے۔
ادارۂ یادگارِ غالب کی تقریب "تماشائے اہلِ کرم" کی روداد، اخباری کالم وغیرہ۔

(۱۳) ذکرِ غالب، ذکرِ عبدالحق ۔ سحر انصاری ۔ پانچ روپے
مولوی عبدالحق پر شائع کردہ تین سو مضامین کا اشاریہ اور غالب پر بابائے اُردو کے دو مضامین۔

(۱۴) جریدۂ غالب لائبریری ۔ مرتبین: مرزا ظفر الحسن، سحر انصاری، محسن بھوپالی ۔ پانچ روپے
غالب پر مضامین ۔ ادارے کی تقریبات کی رُوداد، لائبریری کی سرگرمیوں کا حال، مضامین
معلومات، منظومات، تصاویر، خطوط، رائیں وغیرہ۔

مدیر اعلیٰ

فیض احمد فیض

غالب

سہ ماہی

غالب

مدیرِ اعلیٰ: **فیض احمد فیض** بانی و صدر ادارۂ یادگارِ غالب

مدیر: **مرزا ظفر الحسن** معتمد ادارۂ یادگارِ غالب

جنوری تا دسمبر [redacted] شمارہ ۳،۴ | آٹھواں اور نواں شمارہ
جنوری تا مارچ ۱۹۷۶ء | جلد ۲ شمارہ ۱ | غالب نمبر ۲۱ دوسرا سالنامہ

ادارۂ یادگارِ غالب

غالب لائبریری، ناظم آباد، کراچی نمبر ۱۸

ادارۂ یادگار غالب

غالب لائبریری

پوسٹ بکس ۲۲۶۸ دوسری چورنگی ناظم آباد کراچی ۱۸

اس شمارے کی قیمت [redacted]

رجسٹری اور ڈاک کا خرچ خریدار کے ذمّے ہوگا

مرزا ظفر الحسن مدیر و ناشر نے کتب پرنٹرز اینڈ پبلشرز لمیٹڈ
ایم اے جناح روڈ، کراچی میں چھپوا کر ادارۂ یادگار غالب، غالب لائبریری
سے شائع کیا

فہرست

مقالے، مضامین

ڈرامہ نگار، ڈرامہ، اداکار

افسانے

ادیبوں کے خطوط

افق تا افق

طنز و مزاح

کتاب اور کتاب خانہ

تبصرے

نامے مرے نام آتے ہیں

ادارۂ یادگارِ غالب

کی

مطبوعات

اور

جریدۂ غالب

کے نئے پرانے شمارے زرِ نقد ادا کرنے کی بجائے

غالب لائبریری

کے لئے پرانی کتابیں اور رسائل کے خاص نمبر دے کر حاصل کئے جا سکتے ہیں

پوسٹ بکس ۲۲۶۸

ناظم آباد چورنگی ، کراچی ۱۸

اداریہ — مرزا ظفر الحسن

معروضہ

میں احسان مند ہوں ان احباب اور اصحاب کا جو فکر مند تھے کہ غالب کیوں نہیں چھپا۔ ادارے کے افلاس و قرض کا راگ الاپوں تو آپ کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ اس راگ میں میگھ ملہار کی تاثیر کہاں جو غالب پر آپ کی، صوبائی حکومت کی یا وفاقی حکومت کی عنایاتِ بے بہا کی بارش ہونے لگے۔ صوبائی اور وفاقی حکومتیں صوبۂ سندھ اور خاص طور سے کراچی کے کئی علمی و ادبی اداروں کی مالی امداد کرتی ہیں جس کے لئے ہم ان کا شکریہ ادا کرتے مگر اس کے ساتھ یہ شکایت کرتے ہیں کہ ادارہ یادگار غالب کے شاندار ماضی اور بے لوث خدمات سے چشم پوشی کرتی ہیں۔ آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ وزارت تعلیم حکومت پاکستان اور صوبۂ سندھ کے متعلقہ محکموں نے آخر وہ کون سا معیار بنا رکھا ہے جس پر ہم پورے نہیں اترتے۔

مالی مشکلات کی وجہ سے اکتوبر ۷۶ء سے مارچ ۷۷ء تک کے دو شماروں کو ملا کر ایک شمارہ مرتب کیا گیا ہے۔ جس میں تنوع بھی ہے اور اعلیٰ معیار بھی۔ کسی رسالے کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ یا تو اشتہارات زیادہ ملیں یا حکومت کی گرانٹ کا کچھ حصہ اس پر صرف کیا جائے۔ ہمیں نہ اشتہارات ملتے ہیں نہ گرانٹ پھر بھی زندہ ہیں۔ وجہ بظاہر یہی ہے کہ مرزا غالب کی طرح قرض لیتے اور اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

حکومت اور حقی

م ظ ع

اب اس بحث میں الجھنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ ترقی اردو بورڈ کے صدر اور سیکرٹری میں جو اختلاف رائے ہوا اور جس کے نتیجے میں شان الحق حقی مستعفی ہوئے اس میں حق پر کون تھا ہم یہ جانتے ہیں کہ بورڈ کی گذشتہ اٹھارہ برس کی شاندار تاریخ ترقی ایک شخص کی رہین منت ہے اور اسے ہم بورڈ کا معمار اعظم سمجھتے ہیں۔ ... شان الحق حقی... جنہوں نے اپنے خون جگر سے آبیاری کر کے بورڈ کو گل و گلزار بنایا۔ اتنی ہی مدت میں ملک کے دوسرے علمی و ادبی اداروں کے سیکرٹریوں اور عہدیداروں نے ہزار ہا اور بلکہ چند ایک صورتوں میں تو لاکھ دو لاکھ روپے تنخواہ کی صورت میں وصول کئے اور اب بھی وصول کر رہے ہیں۔ حقی نے اپنے تمام سرکاری فرائض بہ حسن و خوبی انجام دیتے ہوئے بے تنخواہ کے سیکرٹری کی حیثیت میں بورڈ کی جو خدمت کی ہے وہ اپنی جگہ واحد مثال ہے۔ حکومت کو کسی نہ کسی طور حقی کی اس خدمت کا اعتراف کرنا چاہیئے۔ ہم اعتراف پر اصرار کریں گے اپنی طرف سے اعتراف کی نوعیت کی بابت کوئی تجویز پیش نہیں کریں گے کیونکہ وزارت تعلیم حکومت پاکستان ہی مقتدر ہے اور خدمات کو جانچنے کے بہتر موقف میں بھی۔

اہل اصحاب کی ناقدری اور نااہلوں کی قدر شناسی زہر کی طرح نئی نسل کی رگوں میں سرایت کر رہی ہے۔ اس کا فوری انسداد ضروری ہے ورنہ اس جوان نسل کے بوڑھے ہونے سے پہلے ہر طرف نااہلوں کا راج اور ایسا راج ہرج کا سبب بنے گا۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اب بورڈ کے نئے سیکرٹری مقرر ہوئے ہیں جو بحیثیت ادیب اور استاد ممتاز مقام کے مالک ہیں۔ ہم ڈاکٹر صاحب کو ادارہ یادگار غالب، غالب لائبریری اور جریدہ غالب کے ہر معقول و ممکن اشتراک کا یقین دلاتے ہیں۔

ہمارے معاشرے کی ایک روایت ہے نئے آنے والے کے لئے تالی اور پرانے جانے والے کے لئے گالی ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نہ صرف تالی بجانے والوں بلکہ گالی دینے والوں کو بھی پہچان لیں اور شان الحق حقی ہذیان بکنے والوں کا کوئی نوٹس نہ لیں کیونکہ جمیل الدین عالی کی طرح کتنے عالی ظرف ہیں جو اختلاف کے باوجود حق بات کہتے ہیں۔

جو پڑھا، جو سنا

غالب لاشبیری، ناظم آباد کراچی

[پچھلے شمارے میں فیض کی تازہ نثری تخلیق مہ و سالِ آشنائی کے پہلے باب "تصور" کا ابتدائی حصہ دیا گیا تھا۔ باقی اب پیش خدمت ہے]

اس زمانے میں ہم نے جو کچھ پڑھا اور جو کچھ سنا اس کے مطابق سوویٹ انقلاب اور سوویٹ معاشرے کے خیالی نقشے ذہن میں ترتیب دینے شروع کیے۔ لینن گراڈ شہر، سمالنی انسٹی ٹیوٹ جنگی جہاز آرورا، کریملن کا محل، تاشقند، سمرقند اور بخارا کے قدیم آثار، سفید روسی اور ان کے غیر ملکی حلیفوں کی منظم، تربیت یافتہ پیشہ ور فوجوں سے انقلابی مزدوروں کی نبرد آزمائی جو ہتھیاروں سے زیادہ اپنے زورِ بازو اور جوشِ ایماں کے بل پر لڑ رہے تھے۔ وسط ایشیا میں تو ان معرکوں کا کچھ آنکھوں دیکھا حال ہم اپنے بزرگ دوستوں کی زبانی بھی سن چکے تھے۔ یہ لوگ ۱۹۱۹ء۔۱۹۲۰ء میں خلافت کی ہجرت تحریک کے زیر اثر اپنے گھر بار کو خیرباد کہہ کر اپنے خیال سے جہاد کی خاطر ترکی کو پاپیادہ روانہ ہوئے تھے لیکن وسط ایشیا کی انقلابی سرزمین تک پہنچ کر گھر لوٹنے تک دیں کے ہو رہے۔ ان کی زبانی سنا ہے کہ جب ان کا لٹا پٹا بے سر و سامان، قافلہ کوہ ہندو کش کی برف اور افغانستان کے دشت و دریا سے گذر کر ازبکستان میں داخل ہوا تو اس علاقے میں قدم قدم پہ انقلاب کے حامی اور مخالف مسلح دستوں میں جدال و قتال کا بازار گرم تھا۔ اس جنگ میں مورچوں اور صف بندی کا کوئی سوال نہیں تھا۔ آج ایک علاقہ انقلابیوں کے ہاتھ میں ہے تو کل ان کے دشمنوں کے تصرف میں۔ چنانچہ یہ لوگ کبھی اسیر ہوئے کبھی چھڑائے گئے حتیٰ کہ باقاعدہ سرخ فوج کے کسی دستے نے انہیں اپنی حفاظت میں لے کر بخارا پہنچا دیا۔ جہاں سے امیر بخارا اپنی کنیزوں اور مقبوں کا انبوہ ساتھ لے کر چند دن

پہلے فرار ہو چکے تھے۔ اس یادگار، برہنہ سرگرمیاں چاک قافلے کو امیر ہی کے محل میں ٹھہرایا گیا اور یہ بھی اذن ملا کہ محل کے توشہ خانوں میں خلعتوں فرغلوں اور شال دوشالوں کا جو ڈھیر ہے ان میں سے جو چاہیں اپنے لئے پسند کر لیں۔ میں نے یہ محل دیکھا ہے اس میں باقی سب کچھ تو وہی ہے جو ہمارے راجوں مہاراجوں اور نوابوں کے محلات میں ہوتا ہے، وسیع باغات، غلام گردشیں دربار ہال، جھاڑ، فانوس وغیرہ وغیرہ لیکن ایک چیز مجھے ذرا عجوبہ معلوم ہوئی۔ باغ میں ایک کافی بڑا شفاف پانی کا تالاب ہے جس کے کنارے کچھ چوبی سیڑھیاں ہیں جن کے اوپر ایک شہ نشین صورت کا چبوترا سا بنا ہے، ہمارے گائڈ نے بتایا کہ ہر سال جب امیر کی مملکت سے حسین دوشیزائیں کنیزیں بنا کر لائی جاتیں تو انہیں اس تالاب کے کنارے جمع کیا جاتا، اس چبوترے پر امیر کا تخت سجایا جاتا اور وہ ایک سیب ہاتھ میں لے کر اس تخت پر متمکن ہو جاتے، پھر ان کنیزوں کو حکم ہوتا کہ وہ کپڑے اتار کر اس تالاب میں نہائیں اور ان میں سے جو بھی امیر کی نظر میں کھب جاتی امیر صاحب یہ سیب اس کی طرف پھینک دیتے اور اگلے دن وہ شاہی حرم میں داخل ہو جاتی۔ نہ جانے یہ روایت صحیح ہے یا غلط لیکن اپنے ہاں کے بعض پرانے امرأ کے لچھن دیکھے جائیں تو کچھ ایسی بعید از قیاس بھی نہیں۔

تو ہمارے دوست سناتے ہیں کہ ان کا مستقل قیام تو تاشقند میں رہا لیکن انہیں آذربائیجان اور گرجستان کے رستے ماسکو جانے کا بھی اتفاق ہوا جہاں لینن کی زیر قیادت انقلابی معاشرے کی بنیاد ڈالی جا رہی تھی، ادھر کئی سمت سے ملکی اور غیر ملکی دشمنوں کی یلغار تھی۔ اِدھر نظم و نسق کا پرانا نظام درہم برہم ہو چکا تھا، بینک، ریلیں، ڈاکخانے، رسل و رسائل کسی چیز کا کچھ ٹھیک نہیں تھا، بھوک فاقہ، بے سروسامانی، یہ سب کچھ ایک طرف اور دوسری جانب عوام میں ایک عجیب سرخوشی کا عالم اور سوویٹ کمیٹیوں کی قیادت میں تعمیر نو کی انتھک جدوجہد جس میں لینن سے لے کر ایک عام مزدور تک دن رات یکساں مصروف تھے، یوں تو زندگی کے ہر شعبے میں تن دہی سے کام ہو رہا تھا لیکن رسل و رسائل کی درستی، بجلی کی فراہمی، تعلیم اور ثقافتی سرگرمیوں پر خاص زور دیا جا رہا تھا، فلمیں بن رہی تھیں، ڈرامے کھیلے جا رہے تھے، گانے لکھے جا رہے تھے، کہیں گھروں میں بچے اپنے والدین کو سبق دے رہے تھے

کہیں اسکول کی لڑکیاں کارخانوں میں کنٹرول مزدوروں کی استانیاں بنی بیٹھی تھیں۔ مختصراً یہ انقلاب مولانا روم کے شعر کی جیتی جاگتی مثال تھی:

ہر بنائے نو کہ آباداں کنند
اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

انقلاب کے اگلے تعمیری دور کا حال ہم نے ان کتابوں میں پڑھا جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ ایک پوری قوم چیونٹی دل کی طرح اس بنائے نو کے اینٹ پتھر منزل بہ منزل جمار ہی ہے، نئی بستیاں بسائی جارہی ہیں، نئی زمین آباد ہو رہی ہے، نہریں کھد رہی ہیں، کانیں دریافت ہو رہی ہیں، ریلیں اور سڑکیں بچھائی جارہی ہیں۔ نئے عظیم الشان کارخانوں میں نئی دیوہیکل مشینیں کھڑکھڑا رہی ہیں اور سرزمین کی اس کایا پلٹ کے ساتھ ساتھ ایک نیا انسان بھی پروان چڑھ رہا ہے جسے پیسے کی ہوس نہیں، بڑھاپے، بیماری اور بیروزگاری کا ڈر نہیں، اولاد کی فکر نہیں اور جسے اس نئے معاشرے نے اخلاق، آداب اور اقدار کے بالکل نئے ذہنی نظام سے روشناس کیا ہے۔

ادھر ہم نے یہ پڑھ سن رکھا تھا اور ادھر انگریزی اور دیسی رجعت پسند پروپیگنڈے کے زیر اثر سوویٹ یونین کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلائی جارہی تھیں۔ انقلاب نے زار روس کی عظیم الشان سلطنت کا بیڑا غرق کر دیا ہے، اس معاشرے کی کوئی بھی کل ٹھیک نہیں، نہ دین ہے نہ اخلاق ہے، گھریلو زندگی ختم ہو چکی ہے، جس کا جی چاہے جتنے دن جی چاہے کسی کے ساتھ رہ لے اور پھر کسی اور سے رنگ رلیاں منائے، بچوں کو حکومت لے جاتی ہے جہاں انہیں جبراً کمیونسٹ بنایا جاتا ہے، سارا ملک ایک بیگار کیمپ ہے، جہاں مجبور اور بیکس لوگوں سے سخت مشقت لی جاتی ہے اور صرف موٹا جھوٹا پہننے کو اور دال روٹی کھانے کو دی جاتی ہے۔ ہر چیز کا توڑا ہے، کسی بات کی آزادی نہیں اور لوگوں کی سخت مصیبت میں جان ہے۔ جب سوویٹ یونین میں جانے آنے پر کافی بندشیں تھیں اور بہت کم لوگ یہاں کے حقیقی حالات سے واقف تھے اس لئے بہت سے لوگ یہ سب باتیں آسانی سے ہضم کر لیتے تھے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ اس طرح کے قصے آج کل بھی چھپتے رہتے ہیں حالانکہ اس زمانے میں لاکھوں سیاح

یہاں ہر روز آتے جاتے ہیں اور بلا روک ٹوک یہاں کے حالات کا تفصیلی مطالعہ کر سکتے ہیں۔
بہرحال ہم نے اس دور کی جو تصویر اپنے ذہن میں قائم کی تھی وہ بھی کافی رومانی اور مثالی تصویر تھی جس کی ہر تفصیل حقیقت پر مبنی نہیں تھی۔

یہ دوسری تصویر مکمل نہ ہو پائی تھی کہ اس پر ایک تیسری تصویر ابھرنا شروع ہوئی ۱۹۳۹ کے وسط میں میں نے مزید تعلیم کے لئے کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ ایک اطالوی بحری جہاز میں جگہ بھی مخصوص کروالی تھی، ٹکٹ خرید لیا تھا۔ کپڑے بنوا لئے تھے بس روانگی کا انتظار تھا اور جہاز کے جانے میں کوئی دس دن باقی تھے جب خبر آئی کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی ہے اور ملک سے باہر آنے جانے کے سب راستے بند ہو گئے ہیں اس کے ساتھ ہی ملک میں بائیں بازو کی جماعتوں پر انگریزی حکومت کا نزلہ گرا۔ جو معروف کارکن تھے سب گرفتاری کے بعد راجستان میں دیولالی کیمپ میں نظر بند کر دیئے گئے، جو روپوش تھے ان کی کھوج میں گھر گھر چھاپے پڑنے لگے۔ ممنوعہ لٹریچر کی برآمد کے لئے تلاشیاں ہونے لگیں۔ ادھر کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک شروع کر رکھی تھی اور فرداً فرداً گرفتاریاں پیش کر رہے تھے۔

یہ کافی ہنگامہ آرا دن تھے۔ میں نے امرتسر کو خیر آباد کہہ کر لاہور کے ایک کالج میں ملازمت کر لی تھی ان دنوں ہم جیسے لوگوں کو جو گذشتہ کئی برس سے ہٹلرازم اور فاشزم کے خلاف لکھنے لکھانے میں بھی مصروف تھے اور انگریزی سامراج کے خلاف عملی طور سے مصروف کار بھی ایک عجب ذہنی خلجان کا سامنا کرنا پڑا لیکن جاپانی جنگ بازوں اور نازی ستم رانوں نے ہماری یہ مشکل جلد ہی حل کر دی، ادھر جاپانیوں کے فوجی دل سارے مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا کو تاخت و تاراج کر کے برصغیر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے اور ادھر فاشسٹ حملہ آوروں کے سیاہ بادل سارے یورپ کو پامال کر کے سوویٹ سرزمین پر منڈلانے لگے۔

اور اب یہ تیسری تصویر نظر میں ابھرنے لگی۔ سوویٹ یونین کے میدان کارزار کی تصویر۔ اس تصویر کو میں نے قدرے زیادہ قریب سے دیکھا ہے جب تین طرف سے فاشسٹوں کا ریلا یعنی مشرق سے برما، مغرب سے شمالی افریقہ اور شمال سے جنوبی روس کی طرف بڑھنے

لگا تو اپنا دیس بھی اس سہ شاخہ یورش کی زد میں نظر آنے لگا اور میں نے ہندوستانی فوج میں ملازمت کر لی۔ دوسرے فرائض کے علاوہ میرے ذمّے ایک کام یہ بھی تھا کہ مختلف محاذوں سے جو خبریں روزانہ وائرلیس پر موصول ہوتی تھیں انہیں یکجا کر کے ریڈیو کے لئے ایک جنگی خبر نامہ اور اس پر تبصرہ تیار کروں۔ یہ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے جب قریب قریب ہر محاذ پر انگریز اور اتحادی فوجیں پسپا ہو رہی تھیں ہمارے اور فاشسٹ حملہ آوروں کے درمیان اگر کوئی دیوار کھڑی نظر آ رہی تھی تو وہ سوویٹ یونین ہی کے عوام اور سپاہی تھے جو قدم قدم پر غنیم سے مصروف وغا تھے۔ ہم نے ان فوجوں کے اعلیٰ کمانڈروں کے نام سنے ژوکوف، کونیف، موشکو، بڈینی، راکوسوفسکی، میلی نوفسکی، گووروف، وغیرہ وغیرہ چھاپہ مار گوریلا بہادروں کے کارنامے پڑھے۔ زویا متروسوف، گاستیلو اس زمانے میں ہمارے بعض دوستوں کے ہاں جو بچے پیدا ہوتے، ان کے نام بھی انہیں کے ناموں پر رکھے گئے اور نومولود لڑکیوں کے لئے زویا بہت مقبول نام قرار پایا، مختلف محفلوں میں میدانِ جنگ کا نقشہ سامنے رکھ کر ہر معرکے کے نشیب و فراز پر بحثیں ہوتیں، شمال، جنوب، مشرق، مغرب، کتنے محاذوں پر بیک وقت کہاں کہاں خون بہہ رہا تھا، شمال میں نووگراڈ، سکوف، لینن گراڈ، مغرب میں مینسک، سمولینسک، جنوب میں کیف ڈونیپر، خارکوف، روستوف آن ڈان۔ کس کس مقام پر کیا حشر بپا تھا اور ہر مقام پر محض پیشہ ور سپاہی نہیں پوری قوم کے بچے، بوڑھے، عورتیں ہو کس بے جگری سے لڑ رہے تھے ان کی روداد ممتاز سوویٹ ادیبوں کی نظم و نثر میں نظر سے گذری، الیا اہرن برگ، شولوخوف، سمونوف، سرکوف، پولے وائے اور بہت سے جانے ان جانے ادیبوں سے غائبانہ شناسائی ہوئی، مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھوں تعمیر کی ہوئی ان کی نئی دنیا شہر، بستیاں، تفریح گاہیں، درسگاہیں، بجلی گھر، کارخانے، تجربہ گاہیں، کھیت اور باغات ان سب کی تباہی اور بربادی اور ان کو بچانے کے لئے سرفروشی کی داستانیں۔ اسی زمانے میں اہرن برگ نے اپنی کسی تحریر میں ایک جملہ لکھا تھا جو اب تک دل پر کندہ ہے وہ کچھ یوں تھا کہ "میاں بیوی آپس میں ناتے توڑ سکتے ہیں، محبتیں چھوٹ سکتی ہیں اور عاشق و محبوب جدا ہو سکتے ہیں لیکن ایک رشتہ جو کسی صورت نہیں ٹوٹ سکتا ماں بیٹے کا رشتہ ہے اور ہمارا وطن ہماری ماں ہے"

جب تک ہمارے سب دوست اسیری سے رہا ہو چکے تھے، کمیونسٹ پارٹی اور دوسری بائیں بازو کی جماعتوں پر سے پابندیاں اٹھ چکی تھیں اور سب کی نظریں ان مختلف محاذوں پر جمی تھیں، ان کے بارے میں نظمیں لکھی گئیں، گیت گائے گئے، ڈرامے کھیلے گئے، آل انڈیا ریڈیو پر پہلی بار سوویٹ یونین کے حق میں زبان کھولنے کی اجازت ملی اور لکھنؤ کے ایک ریڈیو کے مشاعرے میں جہاں ہم سب لوگ جمع تھے، مجاز، سردار جعفری، جذبی، جاں نثار اختر وغیرہ۔ مخدوم محی الدین (مرحوم) نے قازق شاعر جمبل کا منظوم ترجمہ اپنی انتہائی شیریں آواز میں سنایا۔

صف اعدا کے مقابل ہے ہمارا رہبر

ان دنوں مجھے ہر روز خبرنامہ تیار کرنے کی وجہ سے کم از کم یورپی سوویٹ یونین کا پورا جغرافیہ اتنا حفظ ہو چکا تھا کہ کسی سوویٹ طالب علم کو بھی نہ ہوگا۔ ہم سب کی نظریں امید و بیم کے عالم میں ان سب محاذوں پر جمی تھیں۔ ہمیں تو نظریاتی وجوہ سے یقین تھا کہ فاشسٹ یہ جنگ نہیں جیت سکتے لیکن سب لوگ ہمارے ہم خیال نہیں تھے۔ شروع شروع میں تو کچھ کوتاہ اندیش لوگ انگریز امریکن فوجوں کی ہزیمت پر خوش تھے اور اس مغالطے میں مبتلا تھے کہ جاپانی یا جرمن اطالوی فوجیں انہیں انگریزوں کی غلامی سے نجات دلادیں گی لیکن جنوب مشرقی ایشیا میں جاپانیوں کے مظالم اور یورپ میں فاشسٹوں کی چیرہ دستیوں کے سبب یہ خوش فہمی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی تاہم یہ اندیشہ عام پایا جاتا تھا کہ فاشسٹ ریلے کے خلاف سوویٹ انسان زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے گا۔ چنانچہ جب ماسکو اور لینن گراڈ چاروں طرف سے محصور ہو گئے تو ہمارے فوجی دفتر میں شرطیں بدلنے لگیں کہ یہ شہر کتنے دنوں میں فتح ہوں گے۔ کوئی تین ہفتے کہہ رہا تھا کوئی ایک مہینہ۔ میں نے ایک انگریز دوست سے ایک اور تین کی بازی لگادی کہ یہ شہر فتح نہیں ہوں گے اور آخر کار میں جیت گیا۔

اور پھر اسٹالن گراڈ کی جو اب والگا گراڈ کہلاتا ہے، تاریخی لڑائی شروع ہوئی۔ اب دنیا بھر میں اتحادی طاقتوں سے دوسرا محاذ کھولنے کے تقاضے ہو رہے تھے لیت و لعل جاری تھا تاہم یہ سبھی لوگ محسوس کر رہے تھے کہ جیت ہار کا فیصلہ اسی لڑائی پر ہے۔ ہم بھی دور سے سانس تھامے اس کا نظارہ کرتے رہے۔ آج اس محلے میں دونوں طرف جان کی بازی لگی ہے تو کل اس بازار میں کشتوں کے پشتے لگ رہے ہیں۔ آخر کار جب سوویٹ فوجیں جیت گئیں تو ہندوستان

میں بھی شادی کے شادیانے بجے، پھر کچھ عرصے کے بعد جرمن کمانڈر فان پالس کی ذاتی کار اور ایک ٹینک نمائش کے لئے دہلی لائے گئے۔ کناٹ سرکس کے بیچوں بیچ چمن میں ان کی نمائش ہوئی، جھنڈیاں لگائی گئیں، بینڈ بجائے گئے اور سب خلق خدا دیکھنے کو آئی۔

جنگ کی یہ تصویر بیک وقت بھیانک بھی تھی اور ولولہ انگیز بھی۔ اس کے بعد جب فاشسٹ طوفان چڑھ کر اتر گیا، اتحادیوں کی فتح ہو گئی اور برلن پر سرخ جھنڈا لہرانے لگا تو اسی تصویر کے بہت سے نقوش دلوں پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو گئے۔

یہ تھے وہ تاثرات جو مختلف اوقات میں، مختلف صورتوں میں ہمارے دل و دماغ پر وارد ہوتے رہے۔ اب طلب یہ تھی کہ ان کی تصدیق کیسے کریں اور یہ کیسے دیکھیں کہ سوویت سرزمین اور وہاں کا معاشرہ سچ مچ کیسا ہے اور وہاں کس نوع کی مخلوق بستی ہے۔

پہلا تعارف

۱۹۴۹ء میں لاہور میں ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کانفرنس کے سلسلے میں تاخیر سے سہی، روسی ادیب بھی آئے۔ وائی ایم سی اے ہال میں مشاعرہ ہوا جو بقول فیض "مرزا ترسون زادہ نے اپنی فارسی غزلیں سنا کر لوٹ لیا۔" فیض مرزا ترسون زادہ اور دوسروں کا تعارف اس طرح کراتے ہیں۔

مرزا ترسون زادہ نرم گفتار، نرم رفتار، خوابیدہ سی آنکھیں اور بچوں کا سا معصوم چہرہ... سوفرونوف دیو کے دیو آدمی، جتنے لمبے ہیں اتنے چوڑے ہیں اتنے موٹے ہیں۔ پہلوانوں کی سی صورت کو دیکھ کر ڈر لگتا ہے اور شرارت بھری آنکھوں کو دیکھ کر گدگدانے کو جی چاہتا ہے۔"

تفصیل کے لئے اگلا شمارہ ملاحظہ ہو۔

فیض کی کلر اسکیم

"میں فیض کو رنگوں کا شاعر کہتی ہوں۔ ایسے رنگ جو ہر جگہ نمایاں ہوتے ہیں، پہچانے جاتے ہیں۔ ان رنگوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے، انہیں محسوس کیا جا سکتا ہے۔" اردو ادب کی معلم [illegible] آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجئے۔

"نسخۂ امروہہ"

اپریل ۱۹۶۹ء میں ہندوستان میں بڑی دھوم مچی تھی کہ بخطِ غالب دیوانِ غالب کا ایک نسخہ دریافت ہوا ہے۔ پھر یہ نسخہ ہندوستان میں اکبر علی خان عرشی زادہ فرزند مولانا امتیاز علی خان عرشی اسسٹنٹ ڈائریکٹر رامپور رضا لائبریری نے بڑے اہتمام کے ساتھ طبع کیا اور اس پر ایک مفصل دیباچہ بھی لکھا۔ اس کی قیمت تین سو روپے مقرر کی اور سنا ہے کہ صرف تین سو کاپیاں طبع کیں یہ مطبوعہ دیوانِ غالب لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہاں پاکستان میں محمد طفیل مدیر نقوش لاہور نے بھی وہی دیوان طبع کیا البتہ ناظرین کی سہولت کی خاطر ہر غزل جہاں بخطِ غالب ہے وہیں اس کی کتابت خطِ نستعلیق میں بھی کرا دی ہے اور قیمت تیس روپے رکھی ہے۔ متذکرہ نسخہ عرشی زادہ کے طبع ہوتے ہی ہندوستان میں مقدمے بازی شروع ہو گئی۔ کیونکہ زیرِ بحث مسودہ (بخطِ غالب) اصل دریافت کنندہ سے لے کر ہندوستانی پبلشر تک تین چار ہاتھوں سے گزرا اور الزام لگایا گیا کہ اس معاملے میں دریافت کنندے کے ساتھ بدعہدی کی گئی۔

جوں ہی مقدمے بازی شروع ہوئی ایک دن خبر آئی کہ اصل مسودہ غائب ہو گیا ہے، پھر ہندوستان میں یہ شور برپا ہوا کہ مسودہ کسی طرح پاکستان پہنچ گیا ہے بلکہ اہلِ ہند کا لفظ استعمال کیا جائے تو "اسمگل" کر کے پاکستان پہنچایا گیا ہے۔ جہاں تک ہم جانتے ہیں، اور ہم بہت حد تک صحیح جانتے ہیں، یہ ہے کہ نقوش لاہور میں "بخطِ غالب" جو نسخہ شائع ہوا ہے وہ اصل فوٹو اسٹیٹ نہیں بلکہ فوٹو اسٹیٹ سے فلم بنوا کر شائع کیا گیا ہے۔ ہم اردو کے نہایت معتبر غالب شناس سے واقف ہیں جنہوں نے ہمیں بتایا کہ انہوں نے نقوش لاہور کی اشاعت سے کافی پہلے وہ فوٹو اسٹیٹ کاپی دیکھی تھی جس سے نقوش نے استفادہ کیا۔ یہ بالکل یقینی ہے کہ اصل پاکستان میں نہیں ہندوستان میں ہے۔ ہندوستان میں جو کچھ شور مچا اس کے بظاہر دو اسباب

نظر آتے ہیں۔ ایک تو اس باب میں وہ مقدمے بازی جو ہندوستان میں ہوئی اور اس کے آخری نتیجے سے ہم تاحال واقف نہیں ہیں۔ دوسرا یہ سبب کہ نسخہ عرشی زادہ کے بازار میں آنے سے پہلے نقوش کا نسخہ شائع ہو گیا۔ اس کی قیمت بھی کم تھی اور کلام خط نستعلیق میں بھی تھا۔ محض طباعت و اشاعت کے معاملے میں پاکستان کو اولیت حاصل ہو گئی۔ اور جب یہ نسخہ مختلف ذرائع سے ہندوستان پہنچا تو متعلقہ اصحاب چراغ پا ہو گئے۔ چنانچہ غالب لائبریری میں ایسی تحریریں محفوظ ہیں جن میں غم و غصے کا اظہار کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں دو تین اہم سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ آیا متذکرہ نسخہ عرشی زادہ بخط غالب ہے کہ نہیں۔ اس کی تائید و تردید میں ہندوستان میں کئی مضامین اور اب تو ایک پوری کتاب (تردید میں) شائع ہو چکی ہے۔ دوسرے یہ کہ اصل نسخہ ہندوستان میں کس کے پاس ہے؟ اگر پاکستان میں موجود ہوتا تو اب تک اعلان ہو چکا ہوتا کہ کس کی دسترس میں ہے۔ کیونکہ یہاں تو کوئی مقدمے بازی نہیں ہو رہی ہے جس سے اس شخص یا ادارے کو جس کی تحویل میں یہ نسخہ ہے کوئی اندیشہ اس کے ضبط ہو جانے کا ہوتا۔ تیسرے یہ کہ اس معاملے کو ہندوستانی پارلیمنٹ (لوک سبھا) میں دو مقاصد کے تحت لے جایا گیا۔ ایک یہ کہ مقدمے بازی کو الجھاوے میں ڈال دیا جائے، دوسرے یہ کہ اس سے کوئی سیاسی فائدہ حاصل کیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۷۱ء کی دوسری ششماہی کے شروع میں ایس اے شمیم رکن لوک سبھا نے ہندوستانی پارلیمنٹ میں چار سوالات کئے جن کے جوابات ڈی پی یدیو نائب وزیر تعلیم نے دیئے۔ دونوں کچھ اس طرح تھے۔

پہلا سوال:۔ کیا یہ صحیح ہے کہ دیوان غالب بخط غالب ۵ اپریل ۱۹۶۹ء کو بھوپال میں دریافت ہوا تھا؟

جواب:۔ کل ہند غالب صد سالہ برسی کمیٹی سے حاصل کی ہوئی رپورٹ کے مطابق ایک نایاب نسخہ دیوان غالب ۵ اپریل ۱۹۶۹ء کو بھوپال میں دریافت ہوا تھا۔

دوسرا سوال:۔ کیا یہ صحیح ہے کہ یہ نسخہ اسمگل کر کے پاکستان پہنچایا گیا جہاں شائع کیا گیا ہے۔

جواب:۔ جی ہاں یہ درست ہے۔

(حیرت کا مقام ہے کہ ایک وزیر مفصل حالات سے واقف ہوئے بغیر اور
کسی دستاویزی ثبوت کی عدم موجودگی میں اعتراف کرتا ہے نسخہ "اسمگل" ہوا
یا کیا گیا ہے۔ ٹیکنالوجی اور خصوصاً فوٹوگرافی اور فلم سازی کے اس ترقی یافتہ دور
میں کسی پرنٹ کو دیکھ کر یہ تو طے کیا جا سکتا ہے کہ قلم اصل سے تیار کی گئی ہے
یا اصل کی فوٹو اسٹیٹ نقل سے۔)

تیسرا سوال:۔ کیا یہ صحیح ہے کہ پاکستان میں شائع شدہ نسخے کی کاپیاں ہندوستان میں اسمگل
کر کے لائی گئیں اور نہایت اونچے داموں فروخت کی گئیں؟

جواب:۔ جی ہاں درست ہے۔

یہاں بھی حیرانی ہوتی ہے کہ وزیر موصوف نے اسے اسمگل شدہ مال قرار دیا۔
اوّل تو نسخہ نقوش نجی ذرائع یا دیگر ممالک کے توسط سے منگوایا جا سکتا ہے۔
اور ضرور اسی طرح منگوایا گیا ہوگا۔ دوم یہ کہ صرف ان ہی اشیاء کو اسمگل کیا ہوا مال
قرار دیا جاتا ہے جن کی درآمد قانوناً ممنوع ہو۔ مانا کہ ان دنوں ہندوستان اور
پاکستان کے درمیان نہ کوئی تجارتی معاہدہ تھا اور نہ اِدھر سے اُدھر کچھ
بھیجنے یا اُدھر سے اِدھر کچھ منگوانے کی اجازت تھی اس کے باوجود اگر سو پچاس
نسخے ہندوستان پہنچ بھی گئے تو اُسے اسمگلنگ کس طرح قرار دیا گیا۔ یہ سوال
بھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ حکومت نے ان نسخوں کو غیر قانونی درآمد قرار دے کر
ضبط کیوں نہیں کیا؟

ایس اے شمیم متعلقہ وزیر کے جوابات سے مطمئن نہیں ہوئے اور انھوں نے
لوک سبھا کے ۳۰ جولائی ۱۹۷۱ء کے اجلاس میں پھر پوری کہانی دہرا کر پوچھا کہ یہ نسخہ
کس طرح پاکستان پہنچا، وہاں شائع ہوا۔ اس کی کاپیاں ہندوستان آکر فروخت ہوئیں اور
یہ واقعہ بطور "جشن" منایا گیا۔

ہندوستانی ناظرین کو معلوم ہونا چاہیئے کہ پاکستانی ایڈیشن پر کوئی جشن نہیں منایا
گیا بلکہ اخبارات میں صرف یہ کہا گیا کہ اولین اشاعت پاکستان میں ہوئی جو حقیقت ہے۔

فیض احمد فیض کی اسیری کے خطوط کا مجموعہ "صلیبیں مرے دریچے میں" ہندوستان میں شائع کر دیا گیا۔ یہاں کسی نے اسمگلنگ کا واویلا نہیں مچایا حالانکہ جس قسم کے ذرائع سے دیوان غالب کی فوٹو اسٹیٹ کاپی پاکستان آئی ہوگی قریب قریب ان ہی ذرائع سے فیض کا مجموعہ بھی ہندوستان پہنچا ہوگا۔ اسی طرح فیض کے کلام کے مجموعے بلکہ کلیات "ورق ورق" کے عنوان سے شائع کیا جا چکا ہے۔

ایس اے شمیم کے متذکرہ سوالات کے جواب میں ایچ آر گوکھلے وزیر قانون حکومت ہند نے لوک سبھا میں بتایا کہ معاملہ قدرے الجھا ہوا ہے کیونکہ تھوڑی بہت چھان بین پاکستان میں کرنی ہوگی۔ سنٹرل بیورو آف انوسٹیگیشن نے تحقیق و تفتیش کی کوشش کی مگر اس میں کچھ "ٹیکنیکل" مشکلات حائل ہوئیں۔ وزیر موصوف نے ایوان کو یقین دلایا کہ پولیس اندرون ملک ہر ممکن کوشش کرے گی۔

ایس اے شمیم کا دوسرا سوال یہ تھا کہ جو لوگ اس نسخے کے معاملات سے متعلق ہیں وہ کافی معروف ہیں جیسے نثار احمد فاروقی، توفیق احمد اور تین چار دیگر اصحاب کیا وزیر موصوف معلوم کریں گے کہ یہ نسخہ ملک میں ہے یا پاکستان میں۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ وزیر موصوف کو تمام واقعات کا علم نہیں ہے اور وہ نہیں جانتے کہ یہ نسخہ کس نے حاصل کیا اور اب کس کی دسترس یا تحویل میں ہے۔ اس پر متعلقہ وزیر نے جواب دیا۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ ہندوستان میں تفتیش کرنا مشکل ہے۔ یہ کہا ہے کہ کچھ تفتیش ایسے علاقے سے متعلق ہے جو پاکستان میں ہے کیونکہ نسخے کا "امپورٹر" پاکستان میں مقیم ہے۔ جہاں تک ان اصحاب کا تعلق ہے جن کے نام لیے گئے ہیں ان کے متعلق ہمیں رپورٹیں ملی ہیں اور ان کے خلاف الزامات لگائے گئے ہیں۔ کہ وہی اس معاملے میں ملوث ہیں۔ اس کا تمام تر انحصار مناسب تفتیش اور الزامات کے صحیح ثابت ہونے پر ہے۔

ایس اے شمیم نے پوچھا اصل نسخہ کہاں ہے؟ وزیر انصاف نے جواب دیا غالب صد سالہ برسی کمیٹی نے اطلاع دی ہے کہ نسخہ بھوپال میں دریافت ہوا تھا۔

اس سے زیادہ حکومت کو کچھ نہیں معلوم۔

پھر حیرت ہوتی ہے کہ ایک نمائندہ ایوان کی سرکاری کارروائی میں لفظ "امپورٹر" استعمال کیا گیا ہے حالانکہ اوّلین اجلاس میں جواب دینے والے وزیر ڈی پی یدلو کے جواب کو یاد رکھا جائے تو امپورٹر کی بجائے "اسمگلر" کا لفظ استعمال کیا جانا چاہیئے تھا۔ کوئی شے "ایکسپورٹر" کے بغیر امپورٹ نہیں ہوتی لہٰذا ارباب اختیار نے "ایکسپورٹر" کو تلاش کیوں نہیں کیا؟)

اس نسخہ کی اصلیت وحقیقت کے ضمن میں اگلے صفحات میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری صاحب کے خیالات پیش کئے جا رہے ہیں۔ ادارہ اس کے تعلق سے غالب شناس حضرات کو اظہار خیال کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے لئے "غالب" کے صفحات حاضر ہیں۔ (م۔ظ۔ح)

کیا دیوان غالب "نسخۂ امروہہ" واقعی جعلی ہے

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

غالب شناسوں اور غالب کے پرستاروں کو یاد ہوگا کہ غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر اپریل ۱۹۶۹ء میں کلام غالب کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا تھا۔ اس کے بارے میں ماہرین غالب نے یہ رائے دی تھی کہ یہ غالب کے ہاتھ کا مخطوطہ ہے اور ۱۲۳۱ھ میں اس وقت مکمل ہوا ہے جب کہ غالب کی عمر صرف انیس سال تھی۔ یہ قلمی نسخہ بھوپال میں برآمد ہوا۔ بھوپال سے امروہہ لے جایا گیا اور بعد ازاں پاکستان و ہندوستان سے باہتمام خاص شائع ہوا۔ پاکستان میں یہ محمد طفیل مدیر نقوش (لاہور) کی معرفت، نثار احمد فاروقی کے مقدمہ و حواشی کے ساتھ قارئین تک پہنچا اور ہندوستان میں مولانا امتیاز علی خان عرشی کے صاحبزادے اکبر علی خاں نے اپنے مقدمہ کے ساتھ اسے بنام "نسخۂ عرشی زادہ" ادارہ یادگار غالب رامپور سے شائع کیا۔ چنانچہ اس مخطوطے کے ظہور و اشاعت کی رعایت سے بعض نے اس کو نسخۂ بھوپال سے موسوم کیا، بعض نے نسخۂ امروہہ کا نام دیا، بعض نے نسخۂ عرشی زادہ کہا اور بعض نے "بیاض نقوش" یا "نسخۂ لاہور" کہنا پسند کیا۔ اس مضمون میں اس مخطوطے کو نسخۂ امروہہ کہا جائے گا۔

یہ مخطوطہ، بھوپال میں کہاں اور کس کے پاس تھا، امروہہ کس طرح پہنچا، اس کی اشاعت و ملکیت کے سلسلے میں کیسی کیسی بحثیں اور مقدمہ بازیاں ہوئیں اور آخر کیسے اس کی گمشدگی کی خبر آگئی، یہ ایک طویل داستان ہے اور ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۰ء کے ادبی رسائل اور اخبارات خصوصاً ہماری زبان (علی گڑھ) اور نقوش (لاہور) کے غالب نمبروں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس لئے اس کی تفصیل میں جانے یا اس کو اس جگہ دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یقین ہے اس کی دریافت سے لے کر گمشدگی تک کی ساری کہانی قارئین کے

ذہن میں محفوظ ہوگی اور وہ اسی کے پس منظر میں اس مضمون کو دیکھیں گے۔

غالب صدی (۱۹۶۹ء) کے موقع پر اس نسخے کو جو اہمیت حاصل ہوئی اور جس دھوم دھام سے اس کا استقبال کیا گیا اس میں غالب شناسوں سے لے کر ادب کے عام قاری تک سب شامل تھے اور سبھی نے یہ باور کر لیا تھا یوں کہہ لیجئے کہ سب کو باور کرا دیا گیا تھا کہ یہ نسخہ غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اور کلامِ غالب کے اب تک جتنے مخطوطے دستیاب ہوئے ہیں ان میں قدیم ترین ہے۔ ہر چند کہ اس مخطوطے میں بعض بدیہی باتیں ایسی تھیں جو اس کے جعلی ہونے کی طرف اشارہ کرتی تھیں لیکن غالب پرستی کے جوش و خروش اور ایک نئے خزینے کی دریافت کی سرگوشی نے۔ اس کی کمزوریوں پر بغور نظر ڈالنے کا موقع نہ دیا اور شکوک کو پوری طرح رفع کئے بغیر اسے بخطِ غالب تسلیم کر لیا گیا۔ بخطِ غالب ہونے میں اگر کچھ اختلاف تھا تو صرف اتنا کہ بعض کے نزدیک پورا مخطوطہ مع حواشی، غالب کے خط میں تھا اور بعض کے نزدیک حواشی کی غزلوں اور جا بجا اصطلاحات کا کاتب کوئی دوسرا تھا۔ البتہ بعض کو شروع ہی سے اس کے بخطِ غالب ہونے پر شبہ تھا اور انہوں نے اسی وقت، اہلِ نظر کی توجہ اس کی کمزوریوں کی طرف مبذول کرائی تھی چنانچہ ۸ مئی ۱۹۶۹ء کے ہماری زبان (علی گڑھ) میں نقاد اکبر آبادی نے لکھا۔

"ہو سکتا ہے غالب کے کلام کا یہ مخطوطہ کسی تجربہ کار کاتب کا لکھا ہوا ہو اور غالب کی برسی کے موقع پر زمین سے نکالا گیا ہو۔"

یہ شبہ بے بنیاد نہ تھا۔ اس لئے کہ اس سے بھی غالب کے نام سے دوسروں کا کلام منظر عام پر لایا گیا تھا اور بڑے بڑے محققین نے دھوکا کھایا تھا اور بہت دنوں بعد ان پر یہ راز کھلا کہ یہ جعلی تھا۔ مولوی عبدالباری آسی الدنی کی تخلیق کردہ غزلیں اس سلسلے میں ادب کے قارئین کے ذہن میں ہوں گی جنہیں ماہرین نے پہلے دیوانِ غالب میں شامل کیا اور بعد کو راز کھلنے پر اظہارِ ندامت کے ساتھ خارج کر دیا۔ اس کی واضح مثال وہ غزل بھی ہے جو ماڈل ہائی اسکول کے پرچے "گوہرِ تعلیم" میں یکم اپریل ۱۹۲۷ء کو مندرجہ ذیل مطلعے اور مقطعے کے ساتھ شائع ہوئی ؎

بھولے سے کاش وہ اِدھر آئیں تو شام ہو
کیا لطف ہو جو ابلق دوراں بھی رام ہو

پیرانہ سال غالب میکش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

یہی غزل بعد کو کسی جوہر قریشی بھوپالی نے "دین و دنیا" (دہلی) کو بھیجی۔ دین و دنیا میں یہ غالب کی "ایک غیر مطبوعہ غزل" کے عنوان سے شائع ہوئی اور ماہرین غالب نے اسے دیوان غالب میں جگہ دیدی، کسی نے یہ بھی نہ سوچا کہ غالب کبھی بھوپال گئے بھی تھے یا نہیں۔ چنانچہ یہ غزل دیوان غالب کے "نسخۂ عرشی" مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی مطبوعہ انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۵۸ء اور دیوان غالب مرتبہ مالک رام مطبوعہ آزاد کتاب گھر دہلی ۱۹۵۷ء دونوں میں شامل ہے۔ بعد ازاں جب یہ معلوم ہوا کہ اس غزل کے خالق، غالب نہیں بلکہ بھوپال کے ایک بزرگ محمد ابراہیم خلیل تھے اور انہوں نے غالب کے رنگ میں یہ غزل کہہ کر اپریل فول کے طور پر "گوہرِ تعلیم" بھوپال میں شائع کرائی تھی تو ماہرین غالب کو خجل ہونا پڑا۔ عجیب اتفاق ہے کہ نسخۂ امروہہ بھی بھوپال ہی میں دستیاب ہوا ہے اور اپریل ۱۹۶۹ء ہی کے پہلے ہفتے میں۔

کلامِ غالب میں الحاق کی اس صورتِ حال اور ماہرین کی اس سلسلے میں لگاتار چوک کے پیش نظر ضروری تھا کہ "نسخۂ امروہہ" پر بخطِ غالب ہونے کا حکم لگانے اور اسے قدیم ترین دستیاب نسخہ قرار دینے سے پہلے، کامل غور و فکر اور حد درجہ احتیاط و تلاش سے کام لیا جاتا لیکن ڈاکٹر انصار اللہ نظر کے سوا کسی نے اس جانب پوری توجہ نہ کی۔ ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے ایک دو نہیں کئی مضامین لکھے اور اس کے جعلی ہونے کے امکانات کا بڑی دقتِ نظر سے جائزہ لیا۔ یہ مضامین ہماری زبان علی گڑھ میں یکم اگست ۱۹۷۰ء، ۱۵ ستمبر ۱۹۷۰ء، یکم اکتوبر ۱۹۷۰ء، یکم نومبر ۱۹۷۰ء اور دسمبر ۱۹۷۰ء کی اشاعتوں میں شائع ہوئے۔ ان میں یکم اگست ۱۹۷۰ء اور یکم نومبر ۱۹۷۰ء کے مضامین طویل اور باقی مختصر ہیں۔ ان میں مضمون نگار نے ان تمام شواہد و دلائل کو کمزور اور مشکوک ظاہر کیا جن کی بنا پر نسخۂ امروہہ کو قدیم ترین اور بخطِ غالب کہا گیا تھا۔

ڈاکٹر انصار اللہ نظر کے مضامین کے مطالعہ کے بعد لوگ چونکے اور بعض نے ان کے دلائل کو وزنی جان کر ان کی رائے سے اتفاق بھی کیا۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے ڈاکٹر انصار اللہ نظر کو ایک خط میں لکھا

"آپ نے مکمل طور پر دیوان غالب (نسخۂ عرشی زادہ) کا جو طلسم توڑ دیا ہے وہ لائقِ ستائش ہے۔"
ڈاکٹر گیان چند جنہوں نے بعض ماہرین غالب کی شہادت پر اسے بخطِ غالب مان لیا تھا وہ بھی تذبذب
میں پڑ گئے تھے اور ڈاکٹر انصار اللہ نظر کی طرح انہوں نے بھی اپنے مضامین مطبوعہ ہماری زبان
علی گڑھ (یکم دسمبر اور ۸، دسمبر ۷۰ء) میں اس نسخے کے بارے میں بعض نئے سوال اٹھا دیئے۔ بعد
کو ڈاکٹر گیان چند نے ڈاکٹر انصار اللہ نظر کے اٹھائے ہوئے بعض سوالوں کا جواب بھی دیا اور نقوش
کے غالب نمبر حصہ سوم میں اس سلسلے کے دوسرے مضامین کا احاطہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر
پہنچے کہ "نسخۂ امروہہ میں بخطِ غالب ہونے کے شواہد اس کے بخطِ غیر ہونے کے دلائل سے قوی تر
ہیں" ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ "میرا منشا یہ نہیں کہ قاری خواہی نہ خواہی میری رائے سے ضرور اتفاق کرے
میں چاہتا ہوں کہ وہ اس سلسلے میں اپنی رائے قائم کرے" لیکن یہ مخطوطہ ابتداءً جن حضرات کے ہاتھ لگا تھا
اور جو اس کا بعجلت جائزہ لے کر اس کے بخطِ غالب ہونے کا اعلان کر چکے تھے انہوں نے ڈاکٹر انصار اللہ
نظر اور بعض دوسروں کے اٹھائے سوالوں کو پوری طرح درخورِ اعتنا نہ جانا اور اپنے ابتدائی فیصلوں
ہی پر قائم رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ "نسخۂ امروہہ" کے بارے میں بے یقینی اور تذبذب کی جو کیفیت ذہنوں
میں پیدا ہو گئی تھی وہ دور نہ ہو سکی پھر اچانک اس کی گمشدگی کی خبر آگئی اور اس کے جعلی ہونے
کے شبہ کے لئے تازیانہ ثابت ہوئی۔ بایں ہمہ بعض حضرات اس نسخے کی فوٹو اسٹیٹ اور اس کی
مطبوعہ صورتوں کو سامنے رکھ کر اس کی چھان پھٹک میں لگے رہے۔ اس سلسلے میں خصوصیت
سے قابلِ ذکر نام کمال احمد صدیقی کا ہے جنہوں اپنے تحقیقی نتائج کو "بیاضِ غالب تحقیقی جائزہ" کے
نام سے ادارہ مطالعات غالب (انسٹی ٹیوٹ آف غالب اسٹڈیز) جی نگر سے کتابی صورت میں
شائع کیا۔ کتاب بھی دو چار صفحے کی نہیں رسالہ سائز میں پورے چار سو اٹھاسی صفحے کی ہے۔ سرورق
پر غالب کی تصویر اور تاریخ پیدائش اوقات درج ہے کتاب کے شروع میں۔

۱۔ حبیب گنج مولانا آزاد لائبریری۔
۲۔ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد دکن۔
۳۔ ذخیرہ خان بہادر ابو محمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لائبریری۔
۴۔ ذخیرہ بشیر الدین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لائبریری۔

غالب کے ہاتھ کی جو تحریریں محفوظ ہیں ان کے فوٹو اسٹیٹ بطور نمونہ دیئے گئے ہیں۔
بغیر کسی تمہید و مقدمہ کے اصل مخطوطے کی پہچان ہین کا باقاعدہ سلسلہ پہلی غزل کے مطلع

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

سے لے کر ترقیمے تک کوئی چار سوا تین صفحات (صفحہ ۹ تا صفحہ ۴۸۸) میں پھیلا ہوا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ کمال احمد صدیقی نے الف تا ی اس خط کے ایک ایک حرف، ایک ایک نقطہ اور ایک ایک شعر کا تحقیقی جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نسخۂ امروہہ یکسر جعلی ہے اور کسی ماہر جعل ساز کی مشق و محنت کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے۔

کم و بیش پانچ سو صفحات کی اس ضخیم کتاب کے جملہ مباحث و دلائل کو اس مختصر سے مضمون میں کیا طویل سے طویل مضمون میں بھی بیان کرنا ممکن نہ ہوگا اس لئے جزئیات و تفصیلات کو نظر انداز کر کے اس جگہ جو کچھ عرض کیا جائے گا وہ اس کتاب کی چند خاص باتوں کی طرف اشارہ کی حیثیت رکھے گا۔ نکات، صاحب کتاب کے ہوں گے بیان میرا ہوگا۔ مقصود یہ ہے کہ ماہرین غالب اس کی طرف توجہ کریں اور اگر اسکے شواہد و دلائل کمزور اور بے بنیاد ہیں تو ان کی تردید کر کے "نسخۂ امروہہ" کو جعلی ہونے کے الزام سے بچائیں اور قوی تر دلائل کے ساتھ اسے بخطِ غالب ثابت کریں۔ ورنہ ڈاکٹر انصاراللہ نظر کے مضامین نے اس سلسلے میں جس قسم کا تذبذب پیدا کر دیا تھا، یقین میں بدل جائے گا اور نتیجۃً یہی کہا جائے گا کہ "نسخۂ امروہہ" بھی ایک طرح کا اپریل فول تھا اور ماہرین نے پہلے کی طرح اس بار بھی دھوکہ کھایا۔

کمال احمد صدیقی نے نسخۂ امروہہ کو، جن کمزوریوں کے سبب، جعلی قرار دیا ہے ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ نسخۂ امروہہ، بخطِ غالب کا انداز، اس زمانے کے مخطوطات، حتیٰ کہ خود غالب کے دوسرے مخطوطوں سے مختلف ہے۔ قدیم قلمی نسخوں میں صفحہ نمبر نہیں ہوتا تھا بلکہ ترکے یا رکاب کا رواج تھا یعنی ہر صفحے کی آخری سطر کے نیچے بائیں جانب اگلے صفحے کا پہلا لفظ لکھ دیا جاتا تھا

گویا پہلا صفحہ ۱ و دوسرا صفحہ ۱ ب، تیسرا صفحہ ۲ و اور چوتھا ۲ ب ہوتا تھا۔ علیٰ ہذالقیاس نسخۂ امروہہ قدیم مخطوطہ نگاری کے اس اصول پر پورا نہیں اترتا۔ نہ تو اس میں ورق نمبر کا اصولی اور بالالتزام اندراج ہے اور نہ ترکے یا رکاب کا استعمال ملتا ہے۔ نسخۂ امروہہ کے صرف پہلے صفحے پر ۱ الف، (بیاض نقوش ص ۵۰) دوسرے صفحے پر ۲ الف (نقوش ص ۵۲) تیسرے صفحے پر (نقوش ص ۵۴) ۲ ب، اور چوتھے صفحے (نقوش ص ۵۶) پر صفحہ ۳ الف درج ہے۔

باقی صفحوں پر نہ صفحہ نمبر ہے نہ ورق نمبر اور یہ ایک ایسا نقص ہے کہ جس کی تاویل میں ماہرین غالب ہی کچھ کہنے کا حق رکھتے ہیں۔ ترکے اور رکاب کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ترکے کا استعمال بھی پورے مخطوطے میں صرف شروع کے دو صفحوں (نقوش ص ۵۰ اور ص ۵۴) پر ملتا ہے ان میں بھی پہلا درست اور دوسرا غلط ہے۔ دوسرے صفحے کے ترکے میں "مگر دستے" کے الفاظ ہیں حالانکہ اگلے صفحے کا پہلا لفظ "حصار" ہے۔ لطف یہ ہے کہ جس صفحے کے بائیں گوشے پر "مگر دستے" کے الفاظ درج ہیں اسی پر آخری شعر کے دوسرے مصرعے میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ معلوم نہیں اس مخطوطے میں کس قسم کے ترکے سے کام لیا گیا ہے، نہ اس کا کوئی قاعدہ مقرر ہے اور نہ ابتدائی دو صفحوں کے سوا پورے مخطوطے میں اس کا استعمال نظر آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قدیم مخطوطوں کے طرز پر نسخۂ امروہہ میں صفحات کے اندراج اور ترکے کے استعمال کو کیوں نہیں اپنایا گیا نیز ابتدائی دو تین صفحوں میں صفحہ نمبر اور ترکے کی جو مثالیں ملتی ہیں ان میں بھی شتر گربگی اور بے ڈھنگا پن کیوں نظر آتا ہے۔

(۲) نسخۂ امروہہ کا ترقیمہ خصوصیت سے اسے مشکوک بناتا ہے، پہلے ترقیمہ پر ایک نظر ڈالتے چلیے۔

"تمت تمام شد"

"بتاریخ چہار دہم رجب المرجب یوم سہ شنبہ سنہ ہجری وقت دوپہر روز باقی ماندہ فقیر بیدل، اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ متخلص بہ اسد عفی اللہ عنہ از تحریر دیوان حسرت عنوان خود فراغت یافتہ، بہ فکر کاوش مضامین دیگر رجوع بجناب روح میرزا علیہ الرحمۃ"

اس ترقیمے کا بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں وقت، تاریخ اور دن تو دیئے ہوئے ہیں لیکن سن کے

کے اعداد درج نہیں ہیں۔ اس کی تاویل بھی اب تک کسی سے نہیں بن سکی محض قیاس پر تقویم کی مدد سے سنہ کے اعداد کو ۱۲۳۱ مان لیا گیا ہے۔ حالانکہ اس کا اعتراف ماہرینِ غالب کو بھی ہے کہ ہجری سال کو پوری طرح عیسوی سال کے مطابق کرنا بہت مشکل ہے۔ بات یہ ہے کہ چاند کے نظر آنے کا کوئی اصول مقرر نہیں ہے۔ چاند کبھی یکے بعد دیگرے انتیس کو نظر آجاتا ہے کبھی تیس کو اور کبھی یہ بھی ہے کہ لگاتار دو دو تین تین مہینے تک انتیس کو یا تیس کو دکھائی دیتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ جہاں جس تاریخ کو دکھائی دیتا ہے وہاں اسی دن سے تاریخ اور سنہ کا حساب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ چاند نظر آنے اور نہ آنے کے سبب، کبھی کبھی ایک ہی علاقے کے مختلف مقامات پر تاریخ اور دن کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، نتیجتہً ایک ہی سال میں کہیں عید پیر کو ہوتی ہے کہیں منگل کو۔ اسی طرح کا واقعہ کبھی سال میں ایک بار اور کبھی کئی بار رونما ہوتا ہے۔ اس لئے جب تک ہر قمری مہینے کے بارے میں، رویت ہلال کی تاریخ صحیح طور پر معلوم نہ ہو، اس وقت تک کسی قمری کیلنڈر کو عیسوی کیلنڈر کے مطابق نہیں بنایا جاسکتا۔ صرف قیاس سے کام نکالا جائے گا اور اس میں غلطی کا کلی امکان بہرحال رہے گا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ نسخۂ امروہہ کے ترقیمہ میں سنہ کے محذوف اعداد کو کسی اصول کی بناء پر نہیں، محض اور قرائن سے اخذ کیا گیا ہے جس کے حتمی اور یقینی ہونے کی کوئی دلیل نہیں دی جاسکتی۔ ممکن ہے کہ کاتب نے سنہ کے اعداد مغالطہ پیدا کرنے کے لئے دانستہ چھوڑ دیئے ہوں۔

سنہ کے اعداد کے سلسلے میں یہ سوال ڈاکٹر انصار اللہ نظر اور بعض دوسروں نے بھی اٹھایا تھا لیکن اس کا شافی جواب، اب تک کسی سے نہیں بن سکا۔ اس کے علاوہ بھی اس ترقیمے میں بعض خرابیاں ہیں۔

الف۔ ترقیمہ سے پہلے تمت تمام شد کے الفاظ درج ہیں اور معنوی اعتبار سے یہ ٹکڑا مضحکہ خیز ہے۔ "تمت تمام شد" کا مفہوم ہوا "تمام تمام شد" اور یہ ایک بے معنی سی بات ہے۔ مخطوطوں یا کتاب کے آخر میں صرف "تمت" یا صرف "تمام شد" لکھا جاتا ہے کیونکہ بلحاظ عربی "تمت" کا وہی مفہوم ہے جو فارسی کی رو سے "تمام شد" کا۔ تمت اور تمام شد دونوں کو یکجا لکھنا مہمل محض ہے اور قدیم مخطوطوں میں اس کی مثال نظر نہیں آتی۔

ب۔ اس ترقیمے میں مرزا کا لفظ دوبارہ آیا ہے اور دونوں جگہ اس لفظ کا املا جداگانہ ہے۔ پہلی بار "مرزا" اور دوسری بار "میرزا" لکھا ہے۔ چند سطری ترقیمے کے ایک ہی لفظ میں املا کا یہ اختلاف ماہرینِ غالب کے لئے بہرحال ایک سوالیہ نشان ہے۔

ج۔ ترقیمے میں "عفی اللہ عنہ" سے ماہرین نے ایک حتمی نتیجہ یہ اخذ کیا ہے کہ کسی تحریر میں ان الفاظ کا استعمال صرف اس کا کاتب ہی اپنے نام کے ساتھ کرتا ہے اور اسی کو بنیاد بنا کر مخطوطے کو بخطِ غالب بتایا گیا ہے۔ لیکن کمال احمد صدیقی، اس اصول کو تسلیم نہیں کرتے۔ انہوں نے مثالوں کے ذریعے وضاحت سے بتایا ہے کہ "عفی اللہ عنہ" کا استعمال صرف اپنے نام کے ساتھ نہیں، دوسروں کے نام کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ اس لئے نسخہ غالب کو بخط غالب کہنے کے سلسلے میں "عفی اللہ عنہ" کے اندراج کی شہادت بہت کمزور ہے۔

د۔ ترقیمے میں "تحریر دیوان حسرت عنوان" کا ٹکڑا بھی کوئی واضح معنی نہیں دیتا۔ اس جگہ "حسرت عنوان" کا کیا محل و مصرف ہے اور غالب نے اسے کس خاص پس منظر میں استعمال کیا ہے، اس پر بھی روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔

س۔ ترقیمے کے آخر میں "آورد" کے بعد فقط کا لفظ مخفّف کر کے "ط" کی شکل میں درج ہے۔ قدیم نسخوں، خاص طور پر غالب کی دوسری قلمی تحریروں میں فقط کو اس طرح لکھنے کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ ایسا کیوں ہے ؟ اس کا بھی جواب، ماہرینِ غالب ہی دے سکتے ہیں۔

۳۔ مخطوطے کے آخر میں اردو اور فارسی کی رباعیاں ہیں اور ماہرین کے نزدیک ان میں نصف سے زائد غیر مطبوعہ ہیں اور پہلی بار سامنے آئی ہیں، ان رباعیوں میں غالب کی وہ مشہور و معروف رباعی نہیں ہے جو ان کے متداولہ اردو دیوان میں بھی بشکل ذیل موجود ہے۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل

غالب کے سارے محققین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ غالب کی یہ رباعی ان کے ابتدائی دورِ شاعری کی یادگار ہے۔ اس کے قدیم تر ہونے کا ایک واضح ثبوت یہ بھی ہے کہ یہ تذکرہ "عمدۂ منتخبہ" میں دوسرے مصرعے میں لفظی تغیر کے ساتھ اسی طرح موجود ہے۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

عمدۂ منتخبہ ۱۲۱۵ھ سے ۱۲۲۴ھ یا بقول مولانا امتیاز علی خان عرشی ۱۲۱۶ھ سے ۱۲۲۶ھ تک کے درمیانی عرصے میں یعنی نسخۂ امروہہ مکتوبہ ۱۲۳۱ھ سے کئی سال قبل مکمل ہو چکا تھا۔ اس لئے اس رباعی کو کسی نہ کسی شکل میں نسخۂ امروہہ میں ہونا چاہیے تھا خصوصاً اس لئے کہ یہ رباعی غالب کے قیامِ آگرہ کی یادگار ہے اور اس معاصرانہ چشمک کی طرف اشارہ کرتی ہے جسے غالب کے سوانح نگاروں نے تاریخی واقعات سے منسلک کیا ہے۔ غالب کو بھی یہ رباعی ضرور عزیز تھی اس لئے کہ متداول دیوان میں موجود ہے۔ ایسی اہم رباعی کو نسخۂ امروہہ بخطِ غالب میں کیوں جگہ نہیں دی گئی، اس کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

۴۔ اس رباعی پر موقوف نہیں اور کئی ایسی غزلیں ہیں جن کا ثبوت "عمدۂ منتخبہ" سے ملتا ہے۔ نسخۂ امروہہ میں نہیں ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کے جواب میں قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ "عمدۂ منتخبہ" کے ترجمۂ غالب میں بعد کو اضافہ ہوا ہوگا۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ "عمدۂ منتخبہ" کے تراجم میں ۱۲۲۴ھ یا ۱۲۲۶ھ کے بعد کسی اضافے کا ثبوت نہیں ملتا حتیٰ کہ جن شعراء نے عمدۂ منتخبہ کے لکھے کے بعد وفات پائی ان میں بھی اضافہ نظر نہیں آتا۔ اس لئے نسخۂ امروہہ میں "عمدۂ منتخبہ" میں دیئے ہوئے اشعار کا پایا جانا ضروری تھا خواہ انہیں قلم زد دکھایا جاتا۔

۵۔ نسخۂ امروہہ میں مندرجہ رباعی بھی ملتی ہے۔

بعد از تمام بزمِ عیدِ اطفال — ایامِ جوانی رہے ساغر کش حال
آپہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم — اے عمرِ گزشتہ یک قدم استقبال
(نقوش ص ۲۹۵)

اس رباعی کا مضمون و مفہوم صاف ظاہر کرتا ہے کہ غالب نے یہ رباعی عالمِ نوجوانی یا تیس سال کی عمر میں نہیں بلکہ اس وقت کہی ہوگی جب کہ وہ اپنی زندگی کا بیشتر سفر طے کر چکے تھے۔ اس لئے نسخۂ امروہہ مکتوبہ ۱۲۳۱ھ میں اس رباعی کا پایا جانا مضحکہ خیز ہے۔ مخطوطے میں اس رباعی کی شمولیت کا سبب

ایک ہی معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ غالب کی رباعی چونکہ ان کے متداول اردو دیوان میں پہلی رباعی کی حیثیت سے درج ہے اس لئے کاتب نے اسے غالب کی قدیم ترین رباعیوں میں خیال کیا اور مفہوم پر غور کئے بغیر اسے مخطوطے میں جگہ دیدی۔ اگر اس کے سوا کوئی اور جواز، اس سلسلے میں پیش کیا جاسکتا ہے تو محققین کو اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ اس رباعی کی طرح غالب کی وہ غزل بھی جس کا مطلع و مقطع ہے ۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں ۔ وہ شب و روز اور وہ سال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ غالب ۔ وہ عناصر میں اعتدال کہاں

ان کے عالم پیری سے تعلق رکھتی ہے لیکن یہ بھی نسخۂ امروہہ (نقوش ص ۱۴۲) میں موجود ہے اس کے متعلق تو تیر پر حکم لگا دیا گیا ہے کہ یہ حاشیے میں درج ہے اور بعد کا اندراج ہے حالانکہ یہ بات بھی محض قیاسی ہے پھر بھی اگر اسے یوں ہی تسلیم کر لیا جائے تو مذکورہ بالا رباعی کے شامل ہونے کا کیا جواز ہے یہ تو خاص متن کے اندر ہے اور بخط غالب بتائی گئی ہے۔

۶۔ مندرجہ ذیل فارسی کی رباعی بھی بعض وجوہ سے قابل توجہ ہے ۔

گفتم کہ اسد؟ گفت دل آشفتۂ من ۔ گفتم نفسش؟ گفت بخون خفتۂ من
گفتم سخنش، بایں نزاکت گفتن ۔۔ گفت ایں ہمہ مدعائے ناگفتۂ من

(نقوش ص ۲۹۳)

اس رباعی کے پہلے مصرعے میں "گفتم" کے بعد "کہ" کا نہیں "کہ چہ" کا محل ہے اور غالب ایسے موقعوں پر "کہ چہ" ہی لکھتے تھے۔ دوسری حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس رباعی میں "اسد" تخلص استعمال ہوا ہے۔ مرزا نوشہ فارسی میں شروع ہی سے "غالب" تخلص کرتے تھے، ایک جگہ بھی انہوں نے فارسی میں اسد نہیں لکھا۔ یہ فارسی رباعی جس کا وجود نہ تو عمدہ منتخبہ میں ہے نہ نسخۂ حمیدیہ میں اور نہ کسی فارسی کلیات میں، جعلی معلوم ہوتی ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اس فارسی رباعی میں "اسد" کے استعمال کا جواز تلاش کرنا ہوگا۔

۷۔ مخطوطے کی آخری رباعی پر بھی نظر ڈالتے چلئے ۔

گلشن شرر، اہتمام بستر ہے آج -- یعنی تپ عشق شعلہ پرور ہے آج
ہوں در دِ ہلاک نامہ بر سے بیمار -- قارورۂ مرا خونِ کبوتر ہے آج

اس رباعی کی "ردیف" یکسر حشو اور بھرتی کی ہے اور چوتھے مصرعے کی زبان بھی ایسی ہے کہ اسے غالب سے منسوب کرنا مشکل ہے۔

۸۔ "نسخۂ امروہہ" میں املا و قواعد کی بھی ایسی غلطیاں نظر آتی ہیں جن کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ غالب کے قلم کا نتیجہ ہوں گی۔ مثلاً نسخۂ امروہہ میں ارادہ کو ارادا، تعالیٰ کو تعالا اور کثافت کو کسافت لکھا ہے۔ اسی طرح تپ کو ہر جگہ تب اور مژہ و مژگان وغیرہ کے الفاظ میں ہر جگہ ژ کی جگہ ز لکھا ہے حالانکہ ایسا کرنا مرزا کے مسلک و مزاج کے برعکس نظر آتا ہے۔ متعدد ضروری مقامات پر اضافت کی علامت ظاہر نہیں کی گئی اور بعض جگہ ترکیب اضافی و ترکیب توصیفی میں فرق نہیں کیا گیا۔ مثلاً اس مصرعہ میں --

"حصارِ شعلۂ جوّالہ میں عُزلت گُزیں پایا (نقوش ص ۵۷)

"جوّالہ" پر تشدید اور "عُزلت" اور "گُزیں" کے ع اور گ پر پیش کا نشان ملتا ہے لیکن "جوّالہ" پر ہمزۂ اضافت نہیں ہے، کیوں؟ جب تشدید اور پیش کی سی غیر ضروری جزئیات جن کے بغیر مصرعے کو بہ آسانی صحیح طور پر پڑھا جا سکتا ہے، حذف نہ ہو سکیں تو ہمزۂ اضافت کیوں کر محذوف ہو گیا، چند مثالیں اور دیکھئے۔

مگر ہو مانعِ دامن کشی شوقِ خود آرائی -- ہوا ہے نقش بندِ آئینۂ سنگِ مزار اپنا

اس میں چار جگہ اضافت کا زیر آنا چاہئے لیکن ایک جگہ بھی نہیں آیا۔ غالب کی دوسری تحریروں میں اس قسم کی فروگذاشت نظر نہیں آتی، ایک مصرعہ اور دیکھئے۔

حسن خود آرا کو ہے عشقِ تغافل ہنوز

اس میں "حسن" کے ن کے نیچے اضافت کا زیر چاہئے لیکن اضافت کے بجائے اسے یائے تنکیری کے ساتھ یوں لکھا ہے۔

حسنے خود آرا کو ہے عشقِ تغافل ہنوز

اسی طرح اس شعر میں --

ہے مستِ امتحانِ ہوس طینتی، اسد
اے جوشِ عشق بادہ مرد آزما مجھے

"امتحان ہوس طینتی" کو "امتحانِ ہوس طینتے" یعنی طینت کو یائے تنکیری کے ساتھ لکھا ہے جس کا یہاں کوئی محل نہیں ہے۔ غالب کے محققین نے مخطوطے کی اس قسم کی کمزوریوں کو سہو قلم سے تعبیر کیا ہے مانا کہ ایسا ہی ہے لیکن جب ماہرین کو اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ اس نسخے پر نظر ثانی کی گئی ہے اور اس میں اصلاح و اضافہ، بہت بعد تک ہوتا رہا ہے اور یہ صحیح بھی ہے اس لئے کہ اس میں جگہ جگہ بعض چیزیں اصلاح شدہ اور قلمزد ملتی ہیں، تو پھر وہ خامیاں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کیوں درست نہیں کی گئیں۔

یہی نہیں اس نسخے میں حرفوں کی ساخت، کشش، جوڑ، نقاط اور دوسری علامتوں کے غلط استعمال کی سینکڑوں ایسی مثالیں ملتی ہیں جو غالب کے مسلک و مزاج کے خلاف نظر آتی ہیں اور مخطوطے کو مشکوک بناتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ غالب کے ماہرین از سرِ نو اس پر نظر ڈالیں اور اس کے متعلق جو اعتراضات اٹھائے گئے ہیں ان کو رفع کریں ورنہ کمال احمد صدیقی کی کتاب کے مطالعہ کے بعد، مجھ جیسے غالب کے عام قاری کو قائل ہونا پڑے گا کہ نسخۂ امروہہ، نہ تو قدیم ہے اور نہ بخطِ غالب بلکہ سرے سے جعلی ہے۔

غالب اور جذبۂ آزادی

سید ابوالخیر کشفی شعبہ اُردو جامعہ کراچی

بڑے ادب اور خاص طور پر بڑی شاعری کی ایک پہچان میرے نزدیک یہ بھی ہے کہ اس میں فنکار کی طرح قاری بھی شریک ہو جاتا ہے یہ نکتہ قدرے تفصیل چاہتا ہے۔ شرکت سے مراد یہ ہے کہ قاری ایک طرف شاعر کے مدعا کو اس کے اشعار میں تلاش کرتا ہے اور دوسری طرف ان میں نئی معنویت دریافت یا تخلیق کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے شاعر کے کلام کے نئے افق وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ہماری نظر کے سامنے ابھرتے اور پھیلتے ہیں۔ ان آفاق کی تخلیق میں شاعر، ہم اور نئے دور کے احوال و کوائف سبھی شامل ہوتے ہیں۔

آج غالب کو ہم سے رخصت ہوئے ایک سو سات سال ہو گئے ہیں اور اس وقت جب میں آپ سے غالب کے بارے میں گفتگو کرنے بیٹھا تو خیال آیا کہ ذرا اسی زاویہ سے غالب کے چند اشعار پر نظر ڈالیں یا کم سے کم چند شعر دہرا لیں۔ ایسے اشعار جن کی بنا پر غالب ہماری زندگی میں شریک ہے۔ غالب نے لہو کے بارے میں کہا تھا:

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

لیکن غالب تو اس لہو سے بھی زیادہ معتبر اور برگزیدہ ہے۔ اس کا جذبہ ہماری آنکھوں سے لہو بن کر ٹپکتا، اور اس کا فکر ہماری رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے۔ اردو کا کوئی کلاسیکی شاعر اس حد تک عہدِ حاضر کے مزاج کا حصہ نہیں ہے۔ غالب کی اصطلاحوں میں کلاسیکی اور مسلّمہ مفاہیم کے بطن سے وہ نئے معانی پیدا ہوتے ہیں جو ہمارے عہد کے تجربوں کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

استبداد کی دیوی بڑی سخت جان ہے۔ اس نے آج بھی آزادی کے اس عالمگیر عہد میں جمہوری قبا چڑالی ہے اور اس میں پلٹے کو بی کر رہی ہے۔ ستم یہ ہے کہ استبداد

کی یہ دلیری آمریت کو بھی جمہوریت بکنے اور کہلانے پر دوسروں کو مجبور کرتی ہے، اور اظہار کے ہر وسیلہ اور ذریعہ پر اپنے مفادات کے پہرے بٹھا دیتی ہے۔ اس صورتِ حال سے آپ کچھ ایسے بے گانہ اور لاتعلق نہ ہوں گے سا ایسے حالات میں نکلنے والے ہی معاشرہ کا ضمیر بن کر سامنے آتے ہیں، چاہے غالب کے الفاظ میں اس راہ میں ان کے ہاتھ ہی قلم کر دیئے جائیں ۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

"جنوں کی حکایات خوں چکاں" کا اظہار، دل پر گذرنے والی واردات کے بیان سے آگے کا مرحلہ ہے، اور پھر اس مُغل بچہ نے اپنے ہاتھ کے قلم ہونے کے تذکرہ پر بات ختم کر دی اور پہلے پرسشِ لوح و قلم کا نعرہ بلند نہیں کیا۔ غالب اپنے کلام کے محاسن اور ذات کے اعلان میں کسی سے پیچھے نہیں اور نہ انکسار کا قائل ہے، لیکن جب ادائے قرض کی بات کرتا ہے تو ادعا کے بغیر۔

ان حکایاتِ خوں چکاں کی اساس آزادی کا وہ جذبہ ہے جو کلام غالب میں جابجا شعلہ وار نظر آتا ہے۔ غالب نے اپنے آپ کو "جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گذار" کہا ہے۔ یہ ہوائے سرِ رہ گذار، آزادی کی علامت ہے۔

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گذار تھا

آزادی کی کئی راہیں اور مرحلے ہیں۔ ہر فرد اور جماعت کو آزادی کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ غالب تو عشق کے مرحلوں اور آزمائشوں کی نسبت آزادی کی آزمائشوں کو کڑی تر سمجھتے ہیں۔

قد و گیسو میں قیس و کوہ کن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

دار و رسن کی آزمائش تو وہ مقتلِ آتشیں ہے جو آزادی کو ہمیشہ جاں در کشی ہے۔ پھر آزادی کے یہ دیوانے تو خود ظلم کو کہاں تک سہتے ہیں۔ یہ استحکام ذات کی معراج ہے کہ وہ کہتا

کے یہ زندہ شہید جانتے ہیں کہ ظلم کے تیروں کا مقدر ہی خطا ہونا ہے۔ ظلم کے تیر آزادی کے سینے پر لگتے ہی کند ہو جاتے ہیں ؎

کیوں نہ ٹھہریں ہدف ناوکِ بیداد کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

یہ خیال غالب کے ہاں بار بار اپنے آپ کو دہراتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بعض جذبے اپنے اظہار کے لئے خود شاعروں کو چن لیتے ہیں۔ آزادی اور عظمت آدم کے تصورات نے اپنی پہلی واضح نمود کے لئے میر اور غالب کو چنا اور اس اظہار کو اقبال کے ذریعہ درجۂ تکمیل تک پہنچایا۔

ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا غالب کے ہاں تیر خود اٹھا لانے کا بنیادی خیال زبان کے نئے نئے لباسوں اور اظہار کی نت نئی صورتوں میں ڈھلتا ہے ؎

عشرتِ قتل گہہ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

"اہلِ تمنا" کی اصطلاح زلف و رخسار کے اسیروں کے ساتھ ساتھ کاروانِ آزادی کے رہروؤں کا احاطہ بھی کرتی ہے اور یہ شمشیر، شمشیرِ غمزہ بھی ہے اور شمشیرِ دستِ جور بھی۔ اس شمشیر کی عریانی اہلِ تمنا کو اپنے قد کی پیمائش اور حوصلوں کو ناپنے کا موقع فراہم کرتی ہے اب تک تو بات شمشیرِ ستم، ناوکِ ظلم، جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں اور دار و رسن کی آزمائش کی ہوئی ہے، اب ذرا یہ دیکھیں کہ غالب نے ان حقائق کا اظہار کس طرح کیا ہے۔

اس گفتگو میں جو اشعار میں نے آپ کی خدمت میں پیش کئے ہیں ان سے غالب کے فنِ شعر کا پوری طرح اندازہ ہو سکتا ہے۔ اردو کے شاید ہی کسی شاعر نے غزل کی ہیئت اور اس کے امکانات کو اس تخلیقی انداز میں پیش کیا ہو جس طرح غالب نے۔ اس نے غزل کی ہیئت کو نہایت گہرائی میں جا کر سمجھا ہے اور ہمیں سمجھایا ہے۔ غالب نے ہمیں بتایا ہے کہ غزل بادہ و ساغر کے پردوں میں مشاہدۂ حق کی گفتگو ہے اور غمزہ کو دشنہ و خنجر کا روپ عطا کرنے کا نام ہے۔ غالب نے خام و رمز سے کام لیا ہے لیکن اس طرح کہ معانی

کہیں مخفی نہ ہونے پائیں۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ غالب کا سروش کہیں غلط آہنگ نہیں ہوتا ہے لیکن گرمیٔ کلام کا درجہ ہمیشہ غالب کے فن کے تابع رہتا ہے۔ غالب نے ہمیں یہی سکھایا ہے

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

غالب کی شاعری نوا ہائے راز کا گنجینہ ہے اور یہاں پر حجاب ساز کا پردہ ہے

غالب کا شعر ہے

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ غالب کا یہ خطاب اپنے عہد کے سامع اور ہر دور کے قاری سے ہے۔ غالب کے ہاں جذبۂ آزادی کی تلاش میں میں نے جو اشعار پیش کیئے ہیں ان کی تعبیر و تفسیر غالب کے شارحوں نے مختلف انداز سے کی ہے۔ خود ان اشعار کے دوسرے معانی میرے ذہن میں بھی ہیں، لیکن جذبۂ آزادی کے موضوع پر سوچتے ہوئے یہ اشعار خود بخود ہم رشتہ ہوتے گئے۔ یہ گفتگو ادب کی تفہیم اور تعبیر میں قاری کے کردار کی ایک مثال ہے۔ آیئے غالب کی برسی کے موقع پر ہم اور آپ اسی تلاش کے عمل کو آگے بڑھائیں۔ یہی عمل ادب کی آفاقیت کی ایک بنیاد ہے۔

غالبؔ کا ایک شعر۔ فکر و فن کے آئینے میں

از

شہد احمد علوی ۔ دہلی

غالبؔ کے نہ معلوم کتنے شعر ایسے ہیں کہ ان کی شرح کرنے میں بڑے بڑے سخن فہم آپس میں اختلاف کرتے ہیں اور لطف یہ کہ ہر نقاد یا شارح مختلف معانی و مطالب بیان کرنے کے باوجود شاعر کے مقصود ذہنی تک پہنچنے کا دعویدار ہے۔ منجملہ ایسے اشعار کے یہ شعر بھی تشریح و توضیح کا متقاضی رہا ہے۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ! نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

رنگِ بیدلؔ میں یہ فکر انگیز شعر غالبؔ کے اس معروف مشکل کلام، کے ذیل میں نہیں آتا جو نامانوس الفاظ اور دور از کار تلمیحات سے مرصّع ہے۔ تاہم مرزا کی مشکل پسند طبیعت کی غمازی کرتا ہے۔ خود آفریدہ تشبیہات، "کفِ خاکستر" اور "قفسِ رنگ" نے جہاں محسوسات و مشاہدات کو تازہ رنگ و آہنگ دیا ہے وہاں الفاظ کی دروبست اور "اے نالہ" کے نرالے طرزِ تخاطب نے شعر کے ہر لفظ کو "گنجینۂ معنی"(۱) کا ایک طرفہ طلسم بنا دیا ہے۔ یہ شعری تصویر گوش آشنا ہوتے ہی مبصر کو اپنے معانی کی گوناگونی کی طرف لے جاتی ہے۔ چنانچہ غالبؔ کی حیات ہی میں یہ شعر اہلِ نقد و نظر کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ "یادگارِ غالبؔ" میں حالی رقمطراز ہیں کہ انھوں نے خود اس کے معنی مرزا سے پوچھے تھے۔ فرمایا کہ "اے" کی جگہ "جز" پڑھو معنی خود سمجھ میں آ جائیں گے۔" حالی کے نزدیک شعر کا مطلب یہ ہوا کہ "قمری جو ایک کفِ خاکستر

---

(۱) گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے۔ جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے۔

سے زیادہ اور بلبل جو ایک قفس عنصری سے زیادہ نہیں ان کے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف ان کے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔"

حسرت موہانی "اے نالہ" کو "جز نالہ" مان کو شعر کا مطلب یہ نکالتے ہیں: "...... بلبل و قمری کے سوز عشق کا تو ایک نشان ہے مگر عاشقِ مہجور کی محبت کا نشان صرف "نالہ" رہ گیا ہے۔"

"جاوید نامہ" میں اقبالؔ فلک مشتری پر پہنچتے ہیں تو غالبؔ سے پہلا سوال یہی کرتے ہیں کہ اس شعر کے کیا معنی ہیں؟ جواب میں غالبؔ کہتے ہیں کہ سوز جگر کے نالے کی تاثیر ہر جگہ مختلف ہوتی ہے۔ قمری اس نالے سے کفِ خاکستر بن گئی ہے۔ اور بلبل پیکر رنگ (۱) ......

غرض اس جہان رنگ و بو میں "قسمت ہر دل بقدر ہاؤ ہوست"(۲)

شاعر کا معہودِ ذہنی کیا ہے؟ اقبالؔ اس کی سند بھی غالبؔ کے جواب ہی سے لاتے ہیں

یا برنگ آ، یا بہ بیرنگی گذر

تا نشانے گیری از سوز جگر

بیخود موہانی بہ تقلید شوکت میرٹھی زیر نظر شعر میں "قفس رنگ" کو "قفسی رنگ" پڑھ کر یہ مطلب بیان کرتے ہیں۔

"قمری بھی نالہ کش ہے اور بلبل بھی۔ قمری سوز عشق سے جل کر خاکستر ہے اور بلبل خاکِ سیاہ۔ اے نالہ! میں اپنے سوزِ دل کے ثبوت میں دنیا کو کیا دکھاؤں خالی نالہ دعویٰ بے دلیل اور موجب رسوائی ہے۔"

جہاں تک شعر میں رد و بدل کا تعلق ہے "قفس رنگ" کی جگہ "قفسی رنگ" اور "اے نالہ" کی بجائے "جز نالہ" تو یہ محض املا کی غلطی کی بنا پر نہیں بلکہ شارحین یہ سمجھے کہ اس رد و قبول کے بغیر دونوں مصرعوں کا معنوی ربط وہ نہیں رہتا جو شاعر کا منشا و اصلی ہے۔ بغرض نادر تشبیہات اور "اے نالہ" کے اندر استفسار سے پیدا ہونے والی پیچیدگی کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے شارحین

۱:۔ قمری از تاثیر او واسوختہ   بلبل از وے رنگہا اندوختہ (جاوید نامہ۔ اقبالؔ)

۲:۔ تو ندانی ایں مقام رنگ و بوست۔ قسمت ہر دل بقدر ہاؤ ہوست (جاوید نامہ۔ اقبال)

کہیں سے کہیں نکل گئے۔ اقبال سہیل نے تحریف لفظی و معنوی پر گرفت کرتے شعر کا مفہوم اس طرح متعین کیا ہے۔

"پہلے (۱) چند مقالات ذہن نشین کر لینا ضروری ہے،

(۱) قفس رنگ کے وہی معنی ہیں جو نظم طباطبائی نے لکھے ہیں یعنی سبد رنگ۔ ان معنوں میں یہ لفظ زبان فارسی میں مستعمل ہے اور وجہ ظاہر ہے۔ رنگ کو اڑنے کی بنا و پر طائر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہاں بلبل کی رعایت سے قفس رنگ کا لفظ سبد رنگ سے زیادہ مناسب ہے۔

(۲) نالہ کشی ایک صفتِ مشترک ہے جو بلبل، قمری اور عاشق ناشاد سب میں پائی جاتی ہے۔

(۳) نالہ کشی اگر حقیقی ہو تو فطری ظہور ہے "دل کی اندرونی کاوشوں کا" اور یہ کاوشیں ایک شاعر کے خیال میں صرف سوز محبت سے پیدا ہوتی ہیں۔

(۴) سوز منافی ہے رنگینی کا کیونکہ رنگینی علامت نشاط اور سوز محبت نام ہے حزن و اضطراب کا۔

اب شعر کا مطلب سنئے۔

یوں تو ظاہری طور پر بلبل و قمری کی صدائیں بھی نالۂ عاشق سے ملتی جلتی ہیں۔ مگر نالۂ عاشق اور نوائے بلبل و قمری میں اصل و نقل کا فرق ہے۔ عاشق کے نالے تو محبت کی بیتابی ظاہر کرتے ہیں یہ بات فغاں بلبل و قمری میں کہاں۔ قمری محض کا ڈھیر ہے جس میں سوز محبت کی کوئی چنگاری نہیں ہے اور بلبل ہمہ تن رنگینی نشاط ہے۔ اس کو سوز محبت سے کیا سروکار۔ ان دونوں کی صورتیں خود اس امر کی شاہد ہیں کہ یہ ذوق جگر سوختگی سے محروم ہیں کہ یہ ذوق جگر سوختگی سے محروم ہیں اور ان کی نالہ کشی محض نقالی ہے۔ یہاں "نالہ" سے مراد نالہ بلبل و قمری ہے خود اپنا نالہ مخاطب نہیں ہے"۔ــــــ اقبال سہیل آگے

---

(۱) تبصرہ بر "گنجینۂ تحقیق" (مولفہ بہزاد موہانی) مطبوعہ ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ بابت ماہ نومبر و دسمبر، ۱۹۲۱ع و جنوری، ۱۹۲۲ع

چیل کو کہتے ہیں تو...... اولاً تو "قفسِ رنگ" کا لفظ کانوں کو کھٹکتا ہے۔ علاوہ بریں قفسِ رنگ سے رنگ سیاہ ہی کیوں مراد لیا جاتے کیا قفس کے لئے ضروری ہے کہ لوہے کا ہی ہو۔ اکثر پنجرے بانس یا پیتل کی تیلیوں کے بھی تو ہوتے ہیں۔ جناب بیخود کا استدلال کتابت دیوان پر ہے۔ وہ چنداں قابل اعتناء نہیں۔ وجہ ثانی اختلاف کی یہ ہے کہ اگر بیخود صاحب کی تعبیر صیحح مان لی جاتے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ غالب اپنے مرتبہ عشق کو بلبل و قمری کے عشق سے فروتر سمجھتا ہے اور یہ امر غالب کی فطرت کے بالکل مخالف ہے۔"

سہیل مرحوم نے جس فطرت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ غالب کی انانیت ہے جو ان کے کلام میں روح کی طرح جاری و ساری ہے۔ یقیناً عندلیب "گلشن نا آفریدہ" یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ بلبل و قمری کا روایتی عشق کسی مرحلے پر بھی اس کے ذوق جگر سوختگی سے زیادہ تپش اندوز ہے۔ غالب کی انانیت کا تو یہ عالم ہے کہ وہ دوسروں کی سخنوری کی کما حقہ داد دیتے ہوئے بھی اپنے انداز بیان (۱) کی طرفگی پر نازاں ہے۔ یہ انفرادیت کی نمود غالب کے انداز بیان کو بھی نیا رُخ دکھاتی ہے اور ان کے محسوسات معنی کو بھی نئی بلندیوں سے آشنا کرتی ہے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا لیتے
عرش کے پرے ہوتا کاش کے مکاں اپنا

غالب کی انانیت انھیں کہیں نچلا نہیں بیٹھنے دیتی البتہ اپنے حریفوں کے مقابل وہ شاعرانہ تعلّی سے کام نہیں لیتے بلکہ ایسے پہلو تلاش کرتے ہیں کہ گوئے سبقت انھیں کے ہاتھ رہے۔ اسی فطرت کے سبب انھیں نکونامیٔ فرہاد (۲) تسلیم ہے اور نہ "تقلید تنک ظرفی منصور" (۳) کسی طور منظور۔ ہر چند "قفس" ان کا ہمسر ہے مگر کس پہلو سے۔

جز قفس اور کوئی نہ آیا بروئے کار صحرا مگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا۔

---

(۱) ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے ۔ کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور۔

(۲) عشق و مزدوریٔ عشرت گہہ خسرو کیا خوب ۔ ہم کو تسلیم نکونامیٔ فرہاد نہیں

(۳) قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ۔ ہم کو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ - سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا۔

ایسے پہلو دار اشعار غالب کے دیوان میں جابجا بکھرے پڑے ہیں - وہ حریفوں سے پورا پورا انصاف کرتے ہیں - مگر اپنی "میں" کا سر جوش دبا نہیں سکتے - ایسے موقع پر وہ فکری سنجیدگی سے کام لیتے ہیں اور اپنی "انا" کو عموماً پردے سے دکھاتے ہیں - غالب کا یہ منفرد انداز مجھے کشاں کشاں ایک ہندی دوہے کی طرف لیئے جاتا ہے۔

لکڑی جل کوئلہ بھئی اور کوئلہ جل بھیو راکھ
میں برہن ایسی جلی کوئلہ بھئی نہ راکھ

اس دو ہے میں کیا نہیں جو غالب کہنا چاہتے تھے - وہی حاصل عشق کا مضمون یہ اور بات ہے کہ زبان و بیان کا فرق غالب کے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے - "عجم کا حسن طبیعت" اور عرب کا سوز دروں" کہ غالب کے کلام میں رچا بسا ہے - ان کے محسوسات کو تشبیہ و تمثیل کی اس دنیا میں لے جاتا ہے جہاں "حریف مئے مرد افگن عشق" (۱) غالب کے بعد اور کون ہو سکتا ہے - تشبیہات کا جائزہ لیجئے تو صرف معلوم ہوتا ہے - کہ عاشق ناشاد اور اس کے حریف مقابل بلبل و قمری سب میں نالہ کشی قدر مشترک ہے - اس سے مخاطب ہو کر شاعر پوچھتا ہے کہ عشق کی آگ میں جلنے والوں کا کوئی نہ کوئی نشان باقی ہے - نالہ کش قمری "کف خاکستر" اور فریاد کناں بلبل - "قفس رنگ" ہے - مگر "اے نالہ" میرے جگر سوختہ کا بھی کوئی نشان ہے ؟

میں برہن ایسی جلی کوئلہ بھئی نہ راکھ

اب ذرا تشبیہات کے اجزائے ترکیبی کو سامنے رکھئے تو فکر و خیال کے کتنے دریچے کھلتے در بند ہوتے ہیں - سوز دروں سے جل کر راکھ ہو جانے والی قمری کو اس کے رنگ کی مماثلت سے "کف خاکستر" کہنا اور سوز نہانی سے پریدہ رنگ بلبل کو "قفس رنگ" سے تشبیہ دینا عشق کا زن کا وہ اسلوب ہے جو موضوع کی مناسبت سے تصویر کے خط و خال ابھارتا ہے - یہاں

---

(۱) کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق - ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

ہر دو معنی خیز تشبیہات سے تمثیلی عشاق، بلبل و قمری کی اندرونی کاوشوں کی تصویریں سامنے آجاتی ہیں البتہ "قفس رنگ" سے رنگینی نشاط مراد لینا اور ثمرہ عشق کے طور پر بلبل نامراد کو "ہمہ تن برنگینی نشاط" ٹھہرانا نہ شعر کے انداز بیان سے مطابقت رکھتا ہے نہ ہر دو تشبیہات کے قرینے سے۔ ایسا لگتا ہے کہ غالب کی جدت طرازی نے قفس طائر رنگ پریدہ کو تقلیل الفاظ بلا اختلال معنی "قفس رنگ" بناکر ایک خوشگوار خلا بیچ میں چھوڑ دیا ہے کہ مبصر کا ذہن اس میں دور دور تک پرواز کرے اور دیکھے "ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تاکجا" تشبیہ کی نادرہ کاری پر گہری نظر ڈالئے تو قفس کا لفظ خود اشارہ کرتا ہے کہ "اب جس جگہ یہ داغ ہے یاں آگے درد تھا"۔ اس لئے کہ قفس نکبت و فلاکت کی آماج گاہ تو ہو سکتا ہے نشاط و عیش کی رہائش گاہ نہیں۔ کسی جگہ غالب نے "خود" کی تصویر کشی میں بھی ایسے ہی لوازمات سے کام لیا ہے۔

خون در جگر نہفتہ بہ زردی رسیدہ ہوں
خود آشیان طائر رنگ پریدہ ہوں

اصل یہ ہے کہ غالب کے یہاں ماحصل عشق مضمون فنا کی آخری منزل سے عبارت اپنے تعلق سے جہاں کہیں فنا کے مضمون کو ادا کیا ہے فکری سنجیدگی سائے کی طرح غالب کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

بادی النظر میں یہ ایک معمولی سی بات ہے جو شوخی سے کہی گئی ہے مگر غالب کے انداز نظر اور اسلوب بیان کو سامنے رکھئے تو اس شعر میں "جسم" اور "دل" کی تقدیم و تاخیر پکار کے کہہ رہی ہے کہ آتش عشق وہ آگ ہے کہ سب کچھ بھسم کر ڈالتی ہے۔ سوز درد کی آخری نشانی فنائے کلی ہے۔

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

پوچھتے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہوگئے

تکمیل فنا کے مضمون کو غالب نے سو طرح باندھا ہے مگر مقام فنا، طلب کی گرمی اور طلب کی شدت کو فطری اور طبیعی شواہد کے ساتھ جس طرح زیر تبصرہ شعر میں پیش کیا ہے۔ وہ دوسری جگہ مشکل سے ملے گا۔ رقص معانی کی یہ جیتی جاگتی تصویر غالب کی مصورانہ قوت کا مظہر بھی ہے اور اردو کے مرقع میں ان کے عجبی طرز گفتار کا نادر نمونہ بھی۔ ان کے فکر و فن کے آئینے میں پھر سے دیکھئے کہ یہ شعر ہنوز داد کا طلب گار ہے۔

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ! نشان جگر سوختہ کیا ہے؟

پوسٹ بکس ۲۲۶۸ ناظم آباد، کراچی ۱۸

غم اور غالبؔ

پاشا رحمٰن
۱۵/ڈی گارڈن فلیٹس گارڈن روڈ کراچی نمبر ۱

"یادگارِ غالب" میں حالی نے مرزا اسد اللہ خاں غالب کو "حیوانِ ظریف" کہا ہے اور ان کی غزلوں میں غم انگیز کیفیتوں کا جواز کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔ "لیکن دراصل یہ غزلیں جن میں غم کی کیفیت کا ذکر ہے، ان کی شاعری و انشاء پردازی کے میدان میں ایک میدان تھا جس کی زمین ان کے دل کو لگ گئی تھی۔۔ چونکہ مرزا صاحب خاص کر رنج و غم کے بیان میں ید طولیٰ رکھتے تھے اس لئے یہ مضمون اکثر ان کے قلم سے تراوش کرتا تھا"۔ گویا حالی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غم ان کا خاص میدان نہ تھا کیونکہ بنیادی طور پر وہ طربیہ قلمکار تھا۔ مجھے حالی کی اس رائے سے شدید اختلاف ہے۔ بادی النظر میں تو غالب کی انشا اور بعد کی غزلوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کہاں شگفتہ مزاج، خوش فکر، رنگین طبع غالب اور کہاں غم۔! اس "حیوان ظریف" نالہ دشمنوں سے کیا لگاؤ۔!! تب میں سمجھتا ہوں کہ غالب کی عظمت کا مرکز ہی یہی ہے کہ اس نے غم اور قنوطیت کو ایک نیا رنگ، ایک نیا مزاج اور ایک نیا کلچر دیا۔ اس نے غم کو رچایا، سنورا اور نکھارا۔ اس طرح اس کی شاعری میں سنور اور نکھر آئی۔ غم اور غالب پر وہ مشہور افسانوی کردار یاد آجاتا ہے جو ایک ماہر نفسیات کے پاس گیا تھا اور اس نے اس سے کہا تھا کہ وہ ہر وقت افسردہ اور غمگین رہتا ہے۔ اس نے ماہر نفسیات سے التجا کی کہ وہ اس کے لئے کچھ مشورے تجویز کرے۔ ماہر نفسیات نے جواب دیا کہ آج کل شہر میں ایک سرکس لگا ہوا ہے۔ اس میں ایک مسخرا ہے۔ اپنی مضحکہ خیز حرکتوں سے لوگوں کو ہنساتا ہے۔ آپ اکثر سرکس میں جایا کریں۔ اس مریض نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جناب! میں ہی تو وہ جوکر (JOKER) ہوں جو سرکس میں آنے والے لوگوں کے پیٹ میں ہنسی سے بل ڈال دیا کرتا ہے"۔ غالب کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ غالب کی ساری زندگی کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کی زندگی تلخیوں

سے بھری پڑی تھی۔ غالب اس وقت پیدا ہوئے جب مسلمانوں کا خورشید اقتدار شفق رنگ ہو چکا تھا۔ وہ انیسویں صدی کی پیداوار تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب ایک عہد دم توڑ رہا تھا اور ایک نیا تمدن ابھر رہا تھا۔ بقول آرنلڈ کے ایک تہذیب مر رہی ہے اور دوسری بطن گیتی سے ظہور پذیر ہونے والی ہے۔ مغلیہ عہد کے جاگیردارانہ نظام کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔ ایک غیر ملکی سرمایہ دارانہ معاشرے کا عفریت سر اٹھائے ہندوستان کے دروازہ پر کھڑا دستک دے رہا تھا۔ پورا معاشرہ انتشار کا شکار تھا اسلام کی دی ہوئی قوت اتحاد خود غرضیوں اور محلاتی سازشوں کے ہاتھوں تباہ ہو چکی تھی۔ سارا ہندوستان طوائف الملوکی کا شکار تھا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں ایک دوسرے سے دست بگریباں تھیں اور یورپی استعمار ان کا دوست بن کر اپنی بغل میں چھری لئے کھڑا تھا۔ مرزا نے آنکھ کھولی تو بادۂ شبانہ کی سرمستیاں ختم ہو چکی تھیں۔ وہ رنگا رنگ بزم آرائیوں کی یادیں "نقش و نگار طاق نسیاں" ہو چکی تھیں۔ مرزا صاحب اس دم توڑتی ہوئی معاشرت کا نوحہ ان اشعار میں پڑھتے ہیں ؎

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھئے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

ان کے یہ اشعار بھی اس دور کی نہایت عمدہ عکاسی کرتے ہیں ؎

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامان باغبان و کف گل فروش تھا

یا صبح دم جو دیکھئے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش تھا

مرزا صاحب ابھی عالم طفلی میں تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ چچا نے پرورش کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا۔ ابھی بچپن کا عہد ختم بھی نہ ہو پایا تھا کہ چچا کا انتقال ہو گیا۔ تیرہ سال کی عمر میں مرزا صاحب کی شادی کر دی گئی۔ مرزا صاحب جیسے مرد آزاد کے لئے یہ ابتدائی عمر میں شادی کا بندھن کچھ عجیب تھا۔ لاشعور میں بیٹھا ہوا احتجاج شاید اس خوبصورت شعر میں ڈھل گیا ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

مرزا صاحب کے سسرال والے متمول لوگ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب خراچ ہو گئے۔ جتنا مال اڑا جاتے۔ کھاتے اور کھلا دیتے۔ یہ عادت عمر بھر نہ گئی۔ روسا دلی پر زوال آیا۔

مرزا صاحب اس کی زد میں آئے لیکن اپنی عادتوں سے باز نہ آئے۔ قرض لیتے رہے اور پیتے رہے اور قرض لینے کے بعد عزتِ نفس کو جو رسوائی ہوتی ہے غالب جیسے خود دار انسان کو تو اس کی چبھن کچھ اور زیادہ ہی محسوس ہوتی ہوگی۔ لیکن ہائے عادت۔ اس کے ہاتھوں مجبور تھے عادت کسی نے خوب کہا ہے کہ فطرت ثانیہ ہوتی ہے۔ ساری کی ساری غیرت وحمیت دھری کی دھری رہ گئی یہاں تک کہ پچاس سال کی عمر میں ایک بار قمار بازی تک کے الزام میں پکڑے گئے اور داخلِ زنداں ہوئے۔ غمِ روزگار نے کیا کیا دن دکھائے۔ جب تیس سال کے تھے تو مرزا صاحب کے سگے بھائی پاگل ہو گئے اس حادثے کا مرزا صاحب کے دل ودماغ پر کم اثر نہیں تھا۔

یہ تو تھا غمِ روزگار کا ذکر۔ اب ذرا غمِ عشق کا قصہ بھی سنتے چلیے۔ ایک خاتون ادب کا بڑا صاف ستھرا ذوق رکھتی تھیں۔ غالب کی شاعری اور ان کی شخصیت سے انہیں خاص لگاؤ تھا غالب نے بھی لگاوٹ کا جواب لگاوٹ ہی سے دیا۔ کم عمری میں اٹھنے سے پہلے گرفتار ہونے کے احساس نے آتشِ عشق کو کچھ اور ہی ہوا دی۔ شوئیٔ تقدیر دیکھئے کہ وہ مہ وشِ دلربا عین عنفوانِ شباب میں مالکِ حقیقی سے جا ملیں۔ مرزا صاحب کو ناقابلِ بیان صدمہ پہنچا۔ "ہائے ہائے" والی پوری غزل انہیں محترمہ کا مرثیہ ہے۔ دیکھئے اس کی موت پر کس کس قسم کے خیالات غالب کے ذہن میں آتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

اس سانحے کے کچھ دنوں بعد عارف کے اٹھ جانے کا غم برداشت کرنا پڑا۔ اس کی موت پر کس غضب کا نوحہ کہا ہے اور اس شعر میں تو حد کر دی ؎

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

یہی تو وہ کے ذاتی المیے تھے۔ رات آپ غمِ جاناں کہہ لیجئے۔ مرزا صاحب کو غمِ دوراں کا بھی صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ مغلیہ عہد ختم ہو گیا۔ سات سمندر پار سے آئے ہوئے فرنگی ہندوستان کے فرمانروا بن بیٹھے۔ ہندوستانیوں نے بغاوت کر دی۔ بہادر شاہ ظفر نے قیادت سنبھالی لیکن ہر تحریک ناکام ہو گئی۔ حشر برپا ہوا۔ لاکھوں افراد مارے گئے۔ عجیب سماں تھا۔

دلّی ایسی لٹی گویا عروس البلاد کا سہاگ لٹ گیا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کا مرزا صاحب نے اپنے ایک خط پر بڑا دردناک نقشہ کھینچا ہے۔

یہ وہ ذاتی معاشرتی اور سیاسی حالات تھے جس میں غالب صاحب کو ذہنی بالیدگی حاصل ہوئی اور ان کی شاعری ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی بامِ عروج کی طرف بڑھتی رہی۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ فنکار کو سمجھنے کے لئے اس ماحول کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے جس میں اس کا ذہن پروان چڑھ رہا ہے۔ ان مسائل کو سمجھنا ضروری ہے جن سے فنکار دوچار ہے۔ غالب نے ایک غم انگیز ماحول میں جہاں عیش و طرب کا نام و نشان نہ تھا زندگی گذاری۔ وہ دلّی جو کبھی خوشیوں اور شادمانیوں کا گہوارہ تھی غالب کے ابتدائی دور میں اس کی شکستگی کہلانے لگی تھی اور اس پر مستزاد یہ کہ خود ان کی اپنی زندگی بھی کئی المیوں کا شکار ہو چکی تھی۔ ایک ایسے شخص سے جو خارجی اور داخلی دونوں المیوں کا شکار ہو نشاط انگیز اور طربیہ شاعری کی توقع کرنا فضول ہے۔

شوپن ہار نے کہا ہے "زندگی غم سے عبارت ہے اور خوشی ایک سلبی کیفیت ہے۔" اس کا مطلب یہ کہ خوشی کو غم کے عارضی فقدان کا نام دے دیجئے۔ شاید شوپن ہار یہ کہنا چاہتا ہے کہ بچہ عالم فانی میں گریاں داخل ہوتا ہے اسی لئے گریہ و زاری سے بچے کی زندگی بھر چولی دامن کا ساتھ رہتا ہے۔ زندگی غم کا دوسرا نام ہے اور خوشی انسان کو اسی وقت نصیب ہوتی ہے جب غم کچھ دیر کے لئے زندگی سے مفقود ہو جائے۔ کسی شاعر نے اسی خیال کو بڑے موثر انداز میں کچھ یوں بیان کیا ہے ؎

شادی و غم میں جہاں کے ایک سے دس کا ہے فرق
عید کے اک دن جیے دس دن محرم روئیے

شاعر ہمیشہ نہایت حساس طبیعت ہوتا ہے۔ جو جتنا اچھا شاعر ہوگا اس کی طبیعت اتنی ہی حساس ہوگی۔ مسلسل غم کی یورش نے غالب کو غم زدہ ضرور بنا دیا تھا لیکن [illegible] کی طرح اس نے غم کا [illegible] بلکہ وہ تو ایک باحوصلہ انسان تھے۔ مرزا صاحب غالب کی یہی کیفیت ہے [illegible] رکھتے ہیں ؎

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

غم واندوہ نے ہمیشہ شاعری کو جلادی ہے شاعری کی جان ہی اس کے المیہ عناصر ہوتے ہیں۔ شیلے کا شہرۂ آفاق مصرعہ ہے۔

UR SWEETEST SONGS ARE THOSE THAT TELL OF OUR SADDEST THOUGHTS"

غالب اس نکتہ کو خوب سمجھتا تھا اسی لئے اس نے کہا ہے ؎

جس فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

جیسا کہ اوپر کی بحث سے واضح ہے کہ غم زندگی کا ایک بنیادی جزو ہے۔ لیکن ہر فرد کا درد اور غم الگ الگ ہوتا ہے۔ غم غم میں بڑا فرق ہے۔ میر کے یہاں نشاطِ غم ہے۔ وہ غم میں ایک خاص لذت محسوس کرتے ہیں۔ کچلی ہوئی حسرتوں کا تصور اور ذکر میر کو ایک خاص مزہ دیتا ہے۔ سوز و تپش کو وہ زندگی کا سب کچھ سمجھ بیٹھے۔ فانی کا غم شوپن ہار کے فلسفہ سے ملتا جلتا ہے مجنوں نے بہت صحیح کہا ہے کہ فانی قنوطی سے زیادہ "فراری" ہیں۔ میرے خیال میں قنوطیت تو فطرت کا ایک تقاضا ہے لیکن زندگی سے فرار کم ہمتی کی دلیل ہے۔ اس لحاظ سے فانی کی شاعری مردم بیزار شاعری ہے۔ غم کا تصور اقبال کے یہاں بھی ہے لیکن آفاقیت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ انہیں "غم زمانہ" کھائے جا رہا ہے ورنہ وہ مرد قلندر بنیادی طور پر رجائی تھا۔ اسے سیاہی شب کے سیماب پا ہونے کا یقین کامل۔ وہ کہتا ہے ؎

غم زندگی رم زندگی ہم زندگی دم زندگی
غم رم نہ کر سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری

غالب غم کو زندگی کی بنیادی حقیقت مانتے ہیں ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالب کی زندگی ناکامیوں اور حسرتوں کا مزار تھی۔ ایک اتنا عظیم شاعر اور اسے ا

کی زندگی کے طویل عرصہ تک کوئی خاص مقام حاصل نہ ہوسکا۔ کس حسرت سے مرزا صاحب ایک جگہ کہتے ہیں "شاہجہاں کے عہد میں کلیم شاعر سیم و زر میں تولا گیا تھا۔ اگر میں اس قدر چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی ایک دفعہ کلیم کے کلام کے ساتھ تول لیا جائے" کیسا کرب چھپا ہوا ہے اس ایک جملے میں کتنی تلخی ہے اس میں۔ شیکسپیر نے کہا ہے کہ "غم اکیلا نہیں آتا اس کے ساتھ غموں کی ایک بٹالین (BATTALION) حملہ آور ہوتی ہے" غالب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وطن سے جدائی اور غریب الوطنی کا غم اتنا اذیت ناک نہیں ہوتا جتنا اہل وطن کی بے مہری کا غم دردناک ہوتا ہے۔ غالب کو یہ غم بھی دیکھنا پڑا ہے

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب　　تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

الغرض غالب پر اتنی مشکلیں پڑیں کہ غم کو انہوں نے خضر راہ بنا لیا ہے

غم خضر راہ سخن بودہ است۔ شاید غم کی یہ یورش نہ ہوتی تو غالب میں یہ گل افشانی گفتار بھی نہ ہوتی۔

زندگی کے اندوہناک تجربات، غم انگیز مشاہدات، ناسازگار حالات اور المناک حادثات سے گھبرا کر کبھی کبھی راہ فرار اختیار کرنے کی بھی سوچتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو　　ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیے　　کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار　　اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ہر ہر شعر سے عجیب یاس، حسرت، ناامیدی، بیزاری کرب اور درد کا احساس ٹپک رہا ہے۔ ناقابل برداشت مصائب سے گھبرا کر کبھی کبھی تو وہ یہ بھی سوچنے لگتا ہے

غم ہستی کا اسد کچھ نہیں جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

مصائب کے بے پناہ تھپیڑوں کے باوجود غالب کے یہاں ایک عزم ہے۔ اس کی یاسیت میں میرا ور فانی کی گھٹن کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کی شاعری مرگھٹ کی شاعری نہیں ہے۔ غالب کے یہاں یاسیت کی بادِ سموم نہیں چلتی بلکہ عزم کے فرحت بخش اور حیات افروز جھونکے ملتے ہیں۔ ارسطو نے کہا تھا کہ [illegible]

لازمۂ انسان سے خارج ہے" سوز محبت غم کی پیداوار ہے لیکن جب ارسطو کے بقول غم کا روگ لگ جاتا ہے تو وہ زندگی کو نکھار جاتا ہے۔ سیرت و کردار کی تربیت ہی غم سے ہوتی ہے۔ غالب کی المیہ شاعری کا موازنہ اگر کسی سے کیا جا سکتا ہے تو وہ انگریزی کا شہرہ آفاق شاعر شیلے ہے۔ شیلے نے اپنی مشہور نظم "ODE TO THE WEST WIND" میں ایک جگہ کہا ہے ؎

"OH! LIFT ME AS A WAVE, AS A LEAF, AS A CLOUD
I FALL UPON THE THORNS OF LIFE! I BLEED!"

شیلے کی طرح غالب کی زندگی بھی کانٹوں کی سیج ہی ثابت ہوئی۔ لیکن شیلے کو ہمیشہ افق زیست پر چھائے ہوئے سیاہ بادل میں امید کی شعاع سیمیں نظر آتی تھی۔ مصائب سے گھبرا کر جب وہ باد مغرب (WESTWIND) سے کہتا ہے کہ مجھے ایک پتہ کی طرح اڑا کر اپنے دوش پہ لے چلو کہ زندگی کی سیج پر بچھے ہوئے کانٹوں سے میں خونچکاں ہوں تو وہیں اسے اس کا بھی تیقن ہے۔

IF WINTER COMES, CAN SPRING BE FAR BEHIND

تقریباً اسی مضمون کو ایک اردو کے شاعر نے یوں باندھا ہے ؎

ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہ ہو

غالب بھی غم کا مذاق کچھ یوں اڑاتا ہے ؎

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ غالب تو شیلے کو بھی پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ اس نے غم کا مذاق اڑایا ہے۔ فدا اس کی اولوالعزمی کا اندازہ اس شعر سے لگائیے ؎

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

موت مصائب کی انتہا اور غم کا انجام ہے لیکن غالب موت میں بھی حسن تلاش کرتا ہے۔

اسے موت زندگی کو لطیف بناتی محسوس ہوتی ہے۔ وہ زندگی کی یکسانیت سے تنگ ہے موت زندگی کے اندر رنگ خانہ میں رنگ بھرتی ہے۔ دیکھئے غالب نے کیا بات کہی ہے

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

زندگی کی ساری تلخیوں، ناکامیوں، ناامیدیوں، اور حرماں نصیبوں کے باوجود غالب کے مزاج کی شگفتگی اور زندہ دلی اسی افسانوی کردار کی طرح زندہ رہی جو خود تو غم کے الاؤ میں جلتا رہا لیکن دوسروں کو مسرت بخشتا رہا۔ میں اس مضمون کو غالب کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں

یہ نعش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

غالبیات کا ایک نادر ذخیرہ

از :—
ڈاکٹر عبدالرزاق
شعبۂ اُردو :—
ملتان یونیورسٹی، ملتان

راہِ محبت کی آخری منزل دیوانگی ہے۔ اِسی منزل کے ایک مسافر یعنی دیوانے سے ہم بھی واقف ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کسی دوشیزۂ گلفام کی زلفِ پُرپیچ کے اسیر ہونے کی بجائے اسد اللہ خاں غالب نامی ایک شاعر کے دامِ الفت میں گرفتار ہیں۔ غالب کو فوت ہوئے ایک سو برس بیت گئے مگر ان کے یہ دیوانے اب تک گلی گلی " پیراہنِ غالب " کی خوشبو سونگھتے پھرتے ہیں۔ انہیں غالب ہی سے نہیں " سگِ غالب " سے بھی پیار ہے۔ وہ اپنے محبوب کے خلاف ایک لفظ سننے کو تیار نہیں اور یہ کیفیت اب سے نہیں اوائل عمر سے ہے۔ بچپن میں یاس یگانہ کی " غالب شکن " خریدی مگر کچھ حصہ پڑھنے کے بعد کتاب دوکاندار کے مونہہ پر دے ماری کیونکہ اس میں تو ان کے محبوب کی شان میں گستاخانہ رویہ اختیار کیا گیا تھا اور بھلا دیوانہ یہ کیونکر برداشت کر پاتا۔

اِس " دیوانۂ غالب " کا نام لطیف الزمان ہے۔ آپ گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان میں انگریزی ادبیات کے استاد ہیں۔ غالب اور انگریزی ادبیات میں کیا رشتہ یا قدرِ مشترک ہے؟ یہ الگ بحث ہے۔ بہر صورت اس " بدیسی زبان " کے اُستاد نے " دیسی شاعر " سے اپنے عشق کا حق ادا کر دیا ہے۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت غالبیات سے متعلق وہ نادر ذخیرہ ہے۔ جو پروفیسر موصوف کے مختصر مکان میں نہایت سلیقے سے بکھرا ہوا ہے۔ یوں تو آپ کا کتب خانہ پانچ ہزار سے زائد کتب اور رسائل و جرائد پر مشتمل ہے۔ مگر فی الحال ہمیں ان کے " ذخیرۂ غالبیات " ہی سے سروکار ہے۔ جو

میں بہت سی ایسی چیزیں موجود ہیں جو اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ ان میں غالب کے کلام نظم و نثر کی قدیم اشاعتیں، مختلف رسائل کے غالب نمبر اور غالبیات سے متعلق جرائد کے تراشے خاص طور پر اہم ہیں۔ پاکستان کے علاوہ ہندوستان اور دیگر ممالک میں غالب پر شائع ہونے والے تحقیقی اور تنقیدی مواد کا معتد بہ حصہ اس کتب خانہ کی زینت ہے۔ چونکہ غالب کی حیات اور فن پر کام کرنے والوں کے لئے یہ ذخیرہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ لہذا اہل علم اور محققین کو اس کے مشتملات سے آگاہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سر دست مکمل ذخیرۂ غالبیات کی اشاریہ سازی ممکن نہیں صرف ایک حصہ کی سادہ فہرست پیش کرتا ہوں۔ اس فہرست کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے: مگر فی الوقت صرف حصہ الف پیش خدمت ہے۔

(ا) غالب کے اردو فارسی کلام نظم و نثر کے مختلف مجموعے، شرح کلام غالب اور غالبیات سے متعلق تحقیقی و تنقیدی کتب۔

(ب) رسائل کے غالب نمبر اور (ج) مختلف و منتشر جرائد کے تراشے جن میں غالبیات سے متعلق مضامین اور مقالے شامل ہیں۔

معذرت خواہ ہوں کہ وقت کی قلت اور بعض مجبوریوں کے باعث اشاریہ سازی کے جملہ اصول نہ اپنا سکا، یہاں تک کہ یہ فہرست ظاہری ترتیب سے بھی آزاد ہی نظر آئے گی۔ "دیوانۂ غالب" اور صاحب کتب خانہ پروفیسر لطیف الزماں خاں صاحب کا ممنون ہوں کہ ان کے تعاون اور لطف خاص کی بدولت اس نادر ذخیرۂ غالبیات کے ایک حصہ کی فہرست منظر عام پر آرہی ہے۔

نام کتاب	مصنف، مرتب	نسخہ	سن طباعت	صفحات	ناشر، طابع، پتہ
دیوان غالب اردو	امتیاز علی عرشی	نسخۂ عرشی	۱۹۵۸ء	۶۲۴	انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ
دیوان غالب جدید	ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، مرتبہ محمد انوار الحق	نسخۂ حمیدیہ		۳۴۲	مفید عام اسٹیم پریس آگرہ
〃	〃	〃		〃	〃 〃 〃 〃 〃
دیوان غالب	حامد علی خاں	-	۱۹۶۹ء	۲۲۰	مطبوعات مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی، لاہور
دیوان غالب	م۔ ع۔ اسلام	-	۱۹۶۴ء	۱۴۴	آئینۂ ادب۔ لاہور
〃	-	-	-	۲۲۵	گوشۂ ادب۔ لاہور
〃	حمید احمد خاں		جولائی ۱۹۶۹ء	۲۹۰	مجلس ترقی ادب، لاہور
〃	-	نسخۂ شیرانی	اگست ۱۹۶۹ء	۱۰۹	〃 〃 〃 〃
〃	مالک رام	-	مارچ ۱۹۵۷ء	۳۵۹	آزاد کتاب گھر۔ دلی
〃	〃	-	فروری ۱۹۶۹ء	۲۱۶	صد سالہ یادگار غالب کمیٹی۔ دلی
〃	-	-	-	۱۲۶	فرید احمد اینڈ کو، دلی
〃	-	-	۱۹۵۷ء	۱۵۸	(دراجہ) رام کمار پریس۔ لکھنؤ
〃	احتشام حسین		جنوری ۱۹۵۸ء	۱۷۲	تنظیم پریس، لکھنؤ
〃	-	-	جولائی ۱۹۶۰ء	۱۷۳	مشورہ بک ڈپو۔ دلی نمبر ۶
〃	ملک حسین اختر	طبع ثانی	۱۹۶۹ء	۱۵۲	مکتبہ میری لائبریری۔ لاہور
〃	غلام رسول مہر		-	۱۸۰	حق برادرز۔ لاہور
〃	〃		۱۹۶۷ء	۴۰۳	شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور
〃	بجز الہ آبادی		۱۹۵۸ء	۲۷۲	مکتبۂ پروین۔ الہ آباد۔

دیوان غالب	-	-	-	۳۵۰	شیخ الٰہی بخش و محمد جلال الدین تاجران کتب - لاہور
"	رفیق ذکریا	صدی ایڈیشن	۱۹۶۹ء	-	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بمبئی۔
"		صد سالہ "	۱۹۶۸ء	۱۸۴	دانش محل - لکھنؤ
"	ڈاکٹر معین الرحمن		۱۹۷۶ء		جلال انور اکیڈمی - لاہور
مرقع غالب	خیر بہوری				غالب اکاڈمی - بنارس
دیوان غالب عکسی رنگین	تاج ایڈیشن ڈی لکس		یکم جولائی ۱۹۲۸ء	۳۱۲ (بڑا سائز)	تاج کمپنی، لاہور۔ یہ نسخہ قیام پاکستان کے بعد شائع کیا گیا ہے، انتساب غالب ہے
"	"		"	بڑا سائز	تاج کمپنی، لاہور۔ یہ نسخہ [illegible] کا ہے۔ انتساب موجود ہے۔
دیوان غالب مصور نقش چغتائی	رحیم چغتائی				احسن برادرز - لاہور
دیوان غالب	حنیف رامے		۱۹۶۵ء	۳۲۰	نیا ادارہ - لاہور
مرقع غالب	پرتھوی چندر		۱۹۶۶ء		مکتبہ جامعہ - دلی
"	"		"		" " "
دیوان غالب عکسی رنگین	-		یکم جولائی ۱۹۲۸ء	۳۱۲ (مختصر سائز)	تاج کمپنی - لاہور
دیوان غالب	علامہ خورشید آزاد دہلوی		۱۳۵۵ء	۱۹۲ (نئی اشاعت)	آزاد بک ڈپو - دہلی
"	"		۱۹۳۶ء	۱۴۷	" " " "
"		برلن ایڈیشن	۱۹۲۵ء	۲۷۵ (بڑا سائز)	مطبعہ شرکت کاویانی برلن
نقش چغتائی		پہلا ایڈیشن	۱۹۳۵ء		
مرقع چغتائی	محمد عبد الرحمن چغتائی	"	۱۹۲۸ء		جہانگیر بک کلب، لاہور

؍؍	؍؍	قسم دوم	۱۹۲۸ء		؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍
دیوان غالب	محمد عبدالرحمٰن	طبع دوم	۱۲۷۸ھ		مطبع نظامی، کانپور
مرقع چغتائی	؍؍ چغتائی				احسن برادرز۔ لاہور
دیوان غالب	سردار جعفری				ہندوستانی بک ٹرسٹ، بمبئی
؍؍ کی ہندی فرہنگ	؍؍				؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍
کلیاتِ غالب فارسی جلد اول	مرتضیٰ حسین فاضل		جون ۱۹۶۷ء	۵۱۲	مجلس ترقی ادب، لاہور
؍؍ ؍؍ ؍؍ دوم	؍؍		؍؍	۴۰۱	؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍
؍؍ ؍؍ سوم	؍؍		ستمبر ۱۹۶۷ء	۴۲۳	؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍
کلیاتِ غالب غزلیات فارسی	سید وزیر الحسن عابدی		۱۹۶۹ء ۱۹۷۰ء	۵۱۳	مکتبۂ میری لائبریری، لاہور
کلیات غالب قطعات، رباعیات			۱۹۲۵ء	۵۲۴	مطبع منشی نولکشور، لکھنؤ
ترکیب بند، ترجیع بند	غلام رسول مہر		۱۹۶۹ء	۲۵۲	مجلس یادگار غالب۔ لاہور
قصائد و مثنویات فارسی	؍؍		؍؍	۶۴۵	؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍
انتخاب غزلیات فارسی	مرزا جعفر حسین		؍؍	۱۴۱	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
؍؍ ؍؍	؍؍		؍؍	؍؍	؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍
انتخاب غالب (غالب کے فارسی کلام کا انتخاب)	ڈاکٹر ذاکر حسین		۱۹۷۰ء	۳۲	شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی
کلیاتِ نثر غالب			۱۸۷۱ء	۴۱۸	مطبع نول کشور، لکھنؤ
پنج آہنگ	سید وزیر الحسن عابدی		۱۹۶۹ء	۷۱۴	مجلس یادگار غالب، لاہور
مہر نیم روز	عبدالشکور احسن		؍؍	۲۰۹	؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍
؍؍ ترجمہ	عبدالرشید فاضل			۳۰۱	انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی

پنج آہنگ (ترجمہ)	محمد عمر مہاجر		"	۲۰۰	ادارۂ یادگار غالب۔ کراچی
مہر نیم روز	پراگ نرائن		۱۹۱۵ء	۱۶۳	مطبع نول کشور۔ لکھنؤ
دستنبو	عبدالشکور احسن		۱۹۶۹ء	۹۲	مجلس یادگار غالب۔ لاہور
قادر نامہ	محمد باقر		"	۱۶	۔ ایضاً ۔
دستنبو				۵۰	صد سالہ یادگار غالب کمیٹی دلی
"	ترجمہ محمود سعیدی		۱۹۶۹ء	۱۲۱	غالب اکیڈمی، غالب نگر۔ کراچی
مہر نیم روز	شاداں بلگرامی		۱۹۲۵ء	۱۳۲	شیخ مبارک علی۔ لاہور
درفش کاویانی	محمد باقر		۱۹۶۹ء	۲۹۴	مجلس یادگار غالب۔ لاہور
قادر نامۂ غالب			۱۹۵۹ء		مکتبہ نیا راہی۔ کراچی
کلیات غالب فارسی	غلام رسول مہر		۱۹۶۵ء	۶۶۷	شیخ مبارک علی۔ لاہور
مجموعۂ نثر اردو غالب	خلیل الرحمٰن داؤدی		۱۹۶۷ء	۴۲۱	مجلس ترقی ادب۔ لاہور
افادات غالب	نذیر الحسن عابدی		۱۹۶۹ء	۱۷۴	مجلس یادگار غالب۔ لاہور
قاطع برہان و رسائل متعلقہ	قاضی عبدالودود		۱۹۶۷ء	۲۹۵	ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ
ہنگامۂ دل آشوب	سید قدرت نقوی		۱۹۶۹ء	۱۹۲	انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی
دیوان غالب	۔	تاج ایڈیشن	۔	۳۱۲	تاج کمپنی لمیٹڈ۔ لاہور
غالب کا منسوخ دیوان	مسلم ضیائی	۔	۱۹۶۹ء	۳۴۳	ادارۂ یادگار غالب، کراچی
کلیات غالب اردو	نظیر لدھیانوی	۔	۔	۲۷۸	مکتبہ کارواں۔ لاہور
ناشنیدۂ غالب	اکبر رضا جمشید		۱۹۶۹ء	۱۱۵	لیتھو آرٹ پریس، دریاپور، پٹنہ
باقیات غالب	وجاہت سندیلوی	اشاعت اول	۱۹۶۰ء	۱۵۶	نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ
" "	" "	" دوم	۱۹۶۹ء	۱۸۸	" " " "
سبد باغ دو در	امتیاز علی عرشی		۱۹۷۳ء	۵۲	انجمن ترقی اردو۔ کراچی

سفینۂ غالب	یوسف بخاری		۱۹۶۸ء	۲۰۸	شیخ مبارک علی۔ لاہور
سرل غالب		ہندی	۱۹۶۹ء	۶۳	غالب اکیڈمی۔ نئی دلی
ابر گہربار	رفیق خاور		۱۹۶۹ء	۱۴۶	ماڈرز بیورو۔ کراچی
SELECTED VERSES OF GHALIB	صوفیہ سعداللہ	انگریزی	۱۹۶۵ء		
PROBLEM OF STYLE AND TECHNIQUE IN GHALIB	احمد علی	"	۱۹۶۹ء	۲۳	کراچی پریس۔ کراچی
SELECTED POEMS		"	۱۹۶۹ء	۷۰	روم
شرح کلام غالب	مرزا ظفر بیگ سہارنپوری	اشاعت اوّل	۱۹۳۵ء	۲۵۲	نظامی پریس۔ بدایوں
"	"	" دوم	۱۹۶۸ء	۲۵۴	نشریات ادب اکیڈمی، سہارنپور
ہم طرح غالب شان غزل	سلیمان اویسی		۱۹۶۹ء	۲۰۸	علمی کتاب خانہ۔ لاہور
نقش حیات غالب	نبی احمد باجوہ		۱۹۷۲ء	۱۰۰	آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس۔ لاہور
WHISPERS OF THE ANGEL			۱۹۶۹ء	۵۱	غالب اکیڈمی، دلی
SELECTIONS FROM GHALIB				۵۶	کوہ نور پریس۔ دلی
غزلیات غالب	محمد مجیب			۱۶۹	مسلم پروگریسیو گروپ، دلی
MIRZA GHALIB	آر کے کلدیپ		۱۹۶۷ء	۱۱۲	انٹر ٹریڈ پبلیکیشنز، کلکتہ
انتخاب کلام غالب					
گل رعنا	سید وزیر الحسن عابدی	نسخۂ عابدی	دسمبر ۱۹۶۹ء	۲۷۶	ادارۂ تحقیقات پاکستان، لاہور
باغ دودر	"	"	جولائی ۱۹۶۸ء	۲۴۰	یونیورسٹی اورینٹل کالج۔ لاہور

غالب اردو کلام کا انتخاب	محمد مجیب		فروری ۱۹۶۹ء	۱۳۱	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی
انتخاب غالب	امتیاز علی عرشی	نسخۂ عرشی	۱۹۴۲ء	۳۴۴	مطبعۂ بمبئی
"	سید اختر عباس	تیسرا ایڈیشن	۱۹۶۶ء	۳۲	مکتبہ میری لائبریری۔ لاہور
"	ممتاز حسین	—	۱۹۵۷ء	۱۴۸	اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی
"	مشفق انصاری		۱۹۶۹ء	۹۶	سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور
گل رعنا	مالک رام	نسخۂ مالک رام	۱۹۷۰ء	۲۰۶	علمی مجلس، دلی
"	"	"	"	"	" " "
گل رعنا	سید قدرت نقوی	—	۱۹۷۵ء	۴۷۵	انجمن ترقی اردو۔ کراچی
ارمغان غالب	شیخ محمد اکرام		—	۳۲۰	تاج آفس۔ بمبئی
مثنوی ابر گہربار	مرتضیٰ حسین فاضل	—	۱۹۶۶ء		انجمن ترقی اردو۔ کراچی
غالب کی نادر تحریریں	خلیق انجم	—	۱۹۶۱ء	۱۸۴	مکتبہ شاہراہ۔ دلی
متفرقات غالب	سید مسعود حسین رضوی	—	۱۹۴۷ء	۱۸۵	ہندوستان پریس۔ رامپور
انتخاب غالب	سید اختر عباس نقوی		۱۹۵۲ء	۳۲	غالب بک ڈپو۔ لاہور
کلام غالب	جلیل قدوائی	نسخۂ قدوائی	۱۹۶۰ء	۱۰۵	ادارۂ نگارش و مطبوعات۔ کراچی
غالب دیاں غزلاں	دلشاد کلانچوی		۱۹۶۹ء	۶	مکتبہ میری لائبریری۔ لاہور
کلام غالب مکمل شرح	آسی			۳۱۸	صدیقی بک ڈپو۔ لکھنؤ
غالب حالات انتخاب	—	اشاعت ہشتم	۱۹۶۸ء	۸۰	فیروز سنز۔ لاہور
"	—	" نہم	۱۹۶۹ء	۸۰	" " "
خطوط غالب	مولانا غلام رسول مہر	بار دوم		۶۵۶	کتاب منزل۔ لاہور
" جلد اول	"		۱۹۶۹ء	۵۱۸	مطبوعات مجلس یادگار غالب۔ لاہور

" " " دوم	"	بار اول	"	۱۰۱۱	" " " " " "
مکاتیب غالب	امتیاز علی خاں عرشی	بار ششم	۱۹۴۹ء	۲۰۵	
خطوط غالب اردوئے معلی	مرزا ادیب		جنوری ۱۹۴۴ء	۴۰۰	لاہور اکیڈمی۔ لاہور
اردوئے معلی حصہ اول جلد اول	مرتضیٰ حسین فاضل		۱۹۶۹ء	۴۳۲	مجلس ترقی ادب، لاہور
" " " دوم	"		"	۸۴۸	" " " "
" " حصہ دوم و سوم	"		اپریل ۱۹۷۰ء	۱۲۴۵	" " " "
" " حصہ اول و دوم	محمد حسن		۱۹۲۲ء	۴۳	انوار المطابع۔ لکھنؤ
مکاتیب غالب	امتیاز علی عرشی		۱۹۳۷ء	۱۳۵	مطبعۂ قیمہ۔ بمبئی
خطوط غالب	غلام رسول مہر	بار چہارم	۱۹۶۸ء	۵۸۴	شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور
اردوئے معلی حصہ اول، دوم	محمد حسن		۱۹۲۲ء		انوار المطابع، لکھنؤ
خطوط غالب	مالک رام	-	۱۹۶۲ء	۴۴۸	سرفراز قومی پریس۔ لکھنؤ
عود ہندی	مرتضیٰ حسین فاضل	-	جون ۱۹۶۷ء	۵۸۸	مجلس ترقی ادب۔ لاہور
"	عبدالواسع جعفری	-	-	۲۴۱	مطبع انوار احمدی الہ آباد
غالب کے خطوط	سید توسل حسین	-	-	۳۱۸	انوار بک ڈپو۔ لکھنؤ
مکاتیب الغالب	احسن مارہروی	-	-	۲۲۸	علی گڑھ بک کمپنی علی گڑھ
نادرات غالب	آفاق حسین	-	۱۹۴۹ء	۱۶۰	ادارۂ نادرات۔ کراچی
اردوئے معلی (حصہ اول و دوم)	-	-	-	۳۸۰	شیخ ظفر محمد تاجر کتب، لاہور
عود ہندی	-	-	-	۲۶۸	مطبع نولکشور لکھنؤ
"	-	-	۱۹۲۸ء	۳۱۸	رام نرائن لعل پبلشرز۔ الہ آباد
انتخاب خطوط غالب	ڈاکٹر عبادت بریلوی، اشرف انصاری		اپریل ۱۹۵۲ء	۱۹۲	اردو مرکز۔ لاہور

ادبی خطوط غالب	مرزا محمد عسکری	طبع سوم	۱۹۵۴ء	۳۰۴	مبارک بک ڈپو۔ کراچی
					ادارہ فروغ اردو۔ لکھنؤ
عود ہندی	-	-	-	۱۸۴	شیخ الٰہی بخش و محمد جلال الدین تاجران کتب۔ لاہور
عکس غالب	آل احمد سرور		۱۹۷۳ء		علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
نکات و رقعات غالب	اکبر علی خاں		اکتوبر ۱۹۶۲ء	۵۸	اکیڈمی آف آرٹس، کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر
نگارشات غالب	عبدالرزاق جالی	طبع دوم	۱۹۵۲ء	۱۲۸	تاج بک ڈپو۔ لاہور
نادر خطوط غالب	رسا ہمدانی		۱۹۴۹ء	۶۲	کاشانۂ ادب۔ لکھنؤ
جان غالب	محمد حسین شمس علوی		۱۹۶۶ء	۸۰	انوار بک ڈپو۔ لکھنؤ
"	انعام اللہ خاں ناصر			۹۶	تاج کمپنی لمیٹڈ۔ لاہور
دیوان غالب مع شرح	حسرت موہانی		۱۹۲۲ء	۱۷۶	انوار المطابع۔ لکھنؤ
شرح دیوان غالب	"		مارچ ۱۹۶۵ء	۲۴	الکتاب۔ کراچی
" " اردو غالب	طبا طبائی		۱۹۵۴ء	۳۶۸	انوار بک ڈپو۔ لکھنؤ
اصلاحات غالب	"		۱۹۶۶ء	۸۷	اعجاز پرنٹنگ پریس۔ حیدرآباد دکن
بیان غالب	آغا محمد باقر	طباعت پنجم	۱۹۴۸ء	۷۰۸	شیخ مبارک علی۔ لاہور
روح غالب / شرح دیوان غالب	نشتر جالندھری			۷۰۲	تاج بک ڈپو۔ لاہور
الہامات غالب	عنایت اللہ		۱۹۳۹ء	۴۰۰	شیخ ظفر محمد اینڈ سنز۔ لاہور
شرح دیوان غالب	یوسف سلیم چشتی	طبع اول	۱۹۵۹ء	۹۵۲	عشرت پبلشنگ ہاؤس۔ لاہور
دیوان غالب اردو / غالب کی غزل	عبدالقیوم	"	۱۹۶۷ء	۲۸۸	دارالادب، لاہور

مزاحیہ شرح دیوان غالب	غلام احمد فرقت	"	ستمبر ۱۹۶۴ء	۲۹۲	ادارۂ فروغ اردو۔ لکھنؤ
خوش مطالب شرح دیوان غالب	شریف احمد عاصی	"		۱۱۲	جدید بک ڈپو۔ لاہور
دیوان غالب ردیف نون	ایس۔ ایم شفیق دسیال	"	جولائی ۱۹۶۷ء	۹۹	نذر سنز، لاہور
دیوان غالب معہ شرح	جوش ملسیانی		جنوری ۱۹۵۰ء	۴۴۸	آتمارام اینڈ سنز۔ دلی
دیوان غالب معہ شرح	جوش ملسیانی	طبع پنجم	۱۹۵۸ء	۴۳۲	آتمارام اینڈ سنز۔ دلی
شرح غالب	صوفی غلام مصطفیٰ تبسم	طبع اول	فروری ۱۹۶۹ء	۲۵۶	گلوب پبلشرز۔ لاہور
کنز المطالب شرح دیوان غالب	ناطق گلاوٹھی	"	۱۹۶۸۰ء	۴۹۳	مکتبہ دین و ادب۔ لکھنؤ
دیوان غالب معہ شرح	سید غضنفر علی غضنفر			۳۶۸	استقلال پریس لاہور
ترجمان غالب	شہاب الدین مصطفیٰ		۱۹۵۶ء		نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد دکن
اشک و رشک غالب	ظہیر الدین احمد علوی			۱۱۲	مسلم ایجوکیشنل پریس۔ علی گڑھ
اشعار غالب	عبدالمنان بیدل	طبع اول	۱۹۴۴ء	۰۶	ادارہ امر نرائن لعل بک سیلرز۔ الہ آباد
فن غالب	ارشد محمد ناشاد			۲۸۸	مشورہ بک ڈپو، دہلی
الہامات غالب	آغائے رازی			۱۲۸	ایم فیروز علی اینڈ سنز۔ لاہور
مرقع غالب	بیخود دہلوی		۱۹۳۴ء		عثمانیہ بک ڈپو۔ کلکتہ
رموز غالب	ڈاکٹر گیان چند جین	طبع اول	۱۹۷۶ء	۳۴۴	مکتبہ جامعہ۔ نئی دلی
تفہیم غالب	منیر مسعود	"	۱۹۷۳ء	۲۰۸	کتاب نگر۔ لکھنؤ

مطالعہ غالب	جعفر علی خاں اثر	"	١٩٥٢ء	١١٢	دانش محل۔ لکھنؤ
شرح دیوان غالب	فیاض حسین جائسی	"	١٩٥۴ء	١٠٦	نئی زندگی بک ڈپو۔ دلی
دیوان غالب معہ شرح	قاضی سعید الدین		١٩٢٣ء	۴٨٢	ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڑھ
روح المطالب	شاداں بلگرامی	اشاعت اول	١٩٦٧ء	٦١٩	شیخ مبارک علی۔ لاہور
نوائے سروش	غلام رسول مہر	اشاعت اول		١٠٩٦	شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور
مفہوم غالب	احسن علی خاں	"	١٩٦٩ء	٥١٧	حمایت اسلام پریس۔ لاہور
نشاطِ غالب	وجاہت علی سندیلوی	"	١٩٦۴ء	٢٨٨	ادارہ فروغ اردو۔ لکھنؤ
مشکلات غالب	نیاز فتح پوری			١٥٢	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ
صحیفۂ ادب	عبد الرحمٰن	"	١٩٣٥ء	٢٢٢	دار التالیف ہند۔ لاہور
شرح طباطبائی	سید مسعود حسین رضوی		١٩٧۴ء	١٠٠	کتاب نگر، لکھنؤ
اور تنقید کلام غالب	ادیب				
گنجینۂ مطالب	آغا بیدار بخت				تاج بک ڈپو۔ لاہور
غالب	غلام رسول مہر		١٩۴٦ء	۴٨٠	شیخ مبارک علی۔ لاہور
غالب نامہ	شیخ محمد اکرام		١٩٣٩ء	۴١٥	تاج کمپنی لمیٹڈ۔ لاہور
حیات غالب	"			٢۴٧	فیروز سنز۔ لاہور
مرزا نوشہ	عشرت رحمانی			٢٠٣	مکتبۂ خاور۔ لاہور (ناول)
غالب کی زندگی	امیر حسن نورانی		١٩٦٩ء	١٠۴	آزاد کتاب گھر۔ دہلی
روح غالب	سید محی الدین قادری		١٩٥٠ء	٢٢۴	ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن
سرگزشتِ غالب	آغائے ملتانی			١٠۴	ایم فرمان علی بک سیلر۔ لاہور
"	مرزا محمد بشیر		١٩۴٢ء	٩٦	عزیزی پریس۔ آگرہ
"	محی الدین قادری زور	(طبع اول)	١٩٣٩ء	٦۴	مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن
"	"	" دوم	١٩٥٠ء	٦٨	افضل برقی مشین پریس حیدرآباد دکن

غالب کی کہانی	محمد شفیع الدین نیر		۱۹۶۸ء	۱۲۶	نیر کتاب گھر۔ نئی دہلی
غالب (ڈاکٹر الف)	ترجمہ سید معین الدین			۱۵۶	جہاں گھر بک ڈپو۔ دہلی
GHALIB	سید عبد اللطیف قریشی		۱۹۲۹ء	۱۰۴	چندر کانت پریس۔ حیدرآباد
MIRZA GHALIB	مالک رام		۱۹۶۸ء	۹۳	نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی
A SHORT BIOGRAPHY OF GHALIB	اندرجیت لال		۱۹۶۹ء	۴۱	سلوجا پرکاش، دہلی
GHALIB	محمد مجیب		"	۸۰	ساہتیہ اکیڈیمی۔ نئی دہلی
GHALIB	رالف رسل خورشید الاسلام			۴۰۴	جارج ایلن اینڈ ان ون، لندن
احوال غالب	مختار الدین آرزو		۱۹۵۳ء	۲۹۵	انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ
ذکر غالب	مالک رام	دوسرا ایڈیشن	۱۹۵۰ء	۱۳۲	مکتبۂ جامعہ۔ دہلی
"	"	تیسرا "	۱۹۵۵ء	۲۸۴	ایضاً
"	"	چوتھا "	۱۹۶۴ء	۳۶۵	"
"	"	پانچواں "	۱۹۷۶ء	۲۷۹	"
فکر غالب	پرتھوی چندر		۱۹۶۰ء	۲۴۰	نیو تاج آفس۔ دہلی
تلامذۂ غالب	مالک رام		۱۹۵۷ء	۳۱۴	مرکز تصنیف و تالیف نکودر
غالب جنہوں ہر کوئی چنگا آکھے	کرار حسین	پنجابی	۱۹۶۹ء	۱۲۷	ادارۂ یادگار غالب۔ کراچی
غالب	"	بلوچی	"	۴۰	ایضاً
غالب سب اچھا کہیں جسے	"	بنگالی	"	۴۴	"
"	"	سندھی	"	۸۴	"
"	"	پشتو	"	۴۵	"
"	"	اردو	"	۴۳	"
یادگار غالب	حالی		۱۹۲۴ء	۴۵۴	دائرہ ادبیہ لکھنؤ

یادگارِ غالب	داؤدی		۱۹۶۳ء	۵۹۷	مجلس ترقی ادب۔ لاہور
〃	دیانرائن نگم		۱۹۴۴ء	۱۴۸	عائشہ صاحبہ اسمٰعیل گگول الہ آباد
جہانِ غالب	کوثر چاندپوری		۱۹۶۳ء	۲۸۸	نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ
〃	〃		۱۹۶۶ء	۳۲۳	حامد برادرس۔ لاہور ۸
غالب	رضیہ سجاد ظہیر		۱۹۶۴ء	۱۰۶	آئینۂ ادب۔ لاہور
یادگارِ غالب صدسالہ	مالک رام		۱۹۷۱ء	۲۱۹	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
غالب اور آہنگِ غالب	ڈاکٹر یوسف حسین	اشاعت اول	۱۹۶۸ء	۳۱۲	غالب اکیڈمی۔ نئی دہلی
〃 〃 〃	〃	〃 دوم	۱۹۷۱ء	۴۴۷	〃 〃 〃
بین الاقوامی غالب سیمینار	〃		۱۹۶۹ء	۳۵۶	صدسالہ یادگار غالب کمیٹی نئی دہلی
〃	〃		۱۹۶۹-۷۰ء	۱۴۶	ایضاً
تلاشِ غالب	نثار احمد فاروقی		۱۹۶۹ء	۲۶۹	ادارۂ فروغِ اردو۔ لاہور
〃	〃		〃	۳۰۴	دہلی
اطرافِ غالب	سید عبداللہ		۱۹۶۸ء	۳۲۰	گلوب پبلشرز۔ لاہور
غالب اور مطالعۂ غالب	عبادت بریلوی		۱۹۶۹ء	۵۰۵	ظفر سنز۔ لاہور
غالب کی [illegible] کی آئینہ میں	سجاد باقر رضوی		۱۹۶۹ء	۱۷۹	مجلس یادگار غالب، لاہور
[illegible]	سراج الدین		۱۹۶۹ء	۲۹۵	〃 〃 〃 〃

GHALIB	سید فیاض محمود		۱۹۶۹ء	۵۱۸	مجلس یادگار غالب، لاہور
تنقید غالب کے سو سال	〃		۱۹۶۹ء	۶۲۸	〃 〃 〃 〃
غالب ایک مطالعہ	ممتاز حسین		۱۹۶۹ء	۱۷۱	انجمن ترقی اردو - کراچی
غالب نام آور			۱۹۶۹ء	۴۶۳	〃 〃 〃 〃
فلسفۂ کلام غالب	ڈاکٹر شوکت	طبع دوم	۱۹۶۹ء	۲۹۹	〃 〃 〃 〃
〃	〃	〃 اوّل	۱۹۴۶ء	۲۷۹	جلیل اکیڈمی بریلی
دود چراغ محفل	حسام الدین راشدی		۱۹۶۹ء	۲۷۰	ادارۂ یادگار غالب کراچی
بزم غالب	عبدالرؤف عروج			۴۲۴	〃 〃 〃 〃
عیار غالب	مالک رام		۱۹۶۹ء	۲۷۲	علمی مجلس دلی
غالب اور حیدرآباد	ضیاء الدین احمد شکیب		۱۹۶۹ء	۲۲۴	ادبی ٹرسٹ بک ڈپو - حیدرآباد
غالب اور ابوالکلام	عتیق صدیقی		۱۹۶۹ء	۲۴۸	مکتبہ شاہراہ، دلی
شہنشاہ سخن مرزا غالب	سید عارف شاہ	اشاعت اول	۱۹۷۰ء	۴۲۹	مدینہ پبلشنگ کمپنی - کراچی
محاسن الفاظ غالب	نذیر احمد		۱۹۶۹ء	۱۷۲	کتابیات - لاہور
غالب کا فن	اسلوب احمد انصاری		۱۹۷۰ء	۵۶	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
نقش غالب	〃		۱۹۷۰ء	۱۴۲	غالب اکیڈمی، نئی دہلی

افکارِ غالب	خلیفہ عبدالحکیم	طبع اوّل	۱۹۵۴ء	۵۳۵	مکتبہ معین الادب - لاہور
"	"	" سوم	۱۹۷۳ء	۵۳۵	سلطان پریس - لاہور
غالب فکروفن	ڈاکٹر شوکت سبزواری		۱۹۶۱ء	۲۶۴	انجمن ترقی اردو پاکستان - کراچی
غالب کے تخلیقی سرچشمے	، حامدی کاشمیری		۱۹۶۹ء	۱۵۱	ادارۂ ادب ، سری نگر
غالب ابتدائی دور	، خورشید الاسلام	طبع اوّل	۱۹۶۰ء	۲۸۴	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
"	"	" دوم	۱۹۷۵ء	۲۸۴	" " " " "
غالب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	" اوّل	۱۹۷۴ء	۱۲۶	مکتبہ ارباب قلم - کراچی
غالب شاعر امروز و فردا	ڈاکٹر فرمان فتحپوری		۱۹۷۰ء	۳۲۷	اظہار سنز ، لاہور
عرفانِ غالب	سلطان صدیقی		۱۹۷۴ء	۱۷۶	الحمرا اکیڈمی ، لاہور
تجزیۂ کلامِ غالب	رفیع بلخی		۱۹۶۵-۶۶ء	۲۰۲	اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کراچی
غالب اور انقلاب ستاون	ڈاکٹر معین الرحمٰن	طبع اوّل	۱۹۷۴ء	۲۱۶	سنگ میل پبلی کیشنز - لاہور
"	"	" دوم	۱۹۷۶ء	۲۸۵	" " " " "
غالب کا فن	عبادت بریلوی		۱۹۶۸ء	۲۸۵	اردو ڈائجسٹ پرنٹرز - لاہور
نقدِ غالب	ڈاکٹر مختار الدین احمد		۱۹۵۲ء	۵۷۲	دلی پرنٹنگ ورکس ، دلی
مرزا غالب	، مہتاب لعل عشرت		۱۹۶۹ء	۲۴۰	رائے بھون - بنارس
آئینۂ غالب	پبلی کیشنز ڈویژن		۱۹۶۴ء	۲۷۷	ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن - دہلی
گنجینۂ غالب	"		۱۹۶۹ء	۱۸۶	" " " "
مقامِ غالب	محمد موسیٰ خاں حکیم		۱۹۶۵ء	۲۵۶	نقوش پریس - لاہور

غالب کی شخصیت اور شاعری	رشید احمد صدیقی	۱۹۷۰ء	۹۶	شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی
دبستانِ غالب	ناصر الدین ناصر	۱۹۶۹ء	۴۳۱	مکتبۂ الفتح - لاہور
لمعاتِ غالب	عارف بٹالوی	۱۹۶۴ء	۱۸۰	ملک سراج الدین اینڈ سنز - لاہور
غالب نما	سید ابن حسن قیصر	۱۹۶۹ء	۱۴۸	ادارۂ یادگارِ غالب کراچی
اشاریۂ غالب	سید معین الرحمٰن	۱۹۶۹ء	۴۹۰	مجلس یادگارِ غالب، لاہور
اشاریۂ کلامِ غالب	رشید حسن خاں، فاطمہ یعقوب	۱۹۷۰ء	۵۰۰	شعبۂ اردو، دلی یونیورسٹی دلی
غالب ببلیوگرافی	انصار اللہ نظر	۱۹۷۲ء		علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
غالبیات	عبد القوی دسنوی	۱۹۶۹ء	۳۱۵	نسیم بک ڈپو - لکھنؤ
نوائے غالب	ڈاکٹر حکم چند نیر	۱۹۶۹ء	۱۸۰	صد سالہ یادگارِ غالب کمیٹی - بنارس
نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی	عبد القوی دسنوی	۱۹۷۰ء	۸۸	شعبۂ اردو سیفیہ کالج، بھوپال
غالب با نثر اردو	محمد حیات، ظہور الاسلام، اقبال مسعود	۱۹۷۰ء	۱۲۰	〃 〃 〃 〃 〃
ASPECTS OF GHALIB	سول شنڈلر	۱۹۷۰ء	۹۴	پاکستان امریکی ثقافتی مرکز، کراچی
GHALIB-THE POET AND HIS AGE	رالف رسل	۱۹۷۲ء	۱۳۱	جارج ایلن اینڈ ان ون، لندن
آیاتِ غالب	نذیر علی شاہ	۱۹۶۸ء		مکتبہ جدید پریس - لاہور
غالب اور شاہانِ تیموریہ	ڈاکٹر خلیق انجم	۱۹۷۴ء	۱۵۸	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

غالب شناسی (۱)	ظ انصاری		۱۹۶۵ء	۱۶۴	طوبیٰ بک ڈپو۔ بمبئی
" " ۲	"		۱۹۷۰ء	۱۴۶	
محاسن کلام غالب	عبدالرحمن بجنوری	اشاعت چہارم	۱۹۵۲ء	۷۱	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
"	"		۱۹۶۹ء	۸۳	دارالکتاب۔ کراچی
غالب نام آورم	نادم سیتاپوری		۱۹۶۲ء	۲۰۷	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ
"	"		۱۹۷۰ء	۳۷۶	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
غالب کے کلام میں الحاقی عناصر	"		۱۹۶۵ء	۲۸۵	ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ
خیابانِ غالب	"		۱۹۷۰ء	۲۶۳	مدینہ پبلشنگ کمپنی۔ کراچی
غالب کے کلام میں الحاقی عناصر	"			۳۲۰	" " " "
حکیم فرزانہ	شیخ محمد اکرام			۳۲۴	فیروز سنز۔ لاہور
فرہنگِ غالب	امتیاز علی خاں عرشی		۱۹۴۷ء	۲۹۷	اشاعت خانہ، رام پور
محاوراتِ غالب	نریش کمار شاد		۱۹۶۷ء	۹۳	کتب خانہ انجمن ترقی اردو۔ دلی
روزمرہ و محاورۂ غالب	پریم پال اشک		۱۹۶۹ء	۳۲۰	قصرِ اردو، دہلی
بھوپال اور غالب	عبدالقوی دسنوی		۱۹۶۹ء	۱۲۸	شعبۂ اردو سیفیہ کالج، بھوپال
غالبیات کے چند مباحث	ابو محمد سحر		۱۹۷۳ء	۲۱۵	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ
غالب تصویر کا دوسرا رخ	تجسس اعجازی		۱۹۶۹ء	۱۵۹	سرفراز قومی پریس لکھنؤ

غالب کچھ مجھے	وقار رومانی، اوصاف احمد		۱۹۶۶ء	۱۱۲	شعبۂ اردو، فارسی لکھنؤ یونیورسٹی
غالب اور اس کی شاعری	نریش کمار شاد			۱۲۷	سٹار پبلی کیشنز، دہلی
نکاتِ غالب	نظام الدین نظامی	اشاعت سوم	۱۹۵۹ء	۸۰	
غالب کی شاعری کا نفسیاتی مطالعہ	ڈاکٹر سلام سندیلوی		۱۹۶۹ء	۵۴۴	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ
غالب سے معذرت کے ساتھ	احمد جمال پاشا		۱۹۶۴ء	۲۲۲	" " " "
غالب کا تنقیدی شعور	اخلاق حسین عارف		۱۹۶۹ء	۱۶۷	ادارۂ فروغ اردو۔ لکھنؤ
غالب کی شوخیاں	عبدالباری		۱۹۶۵ء	۲۶۱	مکتبۂ دین و ادب۔ لکھنؤ
غالب شکن	یگانہ چنگیزی		۱۹۳۵ء	۸۰	آرمی پریس۔ آگرہ
نگارِ غالب	علی عباس		۱۹۶۹ء	۶۴	صد سالہ جشن غالب کمیٹی، غازی پور
غالب کی عظمت (۲)	عابد رضا بیدار		۱۹۶۹ء		انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، رام پور
مرثیۂ غالب	رشید احمد	اشاعت اول	۱۹۴۴ء	۳۲	انجمن ترقی اردو۔ دہلی
چھیڑ غالب سے چلی جائے	اکبر علی خاں		۱۹۶۵ء	۳۰۰	کتاب کار پبلی کیشنز، رام پور
غالب اور ان کی معترضین	سید لطیف الرحمٰن		۱۹۷۳ء	۴۰۷	عثمانیہ بک ڈپو۔ کلکتہ
دیدارِ غالب	عرش ملسیانی		۱۹۷۴ء	۱۶۶	مرکزِ تصنیف و تالیف نکودر

غالب	مہدی نظمی		۱۹۷۰ء	۶۴	ہندوستان پبلی کیشنز، غازی آباد
غالب کی باتیں	شمس بین گرامی			۱۱۰	
احوال و نقد غالب	محمد حیات خاں سیال	طبع اول	۱۹۶۷ء	۸۲۵	نذر سنز۔ لاہور
مقام غالب	عبدالصمد		۱۹۶۸ء	۲۵۹	ادارۂ علمیہ۔ لاہور
غالب کون ہے؟	سید قدرت نقوی		۱۹۶۸ء	۲۰۸	امروز پرنٹنگ پریس، ملتان
غالب کون؟	سلیم احمد		۱۹۷۱ء	۱۵۹	مکتبہ المشرق کراچی
یاد غالب	خالد بزمی، خالد شفیق، صابر گیلانی		۱۹۶۹ء	۱۵۷	مجلس اردو، لاہور
نذر غالب	ڈاکٹر وحید قریشی		۱۹۷۰ء	۳۱۸	سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
” ”	غلام جیلانی اصغر		۱۹۶۹ء	۱۴۲	سرگودھا اکادمی۔ سرگودھا
غالب کے سات رنگ	ڈاکٹر سہیل بخاری		۱۹۷۰ء	۱۱۲	آزاد بک ڈپو۔ لاہور
محاسن خطوط غالب	غلام حسین ذوالفقار		۱۹۶۹ء	۲۲۰	مکتبہ خیابان ادب۔ لاہور
غالب اور دوسرے مضامین	سید ظہیر حسنین زیدی		۱۹۶۳ء	۲۴۰	مسعود اکادمی، ناظم آباد، کراچی
غالب پی۔ ٹی کورس پہ	میجر محمد عاشق	طباعت دوم	۱۹۶۷ء	۱۰۳	عارف پبلی کیشنز، لاہور
لطائف غالب	فیاض نیازی		۱۹۶۶ء	۹۶	خان اکادمی، لاہور
غالب کے رومان	عارف بٹالوی	طبع اول	۱۹۶۹ء	۳۱۴	الفلاح پبلی کیشنز۔ لاہور
غالب نما	سید مرتضیٰ حسین بلگرامی		۱۹۷۰ء	۶۴	بک سنٹر، علی گڑھ

غالب نقش ہائے رنگ رنگ	عطا کاکوی	۱۹۶۹ء	۹۶	عظیم الشان بک ڈپو۔ پٹنہ
صہبائے غالب	صاحبزادہ ناصر یار خاں	۱۹۶۹ء	۸۸	کتابستان - دہلی
غالب کے لطیفے	منتخبہ احمد شہابی		۷۸	حالی پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی
مقام غالب	[illegible] رفعت		۱۶۰	سب رس کتاب گھر، حیدرآباد دکن
مرزا غالب	شمیم حنفی	۱۹۶۴ء	۶۴	سرفراز قومی پریس، لکھنؤ
غالب	[illegible]	۱۹۶۱ء	۱۱۰	مکتبۂ ادب، لاہور
سرگزشت غالب	ناصر عابدی	۱۹۶۵ء	۹۶	الکتاب۔ کراچی نمبر ۱
غالب	ادارہ تصنیف و تالیف		۱۸۸	شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور
GHALIB LIFE AND THOUGHT	ناز	۱۹۶۹ء	۱۲۵	فیروز سنز لاہور
سیر غالب	بیدل نقوی		۲۵۵	دارالحسنات۔ سہارن پور
کہانی میری زبانی میری	حفیظ عباسی	۱۹۶۸ء	۱۶۰	مجلس اشاعت ادب، دہلی
غالب اپنے آئینہ میں	اختر صدیقی	۱۹۷۰ء	۸۷	بھارتی پبلی کیشنز، دہلی
نورتن	شوکت تھانوی	۱۹۶۰ء	۱۳۹	نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ
تصویر خیال	ابرار الرحمٰن	۱۹۶۹ء	۷۰	قدوائی پبلی کیشنز۔ دہلی
پیکر غالب	محمد عبد اللطیف خاں	۱۹۶۹ء	۹۶	جدید آغا پورہ، حیدرآباد دکن

غالب کے دراے	شوکت تھانوی	۱۹۵۱ء	۲۲۴	ادارہ فروغ اردو۔ لاہور
مرزا غالب	منجو قمر	۱۹۶۹ء	۱۶۰	تاج پریس، حیدر آباد دکن
مکالمۂ غالب	سید مرتضیٰ حسین	۱۹۷۰ء	۱۰۷	بک سنٹر، علی گڑھ
گہرے کا چاند	ڈاکٹر محمد حسن	۱۹۶۹ء	۶۹	شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی
مرزا غالب بندر روڈ پر	خواجہ معین الدین	۱۹۷۳ء	۱۳۵	شعبۂ تالیف ڈھاکا کلاتھ کراچی
GHALIB HIS LIFE AND PERSIAN POETRY	ڈاکٹر عارف شاہ گیلانی		۲۹۴	الائیڈ بک کارپوریشن، کراچی
غالب حقیقت کے آئینہ میں	مس راج رہبر	۱۹۷۲ء	۲۲۳	لاجپت سائے اینڈ سنز دہلی
غالب بعد کا	ضیاالدین محمد شکیب	۱۹۷۲ء	۱۲۸	غالب اکیڈمی، نئی دہلی
غالب کی جمالیات	ڈاکٹر شکیل الرحمٰن	۱۹۶۹ء	۲۶۲	عصمت پبلی کیشنز، سری نگر
غالب اور اسکا عہد	شمع زیدی	۱۹۶۹ء		صد سالہ یادگار غالب کمیٹی، نئی دہلی
GHALIB CENTENARY CELEBRATIONS	آل انڈیا غالب سنٹینری کمیٹی	۱۹۶۹ء		″ ″ ″ ″ ″
مرزا غالب		۱۹۶۴ء	۱۶	شہزاد بک ڈپو، دہلی
نام آور دم	علی مظہر رضوی		۹۲	مجلس یادگار غالب، حیدر آباد
ذکر غالب، ذکر عبدالحق	سحر انصاری	۱۹۷۱ء	۷۲	ادارۂ یادگار غالب، کراچی
وفات غالب کا سواں سال	اشرف قدسی	۱۹۶۹ء		ادارۂ معاشرتی بہبود، ساہیوال
غالب کا اثری	اینا لیتیکا نیتک...	۱۹۶۹ء		ایسٹ پبلشرز لمیٹڈ، کراچی

دیباچہ جاوید نامہ

جگن ناتھ آزاد

[گزشتہ شمارے میں (ص ۷) عرض کیا جا چکا ہے کہ جناب جگناتھ آزاد کی قابل قدر کتاب ۱۹۷۶ء میں شائع ہو گی۔ اس کتاب کا دیباچہ جو تاحال غیر مطبوعہ ہے موصوف نے ازراہ نوازش ہمیں عطا فرمایا۔ پہلی قسط اس سے پہلے ہم شائع کر چکے ہیں۔ باقی حصہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ کتابت اور طباعت کی چند مشکلات کی وجہ سے ہم اقبال، آربری اور پروفیسر محمود احمد کے محولہ اور مشمولہ انگریزی تراجم اور متعلقہ بحثیں یہاں نقل نہ کر سکے جس کیلئے ہم فاضل مضمون نگار اور ناظرین سے معذرت خواہ ہیں۔ م ظ ح]

جاوید نامہ کا سب سے پہلا ترجمہ، اطالوی زبان میں پروفیسر بوسانی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ ترجمہ ۱۹۵۲ء میں روم سے شائع ہوا۔ دوسرا ترجمہ جرمن میں ہوا۔ یہ ترجمہ مس انا ماری شمل نے کیا اور یہ اطالوی ترجمے کے پانچ برس بعد میونخ میں چھپا۔ اس سے ایک برس قبل ۱۹۵۶ء میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی "شرح جاوید نامہ" چھپی جس میں اگرچہ ہر شعر کا ترجمہ موجود نہیں لیکن جہاں تک شرح کا تعلق ہے اس کی قدر و قیمت سے انکار نہیں ہو سکتا۔

تیسرا ترجمہ انگریزی میں لاہور سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ مترجم گورنمنٹ کالج میرپور آزاد کشمیر کے پرنسپل شیخ محمود احمد ہیں۔ اگلے برس پیرس میں فرانسیسی ترجمہ چھپا جو ای میورووچ اور محمد مقری کی مشترکہ کاوش کا نتیجہ ہے۔

سنہ ۱۹۶۶ء میں پروفیسر آرتھر جے آربری کا انگریزی ترجمہ یونیسکو کے زیرِ اہتمام لندن سے شائع ہوا۔

یہ ہے جاوید نامہ کے ترجموں کا ایک مختصر سا ذکر۔ اردو میں پروفیسر سلیم چشتی کی "شرح جاوید نامہ" کے باوجود ایک ترجمے کی ضرورت مدت سے محسوس کی جا رہی تھی چنانچہ اقبال کمیٹی کی فرمائش پر یہ کام میں نے اپنے ہاتھ میں لیا۔

❋

ترجمے کی مشکلات سے ہر مصنف کسی حد تک واقف ہے لیکن دراصل ترجمے کی مشکلات کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان خود ترجمہ کرنے بیٹھتا ہے اور بالخصوص اس وقت جب ترجمہ کسی ایسی کتاب کا ہو جو مسلمہ طور پر کلاسیکی اہمیت حاصل کر چکی ہو اور اگر وہ کتاب نظم کی ہو تو ان مشکلات میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

جاوید نامہ کا ترجمہ کرتے وقت میں جن مشکلات سے دوچار ہوا ہوں ان کا تفصیلی بیان یہاں ممکن نہیں۔ مختصراً اتنا ہی عرض کروں گا کہ شعرِ اقبال کے ترجمے کی سب سے بڑی دشواری کا سبب کلامِ اقبال کا ایجاز ہے جو اعجاز کے رتبے تک پہنچا ہوا ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اقبال کے ایک مصرعے یا ایک شعر کا ترجمہ ایک یا دو فقروں میں کرنا ناممکن نظر آیا ہے۔ مثلاً آیۂ "تسخیر اندر شان کیست" کا ترجمہ کرتے ہوئے جو دشواری سامنے آئی وہ یہ تھی کہ اس مصرعے کا محض اردو ترجمہ کر دینے سے قاری تک میں اس مصرعے کا وہ مفہوم نہیں پہنچا سکوں گا جو اقبال پہنچانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے تو میں نے سوچا کہ اس قسم کی تلمیحات قرآنی یا ان کے متعلق اشارات جاوید نامہ میں جہاں کہیں بھی ہیں ان کی مکمل تفسیر لکھوں پھر خیال آیا کہ اس طرح سے ترجمے کی ضخامت بہت بڑھ جائے گی۔ اس لئے آخر یہ فیصلہ کیا کہ حاشیے میں مکمل آیت لکھ کر اس کا ترجمہ پیش کر دیا جائے۔ یہ گویا ایک درمیانی راستہ تھا اور میں نے اوّل سے آخر تک اس فیصلے پر کاربند رہنے کی کوشش کی ہے۔

شعرِ اقبال کے ترجمے کی اس مشکل کی طرف پروفیسر آرتھر آربری نے اپنے الفاظ

اور مخصوص اسلوب اور طرزِ بیان کا حامل ذخیرۂ الفاظ ترجمے کی راہ میں خاصی رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی پروفیسر آربری یہ بھی لکھتے ہیں کہ "فارسی زبان مبہم اندازِ بیان کے لئے زیادہ موزوں ثابت ہوتی ہے۔ اس ابہام کے ساتھ ایک اور ابہام یہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ اقبال نے اکثر مقامات پر مروجہ بندشیں، ترکیبیں اور الفاظ اپنے مسلمہ اور مروجہ معانی میں استعمال نہیں کیئے بلکہ انہیں موقع اور محل کے مطابق نئے مفاہیم اور مطالب سے آشنا کیا ہے۔"

ترجمے کے اس معیار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ معنوی اعتبار سے ترجمہ اصل سے قریب تر ہو اور جب پڑھا جائے تو اس پر ترجمے کا نہیں طبع زاد تحریر کا گمان ہو۔ آربری نے اقبال کے بعض اشعار کے دو ترجمے پیش کیئے ہیں۔ ایک ترجمہ خود اقبال نے کیا ہے دوسرا آربری نے۔

نظم کے نثر یا نظم میں ترجمے کے لئے کوئی ایک ایسا ضابطہ نہیں ہے جس کے دو تین اچھے مترجم پابند نظر آئیں کیونکہ لفظ و معنی کا رشتہ بڑا نازک ہے۔ بقولِ اقبال

ارتباطِ حرف و معنی اختلاطِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

اور اس نزاکت کو اگر لفظوں کا پابند بنایا جائے تو اصل مفہوم سے ہٹ جانے کا اندیشہ ہے اور اگر صرف مفہوم پر نگاہ رکھی جائے تو الفاظ سے رشتہ ٹوٹ جانے کا خطرہ ہے۔

جاوید نامہ فارسی نظم ہے اور اس کے ترجمے کی مشکلات بیان کرتے وقت یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عربی سے اردو ترجمے کی مشکلات کو درمیان میں لایا جائے۔ لیکن ترجمہ آخر ترجمہ ہے۔ کسی زبان سے بھی ہو۔ اس لئے ناموزوں نہ ہوگا اگر یہاں اس بارے میں شمس العلما مولوی نذیر احمد کے خیالات بھی پیش کر دیئے جائیں جو انہوں نے قرآن شریف کا اردو ترجمہ کرتے ہوئے بیان کیئے۔ ترجمے کے دیباچے میں آپ لکھتے ہیں

"ترجمے کے معنی بتانا آسان ہے لیکن ترجمہ کرنا مشکل۔ میں بہت پہلے سے ترجمے کے اشکال سے واقف ہوں اور مجھ کو ایک زبان سے دوسری زبان میں مختلف طور کی

میں اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "اقبال کی گرفت الفاظ سے بچ نکلنے والی اسٹائل
کتابوں اور تحریروں کے ترجمہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ کوئی میرے دل سے پوچھے کہ
میں ترجمے کو کیسا خیال کرتا ہوں۔ میں نے کتابیں تصنیف بھی کی ہیں مگر ترجمے سے آدھی
زحمت بھی تصنیف میں نہیں اٹھانی پڑی۔ مصنف کو صرف مضمون کی پابندی ہے اور مترجم
کو مضمون کی الگ اور ایک چھوڑ دو زبانوں کی الگ۔ بیڑی دونوں کے پاؤں میں ہے مگر
بیڑی کے علاوہ مترجم کی دونوں مشکیں بھی کسی ہوئی ہیں۔ اس کے گلے میں طوق بھی
ہے... لغت کی ایک کتاب یاد کر لینے سے آدمی دوسری زبان سیکھ لے سکتا ہے
نہیں۔ اختلاف لغت کے علاوہ صیغوں کا اختلاف ہے۔ تذکیر و تانیث کا اختلاف
ہے روابط کا اختلاف ہے۔ محاورات کا اختلاف ہے۔ ترتیب الفاظ کا اختلاف ہے۔
ان میں سے بعض اختلاف ایسے ہیں جن کا رفع کرنا مترجم کے اختیار سے خارج ہے۔ مثلاً
محاورات کا اختلاف کہ مترجم زبان کا محکوم ہے نہ حاکم کہ اپنی طرف سے محاورات
تصنیف کرے۔ اشتراک کا اختلاف تھوڑی شرح کا محتاج ہے۔ اس سے ہماری مراد
یہ ہے کہ ہر ایک زبان میں کوئی لفظ کئی معنوں میں مشترک ہوتا ہے اگرچہ کلام میں ایک خاص
معنی مراد ہوتے ہیں مگر اشتراک کی وجہ سے دوسرے معنی بھی سننے والے کے خیال
میں آجاتے ہیں اور یہ انتقالِ ذہن ایک خاص لطف پیدا کرتا ہے اور اس پر
شاعری کے بڑے حصے کا مدار ہے۔"

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں اقبال نے جاوید نامہ کی پہلی نظم "مناجات" ہی
میں زمان و مکاں، جبر و اختیار اور قدر و خیر کی بحث چھیڑ دی ہے۔ یہاں ایک
صورت تو یہ ہو سکتی تھی کہ میں اشعار کے ترجمے کے ساتھ اقبال کے نظریۂ قدر و خیر
کو ترجمے کا حصہ بنا لیتا لیکن اس میں ترجمے کی ضخامت بہت زیادہ ہو جانے کا اندیشہ
تھا۔ اس لئے کوشش میں نے یہ کی ہے کہ ترجمے ہی تک محدود رکھتے ہوئے مفہوم کو
آسان لفظوں میں واضح کیا جائے۔

❋

اس ترجمے کے دوران میں میں نے کلام پاک کے ترجموں اور لغات کے ساتھ تین کتابوں کو خاص طور سے پیش نظر رکھا ہے ایک تو ہے پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی "شرح جاوید نامہ" دوسری ہے پروفیسر آرتھر جے آربری کا ترجمہ "جاوید نامہ" (انگریزی) اور تیسری پروفیسر محمود احمد کا ترجمہ جاوید نامہ (انگریزی)

اقبال نے اپنی تمام تر شاعری کی طرح جاوید نامہ میں بھی رموز و کنایات کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ ان موقعوں پر صرف ترجمے سے کام نہیں چل سکتا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ محض الفاظ کا ترجمہ کر دینے سے قاری اصل مفہوم سے پرے ہٹ جائے گا تو غلط نہیں ہو گا۔ آربری نے تقریباً ہر جگہ اور محمود احمد نے بعض مقامات پر لفظی ترجمے کو اپنا مطمع نظر سا بنایا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض موقعوں پر سیاق و سباق کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا۔ ایسے موقعوں پر میں نے اگرچہ اپنے ترجمے میں لمبی چوڑی تفسیر سے کام نہیں لیا لیکن حاشی میں ان کنایات کی طرف اشارہ کر دیا ہے جن کے بغیر شعر کی روح تک پہنچنا ناممکن ہے۔

❋

جاوید نامہ ایک ایسے عظیم شاعر کا کلام ہے جس کے شعری محاسن کو نظرانداز کر کے ہم کسی طرح اس کی روح تک نہیں پہنچ سکتے۔ ترجمے میں شعری محاسن کو پوری طرح برقرار رکھنا تو ممکن نہیں لیکن انہیں سرے سے نظرانداز کر دینا اور محض الفاظ مضمون یا خیال کو قاری کے سامنے پیش کر دینا مترجم کے فریضے کی ادھوری تکمیل ہے میں نے اپنے ترجمے میں ان اشارات و تلمیحات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن چونکہ یہ "محض ترجمے" کی حدود سے متجاوز ہے اس لئے ان سطور میں اس بات کا ذکر کرنا میں نے مناسب سمجھا ہے۔

ویسے بہ حیثیت مجموعی ترجمہ کرتے وقت میں نے اقبال کے الفاظ سے دور جانے کی کوشش نہیں کی۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ لفظی ترجمے سے واضح نہیں ہوا لیکن

میں نے اس خیال سے لفظی ترجمے کی حدوں کو توڑنے کی کوشش نہیں کی کہ اگر کوئی فارسی کا طالب علم اقبال کے اصل کلام سے مستفید ہونا چاہے تو یہ ترجمہ حتی الامکان اس کے لئے کارآمد ثابت ہوسکے۔ چنانچہ اس صورت میں میں نے حاشیے میں مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کردیا ہے۔

جہاں میں نے یہ محسوس کیا کہ لفظی ترجمے یا حاشیے میں تشریح سے اقبال کے اصل شعر کے ساتھ انصاف نہیں ہوسکتا وہاں میں نے قوسین میں مطالب پر مشتمل عبارت کا اضافہ کر دیا ہے اس لئے یہ امر واضح رہے کہ قوسین میں جو عبارت ہے وہ میری ہے اور شعر کے ترجمے سے نہیں بلکہ شعر کی وضاحت سے اس کا تعلق ہے۔

اقبال نے اپنے سارے کلام میں اور بالخصوص جاوید نامہ میں آیات قرآنی کے جابجا حوالے دیئے ہیں۔ میں نے جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں کوشش یہ کی ہے کہ مذکورہ حوالے کی روشنی میں آیت مکمل صورت میں ترجمے سمیت درج کردوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کوشش میں میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ اہل نقد و نظر سے گذارش ہے کہ جہاں کہیں آیہ شریف کے حوالے میں سہو دیکھیں مجھے اس سے مطلع فرمائیں تاکہ دوسرے ایڈیشن میں تصیح کردی جائے سہو کا امکان اس لئے ہے کہ ایک تو انسان خطا و نسیان کا پتلا ہے۔ دوسرا یہ کہ ایک آیت کے حوالے کے لئے جب متعدد کتابوں پر میں نے نظر ڈالی تو مختلف آیات سامنے آئیں۔

یوں تو جاوید نامہ اقبال کی اہم ترین شعری تصنیف ہے اور اس کی دلکشی حد بیان سے باہر ہے لیکن اس میں اکثر مقامات پر اقبال نے فلسفے کے ایسے دقیق نکتے بیان کیئے ہیں اور قرآن اور حدیث کی روشنی میں ایسی موشگافیاں کی ہیں کہ ترجمے کے وقت داغ کا یہ شعر اکثر زبان پر آیا

رہرو راہ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

بعض فلسفیانہ اور مذہبی مباحث مثلاً "شعورِ خویشتن"، "شعورِ دیگرے"، "شعورِ ذاتِ حق"، تصوف کی مروجہ اصطلاحوں بطون و ظہور کی جگہ شاعرانہ اصطلاحوں غیب و حضور اور حیاتِ مطلق (ذاتِ مطلق نہیں) کی جگہ زندگی کی اصطلاح کا استعمال، شیونِ زندگی پر بحث، حیاتِ مطلق کے تعینات میں ظہور کے عمل کو شاعرانہ لفظ "گداختن" سے بیان کرنے کی کامیاب کوشش... ان تمام مسائل کے ساتھ انصاف ترجمے کی صورت میں ممکن نہیں ہے یہ تمام مسائل محتاجِ تفسیر ہیں۔ لیکن ترجمے اور تفسیر میں فرق ہے۔ میں چونکہ اپنی کاوش کو حتی الامکان ترجمے ہی تک محدود رکھنا چاہتا ہوں کہ فکرِ اقبال کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لئے جاوید نامہ علم کا ایک خزانہ ہے لیکن اس قدر دقیق فلسفیانہ مباحث سے لبریز ہے کہ ایک عام قاری اس سے پوری طرح مستفید نہیں ہوتا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں اس شرح کو اپنے لئے ایک چراغِ راہ سمجھتا ہوں۔ آزاد)

*

فلکِ مشتری والا باب اس لئے خاص اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں اقبال (زندہ رود) نے اپنے فلسفیانہ اور مذہبی مسائل غالب اور منصور حلاج کے سامنے پیش کئے ہیں۔ غالب سے تو اقبال نے نظیرِ خاتم النبین کے بارے میں سوال کئے ہیں اور غالب نے یہ کہہ کے کہ ان معاملات میں کچھ کہنا حدِ ادب سے بڑھنا ہے بات ختم کر دی لیکن جب اقبال نے منصور حلاج سے یہ سوال کیا کہ ذاتِ رسولِ اکرمؐ کی اصل و حقیقت کیا ہے ہم انہیں آدم سمجھیں یا ذاتِ حق کا جوہر تو منصور حلاج نے یہ سمجھانے کے لئے کہ محمدؐ کی دو شانیں ہیں۔ وہ عالمِ لاہوت میں وجودِ مطلق کا تعینِ اول اور عالمِ ناسوت میں آنے کے باعث محمد بن عبداللہ ہیں۔ عبدہ کے تمام مراتبِ داخلی (لاتعین، تعینِ اول اور تعینِ ثانی) اور مراتبِ خارجی (عالمِ ارواح، عالمِ امثال اور عالمِ ناسوت) پر فلسفیانہ بحث کی ہے۔ اقبال نے یہ ساری بحث تیرہ اشعار میں سمیٹ کر کوزے میں دریا کو بند کر دیا ہے۔ میرے لئے ترجمے میں اس بحث کی وضاحت ممکن نہیں تھی جب تک اس موضوع پر ایک الگ باب نہ لکھا جاتا۔ اگر اقبال کے الفاظ میں اس بحث کو سمجھنا مقصود ہو تو ان کی تصنیف دی کنسٹرکشن آف ریلی

جیس تھاٹ اِن اسلام کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ابلیس کے بارے میں اقبال کا نظریہ پیامِ مشرق، زبورِ عجم، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز میں طرح طرح کے حُسنِ بیان کے ساتھ ہمارے سامنے آچکا ہے لیکن جاوید نامہ (فلکِ مشتری) میں اقبال ابلیس کی ادا پر کچھ زیادہ ہی فریفتہ نظر آتے ہیں چنانچہ وہ منصور حلاج کی زبانی ابلیس کے بارے میں کہلواتے ہیں

چاک کن پیراہنِ تقلید را
تا بیاموزی از و توحید را

اس بات سے قطع نظر کہ اقبال یہاں دراصل جذبۂ تحقیق اور کوشش پیہم پر زور دے رہے ہیں لفظ توحید کا استعمال ہر اعتبار سے قابلِ غور ہے۔

نثر میں ترجمہ کرتے وقت بعض دفعہ بغیر کاوش کے شعر کا ترجمہ شعر میں ہوگیا۔ مثلاً

نثر میں ترجمہ کرتے وقت بعض دفعہ بغیر کاوش کے شعر کا ترجمہ شعر میں ہوگیا۔ مثلاً

اقبال:۔

بستہ درہا را بر دیم باز کن — خاک را با قدسیاں ہمراز کن

مترجم:۔

بند دروازوں کو مجھ پر باز کر — قدسیوں کو خاک کا ہمراز کر

اقبال:۔

پیکرے روشن ز نورِ سرمدی — در سراپائش سرودِ سرمدی

مترجم:۔

اس کا پیکر ایک نورِ سرمدی — اس کی شخصیت سرودِ سرمدی

اقبال:۔

می نداند عشق ماہ و سال را — دیر و زود و نزد و دورِ راہ را

مترجم:۔

عشق ناواقف ہے ماہ و سال سے — دیر و زود و نزد و دورِ راہ سے

اقبال:-

عقل در کوہے شگافے می کند　　　یا بگرد او طوافے مے کند

مترجم:-

عقل نے کہسار میں ڈالا شگاف　　　اور یا کرتی رہی اس کا طواف

اقبال :-

عشق سلطان است و برہان مبیں　　　ہر دو عالم عشق را زیر نگیں

مترجم:-

عشق ہے سلطان و برہان مبیں　　　دونوں عالم عشق کے زیر نگیں

اقبال:-

چشم کور است ایں کہ بیند ناصواب　　　ہیچ گر شب را نہ بیند آفتاب

مخطوطہ غالب لائبریری — چالیس برس پرانی کتاب

گلبانگ

دیباچہ — کلام

پطرس بخاری — میر ولی اللہ

[ایبٹ آباد کے ممتاز وکیل اور مستند عالم میر ولی اللہ صاحب کی کتاب جوان کا شعری مجموعہ ہے۔ لاہور سے ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا تھا۔ تعداد ایک ہزار قیمت دو روپے ضخامت دو سو چالیس صفحات، تعداد منظومات ایک سو تین۔ اس میں تین دیباچے ہیں۔ تیسرا دیباچہ منشی سراج الدین احمد خاں میر منشی ریذیڈنسی کشمیر سری نگر کا، دوسرا چودھری جے کشن وکیل ایبٹ آباد و مصنف "دی گیٹ کیپرز آف انڈیا" کا اور پہلا پطرس بخاری کا لکھا ہوا جو ان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر تھے۔ ذیل میں دیباچۂ اول پیش کیا جاتا ہے کہ بہت کم لوگوں کی نظر سے گزرا ہے۔ اس کے ساتھ میر صاحب کا وہ کلام بھی جس کی تعریف پطرس مرحوم نے اپنے دیباچے میں کی ہے۔ ادارہ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کا ممنون ہے جنہوں نے غالب لائبریری میں اپنا تحقیقی کام کرتے ہوئے اس دیباچے کی نشاندہی کی اور شائع کرنے کا مشورہ دیا۔ م ط ع]

سال ہا سال کی جدائی کے بعد گزشتہ کرسمس میں جب میری خوش قسمتی میر صاحب کو لاہور لے آئی اور ان سے ملاقات ہوئی تو لمحہ بھر کے لئے انہیں پہچان نہ سکا۔ میں اس بات کے لئے تیار نہ تھا کہ وہ ہو بہو ویسے ہی ہوں گے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس متغیر و بے ثبات دنیا میں بھی بعض لوگوں کا شباب جاودانی ہوتا ہے۔

ہمکلامی کا موقع نصیب ہوا تو حیرت ہوئی۔ ان کی گفتگو میں وہی خلوص وہی سادگی وہی خوش مذاقی اور وہی متین ظرافت موجود تھی جس نے پہلی ملاقات میں مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ یہ اس قدیم زمانے کا ذکر ہے جب تھیا گلی جانے والے مسافر حسن ابدال سے ڈاک

کے تانگے پر سوار ہو جایا کرتے تھے اور کوچوان بگل بجاتا ہوا ایبٹ آباد میں داخل ہوتا تھا۔

میر صاحب کے علم پرور گھرانے کی شہرت شروع ہی سے اس قدر جاذب تھی کہ کسی فاضل اہل کے لئے بھی ان کی آستان بوسی کیئے بغیر ایبٹ آباد سے گذر جانا ناممکن تھا۔ اور میں تو ان کا نادیدہ مشتاق تھا، علم سے بے مایہ تھا لیکن رُشد سے اس قدر بے بہرہ نہ تھا کہ میر صاحب کی فضیلت مجھے مسحور نہ کر سکتی تھی۔ کئی دن تک میں نے ان کے دسترخوان پر طعام و کلام دونوں کی ریزہ چینی کی۔ دل نے عقیدتِ دوام کی قسم کھالی الحمدللہ کہ اسے آج تک نہیں توڑا۔

میر صاحب کو اساتذۂ ایران کے دواوین ازبریاد تھے اور علاوہ بریں اپنے والد خلد آشیاں۔

زندہ باز ندگی تازہ وز ندہ تری
آفتاب علم وفن بودی وتابندہ تری

کے فیض اور اپنے مذاق کی بدولت علوم شرقیہ سے عمیق واقفیت حاصل تھی۔ ہر چند کہ ہندیوں کی زبان اردو ہے اور ہر شاعر مزاج ہندی ایک نہ ایک دن اپنی جبلت یا حالات کے ہاتھوں اردو میں طبع آزمائی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جب تک اس کی طبیعت فارسی کی شیرینیوں سے کما حقہٗ بہرہ یاب نہ ہولے اس کا کلام کمال پر پیدا نہیں کر سکتا۔ غالب اور اقبال دونوں اس بات کی زندہ مثالیں ہیں کہ ان کا کلام فارسی کے عطر سے معطر ہے۔ میر صاحب کے وسیع مطالعے نے ان کی طبیعت کو اس قدر مملو و مرصع کر دیا ہے کہ ایک ہندی شاعر کے لئے جو بہتر سے بہتر پس منظر خیال انگیز قرار دیا جا سکتا ہے اس پر ان کا ذہن پوری طرح حاوی ہے۔

لیکن میں اس بات کو اس قدر کھول کر کیوں بیان کروں جب کہ ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا آدمی میر صاحب کے عملی کارناموں سے بخوبی واقف ہے۔ اگر میر صاحب نے لسان الغیب سپرد قلم نہ کیا ہوتا تو ممکن تھا کہ اس بے چہرہ دستم کی شخصیت محتاج تعارف ہوتی۔ لیکن اس صحیفے کے بعد کس کو شک لانے کا یارا ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد میر صاحب کے تبحر اور

یا وسعتِ نظر، ان کی دقتِ نگاہ اور ان کی حق پرستی کا کون قائل نہیں۔

صوبہ سرحد کی فضا علم کی بہ نسبت عمل کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ تاہم یہ خطہ علما و فضلا سے محروم نہیں۔ بلکہ جہاں تک فارسی اساتذہ کا تعلق ہے یہاں کے سخن سنج باقی ہندوستان پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ایران کے سرچشمے سے صوبۂ سرحد جس قدر سیراب ہے کسی اور علاقے کو نصیب نہیں۔ لیکن میر صاحب کا کمال سمجھئے کہ انہوں نے اساتذۂ قدیم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کے بعد اپنے دل و دماغ کو بالکل ان کا غلام نہیں بنا لیا۔ ان کے معترف ہوئے لیکن مقلد نہ بنے اور نئے زمانے کے اثرات سے اپنی طبیعت کو متنفر نہ کیا۔ یہ مجموعۂ کلام جا بجا اس کا شاہد ہے اور مجھے یقین ہے کہ سخن فہم حضرات اسی نقطۂ نظر سے اس کو پڑھیں گے کہ قدیم پختگی اور جدید آرزوئیں کیونکر بوجہ احسن یکجا کی جا سکتی ہیں۔ اب ہندوستان میں شاعری کا وہ دور گزر گیا جب شاعر کی کوشش یہی تھی کہ اس کے کلام کے منتخبات "پیام یار" میں جگہ پائیں۔ شاعری کے موجودہ رجحان کو دیکھئے تو اس میں یار کم اور پیام زیادہ پایا جاتا ہے۔ بے ہنر شاعر کے ہاتھوں میں یہ چیز بے کیف موعظت اور بے سوز گریہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ شاعری شاعر کے لئے ایک مشقت بن جاتی ہے جس میں مذاق کو دخل نہیں ہوتا اور پڑھنے والے کے لئے ایک جفاکشی جس میں دلکشی نام کو نہیں ہوتی۔ لیکن میر صاحب کا کلام اس قسم کی یبوست سے ناآشنا ہے۔ انہوں نے جذبۂ قومی و ملی کے اظہار اور مد و جزرِ زمانہ کے مشاہدے کے باوجود اپنی طبیعت کو طراوت اور رنگینی سے محروم نہیں ہونے دیا۔

اس مجموعے کی سب سے نمایاں خوبی اس کا تنوع ہے جس سے میر صاحب کی قادر الکلامی پر روشنی پڑتی ہے۔ اس میں نظمیں ہیں قطعے ہیں۔ غزلیات ہیں۔ حالاتِ حاضرہ پر تبصرے ہیں۔ قدرتی مناظر کے مرقعے ہیں۔ کہیں اپنے دل کا حال بیان کیا ہے۔ کہیں قوم کی ترجمانی کی ہے۔ امید و یاس کی دھوپ چھاؤں ہے۔ تبسم و گریہ کا عنوان ہے کہیں دو باتیں کہہ کر چپ ہو گئے ہیں کہ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ کہیں بے تاب ہو کر بے پناہ ہو گئے ہیں۔ غرضیکہ ہائے دہو کی ایک دنیا آباد کر دی ہے جس سے ایک مست ہوشیاری

لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

میرے ایک استاد کا قول ہے کہ شاعر کا اصلی کمال چھوٹی بحروں میں ظاہر ہوتا ہے جہاں زمین کی تنگی ہاتھ پاؤں نہیں مارنے دیتی اور سست بندش کی گنجائش نہیں ہوتی۔ میر صاحب نے اس مجموعے میں کئی جگہ چھوٹی بحریں استعمال کی ہیں اور حق یہ ہے کہ انہیں خوب نبھایا ہے۔ بعض شعروں میں تو تھوڑی سی جگہ میں بڑی گنجائشیں نکالی ہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

آج کل وہ بھی اہل سنت ہے　　جو کبھی فرض بھی ادا نہ کرے

اور اسی غزل میں ایک بے بہا شعر ہے

گر حقیقت ہو موت کی معلوم　　خضر کو کوئی رہنما نہ کرے

نیاز آیا گر باز آیا والی غزل میں کیا شعر پیدا کیا ہے کہ

گالی دینے سے باز آ جاؤ　　ورنہ میں عاشقی سے باز آیا

اور جس نظم کا پہلا شعر یہ ہے کہ

عجب ناگفتہ بہ ہے اپنی حالت　　خدا جانے ہمیں کیا ہو گیا ہے

اس میں تو اس بلا کی روانی ہے کہ اس کا صحیح اندازہ نظم کو ایک سانس میں پڑھنے سے ہو سکتا ہے۔ افسوس کہ بخوف طوالت میں اسے یہاں نقل نہیں کر سکتا اور بوجہ دوری میں قارئین کو خود سنا نہیں سکتا ورنہ اس خشک دیباچے کی نسبت وہ شغل بدرجہا اولیٰ ہوتا اور ایک غزل تو ایسی ہے کہ اس کی توصیف میں خود اس کے مقطعے سے بہتر الفاظ مجھے دستیاب نہیں ہو سکتے۔

آج ہر بات میر صاحب کی　　مست جام شراب کی سی ہے

یہی حال آپ نے مارا، خواب نے مارا والی غزل کا ہے۔ اور کیونکر ہوا وفا تو کیوں کر ہو، روا تو کیوں کر ہو) میں تو میر صاحب نے ہمیشہ کے لئے اپنے کمال کی مہر ثبت کر دی ہے کیونکہ اس زمین پر اساتذہ کے نقش قدم باقی ہیں جن کو محو کرنا ہر رہگزر کا کام نہ تھا۔

قومی و فلسفیانہ نظموں میں سے اشعار کا انتخاب کرنا مشکل ہے کیونکہ ایسی نظمیں

پوری کی پوری پڑھی جائیں تب اپنا پورا اثر پیدا کرتی ہیں اس لئے میں مجبور ہوں کہ دخل در معقولات نہ دوں ورنہ میں باز نہ آتا۔ اب بھی اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ حزن و ملال جو آج کل ہر قومی دردمند کے دل پر چھایا ہوا ہے میرؔ صاحب کے کلام میں ایسا سوز بن کر ظاہر ہوا ہے کہ درد درد نہیں رہا دوا بن گیا ہے اور خود ماتم اور راگ میں ایسی رفعت پیدا ہو گئی ہے کہ اس سے روح کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے اور جس پختگی اور قدرت کے ساتھ میرؔ صاحب نے

عقل ہے مایۂ پریشانی　　بس غنیمت تھا عہد نادانی

والی نظم لکھی ہے۔ اس کی تعریف میری طاقت سے باہر ہے۔ اس کے بعد میرؔ صاحب کا یہ کہنا کہ

ہے یہاں گرمئ بازارِ سخن ناممکن　　ایبٹ آباد بھی ہو سکتا ہے لاہور کہیں

محض دل لگی ہے۔ ایسی باتوں سے تو میرؔ صاحب قبلہ

بازارِ خویش و آتشِ ما تیز می کنی

نمیقۂ لاہور ۱۱ مئی ۱۹۳۵ء۔

(۱) دو قطعات　دشمن۔ ص ۹۵

جو کبھی پوچھتا نہیں مجھ کو　　اور مجھے دشمن اپنا کہتا ہے
بات کیا ہے کہ رات دن مجھ کو　　اسی کافر کا دھیان رہتا ہے

(۲) دو دوست　ص ۱۲۷

دوستی عام ہے اس عہد میں کمیاب بھی ہے
اس حقیقت سے ہو کیوں آپ کو وجہ پرخاش
مجھ کو دیکھو کہ بھری بزم میں تنہا ہوں میں
دوست کتنے ہیں مگر دوست کی پھر بھی ہے تلاش

غزلیں

گلبانگ ص ۵۸

سوز بازارِ حسن میں عاشق
لے کے سرمایۂ نیاز آیا
لے کے دل میں گیا تھا کیا کیا کچھ
اور لے کر فقط گداز آیا
ان کے آنے کا انتظار تھا آج
دیکھو قسمت کہ چارہ ساز آیا
خوب پی اور پلا کہ موسمِ گل
لے کے خود فتویٰ جواز آیا
توبہ کر لیں گے مے پرستی سے
یعنی جب موسمِ نماز آیا
دیکھ کر مجھ کو دور سے بولے
دیکھو وہ میرؔ شعر باز آیا
گالی دینے سے باز آ جاؤ
ورنہ میں عاشقی سے باز آیا

گلبانگ ص ۷۲

زندگی میری خواب کی سی ہے
نقش بر روئے آب کی سی ہے
آب ہر ایک شعر کی میرے
صاف دُرِ خوشاب کی سی ہے
باندھ رکھی ہے اک ہوا میں نے
میری ہستی حباب کی سی ہے
تیرے ہر ناز میں کرشمے ہیں
دلفریبی سراب کی سی ہے
مصحفِ رخ پہ خال کی صورت
نقطۂ انتخاب کی سی ہے
اس بتِ سیم تن کے گالوں پر
ساری سرخی گلاب کی سی ہے
ان دنوں کیفیت مرے دل کی
زلف پر پیچ و تاب کی سی ہے
میرے سینے کے آتش ستاں میں
دل کی حالت کباب کی سی ہے
آج ہر بات میرؔ صاحب کی
مست جامِ شراب کی سی ہے

امیر خسرو کا ہندوی کلام

(اسناد کا مسئلہ)

پروفیسر گوپی چند نارنگ

صدر شعبہ اردو - جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

امیر خسرو سے جو ہندی اردو یا ہندوستانی کلام منسوب کیا جاتا ہے، اس کے بارے میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے کس نام سے یاد کرنا مناسب ہوگا، کیونکہ ہندی اردو یا ہندوستانی سے جو موجودہ لسانی مفاہیم ہم نے وابستہ کر لئے ہیں، ان کے تیرھویں صدی میں موجود ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نیز "مغربی ہندی" اور "مشرقی ہندی" کی جو اصطلاحیں گریرسن نے بہار سے پنجاب تک کی ہند آریائی بولیوں کی درجہ بندی کے لئے وضع کی تھیں۔ ان کا اطلاق بھی امیر خسرو کی زبان پر صحیح نہیں، کیونکہ اول تو یہ محض اصطلاحیں ہیں، اس نام کی کوئی زبان یا بولی نہیں ہے۔ دوسرے ان کا تصور بعد کا ہے۔ نیز کھڑی یا برج یا ہریانی بولیوں کے نام بھی ایسے ہیں جو بعد کو وضع ہوئے یا چلن میں آئے۔ اس زمانے کی بولیوں کے ناموں کی جو بھی تفصیل عہد وسط کے ماخذ میں ملتی ہے، وہ ناقص اور ادھوری ہے، کیونکہ زیادہ تر لکھنے والوں نے صرف انہیں زبانوں کا ذکر کردیا ہے جن کو وہ جانتے تھے یا جن کے علاقوں سے وہ واقف تھے۔ باقی کو نظر انداز کردیا ہے۔ پندرھویں صدی کے آخر میں شیخ بہاؤ الدین باجن (متوفی ۹۱۲ھ) نے اپنے اشعار کی زبان کو "زبان دہلوی" کہا ہے۔ سولھویں صدی میں ابو الفضل نے آئین اکبری میں ہندی علاقے کی صرف دو زبانوں دہلوی اور مارواڑی یعنی راجستانی کا ذکر کیا ہے۔ یہ بات اب قطعی طور سے معلوم ہے کہ اس وقت ہریانہ، دہلی اور مغربی یوپی میں شورسینی اپ بھرنش کا دور دورہ تھا۔ اپ بھرنش کی کوئی ایک منضبط شکل نہیں تھی۔ ہر اپ بھرنش میں یقیناً

ذیلی علاقائی خصائص موجود رہے ہوں گے جن سے متعلقہ علاقوں کی بولیاں صورت پذیر ہوئیں۔ جب ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ برج بھاشا کی روایت اکبر سے بھی پہلے کی ہے اور اکبر کے زمانے میں تو کرشن بھگتی کے اثر سے برج میں ادب کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ وجود میں آچکا تھا تو ہم ابوالفضل کے بیان کی صحت کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ یہی معاملہ دہلی اور نواحِ دہلی کی بولیوں کا بھی ہوگا جنہیں بہت بعد میں کھڑی اور ہریانی کے نام دیئے گئے۔ اس مسئلہ کو سلجھانے سے پہلے امیر خسرو کی حیات کی خاص خاص کڑیوں پر ایک نظر ڈال لینی چاہیئے۔ امیر خسرو ۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء میں پٹیالی ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے ۱۔ ابھی آٹھ سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۲۔ اس کے بعد ان کے نانا عمادالملک نے انہیں پالا۔ عمادالملک سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد کے امرا میں سے تھے اور تیس سال تک عارض ممالک رہے۔ ظاہر ہے کہ آٹھ برس کی عمر میں امیر خسرو دہلی آگئے ہوں گے۔ ۶۷۱ھ میں عمادالملک کا بھی انتقال ہوگیا ۳۔ اس کے بعد خسرو سلطان بلبن کے بھتیجے علاء الدین کشلو عرف ملک جھجو کی ملازمت میں آگئے۔ دو ہی برس کے اندر ان کی شناسائی بلبن کے بیٹے بغرا خاں سے ہوئی۔ بغرا خاں سامانہ کا حاکم تھا جو اب پٹیالہ کی ریاست میں ہے۔ امیر خسرو چند برس تک سامانہ میں بغرا خاں سے متعلق رہے۔ ۶۷۰ھ میں لکھنوتی (بنگال) کے حاکم طغرل نے جب بغاوت کی تو سلطان بلبن بغرا خاں کو لے کر خود بنگال گیا اور طغرل کو معزول کر کے بغرا خاں کو بنگال کا حاکم بنا دیا۔ "یہ بلبل ہزار داستان بھی بغرا خاں کے ساتھ تھا اور اس طرح دہلی کا طوطی کچھ دنوں بنگال کی ترائی میں چہکتا رہا" ۴۔ بعد میں امیر خسرو دہلی آئے اور بلبن کے بڑے بیٹے محمد قاآن کی سرپرستی میں ان کے ساتھ ملتان چلے گئے۔ ۶۸۰ھ میں شمال مغربی ہندوستان تاتاریوں کے حملوں سے خون کا سمندر بنا ہوا تھا۔ شہزادہ قاآن

۱۔ ڈاکٹر محمد وحید مرزا، امیر خسرو، الہ آباد، ۱۹۴۹ء ص ۲۶

۲۔ ایضاً ص ۳۷

۳۔ ڈاکٹر محمد وحید مرزا، امیر خسرو، الہ آباد، ۱۹۴۹ء ص ۵۵

۴۔ سید سلیمان ندوی "خسرو" معارف نمبر ۳ جلد ۴۳ ص ۲۲۷

نے ملتان پر اس سیلاب کو روک دیا۔ لیکن بعد میں ایک تالاب کے کنارے نماز پڑھتے ہوئے شہید کر ڈالا گیا۔ امیر خسرو بھی فوجی قیدیوں کے ساتھ گرفتار کر کے بلخ بھیج دیئے گئے۔ دو برس کے بعد رہائی پا کر دہلی آئے۔ سلطان بلبن کے بعد اس کا پوتا، بغرا خاں کا بیٹا کیقباد بادشاہ ہوا۔ امیر خسرو اس زمانے میں صوبہ اودھ کے حاکم خواجہ احسان کے ساتھ اودھ چلے گئے اور دو سال وہاں رہے۔ امیر خسرو کی ماں ابھی تک حیات تھیں اور ان کی محبت کے تقاضے سے امیر خسرو دہلی آتے جاتے رہے۔ کیقباد دہلی کے تخت پر بیٹھ کر عیاشی میں پڑ گیا۔ یہ دیکھ کر اس کے باپ بغرا خاں نے جو بنگال کا حاکم تھا، دلی کا رخ کیا۔ بیٹے نے نا خلفی سے باپ کا مقابلہ کرنا چاہا۔ امرا نے بیچ بچاؤ کر کے باپ بیٹے میں صلح کرا دی۔ امیر خسرو نے اس واقعہ پر دلچسپ قصیدہ لکھا۔ کیقباد نے خسرو سے فرمائش کر کے اس پر ۶۸۸ھ میں پوری مثنوی لکھوائی جس کا نام قران السعدین ہے۔ اب خسرو کیقباد کے مصاحب اور ندیم ہی نہیں بلکہ ملک الشعرا کی حیثیت رکھتے تھے ۵۔ ۶۸۹ھ میں کیقباد کے انتقال کے بعد امیر خسرو جلال الدین فیروز خلجی سے وابستہ ہو گئے۔ انہوں نے ۶۹۰ھ میں بادشاہ کی فتوحات کو نظم کیا اور مثنوی کا نام "مفتاح الفتوح" رکھا ۶۔ علاء الدین خلجی ۶۹۵ھ میں تخت نشین ہوا ۷۔ امیر خسرو کا تیسرا اور اہم ترین دیوان غرۃ الکمال ۶۹۳ھ میں مرتب ہوا ۸۔ ڈاکٹر وحید مرزا لکھتے ہیں کہ علاء الدین کا عہد امیر خسرو کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا اور ان کی زیادہ تر تصنیفات اسی زمانہ میں مکمل ہوئیں "غرۃ الکمال بھی علاء الدین کے عہد میں مرتب ہوا" ۹۔ بعد میں جب قطب الدین خلجی نے جلوس کیا تو امیر نے اس کے لئے ۷۱۸ھ میں مثنوی "نہ سپہر" تصنیف کی۔ سلطان نے ہاتھی کے برابر تول کر روپے شاعر کو انعام دیئے ۱۰۔ خلجیوں کے بعد تغلقوں کا دور دورہ ہوا تو انہوں نے بھی امیر خسرو

۵:۔ ڈاکٹر محمد وحید مرزا ص ۱۰۲

۶:۔ ایضاً ص ۲۴۵

۷:۔ ایضاً ص ۱۱۹

۸:۔ ڈاکٹر محمد وحید مرزا ص ۲۱۶ ۹: ایضاً ص ۱۴۱-۱۴۲

۱۰:۔ ایضاً ص ۲۵۵

کی قدردانی میں کمی نہ کی۔ غیاث الدین تغلق نے جب بنگال کا سفر کیا تو امیر بھی ساتھ گئے۔ اس اثنا میں امیر کے پیر سلطان الاولیا حضرت نظام الدین کا وصال ہو گیا۔ دلی آئے تو یہ اندوہناک خبر سن کر رنج و غم سے وارفتہ ہو گئے۔ اپنے پیر و مرشد کے انتقال کے بعد خسرو زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہے اور ۷۲۵ھ میں شاید حقیقی سے جا ملے۔

اس مختصر سوانحی خاکے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ امیر خسرو کے تیسرے دیوان غرۃ الکمال کی تالیف کے وقت تک، جس میں امیر خسرو کے ہندوی میں شعر کہنے کا سب سے اہم اور بنیادی ثبوت ملتا ہے، امیر خسرو اگرچہ ملازمت کے سلسلے میں دلی سے باہر جاتے آتے رہے لیکن ان کا زیادہ وقت دلی ہی میں گذرا اور کیقباد کے عہد میں دربار سے باقاعدہ متعلق ہونے کے بعد تو وہ تقریباً دلی ہی میں رہے۔ ان کی والدہ بھی دلی ہی میں تھیں اور دلی راجدھانی بھی تھی چنانچہ دلی سے ان کا تعلق کبھی نہیں ٹوٹا۔ اس لئے ان کی زبان وہی ہونی چاہیے جو اس وقت دلی کی زبان تھی۔

مثنوی "نہ سپہر" کے تیسرے سپہر میں امیر خسرو نے اپنے عہد کی ہندوستانی زبانوں کی فہرست ان الفاظ میں دی ہے:-

سندی[1] و لاہوری[2] و کشمیر[3] و کبر[4]
(ڈوگری)
دھور[5] سمندری تلنگی[6] و گجر[7]
(گجراتی)
معبری[8] و گوری[9] و بنگال[10] و اودھ[11]
(تامل) (پہاڑی) (اودھی)
دہلی[12] و پیرامنش اندر ہمہ حد

این ہمہ ہندویست ز ایام کہن
عامہ بہ کارست بہ ہر گونہ سخن

ان اشعار میں امیر خسرو نے ہندوستان کی جن بارہ زبانوں کا ذکر کیا ہے۔ پانچویں مصرعے میں ان سب کو "ہندوی" کہا ہے۔ گویا خود امیر خسرو کی زبان دلی کا باشندہ ہونے کے ناتے "دھلوی ہندوی" ہوئی جو اس فہرست کی بارھویں زبان ہے اور جس کو خسرو نے علی اور

۲: ایضاً ص ۱۸۶

پیرا منش دہلی کی زبان بتلاتے ہیں۔ گویا امیر خسرو نے جس ہندی، اردو یا ہندوستانی میں شعر کہے ہیں، اسس کو "دھلوی ہندوی" کہنا چاہیئے، سہولت کی خاطر زیر نظر مضمون میں اسے صرف "ہندوی" کہا جائے گا اس طرح کھڑی یا برج سے وہ لسانی خصائص مراد ہوں گے جو بعد میں کھڑی یا برج سے موسوم ہوئے۔

امیر خسرو کے والد ترک اور ماں ہندوستانی نسل سے تھیں ؎۲۔ ان کے نانا عماد الملک کے ہندی نژاد ہونے کا ثبوت خود خسرو کے اشعار میں مل جاتا ہے۔ عماد الملک نہ صرف ہندوستانی تھے بلکہ گورے رنگ کے بھی نہ تھے وہ تنبول پان کے بے حد شوقین تھے اور اپنی مجلس میں پان تقسیم کیا کرتے تھے ؎۳۔ بظاہر ہندوی امیر خسرو کو اپنی والدہ اور نانا سے ورثے میں ملی تھی۔ امیر خسرو کو اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر تھا۔

مثنوی "نہ سپہر" میں ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہست مرا مولد و ماوی و وطن

وہ ہندوستان کے عاشق صادق اور سچے وطن پرست تھے اپنی شاعری میں جہاں جہاں وہ ہندوستان کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کی روح وجد میں آجاتی ہے اور جیسے ان کے منہ سے پھول جھڑنے لگتے ہیں۔ مثنوی نہ سپہر کا سب سے بڑا اور اہم تیسرا باب پورا ہندوستان کی تعریف میں ہے۔ اس میں چار پانچ سو شعر ہیں جن میں ہندوستان کے بادشاہوں کی ذہانت، ان کے مذہبی عقائد، علمی استعداد، زبانوں، رسم و رواج، پرندوں، موسموں، پھلوں، پھولوں، غرض ہر چیز کے بارے میں جس تاثر اور شدت احساس سے خسرو نے شعر کہے ہیں، اسس کی مثال شاید ہی کسی دوسرے ہندوستانی شاعر کے ہاں مل سکے۔ ایک جگہ انہوں نے اپنی پدری زبان ترکی اور فارسی پر ہندوی کو ترجیح دی ہے۔

اثبات گفت ہند بہ حجت کہ راجح است

بر پارسی بہ ترکی ز الفاظ خوشگوار

؎۲۔ ڈاکٹر وحید مرزا ص ۴۰-۴۱

؎۳۔ ایضاً ص ۴۲

امیر خسرو کے ہندوی کلام کے بارے میں سب سے اہم روایت غرۃ الکمال کے دیباچے کی ہے اس لئے ہم اس پورے حصے کو جس میں کئی ضروری باتیں آگئی ہیں، بغیر ایک بھی لفظ حذف کئے من وعن نقل کرتے ہیں۔

ترک ہندستانیم من ہندوی گویم جواب
شکری مصری ندارم کز عرب گویم سخن

جزوے چند نظم ہندوی نیز نثر (نذر) دوستان کردہ شدہ است۔ اینجا ہم بدیگوی بس کردم ونظر بر نداشت کہ لفظ ہندوی در پارسی لطیف آوردن چنداں لطفی ندارد مگر بضرورت آنجا کہ ضرورت بودہ است آوردہ شد۔

چو من طوطی ہندم ار راست پرس
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

ذکر ترتیب سہ دیوان، پیش ازیں او شاہان سخن کسی راسہ دیوان نبود مگر مرا کہ خسرو ممالک کلام، مسعود سعد سلمان را اگرچہ ست اما ان سہ دیوان در عبادت عربی و پارسی و ہندوی (ہندی)۔ در پارسی مجرد کسی سخن را سہ قسم نکردہ جز من کہ دریں کار قسام و عالم ۴۹

اس بیان کی روشنی میں اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ خسرو نے ہندوی میں شعر کہے تھے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ انہوں نے اپنا ہندوی کلام کبھی باقاعدہ طور پر جمع نہیں کیا۔ غرۃ الکمال کے مندرجہ بالا اقتباس "جزوے چند نظم ہندوی نیز نذر دوستان کردہ شدہ است" کو اکثر حضرات نے سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش کیا ہے۔ نیز اسے مسعود سعد سلمان (المتوفی ۵۱۵ھ) کے تین دیوانوں والے بیان سے بھی جو فوراً اس کے بعد آیا ہے، الگ کر کے دیکھا ہے۔ اس سے غلط نتائج اخذ کئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ امیر خسرو نے ہندوی میں شعر ضرور کہے تھے لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی، اس لئے امیر نے انہیں اپنے دوستوں کی نذر کر دیا۔ یا یہ کہ امیر کے نزدیک ان کا ہندوی کلام مسعود سعد سلمان کے دیوان کے برابر نہ تھا، ورنہ اگر ان کا ہندوی کلام معتد بہ ہوتا تو وہ اس موقع پر اپنے ہندوی دیوان کا

۴۹: دیباچہ غرۃ الکمال، مطبوعہ، ناقص الاول، ص ۶۶

ذکر ضرور کر سکتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں اکثر ماہرین خسرویات دونوں فخریہ شعروں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو اس بیان سے فوراً پہلے اور فوراً بعد آئے ہیں۔ نیز مسعود سعد سلمان پر اپنی فضیلت جتانے کے لئے امیر خسرو نے فخریہ بیان کے عین بعد جو دلیل دی ہے۔ اس میں جو لطیف نکتہ ہے۔ یعنی ایک ہی زبان میں تین دیوان مجتمع کرنے کا اسے بھی ماہرین نے نظر انداز کر دیا ہے۔ مزید برآں "جزوے چند نظم ہندوی" سے جڑا ہوا "لفظ ہندوی در پارسی لطیف آوردن چنداں لطفی ندارد مگر بضرورت آنجا کہ ضرورت بودہ است آوردہ شد" میں اپنے اصول سے روگردانی کرنے کا جو اعتذاریہ لہجہ ہے، وہ ہندوی سرمائے کے ایک اضافی حصے کی طرف جس طرح اشارہ کرتا ہے اس پر بھی ماہرین نے ابھی تک پورا غور نہیں کیا۔ میرے نزدیک غرۃ الکمال کے اس اہم بیان سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ دونوں اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ خسرو ہندوی میں جواب دینے یا شعر کہنے کو نہ صرف دون مرتبت نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس پر انہیں فخر تھا۔ انہیں ہندوی میں اپنی "نغز گوئی"، اور قادر الکلامی کا بھی گہرا احساس تھا۔

۲۔ "جزوے چند نظم ہندوی نیز نذر دوستاں کردہ شدہ است" کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ خسرو نے ہندوی میں چند اشعار کہے تھے۔ ۴۲ برس کی عمر تک ہندوی اشعار کی کل تعداد کیا تھی۔ اس کا کہیں ذکر نہیں، البتہ جو ہندوی اشعار دوستوں کی نذر کیئے وہ "جزوے چند" تھے

۳۔ "جزوے چند۔۔" والا فخریہ شعر "ترک ہندستانیم من ہندوی گویم جواب" والے شعر کے فوراً بعد کا ہے۔ ان دونوں کو ملا کر پڑھا جائے تو اس کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ امیر کا ہندوی کلام اس قدر مقبول تھا کہ اس کے "جزوے چند" انہوں نے دوستوں کی نذر کیئے۔

۴۔ خسرو کے نزدیک عربی میں فارسی لفظ ملانا مستحسن نہیں تھا۔ اسی طرح فارسی میں ہندوی کا پیوند بھی اصول کے خلاف تھا۔ لیکن اپنے اس اصول سے (عوامی ضرورتوں کی وجہ سے) انہوں نے انحراف بھی کیا تھا۔ ان کا ہندوی کلام تو اپنی جگہ پر تھا، لیکن اس کا ایک حصہ ایسا بھی تھا، جہاں انہوں نے ہر طرح کی لسانی کھچڑی کو جائز رکھا تھا، چنانچہ "جزوے چند" والے

جملے کے فوراً بعد معذرت کا جملہ ہے کہ جہاں ضرورت تھی وہاں انحراف کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام ہندوی کلام کے علاوہ کلام کا ایک حصہ ایسا بھی تھا، جس میں امیر نے فارسی ہندوی کو پیوند کیا تھا، ورنہ فخریہ حصہ میں اعتذار کی ضرورت کیا تھی گویا ہندوی کلام بنیادی تھا اور پیوندی کلام اضافی۔

۵۔ مسعود سعد سلمان پر اپنی فضیلت جتانے کی دلیل ہی یہی ہے کہ مجھ سے پہلے کسی کے تین دیوان نہیں تھے، سوائے مسعود سعد سلمان کے لیکن اس کے دیوان تین زبانوں میں الگ الگ ہیں، عربی فارسی اور ہندوی میں جب کہ میرے چونکہ میں ممالک کلام کا خسرو ہوں، اکیلے فارسی میں تین دیوان ہیں۔ گویا فارسی میں میری قدرت بیان اور تعداد کلام اپنے تمام پیش روؤں سے زیادہ ہے۔ یہ بیان "زمن ہندوی پرس تا نغز گویم" کے بعد کا ہے، اور ممکن ہے کہ توازن قائم کرنے کے احساس کا کرشمہ ہو نیز احساس کا کہ ہندوی پر تو انہیں قدرت ہے۔ لیکن فارسی میں وہ اپنے تمام پیش روؤں سے آگے ہیں۔ جب مسعود سعد سلمان سے بازی لے جانے کے لئے دلیل کا سارا وزن ہی فارسی کلام کی تعداد پر ہے تو ہندوی کی تعداد کے لئے اس بیان میں گنجائش کہاں تھی، ورنہ دلیل ہی ساقط ہو جاتی۔

۶۔ اوحدی کا یہ بیان جسے صاحب جواہر خسروی نے نقل کیا ہے اور جس سے ڈاکٹر وحید مرزا [۱۵] اور ڈاکٹر گیان چند جین [۱۶] نے بجا طور پر اختلاف کیا ہے کہ امیر خسرو کے ہندوی کلام کا حصہ فارسی کلام سے بہت زیادہ تھا، صریحاً مبالغہ ہے۔ لیکن امیر کا ہندوی کلام اتنا کم بھی نہ تھا کہ اسے "جزو سے چند" سمجھ لیا جائے۔ میر تقی میر نے نکات الشعراء میں لکھا ہے "اشعار ریختہ آں بزرگ بسیار دارد۔۔" [۱۷]۔

۷۔ امیر خسرو فارسی میں اتنا زیادہ کہہ چکے تھے اور ان کا وہ مقام تھا کہ اپنی ادبی

[۱۵]:۔ ڈاکٹر وحید مرزا ص ۲۲۹

[۱۶]:۔ میں ڈاکٹر گیان چند جین کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنا مضمون "کھڑی بولی کے ارتقا میں امیر خسرو کا حصہ" پڑھنے کو عنایت فرمایا۔ زیر نظر مضمون میں جہاں ڈاکٹر گیان چند جین کا ذکر آیا ہے اس سے مراد ان کا یہی مضمون ہے۔

[۱۷]: میر تقی میر: نکات الشعراء مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد، طبع ثانی، ۱۹۳۵

حیثیت تسلیم کرانے کے لئے انہیں مسعود سعد سلمان کی طرح دوسری زبانوں کا سہارا لینے کی ضرورت نہ تھی۔ ہندوی امیر کی مادری زبان تھی، اس سے ان کو صد درجہ محبت تھی اور اس میں وہ "نغز گوئی" پر قادر بھی تھے، لیکن مسعود سعد سلمان پر گوئے سبقت لے جانے کے لئے یا کسی ایسی وجہ سے انہوں نے ہندوی کو ادبی اظہار کا وسیلہ نہیں بنایا۔ البتہ اپنی طبیعت کے تقاضے سے دوستوں کی فرمائش پر اور عوامی ضرورتوں کے تحت وہ ہندوی میں شعر کہتے رہے، لیکن انہوں نے اسے تفریح و تفنن طبع اور دل لگی ہی کا ذریعہ بنایا اور اپنے ہندوی کلام کو کبھی مدون نہیں کیا۔

امیر خسرو سے منسوب ہندوی کلام کو تین شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) ہندوی کے وہ کلیے یا مصرعے جو فارسی سے مخلوط ہو کر امیر خسرو کے فارسی کلام میں آئے ہیں اور جو یقینی طور پر امیر خسرو کی تصنیف ہیں اور ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔ (۲) امیر خسرو سے منسوب وہ ہندوی کلام جس کا ذکر بعد میں آنے والے تذکرہ نویسوں شاعروں یا مصنفین نے کیا ہے۔ (۳) امیر خسرو سے منسوب وہ ہندوی کلام جنہیں مختلف ماخذ سے جمع کر کے مولانا محمد امین عباسی چریاکوٹی نے "لآلی عمان موسوم بہ جواہر خسروی" میں ۱۹۱۸ء میں علی گڑھ سے شائع کیا تھا جس میں پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، دو سخنے، انمل دوہے، گیت وغیرہ شامل ہیں۔

۱

امیر خسرو کا کلام اپنی مقبولیت کی وجہ سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا ہے اور ان سات صدیوں میں وہ ہماری لوک روایت یا لوک ساہتیہ کا حصہ بن گیا ہے۔ لاکھوں کروڑوں زبانوں پر چڑھنے سے اس میں اصلاح و تحریف ضرور ہوئی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ امیر خسرو سے منسوب کلام کے کئی حصے اصلی ہوں لیکن کئی حصے ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کا بعد میں اضافہ ہو گیا ہو۔ اس لئے ایسے کلام کا جائزہ لینے میں تاریخی اور لسانی دونوں طرح کی شہادتوں پر نظر رکھنی ہوگی۔

سب سے پہلے اس مخلوط ہندوی کلام کو لیجئے جو امیر خسرو کے ان مستند فارسی مجموعوں میں ملتا ہے جن کی تدوین خود امیر خسرو نے کی تھی۔

(۱) آری آری ہمہ بیاری آری
ماری ماری برہ کہ ماری آری ؎۱۸

امیر خسرو نے اسے دیباچہ غرۃ الکمال میں ایہام کی ذیل میں پیش کیا ہے "بازایہامی دیگر بربست کردہ ام کہ یکطرف ہمہ ہندوی می افتد" ؎۱۹۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے لکھا ہے کہ یہ شعر "فارسی اور ہندی دونوں زبانوں کا ہوسکتا ہے"۔ ؎۲۰۔ اس کے برعکس ڈاکٹر گیان چند جین کا خیال ہے کہ اس شعر کے دوسرے مصرعے کو:

مارے مارے برہ کے مارے آرے

پڑھنا چاہیئے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ دونوں طرح سے بامعنی ہے۔ اگر مارے آرے پڑھا جائے تو ضمیر محذوف مذکر ہوگی، لیکن یہ فارسی سے دور ہو جائے گا جب کہ اگر یائے معروف سے پڑھا جائے تو ہندوی میں ضمیر محذوف مونث ہوگی، یعنی خطاب برہن سے ہوگا جو قرین قیاس ہے۔ اس شعر میں فعل کا ڈھانچہ غور طلب۔ "آری" میں آنا مصدر سے اور "ماری" مارنا سے صاف ان عناصر کا پتہ دے رہے ہیں جو بعد میں کھڑی بولی سے مخصوص ہو گئے۔

(۲) رفتم بہ تماشای کنار جوئے — دیدم بلب آب زن ہندوئے
گفتم صنما بہای زلفت چہ بود — فریاد برآورد کہ "دُر دُر موئے" ؎۲۱

"دُر دُر موئے" یعنی مردار دور ہو، عورتوں کے روزمرہ سے تعلق رکھتا ہے اور کھڑی کے علاقے میں آج بھی بولا جاتا ہے۔

(۳) گوری کہ تو در حسن و لطافت چو مہی — آن دیگر دہی بر سر تو چتر شہی
از ہر دولب تو قند شکر می ریزند — ہر گاہ بہ وقت کہ "دہی لیو دہی" ؎۲۲

؎۱۸: میرے پاس دیباچہ غرۃ الکمال کا جو مطبوعہ نسخہ ہے، اس میں یہ شعر یوں ہے
آئی آئی ہماں بیاری آئی — ماری ماری براہ موری آئی (دیباچہ ص ۶۳)
جو بظاہر کتابت کی تحریف کا شکار ہے۔ نیز ملاحظہ ہو ڈاکٹر وحید مرزا ص ۲۲۲۔
؎۱۹۔ دیباچہ غرۃ الکمال ص ۶۳ ؎۲۰۔ ڈاکٹر وحید مرزا ص ۲۲۲
؎۲۱۔ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو لاہور طبع دوم، ص ۱۷۱۔ نیز ڈاکٹر وحید مرزا ص ۲۲۲۔
پنجاب میں اردو میں "گفتم صنما چیست بہائے موئے" ہے۔
؎۲۲۔ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، ص ۱۷۱

اس میں "لیہو" برج ہے۔ خسرو کا بچپن پٹیالی ضلع ایٹہ میں گزرا تھا جو برج کا علاقہ ہے عین ممکن ہے یہ بچپن کا اثر ہو یا یوں بھی دلی کی زبان پر برج کا اثر رہا ہے۔ یہ اس کا نتیجہ ہو یا پھر خسرو نے کی اصل اور لہجے کی رعایت سے "لیہو" کہا ہو۔

(۴) تیلی پسرے کہ می فروشد تیلے — از دست و زبان چرب او واویلے
خالے برخش دیدم و گفتم کز لطف — گفتا کہ "بر و نیست دریں تل تیلے" ۲۳

چوتھا مصرع واضح طور پر کھڑی کے محاورے "ان تلوں میں تیل نہیں" کا ترجمہ ہے۔ تل تیل اور تیلی ہندی علاقے کی تمام بولیوں میں ملتے ہیں۔

(۵) ہندو صنمے کو در قم شد کاہی — درد اکہ ندارد ز غم آگاہی
گفتم زیست کار من خستہ بر آر — در خندہ شد و گفت کہ "ناہی ناہی" ۲۴

"ناہی ناہی" ناہیں ناہیں یا نہیں نہیں کی بدلی ہوئی صورت ہے۔

(۶) حجام پسر بخوبی و رعنائی — دے آئینہ بنمود بداں زیبائی
گفتم صنما در برت آیم، نایم — فریاد بر آوردہ کہ "نائی نائی" ۲۵

"نائی نائی" حجام کی رعایت سے نائی بھی ہے اور نہیں نہیں بھی۔

(۷) ہندو بچہ دیدم چو شکوسر تاپا — حیراں کنمش چو بنمیش سر تا پا
با او گفتم کہ ہندو از چیست بگو — ہر موئے خطش گفت کہ "مورے باپا" ۲۶

"مورے" برج ہے اور "باپا" پورے ہندی علاقے میں عام ہے۔

(۸) تنبولی من چو مجلس بادہ کم — آئینہ دل ز زنگ غم سادہ کم
یک لحظہ اگر بمن بیاری دل خود — از نقل تو برگ عیش آمادہ کم ۲۷

۲۳۔ جواہر خسروی، رباعیات پیشہ وراں، ص ۵۔ محمود شیرانی نے برخش کے بجائے بہ لعش لکھا ہے لیکن جواہر میں یہی متن ہے۔ پنجاب میں اردو ص ۱۷۱۔

۲۴۔ جواہر خسروی، رباعیات پیشہ وراں، ص ۱۔

۲۵۔ ایضاً ص ۳ ۲۶۔ ایضاً ص ۱۱

۲۷۔ ایضاً ص ۱۴

اس میں تنبولی اور ہندی علاقے کے لفظ ہیں اور برگ عیش سے پان کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ جواہر خسروی میں جوگی پسر اور سناس (سنیاس) پسر پر بھی رباعیاں ہیں۔

(۹) مثنوی تغلق نامہ جو امیر کی تاریخی مثنویوں کے سلسلے کی آخری مثنوی ہے، اس میں ذیل کے ہندی اجزاء آئے ہیں۔

دگر ہر مار د بیری مار و پر مار
سخن بشان "مارمار" و سر بسر" مار"
بہ زادی گفت "ہے ہے تیر مارا"
یکے از رواتان "ہار" گہر بود ۲۸

۲

دوسری شق میں ہم امیر خسرو سے منسوب اس ہندی کلام یا اس کے اجزا کو لیں گے، جو متاخرین کی کتابوں میں امیر خسرو سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس میں سب سے قدیم وہ دوہا ہے جو وجہی دکنی کی سب رس (۱۰۴۵ھ) میں ملتا ہے:

(۱) پنکھا ہو کر میں ڈلی ساتی تیرا چاؤ
منجھ جلتی جنم گیا تیرے لیکھن باؤ ۲۹

"میں" "ڈلی" "تیرا" "جلتی" "گیا" "تیرے" سب کھڑی کی نشان دہی کرتے ہیں۔

(۲) ڈاکٹر گیان چند جین نے لچھمن نرائن شفیق کے چمنستان شعراء (ترتیب ۱۱۷۵ھ) سے امیر خسرو کا ایک دوہا نقل کیا ہے۔ ہاشم دکنی کے ترجمے میں ہندی تصور عشق کا ذکر کرتے ہوئے امیر خسرو کا ایک فارسی شعر اور اس مضمون کا ان کا ایک دوہا لکھا ہے:

خسروا در عشق بازی کم ز ہندو زن مباش
کو برائے مردہ می سوزد جان خویش را

---

۲۸ ڈاکٹر وحید مرزا ص ۲۶۵ - ۲۶۶۔

۲۹ ملا وجہی، سب رس، مرتبہ مولوی عبدالحق، کراچی، ۱۹۵۲ء، ص ۲۰۳۔

خسرو ایسی پیت کو جیسے ہندو جوئے
پوت پرائے کارنے جل جل کوئلہ ہوئے ۳۰

اس دوہے میں برج کی فضا میں "ایسی" "ایسے" "پرائے" "جل جل" واضح طور پر کھڑی کے عناصر ہیں۔

(۳) روایت ہے کہ ذیل کا دوہا امیر خسرو نے اپنے پیر و مرشد نظام الدین اولیا کے انتقال کی اندوہناک خبر سن کر کہا تھا:

گوری سوئے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے رین بھئی چہوندیس ۳۱

"ڈارے" اور "بھئی" برج ہیں۔ باقی سارا دوہا صاف ستھری کھڑی بولی میں ہے۔

(۴) جواہر خسروی میں ذیل کے دوہے کو بھی امیر خسرو کا کہا گیا ہے:

خسرو رین سوہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرو من پیر کو دوؤ بھئے اک رنگ ۳۲

ڈاکٹر وحید مرزا کا کہنا ہے: "ان دونوں دوہوں میں کوئی شہادت ایسی نظر نہیں آئی جو روایت عام کی تکذیب کرتی ہو" ۳۳۔ جاگی پی اور کے، کی کھڑی کے ہیں اور دوسرے مصرعے میں "میرو" "پیر کو" "دوؤ" "بھئے" برج ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے بھی لکھا ہے کہ ان چاروں دوہوں کو خسرو سے منسوب کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

(۵) ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے امیر خسرو کا ذیل کا دوہا نقل کیا ہے:

شیام سیت گوری لے جنمت بھئی انیت
ایک پل میں پھر جات ہیں جوگی کا کے میت ۳۴

---

۳۰ شفیق لچھمی نرائن، چمنستان شعراء، مرتبہ مولوی عبدالحق، ص ۱۰۲

۳۱ جواہر خسروی، مقدمہ چمنستان، ص ۷۵ نیز ڈاکٹر وحید مرزا ص ۱۸۶ ص ۳۲۷

۳۲ جواہر خسروی، مقدمہ چمنستان، ص ۵۷ نیز ڈاکٹر وحید مرزا ص ۲۲۶، ۳۳ ایضاً ص ۳۲۷

۳۴ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری، لکھنؤ ۱۹۶۱ء ص ۱۴۸

اس دوہے کو سوائے ڈاکٹر شجاعت سندیلوی کے کسی نے نقل نہیں کیا اور انہوں نے اپنے ماخذ کی نشان دہی بھی نہیں کی۔ اس کا پہلا مصرع بے معنی ہے اور شاید بے جوڑ بھی ہے۔ ہمیں ڈاکٹر صفدر آہ سے اتفاق ہے ۳۵ اور اس دوہے کو امیر خسرو کا تسلیم کرنے میں تامل ہے۔

(۶) وجہی کے بعد تاریخی ترتیب سے امیر خسرو کے ہندوی کلام کا دوسرا اہم ماخذ میر تقی میر کا نکات الشعرا ہے (۱۱۶۵ھ) اس میں ذیل کا قطعہ امیر خسرو سے منسوب کیا گیا ہے:

زرگر پسرے چو ماہ پارہ | کچھ گھڑے سنوارے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست | پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا ۔ ۳۶

ایک مصرع فارسی میں ہے اور دوسرا صاف کھڑی میں۔ نیز موضوع بھی امیر خسرو کی مستند رباعیات پیشہ وران جیسا ہے، اس لئے اس کی اصلیت پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

(۷) تیسرا ماخذ ملا عبدالباسط امیٹھوی (متوفی ۱۱۶۷ھ) کی کتاب منار الضوابط ہے جس کا ذکر جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے ۳۷۔ اس میں ذیل کا ایک شعر اور ایک رباعی امیر خسرو سے منسوب کی گئی ہے:۔

گفتم کہ دریں خانۂ ماموں تو مانم | گفتا کہ دریں خانہ بلائیست مکانی
داریم آرزو کہ حکایت کنیم بات | لالہ غلام روئے تو صدبرگ زیرپات
ہر برہمن کہ دید رخ خوبت اے صنم | زنار را گسست رکھ زد بروئے لات

خط کشیدہ الفاظ فارسی اور ہندوی دونوں میں معنی دیتے ہیں اور ان میں ایہام ہے۔ نیز حکایت اور بات لالہ اور صدبرگ، برگ اور پات اور مکرا اور لات کا ساتھ ساتھ آنا بھی لطف

---

۳۵ ڈاکٹر صفدر آہ ص ۴۱

۳۶ میر تقی میر، نکات الشعراء، ص ۲۔ یہ قطعہ قائم کے مخزن نکات (۱۱۶۸ھ) میں بھی ملتا ہے۔ اس میں تیسرا اور چوتھا مصرع یوں ہیں:۔

نقدِ دلِ من ربود و بشکست | آخر نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

مخزن نکات طبع لاہور ص ۷۔

۳۷ "شہر آشوب" مشمولہ نقوش مئی ۱۹۶۵ء ص ۹ (بحوالہ ڈاکٹر گیان چند جین)

سے خالی نہیں سامعوں، حماقی، بات، والہ پات، برہمن، الات، ہندی علاقے کے الفاظ ہیں۔

(۸) تاریخی اعتبار سے امیر خسرو کے ہندی کلام کا چوتھا اہم ماخذ قدرت اللہ قائم کا تذکرہ مجموعہ نغز (اختتام ۱۲۲۱ھ) ہے جس میں امیر خسرو کی مشہور غزل "زحال مسکین مکن تغافل" کے پانچ اشعار درج کئے گئے ہیں، جنہیں بعد میں محمد حسین آزاد نے آب حیات میں شامل کیا، اگرچہ آب حیات کا متن بعینہٖ وہی نہیں۔ محمود شیرانی نے مجموعۂ نغز کو مرتب کر کے ۱۹۳۳ء میں شائع کیا جب کہ وہ اپنی کتاب پنجاب میں اردو ۱۹۲۸ء میں شائع کرا چکے تھے، اور اس میں اس غزل کے اشعار مجموعۂ نغز قلمی ہی سے لئے ہوں گے لیکن اس میں بھی متن بالکل وہی نہیں، یہاں اس غزل کا متن مجموعۂ نغز سے پیش کیا جاتا ہے۔

زحال مسکین (مکن) تغافل دوراہ نیناں ملائے بتیاں

چو تاب ہجراں ندارم ایجاں نہ لیو گاہے لگائے چھتیاں

یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکین

کسے پڑی ہے کہ جا سناوے پیارے پی سے ہماری بتیاں

شبان ہجراں دراز چوں زلف زمان وصلت چو عمر کوتہ

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ہمیشہ گویاں بعشق آں مہ

نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آوے نہ بھیجے پتیاں

بحق آں مہ کہ روز محشر بداد مارا فریب خسرو

سپیت من کی دورا ہے راکھوں جو جانے پاؤں پیا کی گھتیاں) ۲۸

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ مجموعۂ نغز کا مندرجہ بالا متن ہی اس غزل کا قدیم ترین متن ہے۔ اشپرنگر کے ۱۸۵۲ء کے جس مضمون کا ذکر ڈاکٹر صفدر آہ نے کیا ہے (جس کی تفصیل پہیلیوں کی ذیل میں آگے آئے گی) اس میں اشپرنگر نے اپنی تحریر قائم کے حوالے سے شروع کی ہے اور لکھا ہے کہ "قائم نے خسرو کے دو شعر پیش کئے ہیں۔ کوئی پہیلی درج نہیں کی۔ میں قائم کے اشعار میں

۲۸ قدرت اللہ قائم، مجموعۂ نغز، مرتبہ محمود شیرانی، لاہور ۱۹۳۳ء ج ۱ ص ۲۲۴۔

سے ایک شعر پیش کرتا ہوں اور وہ پوری غزل درج کرتا ہوں جس سے دوسرا شعر لیا گیا ہے [۲۹]
اس کے بعد خسرو کی غزل "زحال مسکیں مکن تغافل" اور ان کا قطعہ "زر گر پسرے" نقل کیا ہے۔ تذکرہ
مخزن نکات قائم مرتبہ مولوی عبدالحق میں مذکورہ غزل کا کوئی شعر نہیں [۳۰]۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا
ہے کہ اشپرنگر کے سامنے مخزن نکات کا جو نسخہ تھا اس میں موجودہ نسخے سے زیادہ مواد تھا۔ ۱۹۶۶ء
میں ڈاکٹر اقتدا حسین کی ادارت میں مخزن نکات لاہور سے دوبارہ شائع ہوا۔ اس میں مخزن کے نسخۂ
انجمن کے علاوہ قلمی نسخہ انڈیا آفس سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر انڈیا آفس والا نسخہ
وہی ہے جو شاہان اودھ کے کتب خانوں میں اشپرنگر کے پیش نظر رہا ہے تو اس میں امیر خسرو کی مذکورہ
غزل کا وہ شعر ضرور ملنا چاہیے۔ چنانچہ مطبوعہ نسخۂ لاہور میں یہ شعر صفحہ ۷ پر موجود ہے :-

زحال مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
چو تاب ہجراں نہ دارم اے جاں نلیوہ گاہے لگائے چھتیاں [۳۱]

مخزن نکات ۱۱۶۸ھ/۱۸۵۴ء میں مکمل ہوا اور مجموعہ نغز ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں۔ اس طرح اس شعر کی یہ قرأت
اب تک کی دریافت شدہ روائیوں میں قدیم ترین ہوئی۔ اشپرنگر نے اس مطلع کی پوری غزل شاہان
اودھ کے کتب خانوں میں محفوظ امیر خسرو کے ہندوی کلام کے مجموعوں سے مکمل کر دی اور اسے اپنے
۱۸۵۲ء والے مضمون میں شامل کیا، جہاں سے اسے ڈاکٹر صفدر آہ نے اپنی کتاب میں نقل کر دیا ہے۔
اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اشپرنگر کا قلمی ماخذ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء سے پہلے کا مکتوبہ تھا تو اس غزل کا قدیم ترین متن
وہی قرار پائے گا جسے اشپرنگر نے پیش کیا ہے۔ رہا امیر خسرو سے اس کے انتساب کا مسئلہ تو اگر اشپرنگر
کا ماخذ ۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء سے پہلے کا مکتبہ تھا تو اسے اہمیت حاصل ہوگی، بصورت دیگر اس اطلاع کا قدیم ترین
ماخذ مخزن نکات ہی قرار پائے گا اور اس غزل کے مطلعے کا قدیم ترین بھی مخزن نکات
ہی کا ہے۔

اس غزل کی زبان پر غور کرتے ہوئے یہ بات خاطر نشان رہنی چاہیے کہ فارسی آمیز ہندوی

---

۲۹ ڈاکٹر صفدر آہ، امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر، ص ۴۹۔
۳۰ قائم چاند پوری، مخزن نکات، مرتبہ عبدالحق، اورنگ آباد، ۱۹۲۹ء ص ۲۔
۳۱ قائم چاند پوری، مخزن نکات، مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن، لاہور، ۱۹۶۶ء ص ۷۔

کلام صاف ہندوی کی بہ نسبت قدیم یا مستند ہو، یہ ضروری نہیں۔ ہندوی کے جو ٹکڑے مثلاً "سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں" یا "ماری ماری برہ کی ماری ماری" امیر خسرو کے فارسی کلام میں آتے ہیں، اس زمانے کی ہندوی کی سچی ترجمانی انہیں سے ہوتی ہے۔ یہی وہ ٹکڑے ہیں جو اس زمانے کی بول چال کی زبان کو ظاہر کرتے ہیں، اور جو اس حد تک صاف بھی ہو چکی تھی۔ شاعری میں ان اجزاء کا فارسی کے ساتھ آنا ہرگز اس بات کا ثبوت نہیں کہ اس زمانے میں لوگ مخلوط زبان یا فارسی آمیز ہندوی بولتے تھے۔ اسماء و صفات کی حد تک تو ایسے اثرات برابر ملتے ہیں، لیکن ہندوی کے اجزاء کو غور سے دیکھا جائے مثلاً "بے بے تیرا لا" یا "کسے پڑی ہے کہ جا سنا دے پیارے پی سے ہماری بتیاں" تو معلوم ہوگا کہ پورا ڈھانچہ کھڑی کا ہے۔ "یکے از رواتانؔ ہار گہر" بود یا "مار مار" و "سر بسر نار" کی حد تک تو اختلاط بول چال کی سطح پر ممکن ہے، لیکن اس کے برعکس اس طرح کا مخلوط انداز مثلاً "چوتاب ہجراں ندارم ایجاں کر نہ لیو گا ہے لگائے چھتیاں" ضروری نہیں کہ اس زمانے کی بول چال کا انداز ہو۔ امکان اس کا ہے کہ یہ صرف شاعری کی چیز ہو، اول تو اس لئے کہ عوامی طور پر اس کا ایک تفریحی پہلو تھا، دوسرے یہ کہ شعراء کو فارسی میں کہنے کی مشق تھی، فارسی ہی میں کہتے کہتے ہندوی اجزا کو پیوند کر دیتے تھے۔ اس طرح ظرافت کا سامان بھی ہو جاتا تھا اور اس میں سہولت بھی تھی۔ اس غزل کے دوسرے مصرعے ایسی کھڑی میں ہیں جو قدامت کا رنگ لئے ہوئے ہے، چھتیاں، بتیاں، رتیاں، نیناں، پتیاں، کھتیاں پرانی کھڑی کی جمعیں ہیں جو ہریانی میں بھی عام تھیں[۴۲]۔

(۹) فرہنگ آصفیہ میں ذیل کا قطعہ امیر خسرو سے منسوب کیا گیا ہے:

ہندو بچہ بین کہ عجب حسن دھرے چھے
بر وقت سخن گفتن مکھ پھول جھرے چھے
گفتم ز لب لعل تو یک بوسہ بگیرم
گفتا کہ ارے رام ترک کایں کرے چھے[۴۳]

اس کا انداز بھی امیر خسرو کے ان توصیفی قطعات و رباعیات کا ہے جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا

۴۲۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، مقدمہ تاریخ زبان اردو، لاہور ۱۹۶۶ ص ۱۵۹-۱۶۱،

۴۳۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ ج ا لاہور ۱۹۰۸، ص ۴، نیز پنجاب میں اردو ص ۱۷۲۔

ہے۔ بھور مجرے برج کا انداز ہے، مجرے چپے کر سے چپے راجستھانی کی یاد دلاتا ہے۔

۳

اب آخر میں امیر خسرو کے اس ہندوی کلام کو لیجئے جس کی حیثیت ماہرین امیر خسرو کی نظر میں مشتبہ رہی ہے، لیکن یہ کلام اپنی ہر دلعزیزی کی بدولت نسل در نسل منتقل ہوتا رہا ہے اور ہمیشہ مشتبہ رہا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ متنازع فیہ "خالق باری" ہے جس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس سب کا سمجھنا اور نظم کا تجزیہ کر کے موافق اور مخالف آرا پر محاکمہ کرنا چونکہ الگ مضمون کا محتاج ہے، اس لئے اس بحث کو فی الحال کسی دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھا جاتا ہے۔ محتاط حضرات جس کلام کو الحاقی اور جعلی خیال کرتے ہیں، اس کا کچھ حصہ شمس اللہ قادری کی کتاب اردوے قدیم میں ملتا ہے، کچھ محمود شیرانی کی پنجاب میں اردو میں اور بڑا حصہ محمد امین عباسی چریاکوٹی نے جواہر خسروی میں جمع کر دیا ہے۔

(۱) ڈاکٹر اشپرنگر اور شمس اللہ قادری۔

شمس اللہ قادری نے اپنی کتاب اردوے قدیم (۱۹۲۵ء) میں خبر دی تھی "شاہان اودھ کے کتب خانوں میں جو موتی محل اور توپ خانہ میں تھے حضرت امیر خسرو کے دو سو پہیلیاں موجود تھے اور ان کے علاوہ ایک مجموعہ میں ان کا متفرق کلام جمع تھا جس میں فارسی آمیز غزلیں اور مکرنیاں وغیرہ تھیں [۴۴]۔ شمس اللہ قادری کو یہ اطلاع ڈاکٹر اشپرنگر کے ایک مضمون سے ملی جو ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا تھا اور جس سے انہوں نے استفادہ کیا تھا [۴۵]۔ شمس اللہ قادری نے امیر خسرو کا جو کلام نقل کیا ہے ان میں سے ایک تو مشہور غزل کے پانچ شعر ہیں "ز حال مسکیں مکن تغافل" دوسرے نکات الشعرا والا قطعہ "زرگر پسرے" ہے اور تیسرے ایک غزل کے چار شعر ہیں "کر لُوٹے بے دلوڑا) ہے" جو اس کتاب کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتی۔ حیرت ہے کہ جواہر خسروی کا جو ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی تھی شمس اللہ قادری کو ۱۹۲۵ء میں کوئی علم نہیں تھا۔ مذکورہ ہندوی کلام کے ماخذ کا قادری صاحب نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ پہیلیاں درج کئے ہیں، ان کے بارے میں وضاحت کر دی ہے کہ "ڈاکٹر اشپرنگر

---

[۴۴] شمس اللہ قادری، اردوے قدیم، ۱۹۲۵ء ص ۳۰

[۴۵] ایضاً ص ۳۰

مضمون سے ماخوذ ہیں" [۴۶]۔ ان چیستانوں کے عنوان ہیں:-

۱۔ حمد الٰہی، ۲۔ خربزہ، ۳۔ چراغ، ۴۔ قینچی، ۵۔ کاجل، ۶۔ ابٹے کا گھونسلا۔

ڈاکٹر اشپرانگر کا یہ مضمون تو ابھی دستیاب نہیں ہوا لیکن ۱۸۵۲ء کے جس مضمون کا ڈاکٹر صفدر آہ نے ذکر کیا ہے، اس میں علاوہ "زحال مسکیں" والی غزل اور قطعہ "زرگر پسرے" کے انہوں نے چھ پہیلیاں نقل کی تھیں جنہیں ڈاکٹر صفدر آہ نے پیش کیا ہے [۴۷] اردوئے قدیم سے ان کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے حمد الٰہی اور خربزہ والی دو پہیلیاں مشترک ہیں جو اشپرانگر کے دونوں مضمونوں میں نقل ہوئی ہوں گی، باقی چار مختلف ہیں [۴۸] اس طرح گویا دس پہیلیاں ہاتھ آئیں جو اشپرانگر نے شاہان اودھ کے کتب خانوں کے قلمی نسخوں سے لی تھیں۔ امیر خسرو سے منسوب دوسری ہندوی پہیلیوں کے مقابلے میں ان دس پہیلیوں کا مستند ہونا زیادہ قرین صحت ہے۔ ہم نے ان کا مقابلہ جواہر خسروی میں مندرج پہیلیوں سے کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے چار یعنی چراغ، قینچی، کاجل اور بٹے کا گھونسلا جواہر خسروی میں بھی ہیں۔ اس طرح گویا ان چار پہیلیوں کی مزید تصدیق ہوگی۔ یہاں ان دس پہیلیوں اس ترتیب سے پیش کیا جاتا ہے:

(الف) اشپرانگر کی پیش کردہ وہ چار پہیلیاں جو جواہر خسروی میں بھی ملتی ہیں:

چراغ

بالا تھا جب سب کو بھایا — بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں — بوجھے نہیں تو چھوڑو گاؤں [۴۹]

قینچی

اندر چلن باہر چلن بیچ کلیجہ دھر کے — امیر خسرو یوں کہیں وہ دو دو انگل سر کے [۵۰]

---

[۴۶] ایضاً ص ۲۱۔

[۴۷] ڈاکٹر صفدر آہ، امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر، ص ۳۰ - ۳۱

[۴۸] شمس اللہ قادری، اردوئے قدیم، ص ۳۲۔

[۴۹] اردوئے قدیم ص ۳۲ - جواہر خسروی ص ۳ -

[۵۰] اردوئے قدیم ص ۳۲ - جواہر خسروی ص ۲۱ -

کاجل

جل کر بنے جل میں رہے — آنکھوں دیکھا خسرو کہے [۵۱]

بٹے کا گھونسلا

ایک انوکھا گرہ بنایا — اوپر نیو نیچے گھر چھایا
بانس نہ بلی بندھن گھنے — کہو خسرو گھر کیسے بنے [۵۲]

یہ چار پہیلیاں کھڑی میں ہیں۔ جواہر خسروی میں پہلی پہیلی کے آخری مصرع میں ہریانی کا پٹ ہے "ارتھ کود نہیں چھاڑو گانوں" اس طرح دوسری پہیلی میں "اندر چلمن" کے بجائے "بہتر چلمن" ہے۔ تیسری میں پہلا مصرع ہے "جل میں جل میں رہے" اور چوتھی کا پہلا مصرع "اچرج بنگلا ایک بنایا" ہے۔ ان اختلافات کے پیش نظر یہ دلچسپ انکشاف ہوتا ہے کہ جواہر خسروی میں یہ پہیلیاں جس ماخذ سے منقول ہیں وہ دہلت کا خاص رنگ لیے ہوئے ہے۔

(ب) اشپرانگر کی پیش کردہ وہ دو پہیلیاں جو ان کے دونوں مضمونوں میں مشترک ہیں:

حمد الٰہی

سب کوئی اس کو جانے ہے — پر ایک نہیں پہچانے ہے
آٹھ دھڑی میں لیکھا ہے — فکر کیا ان دیکھا ہے [۵۳]

خربزہ

دس ناری کا ایک ہی نر — بستی باہر وا کا گھر
پیٹھ سخت اور پیٹ نرم — منہ میٹھا تاثیر گرم! [۵۴]

یہ دونوں بھی کھڑی میں ہیں۔

(ج) اشپرانگر کی پیش کردہ وہ چار پہیلیاں جو ان کے ۱۸۵۲ والے مضمون سے منقول ہیں:

---

[۵۱] اردوئے قدیم ص ۲۲ ۔ جواہر خسروی ص ۲۲ ۔
[۵۲] اردوئے قدیم ص ۲۲ ۔ جواہر خسروی ص ۱۲ ۔
[۵۳] اردوئے قدیم ص ۲۲ ۔ امیر خسرو بحیثیت شاعر ص ۳۰
[۵۴] ایضاً

خُدا

سب سکھیں کا پیا پیارا — سب میں ہے اور سب سوں نیارا
واکی آن مجھے یہ بھا — جا کی ہے بن دیکھی جبا [55]

نعت

ایک پرکھ ہے دئی سنوارا — دنیا کا بستارن ہارا
واکے چرنوں لاگ رہو — زیادہ بچن نہ منہ سے کہو [56]

چراغ

تیلی کا تیل — کمہار کا ہنڈا
ہاتھی کی سونڈ — نواب کا جھنڈا [57]

حلال خور

کاٹی اپنی پھینک دے اور جی پر نہیں ملال — واسے ہٹ کیوں جات ہیں جو روزی کھائے حلال [58]

ڈاکٹر صفدر آہ ان پہیلیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "خدا الٰہی والی پہیلی کے مصرعہ اوّل میں "سب" کوئی کی جگہ "ہر کوئی" ہونا چاہیئے ورنہ ردیف "ہے" کے بجائے "ہیں" ہوگی۔" خدا والی پہیلی کے "تیسرے اور چوتھے مصرعہ میں بھا اور جا مہمل ہیں" "نیز نعت والی پہیلی بالکل معمولی ہے"[59] اس سے نتیجہ یہ اخذ کیا ہے کہ "اگر یہ پہیلیاں امیر خسرو کے ہندوی کلام میں شامل نہ کی جائیں تو بہتر ہے۔"[60] قدیم کلام کے ردّ و قبول کا معیار ذوقی و وجدانی ہے۔ اس سے پہلے ڈاکٹر صفدر آہ دوسروں کو اس سے خبردار کر چکے ہیں۔

---

[55] امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر ص ۳۰
[56] ایضاً
[57] ایضاً
[58] ایضاً ص ۳۱
[59] ایضاً ص ۳۱
[60] ایضاً ص ۳۱۔

خسرو کا تمام ہندی کلام عوام کے ذریعے سے ہم تک پہنچا ہے اور عام پسند کا ہے۔ اس کلام کو پست اور رکیک کہہ کر نظر انداز کرنے والے نقاد قابل رحم ہیں۔ وہ بے چارے روایات کے اس بری طرح غلام ہیں کہ حسن و لطافت کو اپنے فرسودہ روایتی معیاروں سے ہٹ کر دیکھ ہی نہیں سکتے"[۱۶] اشپرانگر سے منقول کلام کو بھی روایتی معیاروں سے ہٹ کر دیکھنا چاہیئے۔ سوائے چراغ والی پہیلی کے جو واضح طور پر لکھنؤ کے نوابی عہد کی پیداوار ہے اور جس کے بارے میں ہم ڈاکٹر صفدر آہ سے متفق ہیں، باقی پہیلیوں کو امیر خسرو کا تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں، خدا، نعت اور حلال خور والی پہیلیوں میں برج کا اثر غالب ہے اور زبان میں قدامت کی جھلک ہے۔

(۲) لالی عمان موسوم بہ جواہر خسروی

یہ کتاب مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج سے ۱۹۱۸ء میں طبع ہوئی۔ اس میں سوائے نصاب بدیعی کے امیر خسرو سے منسوب جتنا کلام ہے، مولانا محمد امین عباسی چریاکوٹی کا مرتب کیا ہوا ہے۔ ہندوی کلام مندرجہ ذیل اجزاء پر مشتمل ہیں:

خالق باری۔ بوجھ پہیلیاں۔ بن بوجھ پہیلیاں۔ کہہ مکرنیاں۔ دو سخنے نسبتین۔ انملیاں۔ ڈھکوسلے۔ گیت۔ اور نسخہ۔

یوں تو مولانائے موصوف نے چند صفحوں کے ہندوی کلام پر ۲۴ صفحوں کا ضخیم مقدمہ لکھا، جو ہر طرح کے غیر متعلق مباحث سے مملو ہے، لیکن بحث نہیں کی تو امیر خسرو کے ہندوی کلام کے ماخذ سے۔ آخر میں صرف اتنا ارشاد فرمایا ہے:

"یہ مجموعہ پہیتان مولوی احمد علی خاں صاحب شوق سپرنٹنڈنٹ صرف خاص ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر رام پور، منشی محمد مستجاب اللہ خاں صاحب مقبول شیر دلی مرحوم اور مولانا احسن تقاقی صاحب کے بھیجے ہوئے میٹیریل سے مرتب ہوا ہے۔"[۱۷]

جواہر خسروی میں سوائے چند چیزوں کے وہ تمام ہندوی کلام شریک ہے جو اپنی ہر دلعزیزی کی بناء پر امیر خسرو سے منسوب چلا آتا ہے۔ امیر خسرو سے ایسے عوامی کلام کی نسبت بجائے خود اس کا

---

[۱۶] امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر ص ۲۵۔

[۱۷] جواہر خسروی، مقدمہ پہیتان ص ۲۰۳ - ۲۰۴۔

ثبوت ہے کہ امیر خسرو نے پہیلیاں، مکرنیاں، انمل وغیرہ لکھے ہوں گے۔ یہ واقعہ ہے کہ چیستان اور معمّوں کا امیر خسرو کو خاص طور پر شوق تھا چنانچہ "ان کے مرتبہ فارسی دیوانوں میں بھی بعض رباعیاں پہیلیوں کی قسم سے ہیں اور اکثر ناموں اور تاریخوں کو انہوں نے معمّے کی شکل میں لکھا ہے"[۶۳]۔

امیر خسرو نہایت طباع اور زود گو اور پُرگو شاعر تھے۔ انہوں نے تحفۃ الصغر کے دیباچے میں لکھا ہے "اس کمسنی میں بھی کہ جب میرے دودھ کے دانت ٹوٹ رہے تھے، اشعار میرے منہ سے موتیوں کی طرح جھڑتے تھے"۔ بقیہ نقیہ کے دیباچے میں اپنی زود گوئی کے بارے میں کہتے ہیں۔ "میں شعر اتنی دیر میں کہتا ہوں جتنی دیر میں لفظ بیت زبان سے ادا کیا جائے"۔ ایسے شاعر کے بارے میں یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس سہولت سے اپنی مادری زبان ہندوی میں شعر کہہ لیتا ہوگا۔ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ جواہر خسروی کے تمام کلام کا تجزیہ کیا جائے، البتہ داخلی شہادتوں کی بنا پر چند ضروری امور کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

(الف) یہ مفروضہ قرین صحت نہیں ہے کہ امیر خسرو کی ہندوی ملی جلی برج اور کھڑی ہوگی۔ اس زمانے کے مدھیہ پردیس کی اپ بھرنش بھلے ہی ایک ہی، اس میں علاقائی خصائص ضرور رہوں گے، جو بعد میں برج کھڑی وغیرہ کی تخصیص کا باعث بنے۔ دلّی کی زبان پر میر تقی میر کے زمانے تک برج کا اثر رہا ہے۔ چنانچہ اگر خسرو کی ایسی پہیلیاں میں ایسے لسانی عناصر کی تاک جھانک ملتی ہے جن کا رشتہ ہم آج کی کھڑی یا برج سے ملا سکتے ہیں تو اس کی اصل وجہ یہی علاقائی خصائص رہے ہوں گے۔ سب سے پہلے یہ مثالیں دیکھیے جن میں کھڑی کے اثرات زیادہ ہیں:

آئینہ

فارسی بولی آئی نا — ترکی ڈھونڈی پائی نا
ہندی بولوں آرسی آئے — خسرو کہے کوئی نہ بتلائے [۶۴]

دھوپ

نر سے پیدا ہووے نار — ہر کوئی اس سے رکھے پیار

---

[۶۳] ڈاکٹر وحید مرزا ص ۲۴۷۔

[۶۴] جواہر خسروی ص ۲ – ڈاکٹر وحید مرزا ص ۲۲۷۔

ایک زمانہ اس کو کھاوے — خسرو پیٹ میں وہ نہ جاوے [65]

کاجل

آدھے کٹے سے سب کو پالے — مدھ کٹے سے سب کو مارے

انت کٹے سے سب کو میٹھا — خسرو واکو آنکھوں دیکھا [66]

ذیل کی پہیلیوں میں برج کے خصائص دیکھے جا سکتے ہیں:

نیم کی نبولی

ایک نار تر ور سے اتری ماسوں جنم نہ پایو
باپ کو ناؤں جو واسے پوچھو آدھو ناؤں بتایو
آدھو ناؤں بتایو خسرو کون دیس کی بولی
واکو ناؤں جو پوچھیں نے اپنے ناؤں نبولی [67]

آری

شیام برن اور دانت انیک لچکت جیسے ناری
دونوں ہاتھ سے خسرو کھینچے اور یوں کہے تو آری [68]

موری

ساون بھادوں بہت چلت ہے ماگھ پوس میں تھوڑی
امیر خسرو یوں کہے تو بوجھ پہیلی موری [69]

اپ بھرنش کے یہ علاقائی اثرات صرف برج یا کھڑی تک محدود نہیں بلکہ بعض پہیلیاں ایسی ہیں جن میں ہریانی کی تانک جھانک دیکھی جا سکتی ہے:

---

[65] ایضاً ص ۱۹۔

[66] ایضاً ص ۲۱۔

[67] جواہر خسروی ص ۶۔ ڈاکٹر وحید مرزا ص ۲۲۷-۲۲۸۔

[68] جواہر خسروی ص ۱۔

[69] ایضاً ص ۵۔

دیا

بالا تھا جب سب کو بھایا — بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں — ارتھ کرو نہیں چھاڑ دو گاؤں [۳۹]

ناؤ

جل جل چلتا بستا گاؤں — بستی میں ناد اکا ٹھاؤں
خسرو نے دیا وا کا ناؤں — بوجھو ارتھ نہیں چھاڑ دو گاؤں [۴۰]

امیر خسرو ملتان میں کئی برس تک رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ موسیقی میں نام بھی انہوں نے وہیں پیدا کیا۔ یہ ناممکن ہے کہ امیر خسرو جیسے طباع شخص نے وہاں کی اپ بھرنش کے علاقائی خصائص کا اثر قبول نہ کیا ہو۔ جواہر خسروی کی ذیل کی پہیلی میں ان اثرات کی صوتی گونج "ڈاھیٹی" میں سنی جاسکتی ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ لفظ ڈھٹی قافیہ مقطوع ہوگا۔

نقارہ

نر ناری کی جوڑی ڈیٹھی — جب بولے تب لاگے میٹھی
اک نہائے اک تاپن ہارا — چل خسرو کر کوچ نقارا [۴۱]

(ب) معیاری کھڑی فاعلی حالت میں "نے" کی عدم موجودگی کس طرح گوارا نہیں کرتی بعض ما[؟] اسے دکنی سے مخصوص سمجھتے ہیں۔ مثلاً حضور فرمائیے، نظر بات کہی، وہ سب دیکھی۔ (ڈاکٹر [؟] عبدالقادر سروری مشمولہ رسالہ اردوئے معلیٰ دہلی ۱۹۶۲ء ج ۲ شمارہ ۴-۵ ص ۹۹ - ۱۰۰) لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ دکنی سے مخصوص نہیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے صحیح لکھا ہے کہ قدیم دہلوی میں "نے" کے عدم استعمال کی مثالیں ملتی ہیں (رات ہم خواب میں اس زلف کو پیچان دیکھا) [۴۲]۔ فضلی کی کربل کتھا سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے کہ ماضی مطلق کے لئے

---

[۳۹] ایضاً ص ۳ ۔

[۴۰] ایضاً ص ۶ ۔

[۴۱] ایضاً ص ۶ ۔

[۴۲] ڈاکٹر مسعود حسین خاں، مقدمہ تاریخ زبان اردو، طبع لاہور ۱۹۶۶ء ص ۴۲ ۔

اسم کی حالت فاعلی کے ساتھ "نے" کا استعمال معدوم تھا[۴]۔ جواہر خسروی کی بعض پہیلیوں میں "نے" کے عدم استعمال کی یہ مثالیں دلچسپی سے خالی نہیں ہیں :

کھٹ

گانٹھ گٹھیلا رنگ رنگیلا ایک پرکھ ہم دیکھا
مرد استری اس کو رکھیں اس کا کیا کہوں لیکھا [۵]

آم

برسا برس وہ دیس میں آوے ——— منہ سے منہ لگا رس پیاوے
وا خاطر میں خرچے دام ——— اے سکھی ساجن نا سکھی آم [۶]

چوکی

ایک نار جب بن کر آوے ——— مالک کو اپنے اوپر بٹھاوے
ہے وہ ناری سب کے گون کی ——— خسرو نام لئے تو چونکی [۷]

چوڑا

انگوں موری لپٹا رہے ——— رنگ روپ کا سب رس پئے
میں بھر جنم نہ واکو چھوڑا ——— اے سکھی ساجن نا سکھی چوڑا [۸]

(ج) جنسی پہلو۔ امیر خسرو کی متعدد پہیلیوں اور مکرنیوں کو بعض حضرات نے محض اس لئے غیر مستند قرار دیا ہے کہ ان میں بقول ان کے ذم کا پہلو ہے :

چٹاخ پٹاخ کب سے ——— ہاتھ پڑا جب سے ....

---

[۴] ڈاکٹر گوپی چند نارنگ "کربل کتھا کا لسانیاتی تجزیہ" رسالہ اردو کراچی اپریل ۱۹۶۸ء ص ۶۳-۶۴

[۵] جواہر خسروی ص ۲۳

[۶] ایضاً ص ۲۷

[۷] ایضاً ص ۲

[۸] ایضاً ص ۳۲

پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صفدر آہ لکھتے ہیں کہ اس میں ذم کا پہلو آگیا ہے[9] شاید ڈاکٹر وحید مرزا بھی اسے امیر خسرو سے اس لئے منسوب کرنا نہیں چاہتے تھے[10]۔ امیر خسرو کے ہندوی کلام کے استناد کا یہ خالص موضوعی اور اخلاقی معیار ہے جو ہرگز سائنسی نہیں ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم اپنے موجودہ اخلاقی اور سماجی معیاروں کو سات سو سال پہلے کے اس کلام پر مسلط کر رہے ہیں جو یکسر تفریحی اور عوامی نوعیت کا ہے۔ یہ صرف ہندوی ہی پر موقوف نہیں بلکہ ایک عالم گیر حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر زبان کے ادبی ذخیرے کے اس حصے میں جو "غیر ادبی" کہلاتا ہے یا جس کا تعلق لوک روایت سے ہوتا ہے اور جو محض تفریح یا تفنّنِ طبع کے لئے لکھا جاتا ہے اس میں انسانی جبلت کے وہ تقاضے جن کا اظہار ادب کے اخلاقی معیاروں کے احتساب کی وجہ سے باقاعدہ ادبی سطح پر نہیں ہو سکتا، وہ لوک ساہتیہ میں اپنے اظہار کے راستے ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ گویا لوک ساہتیہ یا عوامی ظرافت ہی وہ سیفٹی والو ہے جس کے ذریعے معاشرے کے ڈھکے چھپے "غیر مہذب" جذبات کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ امیر خسرو کے ایسے کلام میں ذم کا پہلو دیکھنا یا اس کی نام نہاد "عریانی یا فحاشی" کی وجہ سے اسے امیر خسرو سے منسوب کرنے میں پس و پیش کرنا عوامی ادب کے تقاضوں سے ناواقفیت کے مترادف ہوگا۔ دوسرے یہ کہ اگر امیر خسرو کے ہندوی کلام کو ہندوستانی لوک ساہتیہ کی عام روایت کے تناظر میں دیکھا جائے تو بھی اس میں اور اس کلام میں یک گونہ تسلسل ملے گا۔ طوطی نامہ کی روایت ترجموں کے ذریعے بھلے ہی بخشیں کے بعد آئی ہو لیکن جنس کے اظہار کے بارے میں کھلا ڈلا صحت مند انداز تو قدیم ہندوستانی روایت ہے جو صدیوں سے ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ رہی ہے۔ جواہر خسروی کی ذیل کی پہیلیوں اور ڈھکوسلوں میں اس اعتبار سے عوامی مزاج کے اس پہلو کی جھلک دکھائی دے گی۔ بہت واضح مثالیں عمداً درج نہیں کی گئیں۔ ان کو جواہر خسروی میں دیکھا جا سکتا ہے (چوڑیاں، جھولا، چرخا، ڈولی، چوسر، چونری، نگینہ، نیلا، گری، لبنگا، گن، چوڑا، تیل، ستار، بندر وغیرہ)۔

دانت کی مسی

سولہ سنگار کرے سیام برن ایک نار — دو سے دس تے سب سے ایک ہی بار[11]

۹ے ڈاکٹر صفدر آہ، امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر، ص ۳۴۔ ۱۰ے ڈاکٹر وحید مرزا، ص ۲۲۰۔

۱۱ے جواہر خسروی ص ۱۹۔

کتاب

ایک نار چاتر کہلاوے —— مورکھ کو نہ پاس بلاوے
چاتر مرد جو ہاتھ لگاوے —— کھول ستر وہ آپ دکھاوے ۸۲ے

انگیا

کس کے چھاتی پکڑے رہے —— منہ سے بولے نہ بات کہے
ایسا ہے کامن کا رنگیلا —— اے سکھی ساجن نا سکھی انگیا ۸۳ے

پان

بن ٹھن کے سنگار کرے —— دھر منہ پر منہ پیار کرے
پیار سے موپے دیت ہے جان —— اے سکھی ساجن نا سکھی پان ۸۴ے

پنکھا

آپ ہلے اور موسے ہلاوے —— واکا ہلنا مورے من بھاوے
بل بل کے وہ ہوا نسنکھا —— اے سکھی ساجن نا سکھی پنکھا

چند

اونچی اٹاری پلنگ بچھایو —— میں سوئی میرے سر پر آیو
کھل گئی انکھیاں بھئی انند —— اے سکھی ساجن نا سکھی چند ۸۶ے

ہار

سگری رین چھتیں پوراکھا —— رنگ روپ سب واکا چاکھا
بھور بھئی جب دیا اتار —— اے سکھی ساجن نا سکھی ہار ۸۷ے

۸۲ے جواہر خسروی ص ۲۲
۸۳ے ایضاً ص ۲۷
۸۴ے جواہر خسروی ص ۲۹ ۔ ۸۵ے ایضاً ص ۲۹۔
۸۶ے ایضاً ص ۲۲ ۔
۸۷ے ایضاً ص ۳۰ ۔

(۴) ڈھکوسلے، چھو کی چو پہری باجے

قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے مضمون آزاد بحیثیت محقق شائع شدہ نوائے ادب
بی خسرو سے منسوب چھو ساقن کے اس ڈھکوسلے پر شک کا اظہار کیا ہے:

اوروں کی چو پہری باجے چھو کی اٹھ پہری
باہر کا کوئی آئے ناہیں آئیں سارے شہری
صاف صوف کر آگے راکھے جائیں ناہیں توسل
اوروں کے جہاں سینگ سماوے چھو کے واں موسل ۸۸؎

محمد حسین آزاد نے اس کی تمہید میں لکھا ہے کہ چھو ساقن آتے جاتے خسرو کو حقہ پلاتی تھی۔ اردو کے بیشتر محققین نے بجا طور پر اعتراض کیا ہے کہ تمباکو اور حقہ خسرو کے عہد میں کہاں، یہ تو بہت بعد میں پرتگیزیوں کے ساتھ ہندوستان آیا۔ آزاد کی داستان طرازی سے قطع نظر اگر یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ کیا اصل اشعار میں تمباکو یا حقے کا ذکر ہے تو ناکامی ہوگی چونکہ متن میں تو صرف اتنا ہے:

صاف صوف کر آگے راکھے جائیں ناہیں توسل

اس طرح "چھو" نام تو آیا ہے لیکن "چھو ساقن" محمد حسین آزاد کی اختراع ہے۔ حقے تمباکو کا رواج تو امیر خسرو کے زمانے میں نہیں تھا، لیکن بھنگ پینے کا رواج تو تھا اور "چھو" پیالۂ بھنگ صاف مصفیٰ حاضر کرتی تھی" ۸۹؎۔ ضرورت محمد حسین آزاد کی اختراع سازی کو رد کرنے کی ہے، امیر خسرو سے منسوب کلام کو رد کرنے کی نہیں۔ اس طرح امیر خسرو سے منسوب ایک اور ڈھکوسلا ہے:

کھیر پکائی جتن سے اور چرخا دیا جلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا ۹۰؎

اس میں افعال جلا، کھا، گیا، بجا، آئے ہیں۔ اکثر ماہرین نے اس کی صاف زبان پر اعتراض کیا

۸۸؎ محمد حسین آزاد، آب حیات، لاہور طبع ۱۹۵۰ء ص ۷۷۔ جواہر خسروی ص ۴۵

۸۹؎ محمد حسین آزاد، آب حیات ص ۷۶۔

۹۰؎ ایضاً ص ۷۷۔ جواہر خسروی ص ۴۵۔

ہے۔ ہمارے نزدیک یہ امر غور طلب ہے کہ اس ڈھکوسلے کے فعلیہ ڈھانچے میں ایسی کون سی بات ہے جو اسے "در در موئے" "یا ماری ماری برہ کی ماری آری" یا "ہے بے تیر بالٹے" سے مختلف ثابت کرتی ہو۔ کم از کم جب کہ مخصوص یہ ڈھانچا بجائے خود امیر خسرو کی مستند تصانیف میں موجود ہے، تو اسے ان سے منسوب کلام میں سے رد کرنے کا کیا جواز ہے۔ تیرھویں صدی کی زبان ضرور غرابت کے کچھ پہلو رکھتی ہے، لیکن تیرھویں صدی کی زبان میں فعلیہ ڈھانچے کی جو صفائی امیر خسرو کی تصانیف کے ذریعے مصدقہ طور پر موجود ہے، اسے اٹھارھویں یا انیسویں صدی پر محمول کرنا لسانی دیانت سے روگردانی کرتا ہے۔ جہاں تک بے جوڑ چیزوں کو نظم کر دینے یا تک ملانے کا سوال ہے ہم جانتے ہیں کہ بے جوڑ لفظ لے کر بے معنی شعر کہنا اس زمانے میں قدرتِ کلام کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ خود خسرو نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ ان کے استاد قاضی اسد الدین انہیں اپنی ہمراہی قاضی عز الدین کے گھر لے گئے۔ قاضی عز الدین نے امیر خسرو کی قابلیت کا امتحان لینے کے لئے چار متفرق چیزوں کے نام لئے جن میں بظاہر کوئی مناسبت نہیں تھی یعنی مو، بیضہ، تیر، اور خربوزہ۔ خسرو نے برجستہ یہ رباعی کہی۔

ہر موی کہ در دو زلف آن صنم است

صد بیضۂ عنبرین بران موی ضم است

چون تیر مدان راست دلش را زیرا

چون خربزہ دندانش میان شکم است [91]

اگر خسرو اس طرح کی رباعیاں کہہ سکتے تھے تو لوگوں کی فرمائش پر ہندی ڈھکوسلے کہنے میں کیا چیز مانع رہی ہوگی۔

(۴) بیاض سراج الدین آزاد۔

محمود شیرانی نے سراج الدین آزاد کی بیاض سے کئی دوہے، اشعار اور ایک غزل نقل کی ہے جو امیر خسرو سے منسوب ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے "میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ امیر خسرو اس کا مالک ہیں" [92] ان دوہوں میں امیر خسرو کا مشہور عام دوہا بھی ہے "گوری سوئے سیج پر" جس کو "پلنگ پر" لکھ

---

[91] ڈاکٹر وحید مرزا ص ۴۹۔

[92] پنجاب میں اردو ص ۱۷۴ - ۱۷۵۔

ہے۔ جب ماتنے مشہور دوہے کی کاتب نے یہ ریڑھ لگائی ہے تو دوسرے اشعار کا کیا حشر ہوا ہوگا لیکن اس بنا پر شعروں کے انتساب ہی کو غلط قرار دینا کہاں کا انصاف ہے۔ ڈاکٹر صفدر آہ نے ان اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی اشاعت سے "مطبع کی روشنائی اور کتاب کا کاغذ خراب کیا گیا ہے"[٩٢] کاتب اگر موزونی طبع سے محروم ہے تو کلام کو "خرافات"[٩٤] قرار دینا کس حد تک مناسب ہے۔ "یار دیکھا نہیں مجر" یا "بابان غضب" جیسے ٹکڑوں سے ڈاکٹر صفدر آہ نے نتیجہ نکالا ہے کہ یہ کسی "پرانے دکنی شاعر کی غلط سلط تک بندی ہے"[٩٥]۔ واقعہ یہ ہے کہ جیسے پہلے وضاحت کی جا چکی ہے، فعل متعدی کے ماضی مطلق میں نے کا انحراف دکنی کی خصوصیات نہیں نیز "جب زحال مسکین مکن تغافل . . . الخ" میں ڈاکٹر صفدر آہ بتیاں، چھتیاں، پتیاں، رتیاں کی جمعوں کو امیر خسرو کا تسلیم کر کے اس غزل میں خسرو کے "سوز" کی داد دے چکے ہیں[٩٦] تو "باتاں" کو انہوں نے صرف دکنی سے مخصوص کیسے سمجھ لیا۔ حاتم کا مصرع ہے "لب پر کلی کے مہر کرے ان لباں کا رنگ" ہریانی زبان کے مصنف شیخ محبوب عالم کے محشر نامہ میں اسی نہج پر "کملاں، نغریاں، جھوٹاں، اونٹاں وغیرہ جمع کی صورتیں ملتی ہیں[٩٧]۔

ان امور کی روشنی میں یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ روایتاً جو ہندوی کلام امیر خسرو سے منسوب رہا ہے، اسے یکسر رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ افسوس ہے کہ مولانا محمد امین عباسی چریاکوٹی نے امیر خسرو کے ہندوی کلام کو مرتب کرتے ہوئے صرف دوسروں کے بھیجے ہوئے "میٹریل" پر اکتفا کیا اور قلمی نسخوں کی تلاش میں مطلق کوشش نہ کی۔ ضرورت ہے کہ شاہان اودھ کے کتب خانوں میں جو قلمی نسخے تھے اور جن کا ذکر اشپرنگر نے کیا ہے، انہیں تلاش کیا جائے یا ان سے پہلے کا کوئی قلمی نسخہ مل جائے تو امیر خسرو کے ہندوی کلام کی از سر نو تدوین کی جائے لیکن اس میں شک نہیں کہ ایسی کسی دستاویز کی غیر موجودگی میں بھی امیر خسرو کی فارسی تصانیف میں اور ان سے منسوب ہندوی کلام کے بعض حصوں میں ایسی مضبوط تاریخی اور لسانی شہادتیں موجود ہیں کہ ان کی بناء پر امیر خسرو کو "دہلوی ہندوی" کا نقاش اول کہا جا سکتا ہے۔

---

[٩٢] ڈاکٹر صفدر آہ، امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر، ١٩٦٦ء ص ٢٧۔

[٩٤] ایضاً ص ٣٨ ۔ [٩٥] ایضاً ص ٣٩ ۔ [٩٦] ایضاً ص ٢٢ ۔

[٩٧] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ڈاکٹر مسعود حسین خاں، مقدمہ تاریخ زبان اردو، دسمبر ١٩٦٦ء ص ١٦١ ۔

فیضِ سعدی

(عصرِ جدید کے غالب کے لئے)

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

۲/۳۰۸ کشمیری بلڈنگ مجاس روڈ، جوگیشوری، بمبئی

سعدی کی شخصیت اپنے عہد کی ایک عظیم شخصیت تھی، ان کو اس دنیا سے کوچ کیئے ہوتے آج پورے سات سو سال ہوچکے ہیں لیکن ان کی تخلیقات ہیں کہ آج بھی اپنا اثر دکھا رہی ہیں۔ دنیا کا ایک بہت بڑا طبقہ ان کا، ان کے فلسفۂ اخلاق کا ان کی شاعری کا گرویدہ ہے۔ ان کی شخصیت میں بہت ساری خوبیاں ایک ساتھ جمع تھیں، وہ بیک وقت عالم بھی تھے مفکر بھی، شاعر بھی تھے ادیب بھی، صوفی بھی تھے رند بھی، وطن دوست بھی تھے، جہاں گرد بھی، ان کی پوری زندگی جہدِ مسلسل کی ایک طویل کہانی ہے۔ جو دلچسپ بھی ہے سبق آموز بھی، زندگی کے مختلف مرحلوں میں اس مرحلے کی ضرورتوں کے مطابق انھوں نے اپنے آپ کو ڈھالا، اس کا پورا تجربہ کیا اور ایک ماہر غوطہ خور کی طرح سمندر کی گہرائیوں میں جاکر موتی نکال لائے اور ہمارے سامنے بکھیر دیا۔ ان موتیوں کی چمک دمک آج بھی ہماری آنکھوں کو خیرہ اور ہمارے دلوں کو مسحور کیئے ہوئے ہے۔

ان کی اس شخصیت کو بنانے میں ماں باپ کی تربیت کے علاوہ خود ان کی اپنی افتادِ طبع اور اس عہد کے سیاسی و سماجی حالات کا بڑا دخل تھا۔ ان کے والد شیراز کے فرماں روا سعد بن زنگی کے ملازم تھے، بچپن بڑے ناز و نعم میں گزرا لیکن ابھی یہ چھوٹے ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، ناز و نعم کے یہ دن ختم ہوگئے اور زندگی تنگی تکلیف میں گزرنے لگی۔ ماں نے اس تنگی تکلیف میں بھی ان کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھا، شیراز کے اچھے سے اچھے علماء نے انھیں تعلیم دی۔ لیکن عین جوانی میں ان کی ماں بھی ان سے

رخصت ہوگئیں۔ اب اس بھری دنیا میں وہ اکیلے تھے۔ شیراز میں ان کا اپنا کوئی نہ تھا، مادرِ وطن کی غیر یقینی سیاسی و سماجی صورت حال، تاتاریوں کی وحشیانہ غارتگری، بے کسوں اور مظلوموں کی چیخ و پکار ان کے دل و دماغ کو جھنجوڑ رہی تھی۔ اب ان کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ وطن میں رہ کر حالات کا مقابلہ کریں یا وطن سے دور کہیں اور اپنی قسمت آزمائیں۔ انھوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور ایک فقیر بے نوا کی طرح اپنے کندھے پر گودڑی ڈالی اور یاحق کا نعرہ لگا کر شیراز سے نکل پڑے۔

جوانی سے ادھیڑ عمر تک زندگی کا ایک بڑا حصہ انھوں نے دنیا کی سیر و سیاحت میں گزار دیا۔ ایران دیکھا، عراق دیکھا، شام اور فلسطین کی سیر کی، حجاز اور یمن کی خاک چھانی، مراکش اور لیبیا کے صحرا ناپے، یونان، مصر، روم اور ہند کا سفر کیا، غرض کہ ایشیا اور افریقہ کے بہت سارے علاقے کبھی پیدل، کبھی گھوڑے اور اونٹ کی پیٹھ پر، کبھی کشتیوں اور جہازوں پر سوار ہو کر کبھی کسی قافلے کے ساتھ اور کبھی اکیلے ہی دیکھ ڈالے۔ ہر جگہ ان کا روپ انوکھا اور نرالا تھا۔ کہیں وہ پانی پلا رہے ہیں، کہیں کسی صحرا میں پڑے سو رہے ہیں، کہیں خندق کھود رہے ہیں، کہیں بدزبان بیوی سے لڑ رہے ہیں، کہیں وعظ فرما رہے ہیں۔ کہیں کسی عالم اور شاعر سے چھیڑ چھاڑ کر رہے ہیں۔ کہیں کسی حسینہ کو دیکھ کر ان کا دل مچل رہا ہے۔ کہیں کسی شاہد رعنا سے نظر لڑا رہے ہیں۔ غرض زندگی کا اچھا برا کوئی تجربہ نہ تھا جو انھوں نے نہ کیا ہو۔ آخر میں ان سارے تجربات کا نچوڑ گلستان بوستان میں پیش کر دیا۔ جن کی نظیر زبان، ادب اور اخلاق کی تاریخ میں آج بھی نہیں ملتی۔ شعر و حکمت کے لازوال پھول پتوں سے سجے ہوئے یہ خوبصورت باغ رہتی دنیا تک انسان کو مسحور اور بے خود کرتے رہیں گے۔

(۲)

گلستان بوستان کہنے کو تو اخلاق کی کتابیں ہیں لیکن حقیقت میں وہ ان کے اپنے خود نوشت حالات زندگی ہیں جن کو انھوں نے روایتی انداز سے ہٹ کر ایک نئے ڈھنگ سے ترتیب دیا ہے تاکہ ان کے اپنے تجربات اور نتائج فکر میں ذاتی سے زیادہ عوامی اور شخصی سے زیادہ آفاقی رنگ ہو اور اپنے اپنے مراتب کے مطابق ہر شخص ان میں اپنی تصویر دیکھ سکے۔

واقعات کے پس منظر میں لکھی ہوئی ان اخلاقی کہانیوں میں ہمیں اسی دنیا کا ایک ایسا چلتا پھرتا انسان ملتا ہے جو شاہ بھی ہے گدا بھی، امیر بھی ہے فقیر بھی، ظالم بھی ہے انصاف پسند بھی، جھوٹ بھی بولتا ہے سچ بھی، سرمایہ دار بھی ہے مزدور بھی، فنکار بھی ہے بھوکا بھی عیش کوش بھی ہے شرابی بھی، عاشق بھی ہے خود دار بھی، بادشاہوں اور درویشوں کے اخلاق پر قناعت اور خاموشی کے فوائد پر، جوانی اور بڑھاپے کی کمزوریوں پر، آداب صحبت اور تربیت پر عدل وانصاف اور جہاں بانی، جہاں داری پر احسان، توبہ، تواضع اور شکر کے اصولوں پر غرض کہ زندگی کے ہر ضروری اور اہم مسئلے پر ہمیں ان سے روشنی اور ہدایت ملتی ہے۔

اور پھر ان واقعات کو انہوں نے اپنے مقصد کے مطابق ڈھالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے مقصد کے مطابق واقعات کو چن لیا ہے۔ اور جو بات جیسے ہوئی بلا کم وکاست بیان کرنے کے بعد اس کے نتائج دل نشین پیرائے میں ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کے جذباتی واقعات کو بھی نہیں چھپاتے ان کی ایک ایک جزئیات پر سے اس طرح پردہ اٹھاتے ہیں کہ آج کا بھولا بھالا نوجوان بھی کسی حسینہ کے قدموں پر سر رکھ دینے کی تمنا کرنے لگے۔

تبریز کے ایک حمام میں خواجہ ہمام سے میری ملاقات ہوگئی۔ ایک خوبصورت نوجوان اس کو پنکھا جھل رہا تھا۔ میری نظر اس پر جا پڑی۔ دل تو چاہتا تھا کہ نظروں ہی نظروں میں میں اس سے اظہار محبت کردوں۔ مگر ہمام کے بیچ میں ہونے کی وجہ سے ایسا نہ ہوسکا۔ یہاں تک کہ اثنائے گفتگو میں جب ہمام نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا شیراز میں میرے اشعار کا بھی چرچا ہے تو میں نے جھلاکر ہمام کا یہ شعر پڑھ دیا۔

درمیانِ من و دلدار حجاب است ہمام
وقت آنست کہ ایں پردہ بیک سوفگنیم

میرے اور دلدار کے درمیان ہمام پردہ بنا ہوا ہے۔
وقت آگیا ہے کہ ہم اس پردہ کو اٹھاکر ایک طرف پھینک دیں

جوانی کے دنوں میں ایک خوبصورت نوجوان سے میرے تعلقات بڑھ گئے تھے۔
ایک نوجوان جس کی آواز میں جادو تھا۔ جس کے بدن سے چاندنی چھلکتی تھی۔ جس کی ٹھوڑی

میں آب حیات پیتے ہوتے سیب کا مزہ تھا جس کے ہونٹوں کی مٹھاس چھلک منہ کو میٹھا سے بھر دیتی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے پر فدا تھے ایک دن اس نوجوان سے ایک ایسی حرکت سرزد ہوگئی جو مجھے سخت ناپسند تھی' میں نے اس کی محبت سے ہاتھ اٹھالیا اور اس سے کہہ دیا کہ اگر تمہیں ہمارا خیال نہیں تو جاؤ' جو چیز چاہیئے لے لو۔ اور چلتے بنو' اس نے بھی میری پرواہ نہ کی اور یہ کہہ کر مجھے اکیلا چھوڑ گیا کہ اگر کوئی چمگادڑ سورج سے دور رہنا چاہے تو اس سے سورج کی قدر و قیمت کم نہ ہوگی۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک مدت کے بعد پھر وہ میرے پاس لوٹ آیا لیکن اب اس میں وہ حسن وہ دل کشی نہ تھی۔ اس کا سارا جمال ختم ہو چکا تھا۔ اس کے سیب زنخداں پر دھول سی جم گئی تھی۔ غرض کہ بازار حسن کی ساری رونق ختم ہو چکی تھی۔ اس پر بھی وہ اس امید میں تھا کہ میں اس کو دیکھتے ہی ہم آغوش ہو جاؤں گا اور پرانا پیار دوبارہ شروع کر دوں گا۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس سے کنارہ کشی کر لی اور کہا۔

(۱) آن روز کہ خط شاہد ست بود
صاحب نظرے از نظر براندے

(۲) امروز بیامدی بصلحش
کش فتحہ و ضمہ بر نشاندے

(۱) جس دن تمہارا حسن شباب پر تھا
تم نے ایک صاحب نظر کو اپنی نظروں سے گرادیا۔

(۲) آج صلح کرنے کے لئے آئے ہو۔
اور باتیں بناتے ہو۔

ایک رات ایک عزیز دوست میرے گھر آیا' اس کو دیکھتے ہی میں بے اختیارانہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا اور میرے دامن کی ہوا سے بتی گل ہوگئی۔ دوست میرے پاس آکر بیٹھ گیا اور خفگی کے انداز میں کہنے لگا' بس مجھے دیکھتے ہی شمع گل کر دی تمہیں کچھ اور بھی آتا ہے۔ میں نے ہنس کر ایک بزرگ کا یہ قول' سنایا

اگر گرانی بہ پیش شمع آید	در شکر خندہ ایست و شیریں لب
خیزش اندر میاں جمع بکش	آستینش بگیر و شمع بکش

(۱) اگر کوئی پتنگا شمع پر آکر گرے تو
تم اسی وقت اٹھ کر سب کے سامنے اس کو مسلسل ڈالو
(۲) لیکن اگر وہ کوئی شیریں لب محبوب ہو تو
اس کا دامن تھام لو اور شمع بجھا دو۔

جوانی کے زمانے میں ایک دن میں ایک گلی سے گزر رہا تھا، میری نظر ایک بہت ہی حسین دوشیزہ پر پڑی۔ گرمی کا موسم تھا، پیاس کے مارے میری زبان خشک ہو رہی تھی اور گرم ہواؤں کی شدت سے ہڈیوں کے اندر کا خون بھی کھول رہا تھا۔ میں اس گرمی کی تاب نہ لا سکا اور ایک دیوار کے سایے میں پناہ لی۔ اس امید میں کہ کوئی تو میری پیاس بجھائے گا۔ اور گرمی کی شدت سے بھی نجات دلائے گا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ وہ حسینہ اپنے گھر کی دہلیز سے نکل کر میری طرف بڑھ رہی ہے "اس کے حسن کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے رات کی تاریکی سے صبح سحر نمودار ہو رہی ہو یا وادی ظلمات میں آب حیات کا چشمہ پھوٹ پڑا ہو۔ اس کے ہاتھ میں ٹھنڈے پانی کا پیالہ تھا اور پانی میں شکر اور عرق انگور کی ہلکی سی آمیزش تھی، میں کہہ نہیں سکتا کہ اس کی مہک گلاب کی وجہ سے تھی یا اس کے حسین رخسار سے پسینے کا ایک قطرہ ڈھل کر اس پانی میں آگرا تھا۔ میں نے اس کے خوبصورت ہاتھوں سے وہ پیالہ لیا اور ایک ہی سانس میں سب پی ڈالا۔ مجھ میں جان سی آگئی۔ لیکن افسوس میرے دل کی پیاس کچھ ایسی نہیں ہے کہ جو پانی کے چند قطروں سے بجھ سکے۔ دریا کے دریا بھی پی ڈالوں تو شاید یہ آگ ٹھنڈی نہ ہوگی۔

خرم آں فرخندہ طالع را کہ چشم	خوش نصیب ہے وہ شخص جس کی نظر
بر چنیں روی اوفتد ہر بامداد	ہر صبح اس خوبصورت چہرہ پہ پڑتی ہے
مست می بیدار گردد نیم شب	مست شراب آدھی رات کو اٹھ بیٹھتا ہے۔
مست ساقی روز محشر بامداد	مگر مست ساقی کی صبح تو محشر کے دن ہی ہوگی۔

جس شخص کی زندگی کا تجربہ اس قدر وسیع ہو، جو زندگی کے ہر نشیب و فراز سے گزر چکا ہو، جس کی نظر اتنی بلند ہو کہ چھوٹے بڑے سب ایک دکھائی دیں، وہ زمانہ کی پامال اور فرسودہ روایات کا کیا پابند ہو سکتا ہے۔ درباروں میں حاضری دینا، بادشاہوں اور امیروں کی قصیدہ خوانی کرنا، دوسروں کے کندھوں پر سوار ہو کر جنت میں جانا انہیں پسند نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ ان چیزوں سے دور رہے۔ لیکن ان کے سینے میں بھی دل تھا۔ انہیں بہرحال اپنے دل کی بات کہنی تھی، اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کرنا تھا۔ اور اس کے لئے کوئی مروجہ صنف شاعری انہیں موزوں معلوم نہیں ہوئی۔ لہٰذا انہوں نے ادب کی طرح شعر کے میدان میں بھی اپنی ایک الگ راہ نکالنے کی ٹھان لی، قصائد کے فارم سے اس کے حصۂ تشبیب کو الگ کیا اور اس کے نوک پلک درست کر کے غزل کے نام سے اس کو شعر و سخن کی دنیا میں چلا دیا۔ ان کی قائم کی ہوئی بنیادوں پر حافظ خسرو اور بعض دوسرے فارسی شعرا نے اپنی عظیم عمارتیں ضرور بنائیں لیکن وہ سب یک رنگی ہیں۔ ان میں ظاہری چمک دمک زیادہ ہے۔ مروجہ اصول اخلاق سے بغاوت کر کے وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بھی ضرور بن گئے۔ لیکن جو ہمہ رنگی، جو دل نشینی، جو میٹھاس جو نرمی اور لطافت جو برجستگی اور بے ساختگی ہمیں سعدی کے ہاں ملتی ہے۔ اس کی ذرا سی جھلک بھی ہمیں دوسروں کے ہاں نہیں ملتی۔ یہاں بھی وہ منفرد ہیں، یکتا ہیں اور بے مثال ہیں۔

وہ اپنی غزلوں میں ایک آزادہ رو عاشق دکھائی دیتے ہیں، انھیں مروجہ فلسفہ اخلاق کا پاس نہیں، ان کے اپنے اصول اخلاق الگ ہیں، وہ محبت کو دل میں چھپا کر رونے دھونے کے قائل نہیں، وہ جسے چاہتے ہیں کھل کر اس کی تعریف کرتے ہیں۔

اگر تو فارغی از حال دوستاں یارا	تم دوستوں کے خیال سے بے پرواہ ہو سکتے ہو۔
فراغت از تو میسر نہ می شود مارا	لیکن ہمیں تمہاری یاد سے فرصت کہاں۔
بیا کہ وقت بہار است تا من و تو بہم	بہار کا موسم ہے، آؤ ہم تم ایک ہو جائیں۔
بدیگراں بگذاریم باغ و صحرا را	باغ و صحرا کو دوسروں کے لئے چھوڑ دیں۔
کہ گفت در رخ زیبا نظر خطا باشد	کس نے کہا کہ رخ زیبا کو دیکھنا گناہ ہے۔
خطا بود کہ نہ بینند روی زیبا را	گناہ تو یہ ہے کہ ہم رخ زیبا کو نہ دیکھیں۔

وہ خوشی کے کسی لمحے کو ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتے۔ انہیں شراب چاہئے اور خوش رُو اور خوش آواز محبوب چاہیئے۔

وقت طرب خوش یافتم آن دلبر طناز را
ساقی بیار آں جام مے مطرب بزن آں ساز را
روی خوش و آواز خوش دارند ہر یک لذتی
بنگر کہ لذت چون بود محبوب خوش آواز را

اچھا ہوا کہ عین نشاط کے عالم میں وہ دلبر طناز بھی ہاتھ آگیا۔
ساقی جام شراب لا۔ مطرب! ساز چھیڑ
اچھی صورت اور اچھی آواز دونوں ہی اپنا ایک الگ لطف رکھتے ہیں۔
محبوب اگر خوش آواز ہو تو پھر اس کی لذت کا کیا کہنا۔

○

ان کی نظر میں وصال کی پوری رات بھی ایک پل سے زیادہ نہیں۔ محبوب سے بوس و کنار اور اختلاط کے وقت بلبل کی آواز بھی انھیں بے آہنگم معلوم ہوتی ہے۔

امشب ببک ترتی زند این بلبل بے ہنگام را
یا وقت بیداری غلط بودست مرغ بام را
یک لحظہ بود این یا شبی کز عمر ما تاراج شد
ما ہمچنان لب بر لبی نابر گرفتہ کام را

آج رات یہ بے ہنگم بلبل جلد چیخ گیا۔
یا بلبل کے جاگنے کا وقت غلط تھا۔
ہماری عمر کا جو حصہ ضائع ہو گیا وہ ایک پل تھا یا ایک رات
ہم نے تو ابھی محض لب سے لب ملاتے تھے، کامنائیں پوری نہ کی تھیں۔

○

ان کے خیال میں زہد، تقویٰ اور پرہیزگاری شرک ہی کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔ وہ زاہدوں

کو نصیحت کرتے ہیں کہ ریاکاری کے یہ سارے ساز و سامان ایک طرف اٹھا پھینکو اور زندگی کے باقی لمحات، محبت میں، سرمستی میں اور رقص میں گزار دو۔

برخیز تا یکسو نہیم ایں دلق ازرق فام را
برباد قلاشی دہیم ایں شرک تقویٰ نام را
جای کہ سرو بوستاں با پای چوبیں می چمد
مانیز در رقص آوریم آں سرو سیم اندام را
سعدی ملامت نشنود در جان دریں سر می رود
صوفی گر آنجا نے بزن ساقی بیاور جام را

آؤ! یہ نیلی گودڑی ایک طرف اتار کے رکھ دیں۔
اور اس تقویٰ نما شرک کو شراب میں ڈبو دیں۔
جس جگہ سرو بوستاں اپنے پای چوبیں کے ساتھ رقص کرتا ہے۔
ہم بھی اپنے سرو سیمیں کو ساتھ لے کر رقص کریں۔
اس میں اگر سعدی کی جان بھی جائے تو اسے فکر نہیں۔
صوفی! تو بھی اپنے پندار کو چھوڑ! ساقی جام لا۔

○

وہ حکمت اور دانش کے سارے دفتروں کو بے معنی سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں خدا نے آنکھیں ہی اس لئے دی ہیں کہ جلوہ ہائے حسن و رنگ کا نظارہ کریں۔ سرزنش اور رسوائی کی بات تو ہر حالت میں رہے گی۔

○

لا ابالی چہ کند دفتر دانائی را
طاعت وعظ نباشد سر سودائی را
دیدہ را فائدہ آنست کہ دلبر بیند
ور نبیند چہ بود فائدہ بینائی را

عاشقاں راچہ غم از سرزنش دشمن و دوست
یا غم دوست خوریم یا غم رسوائی را

بے فکر دانائی کے دفتر کو لے کر کیا کرے گا۔
سودائی کو پند و ہو واعظ سننے کی فرصت کہاں
آنکھ ہے ہی اس لیئے کہ دلبر کو دیکھے۔
اگر دلبر کو نہ دیکھے تو پھر بینائی کا فائدہ ہی کیا۔
محبت کرنے والوں کو دوست دشمن کی سرزنش کا غم ہی کیا۔
ہر حال غم کھانا ہی ہے چاہے وہ غم دوست ہو یا غم رسوائی۔

○

سب سے اچھا ذکر ان کے خیال میں ذکر یار ہے۔ اگر اور لوگ دل بہلانے کی خاطر باغ و بن کا رخ کرتے ہیں تو ان کا دل انھیں کوئے یار کی طرف کھینچ لے جاتا ہے،

از ہر چہ می رود سخن دوست خوش تر است
پیغام آشنا نفس روح پرور است
ابنای روزگار بہ صحرا روند و باغ!
صحرا و باغ زندہ دلاں کوی دلبر است

ذکر میں ذکر دوست کا ذکر
اس کا محض تذکرہ بھی روح کو بالیدگی بخشتا ہے۔
اور لوگ تفریح کے لئے باغ و صحرا کا رخ کرتے ہیں۔
لیکن زندہ دلوں کے لئے باغ و صحرا محبوب کا کوچہ ہے۔

○

شراب، خمار، وصل جاناں اور سرود و نغمہ کو وہ زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں، اور قیامت تک ان کی سرمستیوں سے باہر نکلنا نہیں چاہتے۔

بازاز شراب دوشیں دوسر خمار دارم
وز باغ وصل جاناں گل در کنار دارم
ساقی بیار جامی کز زہد توبہ کردم
مطرب بزن نوائی کز توبہ عار کردم
زاں مستی کہ ریخت عشقت درکام جان سعدی
تا بامداد محشر در سر خمار دارم

شراب کی مستی پھر سے رنگ لا رہی ہے۔
اور وصل جاناں کے باغ کا پھول پھر ایک بار میرے ہاتھ آگیا ہے۔
ساقی! جام دے، میں نے زہد سے توبہ کرلی ہے۔
مطرب! ساز چھیڑ، توبہ سے مجھے شرم آتی ہے۔
تری محبت نے سعدی کے حلق میں جو شراب انڈیلی
اس کا نشہ میرے سر میں روز محشر تک رہے گا۔

○

یہ تو وہ چند عام باتیں ہیں جو اخلاقیات سے متعلق ان کے رجحان طبع کو ظاہر کرتی ہیں لیکن جب ہم ان کے اس فلسفہ اخلاق سے پلٹ کر ان کے فلسفہ حسن و عشق پر غور کرتے ہیں تو وہاں بھی ان کے دل و دماغ کا جھکاؤ ایک ایسے حساس، نازک اور لطیف گوشے کو ہمارے سامنے لاتا ہے جو سعدی جیسے جہاں دیدہ، کار آزمودہ، لذت آشنا اور سیجھے ہوئے فنکار ہی سے ممکن ہے۔ یہاں ان کی زبان کی طرح ان کے دلی جذبات بھی صاف ستھرے، ٹھنڈے میٹھے اور ریبک اور مترنم آبشار میں ڈھل کر نکلتے ہیں۔ اور ہمارے سوئے ہوئے جذبات کو جگا جاتے ہیں۔ ۔ کاش ہم نے بھی محبت کی ہوتی۔

○

محبوب کی ایک ادنیٰ سی جھلک بھی ان کے دل و دماغ کو ایک نشاط آگیں کیفیت سے دوچار کر دیتی ہے۔ اور ان کے تصورات میں خوشبوؤں کا ایک سیلاب سا امنڈ آتا ہے۔

این تویی یا سرو بستانی برفتار آمدست
یا ملک در صورت مردم بگفتار آمدست
آن پری کز خلق پنہاں بود چندیں روزگار
باز می بینم کہ در عالم پدیدار آمدست
عود می سوزند یا گل می دمد در بوستاں
دوستاں یا کاروان مشک تاتار آمدست

یہ تم ہی ہو یا کوئی سرو بوستان چل پڑا ہے -
یا کوئی فرشتہ ہے جو انسان کے روپ میں بول رہا ہے -
وہ پری جو ایک زمانے تک عوام کی آنکھوں سے اوجھل رہی -
دوبارہ سب کے سامنے جلوہ فشانیاں کر رہی ہے -
دوستو! یہ لوبان جل رہا ہے یا باغ میں پھول کھل رہے ہیں
یا کوئی قافلہ ہے جو اپنے ساتھ مشک تاتار لے آیا ہے -

○

نسیم سحر میں بھی انھیں زلف یار کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ خوابوں میں بھی محبوب سے ان کا بوس و کنار جاری رہتا ہے۔ محبوب کے ظلم و ستم بھی انھیں اس کی غمگساری کی ادائیں معلوم پڑتی ہیں۔

مگر نسیم سحر بوی زلف یار منست
کہ راحت دل رنجور بے قرار منست
بخواب در نہ رود چشم بخت من ہمہ عمر
گرش بخواب ببینم کہ در کنار منست
اگر ہزار غمست از جفای او بر دل
ہنوز بندہ اویم کہ غمگسار منست

شاید نسیم سحر بھی میرے محبوب کے بالوں کی خوشبو ہے -

اس سے میرے بے قرار اور درد مند دل کو ایک سکون سا ملتا ہے
میرے بخت کو زندگی بھر نیند نہ آتے۔
اگر اس کو ذرا بھی یہ شک ہو جائے کہ میں خواب میں اپنے محبوب سے ہمکنار ہوتا ہوں
اس کی جفاؤں کی وجہ سے میرے دل پر لاکھ بوجھ ہوں۔
پھر بھی میں اس کا پرستار ہوں اور وہ میرا غمگسار

○

انھیں کسی حال میں بھی محبوب سے جدائی منظور نہیں۔ وہ مر مٹ کر ختم بھی ہو جائیں تو محبوب کی یاد ان کی خاک کے ذرہ ذرہ کو زندہ رکھے گی۔

زمد گشت جدائی میان ما ای دوست
بیا بیا کہ غلام توام بیا ای دوست
ہزار سال پس از مرگ من چو باز آئی
زخاک نعرہ برارم کہ مرحبا ای دوست
بساز با من رنجور نا تواں ای یار
ببخش بر من مسکین بنیوا ای دوست

اے میرے محبوب! ہم دونوں کی جدائی حد سے گزر گئی ہے
آجا، آجا، اب بھی میں تیرا پرستار ہوں۔
اگر تو میرے مرنے کے ہزار سال بعد بھی آئے گا۔
تو اے میرے محبوب! میں مٹی سے سر نکال کر تجھے خوش آمدید کہوں گا۔
اے میرے محبوب! آ، اور مجھ غم زدہ سے آن مل
میری خطاؤں کو معاف فرما! کیونکہ میں ایک فقیر بنیوا ہوں۔

○

وہ ایک حقیقت پسند عاشق کی طرح حرف متحرک اور زندہ حسن کی پرستش کو روا رکھتے ہیں۔ پتھر کے صنم پوجنا ان کے نزدیک ایک کار عبث ہے اور پھر محبت بھی ایسی کہ جس کا کوئی

کنارہ کوئی انتہا نہ ہو۔

آں شکرخندہ کہ پرنوشش دہانی دارد
نہ دل من کہ دل خلق جہانی دارد
کافراں از بت بیجان چہ تمتع دارند
باری آں بت بپرستند کہ جانی دارد
سعدیا کشتی ازیں موج بدر نتواں برد
کہ نہ بحریست محبت کہ کرانی دارد

اس تبسم ریز اور شیریں لب محبوب نے
صرف میرا نہیں بلکہ ساری مخلوق کا دل اپنی مٹھی میں کر رکھا ہے۔
یہ بے ایمان ایک بے جان بت سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔
خدا ایسے بت کو بھی پوج کر دیکھیں جو جاندار ہے
سعدی! اپنی کشتی اس موج سے سلامت لے جانا ناممکن ہے۔
محبت کوئی ایسا سمندر نہیں جس کا کنارہ بھی ہو۔

○

حسن و عشق کے متعلق سعدی کے یہ سارے تاثرات کچھ ان کی محض خیال آرائیاں نہیں ہیں بلکہ ان کے اپنے تجربات اور احساسات ہیں جو شعر و سخن کے خوبصورت پیالوں میں ڈھل ڈھل کر نکل رہے ہیں، انھوں نے محبت کی ہے اور بھرپور محبت کی ہے۔ وہ حسن کی ایک ایک ادا اور عشق کی ایک ایک تڑپ سے واقف ہیں۔

مرا راحت از زندگی دوش بود
کہ آں ماہ رویم در آغوش بود
چناں مست دیدار و حیران عشق
کہ دنیا و دینم فراموش بود

بزم

نگویم می لعل شیریں گوار
کہ زہر از کف دست او نوش بود
ندانستم از غایت لطف وحسن
کہ سیم وسمن یا بر ودوش بود
بدیدار وگفتار جان پرورش
سراپای من دیدہ وگوش بود
نمیدانم ایں شب کہ چوں روز شد
کسی باز داند کہ با ہوش بود

آہ وہ دن! جب مجھے زندگی کا پورا سکون حاصل تھا۔
اور وہ ماہرو صبح شام میرے آغوش میں رہتا تھا۔
میں محبت کے خمار میں اس قدر مست اور جلوؤں کے دیدار میں اس قدر
حیران تھا کہ دین ودنیا بھی فراموش ہو چکے تھے۔
مئے لعل کی بات ہی کیا۔
زہر کا پیالہ بھی اس کے ہاتھوں سے بھلا لگتا تھا۔
انتہائے لطف وحسن کی وجہ سے مجھے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا۔
کہ کل محبوب آیا تھا یا گلشن میں پھول کھلے تھے۔
اس کے جاں پرور دیدار اور دلنواز گفتگو کی وجہ سے
میں سرتاپا دیدہ وگوش بنا رہتا تھا۔
معلوم نہیں وہ حسین رات کیسے گزر گئی
میں ہوش میں رہتا تو شاید پتہ چلتا۔

○

اسی لئے ان کی محبت میں ایک کامیاب اور سیر چشم عاشق کا سا ٹھہراؤ، بھروسہ اور اطمینان
ہے۔ ناکام یا خیالی عاشقوں کی سی مایوسی، خفگی اور شکست خوردگی نہیں۔ عین فراق میں بھی بیٹھے

ہوتے حسین اور خوشگوار لمحات کی یاد انھیں خوش رکھتی ہے۔ انھیں یقین ہے کہ بچھڑا ہوا محبوب ان سے پھر ایک بار آن ملے گا۔

آمدی وہ کہ چہ مشتاق و پریشاں بودم
تا برفتی ز برم صورت بیجاں بودم
نہ فراموشیم از ذکر تو خاموش نشاند
کہ در اندیشۂ اوصاف تو حیراں بودم
بے تو در دامن گلزار نخفتم یک شب
کہ نہ در بادیۂ خار مغیلاں بودم
زندہ می کرد مرا دمبدم امید وصال
ورنہ دور از نظرت کشتۂ ہجراں بودم
تا مگر یک نفسم بوی تو آرد دم صبح
ہمہ شب منتظر مرغ سحر خواں بودم
سعدی از جور فراقت ہمہ روز ایں می گفت
عہد بشکستی و من بر سر پیماں بودم

اچھا ہوا تم آ گئے میں تو بہت بے چین اور پریشان تھا۔
تمہارے جانے کے بعد میری حالت ایک بے جان بت کی سی ہو گئی تھی۔
خود فراموشی بھی مجھے تمہاری یاد سے بچا نہ سکی۔
صبح شام تمہاری خوبیوں کو یاد کرتا اور حیران ہوتا تھا۔
تمہارے بغیر میں وادیٔ گل میں بھی نہ سو سکوں
خارزار جنگل کا ذکر ہی کیا۔
تمہارے وصال کی امید نے مجھے زندہ رکھا۔
ورنہ میں تمہاری نظروں سے دور غم فراق میں مر ہی چکا تھا۔
محض اس امید میں کہ صبح اپنے ساتھ تمہاری خوشبو بھی لائے گی۔

میں رات بھر مرغِ سحر خواں کا انتظار کرتا رہا۔
سعدی کی زبان سے جدائی کے مظالم سہتے وقت بھی یہی الفاظ نکلتے تھے۔
غم نہیں اگر تم بے وفائی کرو۔ میں اپنے وعدہ پر قائم رہوں گا۔

○

حسن وعشق کے متعلق اپنے ان دلی جذبات کے اظہار میں سعدی مطلق تکلف نہیں برتتے۔ بلکہ ان کے دل میں جو ہوک سی اٹھتی ہے، ان کے جگر میں جو درد سا ہوتا ہے۔ اس کا اظہار وہ برملا کرتے ہیں اور ایسی زبان میں کرتے ہیں جو آسان ہے، نرم ہے، منجھی ہے اور ان کے دل کی آواز کو اپنی اصلی حالت میں ہم تک پہنچا سکتی ہے۔ اور پھر زمین کے انتخاب، الفاظ کے چناؤ اور محاوروں کی بندش میں بھی ان کا ذہن ایک ماہر موسیقار کی طرح کام کرتا ہے۔ جس نے بھی کاروان دیکھے ہیں۔ صحرا میں اونٹوں کی دھیمی، مست اور مترنم رفتار کا مشاہدہ کیا ہے۔ اگر وہ دل رکھتا ہے، حسن کے جادو اور عشق کی وارفتگی سے بھی واقف ہے تو اس غزل کے سماں اور نغمائی کیفیت پر ناچ اٹھے گا۔

اے ساربان آہستہ رو کآرام جانم می‌رود
وآن دل که با خود داشتم با دلستانم می‌رود
محمل بدار ای ساربان تندی مکن با کاروان
کز عشق آن سرو روان گویی روانم می‌رود
با آن همه بیداد او وین عهد بی بنیاد او
در سینه دارم یاد او یا بر زبانم می‌رود
باز آی و بر چشمم نشین ای دلستان نازنین
کآشوب و فریاد از زمین بر آسمانم می‌رود
در رفتن جان از بدن گویند هر نوعی سخن
من خود به چشم خویشتن دیدم که جانم می‌رود

سعدی فغاں از دست مالائق بود اے بے وفا
طاقت نیارم جفا کار از فغانم میروم

اے ساربان! ذرا دھیرے چل، کیونکہ میرا "آرام جاں" جا رہا ہے۔
وہ دل جو کل تک میرے ساتھ تھا آج میرے دلبتاں کے ساتھ جا رہا ہے۔
اے ساربان! محمل پکڑ لے، کارواں کے ساتھ سختی مت دکھا۔
اس سرو رواں کے عشق میں جیسے میری جان جا رہی ہے۔
اس کے تمام ظلم وستم اور بے وفائی کے باوجود
دل میں اس کی یاد اور زبان پر اس کا نام موجود ہے۔
اے دلستان نازنین واپس آ اور میری آنکھوں میں بیٹھ
کیونکہ میری آہ و فغاں زمین سے آسمان تک پہنچ رہی ہے۔
لوگ جان جانے کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سوچتے ہیں۔
میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ میری جان جا رہی ہے۔
اے سعدی! اے بے وفا! تجھے یہ گریہ و فغاں زیب نہیں دیتا۔
مگر کیا کروں اب ستم سہنے کی طاقت نہیں رہی، بات گریہ و فغاں سے آگے بڑھ گئی ہے

○

اور سعدی کی اس غزل کی گونج تو سلاطین دہلی کی تاریخوں میں آج بھی ہمیں سنائی دیتی ہے

سرو سیمناں بصحرا میروی
نیک بد عہدی کہ بے ما میروی
کس بدیں شوخی و رعنائی نرفت
خود چنینی یا بعمدا میروی
روی پنہاں دارد از مردم پری
تو پری روی آشکارا میروی

میںنوازی بندہ راہ میکشی !
می نشینی یک نفس یا میروی
گر قدم بر چشم من خواہی نہاد
دیدہ بر رہ می نہم تا میروی
گرچہ آرام از دل ما میبرد
ہم چنیں میرو کہ زیبا میروی
دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست
تا پنداری کہ تنہا میروی

اے سرو سیمیں! تو اکیلا ہی جنگل کی طرف جا رہا ہے۔
بڑا بے وفا ہے ہمیں بھی ساتھ نہیں لیتا۔
آج تک میں نے کسی کو اس شوخی و رعنائی کے ساتھ چلتے نہیں دیکھا۔
تیری رفتار ہی ایسی ہے یا جان بوجھ کر اس طرح چل رہا ہے۔
پری اپنی صورت لوگوں سے پوشیدہ رکھتی ہے۔
لیکن تو پری رو ہونے کے باوجود کھلے منہ جا رہی ہے۔
بندہ کو زندہ رکھو یا مار ڈالو۔
ایک لمحہ کے لئے بیٹھو اور چلے جاؤ۔
اگر تو میری آنکھوں پر قدم رکھے تو
میں تیری راہ میں آنکھیں بچھا دوں
گو کہ دل کا چین ختم ہو رہا ہے۔
لیکن تو اسی طرح چلتا رہ کیونکہ تیری چال بڑی پیاری ہے۔
سعدی کی آنکھیں اور دل تیرے ساتھ ہیں۔
یہ مت سمجھ کہ تو اکیلا جا رہا ہے۔

کہتے ہیں کہ بلبن کے انتقال کے بعد اس کا پوتا کیقباد تخت نشین ہوا تو اس کی عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی۔ غیر متوقع طور پر تخت و تاج کا مالک بن جانے کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ رنگ رلیوں میں پڑ گیا۔ اس کے باپ بغرا خاں کو یہ روش پسند نہ تھی۔ وہ اس کی تنبیہ کے لئے بنگال سے فوج لے کر نکلا۔ دریائے سرجو کے کنارے باپ بیٹے کی ملاقات ہو گئی۔ مصالحت کے بعد باپ نے اپنے بیٹے کو خاص طور پر اس بات کی نصیحت کی کہ وہ رنگ رلیوں سے دور رہے۔ کیقباد نے باپ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے فوراً ہی شراب سے توبہ کر لی۔ اور رنگ رلیوں سے دور رہنے لگا۔

کیقباد کی اس توبہ کی وجہ سے سارے امرا اور درباری مشکل میں پڑ گئے۔ درمیخانہ ہی بند ہو تو میخوار کدھر جائیں۔ آخر انھوں نے کیقباد کو اس کی توبہ سے نجات دلانے کا تہیہ کر لیا۔ روز حسین و جمیل دوشیزاؤں کا ایک جمگھٹا بادشاہ کے راستے میں کھڑا رہنے لگا۔ جب بادشاہ کی سواری قریب آتی۔ تو یہ جمگھٹ گانے اور غشوہ طرازیاں کرنے لگتا۔

ایک دن ایک شوخ و شنگ مہ پارہ سبز گھوڑے پر سوار بجلیاں گراتی، قیامت ڈھاتی، شاہی فوج میں گھس گئی۔ اور بادشاہ کے سامنے پہنچ کر نہایت دلفریب آواز میں سعدی کا یہ شعر پڑھا۔ ؎ سرو سیمنیا! بصحرا می روی : نیک بدعہدی کہ بے ما می روی

اور پھر رک سی گئی جیسے وہ بادشاہ کے ڈر سے چپ ہو گئی ہو۔ حسن دلفریب اپنی ساری دل نوازیوں کے ساتھ اچانک سامنے آجائے تو زاہد خشک بھی اپنی تسبیح چھوڑ کر اس کو دیکھنے لگے بادشاہ تو پھر بھی بادشاہ تھا۔ لذت آشنائے حسن و ادا، بے خود ہو گیا۔ اور حسینہ سے نغمہ جاری رکھنے کو کہا۔ حسینہ نے دوسرا شعر پڑھا۔

گر قدم بر چشم من خواہی نہاد
دیدہ براہ می نہم تا میروی

کیقباد یہ سن کر وجد میں آگیا۔ اس کو اپنے عیش و عشرت کے سارے مزے ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ مہ لقا کی چھیڑ چھاڑ بڑھتی رہی۔ کیقباد کا جذبۂ عشق بیدار ہوتا رہا یہاں تک کہ وہ بے قابو ہو کر چیخ پڑا۔

شب زمستی توبہ کنیم از نسیم ناز شاہداں
بامداداں روی ساقی باز در کار آورد

پھر کیا تھا، صراحیوں کے منہ کھل گئے۔ جام کا دور چلنے لگا۔ حسن کی شوخیاں اور عشق کی گرمیاں بڑھ گئیں۔ ہر شخص مست و بے خود ہو کر جھوم رہا تھا۔ ناچ رہا تھا۔ گا رہا تھا۔

سر و سیمینا! بصحرا می روی۔ نیک بدعہدی کہ بے ما میروی۔

(۴)

ہمارے گویوں نے زبان کے قواعد مرتب کرتے وقت غزل کے لئے خاص روپ اور خاص رنگ اور خاص ذہن تجویز کر کے اس کی وسعت کو محدود کر دیا۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ غزل کی یہ مقبولیت یہ ہر دلعزیزی اس کے فارم کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے آہنگ، اس کی فضا اور اس کی کیفیت کی وجہ سے ہے اگر یہ آہنگ یہ فضا اور یہ کیفیت کسی اور فارم میں بھی ہمیں مل جائے تو وہ بھی ویسے ہی دلکش اور ہر دلعزیز ہوگی جیسے ایک خوبصورت غزل فارسی شعرا میں ہمیں صرف سعدی کے ہاں یہ حسن ملتا ہے۔ ان کی شاعری چاہے مثنوی کی صورت میں ہو یا قصیدہ کی صورت میں، غزل کی صورت میں ہو یا قطع کی صورت میں۔ یہ حسین فضا ہر طرف چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ اردو شعرا میں یہ بات صرف فیض کے لئے کہی جا سکتی ہے۔

○

بہ ظاہر سعدی کے فریم میں فیض کی تصویر کو سجانے کی کوشش کرنا ایک عجیب سی بات لگتی ہے — کیونکہ ہمارے ذہنوں میں ان دونوں کی پہلے ہی سے دو مختلف اور متضاد تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ ایک جاگیردارانہ نظام کا پروردہ، فرسودہ اور روایات کا علم بردار رجعت پسند ہے اور دوسرا جاگیردارانہ نظام کا دشمن، جدید قدروں کا مبلغ اور ترقی پسند ہے حالانکہ نہ سعدی سر تا سر قدامت پسند تھے اور نہ فیض جدیدیت زدہ۔ بلکہ ہم یہ بھول جائیں کہ دونوں کے زمانے الگ ہیں۔ دونوں کے ماحول الگ ہیں۔ دونوں کی زبانیں الگ ہیں اور ان کی شخصیتوں پر زمان و مکان کی قید سے بلند ہو کر سوچیں تو ان دونوں میں بعض باتیں مشترک ہیں۔

○

○

سعدی کی طرح فیض کا بچپن بھی ناز و نعم میں گزرا۔ وہ بھی ایک خوش حال خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ انھیں ہر قسم کا عیش و آرام میسر تھا۔ نوکر چاکر تھے۔ تعلیم و تربیت کی سہولتیں موجود تھیں۔ دکھ درد سے واقف نہ تھے۔ غم سے شناسائی نہ تھی۔

○

سعدی کی طرح فیض بھی زندگی کے ایک خاص موڑ پر باپ کے سہارے سے محروم ہوئے جائداد ڈوب گئی۔ عیش و آرام کا سامان چھن گیا۔ نہ وہ چین کے دن رہے۔ نہ وہ سکون کی راتیں رہیں۔ ہر طرف بس لٹے ہوئے قافلے کا غبار تھا۔ اس بھری دنیا میں وہ اکیلے تھے۔ انھیں اپنا جہان آپ آباد کرنا تھا۔

○

سعدی کی طرح فیض بھی سیاست وقت سے خوش نہ تھے۔ وزیروں، امیروں کی خوشامد کرنا ٹلوں اور درباروں میں حاضری دینا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ فطرتاً آزادہ رو تھے۔ باغیانہ سرگرمیوں کے نام پر قید و بند کی مصیبتیں بھی جھیلیں انھیں بھی اپنے ملک سے باہر جانے جہاں گردی کرنے اور ہر قسم کے نشیب و فراز دیکھنے کا کافی موقع ملا۔

○

سعدی بھی معلم اخلاق تھے اور فیض بھی معلم اخلاق ہیں۔ صرف دونوں کی قدریں جدا ہیں۔ اور مقصد حیات جدا۔

○

سب سے اہم اور آخری بات یہ کہ سعدی کی طرح فیض کا جذبہ حسن پرستی بھی کوئی فلسفیانہ نہ تھا۔ فیض نے بھی محبت کی ہے اور بھرپور محبت کی ہے۔ ان کی خاموش اور مخمور نگاہوں میں بیسیوں جلوے اور ان کی پرسکون تنہائیوں میں بیسیوں مہ لقائیں آباد ہیں۔ ان کی شخصیت حسن، محبت، کیف اور سرمستی کا ایک حسین مجموعہ ہے۔ جس کا عکس ہمیں ان کی شاعری میں بھی قدم قدم پر نظر آتا ہے۔ چاہے وہ نظم کی صورت میں ہو یا غزل کی۔

○

○

حسن کی تعریف اور محبت کے اظہار میں فیض بھی کسی پابندی کسی تکلف کے قائل نہیں ہیں ان کے ہاں بھی ذکر یار کے بغیر نہ گلستان کی بات ہوتی ہے اور نہ مے خانے کا نام بھلا لگتا ہے۔ نہ نظروں میں پھول مہکتے ہیں اور نہ دلوں میں شمعیں روشن ہوتی ہیں۔ زندگی کا ہر حسن حسنِ یار کے اثر کے بغیر ادھورا ہے۔

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
دوستو! اس چشم ولب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام
پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

○

یہ حسن کا پرتو ہی ہے کہ جس کے اثر سے انسان کا زاویہ نظر بدل جاتا ہے، پرائے بھی اپنے معلوم پڑتے ہیں تاریکی بھی روشنی میں بدل جاتی ہے۔

حدیث یار کے عنوان ابھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں
ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں
صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکر وطن
تو چشم صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں
وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں
در قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں۔

○

سعدی نے ساقی و مطرب کو آواز دی تھی۔ ساقی! جام اٹھا، مطرب! ساز چھیڑ! مگر محبوب کو پانے کے بعد، فیض محبوب کی آمد کا انتظار نہیں کرتے، محض محبوب کا تصور بھی ان میں سرورمے کی نشاط انگیز کیفیت پیدا کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

دل میں اب یوں تیرے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں

رقص مے تیز کرو ساز کی لے تیز کرو
سوئے میخانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں

○

سعدی صرف اس کو "فرخندہ طالع" سمجھتے تھے جو آشنائے راز ہے جس کی نظروں میں محبوب کے جلوے سماتے ہوتے ہیں۔ فیض کا نظریۂ حسن بھی اس سے کچھ الگ نہیں ہے بلکہ وہ اپنی ہی نظروں کو حسن کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔

ہے وہی عارضِ لیلیٰ وہی شیریں کا دہن
نگہ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے
ایک دفعہ بکھری تو ہاتھ آتی ہے کب موجِ شمیم
دل سے نکلی ہے تو کیا لب پہ فغاں ٹھہری ہے
ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

○

جس طرح سعدی کو گھڑی بھر کے لئے محبوب کی جدائی منظور نہ تھی۔ اسی طرح فیض کو بھی محبوب سے دور رہنا پسند نہیں ہے۔ جب بادِ نو بہار چلتی ہے، جب باغوں میں پھول کھلتے ہیں۔ تو وہ بھی بے خود ہو کر پکار اٹھتے ہیں۔

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اداس ہے یارو، صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے
کبھی تو صبح ترے کنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے
مقام فیض! کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

○

سعدی کی طرح فیض کی محبت بھی محض خیال آرائی نہیں، ان کی محبت بھی ایک متحرک اور جاندار محبت ہے اور اس محبت کے ساتھ ان کی بہت سی حسین اور اداس یادیں وابستہ ہیں۔

رنگینیٔ دنیا سے مایوس سا ہو جانا
دُکھتا ہوا دل لے کر تنہائی میں کھو جانا
ترسی ہوئی نظروں کو
حسرت سے جھکا لینا
فریاد کے ٹکڑوں کو
آہوں میں چھپا لینا
راتوں کی خموشی میں چھپ کر کبھی رو لینا
مجبور جوانی کے ملبوس کو دھو لینا
جذبات کی وسعت کو
سجدوں سے بسا لینا
بھولی ہوئی یادوں کو
سینے سے لگا لینا

○

بیتتے ہوئے دنوں کی ان حسین یادوں نے ان کے دل و دماغ کو اس قدر اپنے بس

میں کر رکھا ہے کہ انھیں کائنات کے ذرے ذرے میں محبوب کے جلوے، اس کے عہد و پیمان اور اس کی اداؤں اور جفاؤں کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ سارا حسن آفاق اسی کا ایک عکس جمیل ہے۔

○

ہر گھڑی عکس روح یار لئے پھرتی ہے
کتنے مہ تاب شب تار لئے پھرتی ہے
سن تو لو' دیکھ تو لو' مانو نہ مانو اے دل
شام غم سیکڑوں اقرار لئے پھرتی ہے
ہے وہی حلقۂ موہوم مگر موج نسیم
تار گیسو میں خم دار لئے پھرتی ہے
باغباں ہوش کہ برہم ہے مزاج گلشن
ہر کلی ہاتھ میں تلوار لئے پھرتی ہے

○

اور وہ پھر سعدی کی طرح نہایت بے صبری کے ساتھ "بیا بیا کہ غلام توام بیا ای دوست!" نہیں کہتے بلکہ نہایت پرسکون انداز میں کائنات کی سرمستی و بے خودی کا حوالہ دے کر اس کے ایک ایک حسن اور ایک ایک ادا کی تعریف کرتے ہیں تاکہ محبوب کا جذبۂ سپردگی بیدار ہو اور وہ خود ہی بے اختیارانہ آن ملے۔

گم ہے اک کیف میں فضائے حیات
خامشی سجدۂ نیاز میں ہے
حسن معصوم خواب ناز میں ہے
اے کہ تو رنگ و بو کا طوفاں ہے
اے کہ تو جلوہ گر بہار میں ہے
زندگی تیرے اختیار میں ہے

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہار شباب
آکہ کچھ دیر سن سنالیں ہم
آمحبت کے گیت گالیں ہم

اس طرح اگر ہم فیض کی غزلوں اور نظموں کے ایک ایک تار کو چھیڑتے جائیں تو ان سے جو مدھر اور پرسوز آواز سنائی دے گی اس میں سعدی کے سوز عشق کی بھی دھیمی آنچ ہوگی۔ سعدی کی ساری تعلیمات کا حاصل تھا۔حسن کو ہر روپ میں پوجو اور عشق کو ہر رنگ میں عام کرو فیض کی ساری شاعری کا حاصل بھی یہی ہے۔صریر ناز اور سجدۂ نیاز

فیضی احسنت ازیں عشق کہ دوراں امروز
گرم دارد ز تو ہنگامۂ رسوائی را

حوالے

۱۔ حالی: حیات سعدی ۲۔شبلی: شعر العجم حصہ دوم، ۳۔سعدی: گلستان بوستان، ۴۔مہدی سہیلی (مرتب) شاہکارہای سعدی، ۵۔افکار: فیض نمبر ۶۔فیض: نقش فریادی، زنداں نامہ، دست صبا، دست تہ سنگ ۷۔آزاد بکڈپو (مرتب) ورق ورق۔

ذوق کے اوّلین استاد ـــــ حافظ شوقؔ

ڈاکٹر عبدالرزاق

شعبۂ اردو، ملتان یونیورسٹی

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ ابتدا شاہ نصیر کے ایک شاگرد حافظ غلام رسول شوقؔ سے اصلاح لیا کرتے تھے مگر بعد ازاں ان سے غیر مطمئن ہو کر خود شاہ صاحب کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ آزادؔ کی آبِ حیات و دیوانِ ذوقؔ میں اور منشی احمد حسین کی حیاتِ ذوقؔ میں اس رشتۂ تلمذ اور انقطاعِ تعلق کا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ آزادؔ ذوقؔ کے شاگردانہ تعلقات کے آغاز کے سلسلے میں رقم طراز ہیں کہ شیخ ابراہیم جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رسول نام ایک شخص بادشاہی حافظ ان کے گھر کے پاس رہتے تھے۔ محلے کے اکثر لڑکے انہی کے پاس پڑھتے تھے۔ انہیں بھی وہاں بٹھا دیا۔ حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے۔ شوقؔ تخلص کرتے تھے۔ اگلے وقتوں کے لوگ جیسے شعر کہتے ہیں ویسے شعر کہتے تھے۔ محلے کے شوقین نوجوان دلوں کی امنگ میں ان سے کچھ کچھ کہوا لے جایا کرتے تھے۔ اکثر اصلاح بھی لیا کرتے تھے۔ غرض ہر وقت ان کے ہاں یہی چرچا رہتا تھا۔ شیخ مرحوم خود فرماتے تھے کہ وہاں سنتے سنتے مجھے بہت شعر یاد ہو گئے۔ نظم کے پڑھنے اور سننے میں دل کو ایک روحانی لذت حاصل ہوتی تھی اور ہمیشہ اشعار پڑھتا پھرا کرتا تھا۔ دل میں شوق تھا اور خدا سے دعائیں مانگتا تھا کہ الٰہی مجھے شعر کہنا آ جائے۔ ایک دن خوشی میں آ کر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے ... غرض کہ اسی عالم میں کچھ کچھ کہتے رہے اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے۔"[1]

مولانا آزادؔ نے اس سلسلۂ اصلاح کے انقطاع کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہا ہے

---

[1] آبِ حیات ص ۴۲۷-۲۸ ، دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد ص ۳-۲

کہ اسی محلہ میں میر کاظم حسین[1] نام ایک ان کے (ذوق کے) ہم سن ہم سبق تھے کہ نواب سید رضی خاں مرحوم کے بھانجے تھے، بیقرار تخلص کرتے تھے اور حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے مگر ذہن کی جودت اور طبیعت کی براقی کا یہ عالم تھا کہ کبھی برق تھے اور کبھی باد و باراں انہیں اپنے بزرگوں کی صحبت میں تحصیل کمال کے لئے اچھے اچھے مواقع ملتے تھے۔ شیخ مرحوم اور وہ اتحادِ طبعی کے سبب سے اکثر ساتھ رہتے تھے اور مشق کے میدان میں ساتھ ہی گھوڑے دوڑاتے تھے۔۔۔ ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سنائی۔ شیخ مرحوم نے پوچھا۔ یہ غزل کب کہی؟ خوب گرم شعر نکالے ہیں۔ انہوں نے کہا ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ انہی سے یہ اصلاح لی ہے۔ شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا اور ان کے ساتھ جاکر شاگرد ہو گئے۔"[2]

حیاتِ ذوق کے مصنف نے شاگردانہ تعلقات کے منقطع ہونے کا یہ سبب بیان کیا ہے کہ ذوق حافظ شوق سے اصلاح لیتے تھے مگر یہ اصلاح ان کے خاطر خواہ نہ ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ ان کے دل میں یہ بات سما گئی کہ حافظ شوق کو جو کچھ شد بد آتا تھا وہ تو سیکھ لیا۔ اب کسی اچھے مشاق کی شاگردی ضروری ہے۔"[3]

انقطاعِ رشتۂ تلمذ کے اسباب و علل سے قطع نظر یہ امر مسلمہ ہے کہ خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق نے اوائل عمر میں حافظ غلام رسول شوق سے کتبی تعلیم حاصل کی اور اصلاحِ سخن کے سلسلے میں بھی ابتداً انہی سے فیضیاب ہوتے۔ لہٰذا اس تعلقِ خاص کے پیش نظر ان کے اس گمنام اولین استاد کے حالات و اندازِ شاعری کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

شوق تخلص، غلام رسول نام، حافظِ کلام پاک، باشندہ دار الخلافہ، شاگرد شاہ نصیر دہلوی[4]۔ بقول شیفتہ "بدولت حفظِ کلام اللہ تن را از آفاتِ فاقہ نگہدارد و امامت مسجد یکہ بعض خانہ عزیز آبادی است حضرت ولی عہد بہ رو مسلم داشتہ و تعلیم اطفال نیز می کنند"[5]

---

[1] میر کاظم حسین بیقرار کے تفصیلی حالات و نمونہ کلام کے لئے دیکھئے۔
مجموعہ نغز جلد اول ص ۱۲۷، گلشن بیخار ص ۴۲، منتخبہ ص ۸، معیار الشعراء (قلمی نسخہ انڈیا آفس) ص ۹۹، یادگار شعرا ص ۴۹، تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی جلد اول ص ۲۴۳، سخن شعرا ص ۷۰، خمخانہ جاوید جلد اول ص ۲۴۴۔ [illegible]
[2] آبِ حیات ص ۴۴۰ / ۴۳۱، ۴۲۹-۴۲۸، دیوان ذوق مرتبہ آزاد ص ۲۰۴-۲۰۳/۲۰۲-۲۰۳
[3] آب حیات ص ۴۹۳- [illegible] دیوان ذوق مرتبہ آزاد ص [illegible] [4] حیات ذوق ص [illegible] [5] یادگار شعرا ص ۱۱۲، جلوۂ خضر ص [illegible]

مولوی کریم الدین[1]، حکیم قطب الدین باطن[2] اور عبدالغفور خاں نساخ[3] نے بھی شیفتہ ہی کی اسی روایت کو نقل کیا ہے۔ بقول سرور نوجوانے نست سپاہی وضع[4] آزردہ کے الفاظ میں مردے سپاہی پیشہ[5] اور قاسم کے بیان کے مطابق وے مرد سپاہی منش و عزیز خوش روش است[6]

صابر کا بیان ہے کہ عہد طفولیت سے اب تک باوجودیکہ سنین عمر ستر کے قریب پہنچے مشق سخن میں مصروف ہے[7] چونکہ صابر کے گلستانِ سخن کی تصنیف کا زمانہ ۱۲۷۰ - ۱۲۷۱ھ ہے۔ اس لحاظ سے شوق کی پیدائش تخمیناً ۱۲۰۰ ہجری میں ہونا قرار پاتی ہے جو کہ مؤلف خمخانہ جاوید کے بقول حافظ صاحب کی وفات ۱۲۷۲ ہجری میں ہوئی[8]۔

حافظ غلام رسول شوق تادیب اطفال کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کا بھی شوق رکھتے تھے ایک طرف شاہ نصیر سے تلمذ تھا تو دوسری طرف کئی نومشق خود ان سے اصلاح لیتے تھے جن میں میر کاظم حسین بیقرار اور شیخ محمد ابراہیم ذوق کا نام سرفہرست تھا۔

ہمارے تذکرہ نویسوں نے حافظ شوق کی شاعری کے متعلق مختلف بلکہ متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے چنانچہ بقول ذکا "تازہ مشق است، خوش فکر ارد و شعر بتلاش می گوید[9]" سرور کہتے ہیں اشعار پختہ بہ طور استاد خود خوب می گفت[10] شیفتہ نے بھی اسی خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اکثر کلامش بطرز استاد خود است[11]۔ خوشگو کی رائے میں سیان زبان آور اں کلامش چاشنی ریز[12] بقول کریم الدین اکثر کلام اس کے اچھے ہیں[13]۔

لیکن اس کے برخلاف صابر نے شوق کی شاعری کو معمولی درجے کی قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مشکل زمینوں میں بیشتر گامزن اور قوافی تنگ میں اکثر گرم سخن ہے جو کہ اشعار

۱؎ طبقات الشعرائے ہند ص ۴۰۸ ۲؎ گلستان بے خزاں ص ۱۲۵ ۳؎ سخن شعرا ص ۲۲۵ ۴؎ عمدہ منتخبہ ص ۳۰۰ ۵؎ تذکرہ آزردہ ص ۵۲ ۶؎ مجموعہ نغز جلد اول ص ۳۵۲

۷؎ گلستانِ سخن جلد دوم ص ۷۰ ۸؎ خمخانہ جاوید جلد پنجم ص ۷۷ ۹؎ عیار الشعرا قلمی ص ۴۳۹

۱۰؎ عمدہ منتخبہ ص ۳۰۰ ۱۱؎ گلشن بے خار ص ۱۱۲ ۱۲؎ گلشن ہمیشہ بہار ص ۱۹۷

عاشقانہ و دلچسپ یا تشبیہہ و تمثیل ایسی کہ مذاقِ شاعری میں گوارا ہو اس کے نتائج طبع سے کم کیا کہ مطلق مسموع نہیں ہوئے۔ ناچار یہ ایک شعر کہ بہ نسبت اور اشعار کے فی الجملہ حلیہ صفا سے محلی تھا، مرقوم ہوا۔[1]

مولانا آزاد یہ کہتے ہوئے آگے گذر گئے ہیں کہ اگلے وقتوں کے لوگ جیسے شعر کہتے ہیں ویسے شعر کہتے تھے۔[2] اس چلتے ہوئے فقرے میں بھی آزاد کا عندیہ مخفی نہیں رہ سکا۔ ایک دوسری جگہ جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے شوق کی شاعری کے متعلق آزاد کا خیال کاملاً واضح ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"ایک دفعہ نواب الٰہی بخش خاں معروف نے اپنے چوبدار کے ذریعے شیخ ابراہیم ذوق کو تبرک کے ساتھ کہلوا بھیجا کہ آپ کا کلام تو پہنچا ہے مگر آپ کی زبان سے سننے کو جی چاہتا ہے۔ شیخ مرحوم نے وعدہ کیا اور تیسرے دن تشریف لے گئے۔ وہ بہت اخلاق سے ملے اور بعد گفتگوئے معمولی کے شعر کی فرمائش کی۔ انہوں نے ایک غزل کہنی شروع کی تھی اس کا مطلع پڑھا ؎

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

سن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ خیر حال تو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا مگر تمہاری زبان سے سن کر اور لطف حاصل ہوا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ عجیب اتفاق یہ کہ حافظ غلام رسول شوق یعنی استاد مرحوم کے قدیمی استاد اسی وقت آنکلے۔ نواب انہیں دیکھ کر مسکرائے اور شیخ مرحوم نے اسی طرح سلام کیا جو سعادت مند شاگردوں کا فرض ہے وہ ان سے خفا رہتے تھے کہ شاگرد میرا ادب مجھے غزل نہیں دکھاتا اور مشاعروں میں میرے ساتھ نہیں چلتا۔ غرض انہوں نے اپنے شعر پڑھنے شروع کر دیئے۔ شیخ مرحوم نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور رخصت چاہی۔ چونکہ نواب مرحوم کے برابر بیٹھے ہوئے تھے، نواب نے چپکے سے کہا کہ کان بدمزہ ہو گئے، کوئی شعر اپنا سناتے جاؤ۔ استاد مرحوم نے انہی دنوں میں ایک غزل کہی تھی وہ

---

[1] گلستانِ سخن جلد دوم ص ۵۰ [2] آب حیات ص ۴۲۸

مطلع اس کے پڑھنے سے[۱]

شوقؔ کے اشعار کے متعلق جو خیال نواب معروف نے ظاہر کیا در حقیقت وہ خود آزادؔ کا ہے جو وہ بالواسطہ طور پر کہنا چاہتے ہیں۔ آزادؔ نے محض اس وجہ سے کہ شاہ نصیر کی طرح ذوقؔ نے اپنے استاد اولین حافظ شوقؔ کے ساتھ بھی تعلقات اچھے نہ رہے تھے۔ انہیں (شوقؔ کو) گھٹیا قسم کا شاعر قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ شوقؔ و ذوقؔ کے تعلقات کا اندازہ خود آزادؔ کے اس بیان سے ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"حافظ غلام رسول کے سامنے ہی شیخ مرحوم (ذوقؔ) کا انتقال ہو گیا۔ چنانچہ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ گلی میں ٹہل رہے تھے، میں بھی ساتھ تھا، حافظ غلام رسول صاحب سامنے سے آ گئے۔ چنانچہ شیخ مرحوم نے اسی آداب سے جس طرح بچپن میں سلام کرتے تھے، انہیں سلام کیا، انہوں نے جواب دیا مگر اس ترشروئی سے گویا سو شیشے سرکہ کے بہا دئیے۔ جب وہ بازار میں نکلتے تو لوگ آپس میں اشارے کر کے دکھاتے کہ دیکھو میاں وہ استاد ذوقؔ کے استاد جاتے ہیں"[۲]

چنانچہ شوقؔ و ذوقؔ کے انہی تعلقات کے پیش نظر مولانا آزادؔ نے استاد پرستی کے جوش میں اپنے دادا استاد اور ان کی شاعری کو مطعون کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک صابرؔ کا تعلق ہے تو ان کے بیان کا یہ حصہ کہ "مشکل زمینوں میں بیشتر گامزن اور قوافی تنگ میں اکثر گرم سخن ہے" بالکل درست ہے لیکن یہ دعوے کہ اشعار عاشقانہ دلچسپ یا تشبیہ و تمثیل ایسی کہ مذاقِ شاعری میں گوارا ہو، اس کے نتائج طبع سے کم کیا کہ مطلق مسموع نہیں ہوئے" مبالغے سے خالی نہیں۔

مؤلف خمخانۂ جاوید نے شوقؔ کی شاعری کے متعلق ایک تفصیلی بیان دیا ہے، جو ایک حد تک درست اور متوازن معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"طبع رسا اور فکر رنگین رکھتے تھے۔ استاد کی طرح سنگلاخ زمینوں میں کئی کئی غزلیں کہہ کر فصاحت کے پہاڑ کو چیر کر جواہر آبدار نکالتے ہیں۔ خداداد ذہن اور زور طبیعت سے

۱؎ آب حیات ص ۴۴۵ ۲؎ ایضاً حاشیہ ص ۴۴۵

پتھر کو پانی کر دکھاتے ہیں۔ مشاق اور باکمال شاعر تھے۔ روزمرہ، زبان اور محاورات کی اصلیت سے ماہر تھے۔ جب استاد کے طرز سے الگ ہو کر کہتے تو بیان سادگی اور سلاست سے مربوط ہوتا۔ نکتہ سنج، معنی طراز، اپنے معاصرین میں ممتاز۔ آپ کا ناتمام قلمی دیوان مؤلف کے کتب خانہ میں موجود ہے[1]۔ زمانہ حاضر کے نقاد عطف و اضافت کے بعد اعلانِ نون دیکھ کر مسکرائیں مگر زبان کا قابل قدر سرمایہ محاورات اور امثال کا خزانہ انہی زمینوں میں مدفون پائیں گے جس ایجاد کا سہرا ان کے سر ہے۔ آپ کے باندھے ہوئے محاورات میں نہ قیاسِ نحوی کو دخل ہو سکتا ہے نہ ضمیر متکلم و غائب کی جستجو کام آسکتی ہے کیونکہ عام نظر سے ان کی تصحیح محل فصاحت ہو جائے گی۔ بعض الفاظ اصل میں جمع ہیں مگر محاورہ میں مفرد ہیں۔ مثلاً ؎

لاتے ہیں بجا ہم تو اسے اے شہِ خوباں
سرکار سے اب جو کہ ہے احکام نکلتا

اسی طرح بعض الفاظ مفرد ہیں لیکن محاورہ میں جمع بولے جاتے ہیں۔ حافظ صاحب کے دیوان میں ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں اور کلام پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے ایک ماہرِ فن کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ آپ کو روزمرہ اور محاورات انتخاب کرنے کا خداداد ملکہ تھا اور انہیں صرف کرنے کا عمدہ سلیقہ۔ آپ کے فیضِ صحبت سے حضرت ذوقؔ کو یہی بات ہاتھ آگئی تھی۔

جناب شوقؔ کے کلام میں وہ تمام خصوصیتیں موجود ہیں جو اس زمانے کے شاعر کا مایہ ناز ہو سکتی ہیں مگر انتہائے سادگی میں نہ میرؔ کا درد ہے نہ دردؔ جیسا سوز و گداز۔ رعایت لفظی کا شوق کہیں کہیں کلام کو بدمزہ بھی کر دیتا ہے۔ مشکل زمینوں میں توسنِ طبع کو دوڑاتے چلے جاتے ہیں۔ قدیم خیالات ذروں کی طرح چمک اٹھتے ہیں۔ دیکھو پری رخانِ کہن کا بانکپن دکھانے میں کیا غضب ڈھاتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

گھر سے قشقہ کھینچ کے نکلے لالہ رخاں کیا صندل کا
جادو آنکھیں شوخ نگاہیں قہر ہے ڈورا کاجل کا

پرانے آدمی تھے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ محاورات و امثال کی رد و بدل کیئے

---

[1] شوقؔ کا یہ ناتمام قلمی دیوان اب غالباً لالہ سری رام کے ذخیرۂ کتب کیساتھ ہندو یونیورسٹی بنارس کی لائبریری میں موجود ہوگا۔

جلنے سے غرابتِ لفظی کا عیب پیدا ہو جاتا ہے اس لئے انہیں بجنہ نظم کر دیتے تھے۔ فرماتے ہیں ؎

ٹھہرا تُسے دل کا مجھ سے کیا زلفِ یار سودا　　اپنی تو وہ مثل ہے اک سر ہزار سودا

زبان کے بہترین نمونے ان کے کلام فصاحت نظام میں موجود ہیں[۱]۔"

سب سے پہلے شوقؔ کا ایک ایسا قطعہ ملاحظہ ہو جس میں انہوں نے اپنے استاد شاہ نصیرؔ کی شاگردی کا اعتراف کیا ہے۔ اس قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شوقؔ کے ساتھ ساتھ مومنؔ، آزردہ، غالبؔ اور ذوقؔ بھی شاہ نصیرؔ ہی سے فیضیافتہ ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

مومنؔ و آزردہ، غالبؔ، ذوقؔ، شوقؔ　　شاعری کے فن میں سب مل ایک ہیں
فیض سے جن کے ہوئے ہیں فیضیاب　　وہ نصیرؔ استاد کامل ایک ہیں[۲]

ایک دوسری جگہ استاد شاہ نصیرؔ کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

استاد نصیر اب یہ تفضل سے تمہارے
ہوتا چلا عالم میں ہے سخن عام ہمارا

شوقؔ بلا شبہ ایک مشاق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ اپنے استاد شاہ نصیرؔ کی طرح بالعموم سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ ان کی مشکل پسندی کا اندازہ ان کی اختیار کردہ حسب ذیل زمینوں سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے:۔

آہوں کا، روسیاہوں کا۔ اختر زیر پا، اکثر زیر پا، تقدیر کھینچ، تصویر کھینچ۔ آب تلخ، شراب تلخ، مہ جبیں کے پردہ پر، زمیں کے پردہ پر۔ دل دردِ زنجیر و قفل، مشکل در و زنجیر و قفل۔ اجل تین، بدل تین۔ بن میں بو، سخن میں بو۔ یار آئینہ، بار آئینہ۔ خنجر پہ آنکھ، ساغر پہ آنکھ، زنجیر میں ہے، شمشیر میں ہے۔ وغیرہ

لفظی اور معنوی صنعتوں کا استعمال دبستان شاہ نصیرؔ کی اہم اور نمایاں خصوصیت ہے چنانچہ شوقؔ کی شاعری بھی مجموعی طور پر مضمون و معنی یا جذبے کی بجائے "لفظ" کے گرد گھومتی ہے۔

---

[۱] خمخانۂ جاوید جلد پنجم ص ۷۶-۷۷

[۲] کلام شعرائے ریختہ گو (قلمی) ذخیرہ کیفی دانشگاہ پنجاب لاہور ص ۴۲

ان کے کلام میں جگہ جگہ مختلف صنعتوں کی بھرمار نظر آتی ہے۔ صرف چند اہم صنعتوں کے نمونے یہاں پیش کیئے جاتے ہیں:-

مزا بسکہ اس نے گھر گھر کے تجھ کو جانے کا
ہے بر میں شوخ ترے جامہ چار خانے کا (صنعت ایہام)

کیونکر شفا نہ ہو عرق روئے یار سے
حق میں مریضِ دل کے ہے بہتر گلاب تلخ (")

کروں تعریف کس منہ سے لب اے شیریں دہن تیری
حلاوٹ بات میں پاتا ہوں ہر دم قند مصری کی (رعایت لفظی)

اس شوخ سے جا کے خط اے قاصد تو دیجیو
چھوٹے کہیں نہ اس کی خدا انجمن میں بو (")

کعبۂ دل کو مرے ظلم سے ڈھایا تم نے
کچھ خدا کا بھی تو اپنے تمہیں ڈر نہ ہوا (صنعت تضاد)

بوسہ لوں اس کے میں لبِ شیریں کا کیونکہ شوق
ہر آن مجھ کو شوخ تو دے ہے جواب تلخ (")

ہم خار سے آنکھوں میں کھٹکتے نہ کسی کی
گر یار نہ اس یار گل اندام کے ہوتے (")

سودائی، خبطی، وحشی پکارے ہیں سب مجھے
کیا کیا رکھے ہیں اس نے مرے چن کے نام تین (سیاق الاعداد)

بوسہ جب اس کے چشم و رخ و لب کا لوگے شوق
جھک کر کروں گا آپ کو تب میں سلام تین (")

چٹ پٹ ترا بیمار ہوا تین ہی دن میں
اس واسطے اے شوخ کہیں حرف لبِ لعل تین (")

ابرو، چینِ جبیں و تلِ عدو زنجیر و قفل
مصرِ تن کے ہیں گلے میں اے دل، در و زنجیر و قفل (صنعت لف و نشر)

سیہ خیمہ نہیں استادہ ہے لیلیٰ کے مرقد پر
گھٹا سا چھا رہا ہے یہ دھواں مجنوں کی آہوں کا (حسنِ تعلیل)

لٹ دھوئیں کی ہے سر شعلہ کہاں شمع لگن
سر کے کھولے ہے کھڑی محفلِ دلدار میں بال (")

رو نگٹے پاؤں میں چبھتے ہیں نزاکت کے سبب
فرشِ مخمل پہ وہ گر دھر کے قدم رکھتا ہے (مبالغہ)

لفظ اور اس کی مختلف صورتوں پر زور صرف کرنے والے شاعر بالعموم تشبیہ اور استعارے سے بھی جا بجا کام لیتے ہیں چنانچہ شوق نے بھی عروسِ سخن کو دو چند کرنے کے لئے تشبیہ کو اکثر زیور کے طور پر استعمال کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:-

خال اس کے اب نہیں ہے رخِ آتشیں پہ شوق
آتش پہ دھر دیا ہے یہ دانہ سپند کا

چھوڑ کے عارض پہ اب زلفِ سیہ فام تو
یار دکھا دے بہم ٹک سحر و شام تو

مت سمجھ ساقی سر حباب تو اس کو حباب
جھک رہی ہے یہ کسی میخوار کی ساغر پہ آنکھ

بتاؤں سوسن میں کیا تری اس مانگ کا نقشہ
میانِ شب ہے روشن مہ جبیں یہ نہر دیتی سی

اظہار مطالب کے لئے بعض اوقات شوقؔ تمثیلی پیرایۂ بیان بھی اختیار کرتے ہیں درحقیقت مثالیہ شاعری کی بنیاد ایک طرح سے تشبیہہ پر ہی قائم ہوتی ہے لہٰذا اس کا تذکرہ یہیں تشبیہہ کے ذیل میں ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ شوقؔ کا تمثیلی رنگ کچھ اس طرح کا ہے ؎

جا پڑا اس زلف پرشب کیا ہوا پائے خیال — سانپ تاریکی میں آجاتا ہے اکثر زیر پا
اتنا تو لخت دل کو ہمارے بس اب نہ بھونتا — ہو جائے ہے جلے سے مزہ میں کباب تلخ

تشبیہات و استعارات کی طرح محاورات وضرب الامثال بھی شوقؔ کی شاعری کی جان ہیں۔ کلام کے سرسری مطالعہ سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ شوقؔ کو محاورہ بندی کا خاصا شوق ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں محاورہ برائے محاورہ بھی لاتے ہیں تاہم مجموعی طور پر ان کے محاورات یا ضرب الامثال فطری رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں ؎

مارے خوشی کے جی میں نہ پھولا سمایا قیس — آئی اسے جو ناقۂ لیلےٰ کی بن میں بُو
سرسبز باغ ان کو اب ایسا دکھایئے — اک دم میں بس ہتھیلی پہ سرسوں جمایئے
کرے جو دیدۂ پرنم سے اپنے ہم چشمی — تو پانی پانی خجالت سے ابر تر ہو جائے
ٹھہرا ہے دل کا تجھ سے کیا زلف یار سودا — اپنی تو وہ مثل ہے ایک سر ہزار سودا
کشتِ دل عاشق کی دشمن ہے یہ آہِ سرد — کیا خاک جلی کھیتی سرسبز ہو پالے کی

شوقؔ نے اپنے کلام کو بعض فارسی تراکیب سے مزین کرنے کی کوشش کی ہے اور ایک حد تک کامیاب بھی رہے ہیں ؎

عالم نہ تو ڈبو کہیں گریہ کو ضبط کر — اے چشم اشک بار بس اب تار مت لگا
بسان نقش پا کوچے سے میں ہرگز نہ اٹھوں گا — اگر تم یاں سے اب مجھ کو لگا ؤگے تو کیا ہوگا
دل کہاں رشک پری زلف گرہ گیر میں ہے — قید دیوانہ ترا خانۂ زنجیر میں ہے
کو لک مژگان چشم ستمگر آکے جگر میں کھوپ چلی — آہ کی ہمدم ساتھ ادھر سے جنگ کو اپنے دھوپ چلی

کبھی کبھی جب شوقؔ، سنگلاخ زمینوں اور مشکل پسندی کے باوجود طویل بحر میں غزل لکھتے ہیں تو ترنم اور موسیقیت کی جھنکار ان کی ہر بیت سے سنائی دینے لگتی ہے جیسے ؎

فوجِ الم سے یاں ہیں مقابل جان پر اپنی کھیلے ہیں ۔ ہجر میں تیرے آفاتیں ہم کیا کیا سر پہ جھیلے ہیں
لاکھ طرح کا عالم اپنی نظروں سے یاں گذرے ہے   سیر تماشے کو ہم جاتے اب جو میلے ٹھیلے ہیں

گذرے صبا اگر ادھر کہیو ہمارے یار کو   بھول گیا ہے دل سے کیا عاشق غمگسار کو
قطرۂ مے سے میں اگر چہ نشے میں ہوں تو کیا   جام شراب ساقیا بھر کے پلا جو ہو سو ہو

تیرے عشق میں ہوں میں جاں بلب ، مری تجھ سے ہے یہی بس طلب
ادھر آ کے گاہ تو غنچہ لب ، ذرا لب سے لب تو ملا کہیں

شوقؔ کی شاعری میں مقامی عناصر کی جھلک بھی مل جاتی ہے۔ ان کا مقامی رنگ
عبارت ہے بعض مقامی الفاظ، مقامی زبان، مقامی رسم و رواج اور مقامی زیورات و
ملبوسات سے ؎

محبت میں سنا کوہکن و وامق و مجنوں   بھائی مرے اے عشق یہ ہیں پگڑی بدل تین
کیا زلف سے گونج الجھی اس کان کے بالے کی   یا بنی پہ لڑائی ہے بچھو سے یہ کالے کی
خاکستر اب تمام بدن پر لگائیے   اس عشق میں بس آپ کو جوگی بنائیے
پڑھ کر روز سورتِ اخلاص کیجئے دم   قابو میں اپنے ان کو اسی دم سے لائیے
وعدہ کیا تھا شام کا مجھ سے شوقؔ جنہوں نے کل ان کو   آج وہ آئے پاس میرے جب ڈیڑھ پہر کی تو پ چلی

خیالات کے اعتبار سے شوقؔ کی شاعری حسن و عشق کے روایتی مضامین پر مشتمل ہے۔
کہ اس رنگ میں کوئی جدت یا اچھوتا پن نظر نہیں آتا۔ دو تین شعر دیکھتے چلئے ؎

بدنام ہوا میں تو ترے عشق میں اے یار   اور لب پہ ترے حیف مرا نام نہ آیا
جس کو دیا تم نے ہوا دشمنِ جاں وہ   افسوس زمانے میں کوئی کام نہ آیا
ہے قشقہ کھینچ کے نکلے للہ الغفار کیا صندل تھا   جادو آنکھیں شوخ نگاہیں قہر ہے ڈورا کاجل تھا

شوقؔ نے اپنے کلام میں کہیں کہیں فخر و مباہات کے راگ بھی الاپے ہیں۔ ان کی شاعرانہ
تعلی کا رنگ کچھ اس طرح کا ہے ؎

بلبلِ باغ سخن میں آج شوقؔ   ہیں مرے آگے منہ کچھ مشکل در و زنجیر و قفل

کریں تحسین سخنداں کیوں نہ ہر اک شعر پر اپنے | کہ طرزِ گفتگو ہم شوقؔ استادانہ رکھتے ہیں
کہیئے نہ کیونکہ طوطیٔ ہندآج تجھ کو شوقؔ | خسرو کی صاف نکلے ہے تیرے سخن میں بُو

شوقؔ کی زبان مجموعی طور پر قدیم ہے۔ ان کے یہاں متروکات و محذوفات کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں سے

چھوڑ کے عارض پہ اب زلفِ سیاہ فام تو | یاد دکھادے ہم تک سحر و شام تو
جھانکے ہے اس ذقن کو جو پہلو سے خوب دل | ڈرتا ہوں میں کنوئیں نہ اب جائے ڈوب دل
ابرو، چینِ جبیں دلِ، درو زنجیر دقفل | مصرِ تن کے بیٹھے ہیں سے دل، درو زنجیر دقفل

اقبال نمبر جو غالب لائبریری میں محفوظ ہیں

(۱) نئی قدریں سندھ	۶۶۹	(۱۶) نورس ڈائجسٹ کراچی	۱۹۷۱
(۲) نگار کراچی	۶۶۲	(۱۷) راوی لاہور	۱۹۷۴
(۳) صادق لاہور	۶۵۶	(۱۸) ادبی دنیا لاہور شمارہ ۳۰	
(۴) ساغر کراچی	۶۷۴	(۱۹) تحریک دہلی	۱۹۷۷
(۵) چٹان لاہور	۶۶۷	(۲۰) ماہ نو کراچی	۱۹۷۰
(۶) احساس لاہور	۶۵۱	(۲۱) سب رس حیدرآباد دکن	۱۹۳۸
(۷) ساغر کراچی	۶۷۴	(۲۲) ماہِ نو کراچی	۱۹۶۴
(۸) ادبی دنیا لاہور شمارہ ۲۴		(۲۳) مخزن لاہور	۱۹۵۱
(۹) سیارہ لاہور	۶۹۳	(۲۴) جام نو کراچی جلد ۱ شمارہ ایک دو	
(۱۰) صبا سرگودھا	۶۷۴	(۲۵) قومی زبان کراچی	۱۹۷۴
(۱۱) کتابی دنیا کراچی	۶۴۶	(۲۶) نئی قدریں سندھ	۱۹۶۳
(۱۲) جام نو کراچی	۶۶۷	(۲۷) ماہ نو کراچی	۱۹۷۱
(۱۳) اعمال کراچی	۶۷۱	(۲۸) ادبی دنیا لاہور اپریل مئی	۱۹۷۱
(۱۴) الحمرا لاہور	۶۵۲	(۲۹) اردو نئی دہلی	۱۹۳۸
(۱۵) ہمایوں لاہور	۶۵۳	مزید تفصیلات غالب لائبریری سے طلب فرمائیں	

مطالعہ غبارِ خاطر

عبدالقوی دسنوی ——— سیفیہ کالج، بھوپال۔ ہند

بھوپال سے خاص جریدہ غالب کے لئے

غبارِ خاطر اردو میں غالباً واحد کتاب ہے جس نے اپنی طباعت کی پہلی منزل سے بڑی دھوم مچائی اور شائع ہو کر جب منظرِ عام پر آئی تو ہاتھوں ہاتھ لی گئی، اور اگر تنقید و تعریض کا نشانہ بنی تو عرصہ تک لوگوں کے ذہن و دماغ پر اس کا جادو بھی چلتا رہا، اس نے قلب و نظر، عقل و شعور، گفتار و کردار اور تحریر و تقریر سب کو متاثر کیا صاحبِ دل، صاحبِ نظر، صاحبِ قلم اور صاحبِ علم سبھوں نے اس سے فیض اٹھایا اور اس کی عظمت، اس کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت کا اعتراف کیا، لیکن ایک گروہ ایسے حضرات کا بھی رہا ہے جو خط نگاری میں اسے کوئی درجہ دینا تو الگ بات ہے خطوط میں شمار کرنا بھی پسند نہیں کرتے، کسی نے اس کتاب کو مضامین کا دفتر کہا، کسی نے انشائیے کا مجموعہ قرار دیا، کسی نے خود کلامی سے تعبیر کیا، کسی نے روزنامچوں کی خصوصیات اس میں تلاش کرنے کی کوشش کی اور کسی نے اس میں خود نوشت کی خوبیاں پائیں۔

لیکن میں اس کتاب کو خطوط کا مجموعہ ہی کہوں گا صرف اس وجہ سے نہیں کہ ان میں خط کی بہت سی خوبیاں پائی جاتی ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ اس کے مصنف نے اسے خطوط کا مجموعہ ہی قرار دیا ہے اور خط ہی سمجھ کر انہیں اس وقت اپنے عزیز دوست حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام لکھے تھے جب وہ ۱۰ اگست ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۵ جون ۱۹۴۵ء تک قید و بند کی زندگی جیل میں بسر کر رہے تھے۔ ابتدا میں وہ احمد نگر کے قلعہ میں مقید رہے اور آخری ڈھائی مہینے احمد نگر قلعے سے بانکوڑہ جیل میں منتقل کر دیئے گئے تھے، اس دوران میں قید سے جو پہلا خط مولانا ابو الکلام آزاد

نے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام تحریر کیا وہ ۱۰ اگست ۱۹۴۲ء کا ہے اور آخری خط ۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ء کا ہے گویا تقسیمہ یا نیزہ ماہ مولانا آزاد نے مولانا شیروانی کے نام خطوط لکھے، باقی اکیس مہینے یعنی ۱۷ ستمبر ۱۹۴۳ء سے ۱۵ جون ۱۹۴۵ء تک انہوں نے ایک خط بھی مولانا شیروانی کو نہیں لکھا جس کی وجہ خود مولانا ابوالکلام آزاد یہ بیان کرتے ہیں ۔

"۱۰ اگست ۱۹۴۲ء سے مئی ۱۹۴۳ء تک ان مکتوب کی نگارش کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس کے بعد رک گیا، کیونکہ ۹ اپریل ۱۹۴۳ء کے حادثے کے بعد طبع درماندۂ حال بھی رک گئی تھی اور اپنی واماندگیوں میں گم تھی اگرچہ اس کے بعد بھی بعض مصنفات کی تسوید و ترتیب کا کام بدستور جاری رہا۔"[1]

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں :

"۱۹۴۵ء میں جب احمد نگر سے بانکوڑہ میں قید تبدیل کر دی گئی، طبیعت کی آمادگیوں نے آخری جواب دے دیا صرف بعض مصنفات کی تکمیل کا کام جاری رکھا جا سکا اور کسی تحریر و تسوید کی طرف طبیعت مستعد نہ ہوئی۔ آخری مکتوب جو بعض سیاسی مسائل کی نسبت ایک عزیز کے نام قلمبند ہوا تھا ۱۲ مارچ ۱۹۴۵ء کا ہے۔"

۹ اپریل ۱۹۴۳ء سے مولانا کا اشارہ اہلیہ کے انتقال کی طرف ہے معلوم نہیں مولانا نے یہ کس طرح تحریر کیا کہ "مئی ۱۹۴۳ء تک ان مکتوب کی نگارش کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس کے بعد رک گیا" حالانکہ غبار خاطر میں ۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ء تک لکھے ہوئے خطوط موجود ہیں۔ خود مولانا نے ایک سیاسی خط جو ۳ مارچ ۱۹۴۵ء کا ہے کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے علاوہ مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] غبار خاطر مرتبہ مالک رام ص ۸

کہ خط کے علاوہ "بعض مصنفات کی تسوید و ترتیب کا کام بدستور جاری رہا" تسوید و ترتیب کا یہ کام کہاں ہے اور اب تک اسے منظر عام پر کیوں نہیں لایا گیا؟ آج تک کسی نے اس پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔ مولانا کے ۲ ستمبر ۱۹۴۵ء کے خط سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے مولانا شیروانی کے علاوہ دوسروں کو بھی خطوط لکھے تھے :

"آگے چل کر بعض دیگر احباب و اعزہ کی یاد بھی سامنے آئی اور ان کی مخاطبت میں بھی گاہ گاہ طبع واماندہ حال درازنفسی کرتی رہی؟"

یہ خطوط کہاں ہیں اس کا علم بھی عام طور سے لوگوں کو نہیں ہے آگے چل کر اسی خط میں تحریر کرتے ہیں :

"مکتوب کے دو حصے کر دیئے ہیں، غیر سیاسی اور سیاسی۔ یہ مجموعہ صرف غیر سیاسی مکاتیب پر مشتمل ہے اس کے تمام مکاتیب بلا استثنا آپ کے نام لکھے گئے ہیں[1]"

اس تحریر سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا ہے کہ سیاسی خطوط مولانا شیروانی کے نام لکھے گئے یا نہیں۔ اس لئے کہ مولانا نے ایک خط میں تحریر کیا ہے کہ "میری دکان سخن میں ایک ہی طرح کی جنس نہیں رہتی، لیکن آپ کے لئے کچھ نکالتا ہوں تو احتیاط کی چھلنی میں چھان لیا کرتا ہوں کہ کسی طرح سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے[2]" حالانکہ اسی خط کے ابتدائی حصے میں یہ عبارت بھی شامل ہے "اخبار کا ہاتھ میں لینا تھا کہ تین ہفتہ پہلے کی دنیا جو ہمارے لئے معدوم ہو چکی تھی۔ پھر سامنے آ کھڑی ہوئی معلوم ہوا کہ ہمارے گرفتار ہو جانے سے ملک میں امن چین نہیں ہو گیا بلکہ ہنگاموں نے نئے غلغلے برپا کئے[3]" بہر حال مولانا کے یہ سیاسی خطوط جو الگ کر لئے گئے تھے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ حیرت ہے کہ وہ اب تک منظر عام پر کیوں نہیں

---

[1] غبارِ خاطر ص ۹ [2] غبارِ خاطر ص ۸۷ [3] غبارِ خاطر ص ۸۷

لائے گئے۔

"غبار خاطر" کی طباعت کے سلسلے میں مولانا اپنے مکتوب ۳ ستمبر ۱۹۴۵ء میں مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی کو لکھتے ہیں:

"۱۵ جون کو جب بالکوٹرہ میں رہا ہوا، تو تمام مکتوبات نکالے اور ایک فائل میں بہ ترتیب تاریخ جمع کر دیئے۔ خیال تھا کہ انہیں حسب معمول نقل کرنے کے لئے دے دوں گا، اور پھر اصل آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا، لیکن جب مولوی اجمل خاں صاحب کو ان کی موجودگی کا علم ہوا تو وہ بہت مصر ہوئے کہ انہیں بلا تاخیر اشاعت کے لئے دے دینا چاہیئے، چنانچہ ایک خوشنویس کو شملہ میں بلایا گیا اور پورا مجموعہ کتابت کے لئے دے دیا گیا، اب کتابت ہو رہی ہے اور اُمید ہے عنقریب طباعت کے لئے پریس کے حوالے کر دیا جائے گا۔"[۵۱]

اس اقتباس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ۳ ستمبر ۱۹۴۵ء تک "غبار خاطر" کی کتابت کا کام نہ صرف شروع ہو چکا تھا بلکہ اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ جلد ہی طباعت کا کام شروع ہو جائے گا اور اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا نے اس کی کتابت اور طباعت میں بہت عجلت کی۔ مولانا کے ۲۲ جون ۱۹۴۵ء کے خط سے جو رہائی کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد انہوں نے مولانا غلام رسول مہر کو لکھا تھا محسوس ہوتا ہے کہ رہائی کے بعد پہلی فکر انہیں غبار خاطر کی طباعت کی ہوئی۔ لکھتے ہیں:

"زندہ ہوں اور پھر دنیا میں واپس آ گیا ہوں، معلوم نہیں جو کچھ دیکھ رہا تھا خواب تھا یا جو کچھ دیکھ رہا ہوں خواب ہے[۵۲]....

یہ خط ایک خاص ضرورت سے لکھ رہا ہوں۔ مرادآباد کے ایک خوشنویس عبدالقیوم ہیں اور معلوم ہوا ہے وہاں کوئی "زمزم پریس"

---

۵۱ غبار خاطر۔ ص ۹۔ ۵۲ غبار خاطر مرتبہ مالک رام ص ۹ پر یہ عبارت ملاحظہ کیجیئے: "حیران ہوں کہ جو کچھ گذر چکا وہ خواب تھا یا جو کچھ گذر رہا ہے وہ خواب ہے۔"

ہے وہاں مقیم ہیں۔ انہیں میرا یہ پیغام پہنچا دیجیے کہ مجھے تھوڑا سا کام ان سے فوراً لینا ہے...... یہ بات صاف کر دیجیے گا کہ سرت "ترجمان" کے لئے نہیں بلا رہا ہوں۔ بعض مختصر چیزیں ہیں جو انہیں دینی ہیں۔ مجھ سے مل کر کام کی نوعیت سمجھ لیں[۱]....."

اس خط سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نے غبار خاطر کی اشاعت کو بالکل راز میں رکھا اور مولانا غلام رسول مہر کو بھی اس کی طرف کسی قسم کا اشارہ نہیں کیا ہے شملہ سے ۲۶ جون ۱۹۴۵ء کو پھر لکھتے ہیں:

"بمبئی سے ایک خط لکھ چکا ہوں اسی سلسلہ میں اب پھر لکھ رہا ہوں، منشی عبدالقیوم مراد آبادی کو میں نے دہلی بلایا تھا لیکن چونکہ یہاں قیام کی مدت بڑھ گئی ہے اس لئے وہ یہیں آ کر مجھ سے مل لیں[۲]۔"

۲۷ جون ۱۹۴۵ء کو شملہ سے پھر لکھتے ہیں:

خط لکھ چکا تھا کہ آپ کا خط ملا، منشی عبدالقیوم اگر مراد آباد میں ہیں تو شاید وہ شملہ آ کر نہ مل سکیں۔ بہرحال "زمزم" سے ان کا پتہ دریافت کر کے مجھے لکھ دیجیے تاکہ جونہی موقع ملے انہیں بلوالوں[۳]"

پہلی جولائی ۱۹۴۵ء کو لکھتے ہیں:

"منشی عبدالقیوم کو یہیں بلا رہا ہوں[۴]"

۱۶ اکتوبر ۱۹۴۵ء کے خط میں "غبار خاطر" کا نام غالباً پہلی بار آیا ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"غبار خاطر" کی کاپیوں میں معمولی غلطیاں رہ گئی ہوں گی۔ انہیں درست کر دیجیے[۵]"

---

[۱] نقش آزاد ص [۲] نقش آزاد ص ۱۸۳۔ [۳] نقش آزاد۔ [۴] نقش آزاد ص ۔ ۱۸۴، [۵] نقش آزاد ص ۱۸۵۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو لکھتے ہیں :

"غبار خاطر" پانچ ہزار ایک سو کی تعداد میں چھپیگی، اس غرض سے کہ کچھ کاغذ ردی ہو جاتے ہیں[۱] "

۴ جنوری ۱۹۴۶ء کی تحریر ملاحظہ کیجئے :

کلکتہ سے ایک رجسٹرڈ خط مع مسودات بھیج چکا ہوں آپ کی خاموشی تعجب انگیز ہے کچھ معلوم نہیں کہ "غبار خاطر" کی کاپیاں چھپی یا نہیں ہے میں نے آپ پر اعتماد کیا تھا، امید ہے کہ آپ کی جانب سے دانستہ تغافل عمل میں نہیں آئے گا۔ مجھے بلا تاخیر صورت حال سے مطلع کیجئے[۲] "

۲۰ جنوری ۱۹۴۶ء کو لکھتے ہیں :

"غبار خاطر کا بہت تھوڑا حصہ باقی ہے مطمئن رہیئے، بقیہ کاپیاں جلد پہنچ جائیں گی[۳] "

۱۷ اپریل ۱۹۴۶ء کے تار سے معلوم ہوتا ہے کہ غبار خاطر کی اشاعت مکمل ہو گئی تار کا ترجمہ یہ ہے۔

"مہربانی فرما کر غبار خاطر کا مکمل نسخہ بھیجئے[۴] "

مندرجہ بالا اقتباسات "غبار خاطر" کی اشاعت سے مولانا کی جس دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اسے جلد سے جلد منظرِ عام پر لانے کے لئے بہت بے چین تھے۔

"غبار خاطر" میں جو خطوط شائع ہوئے ہیں ان کی ماہانہ تعداد حسب ذیل ہے جن کا جائزہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

---

[۱] نقش آزاد ص ۱۸۷۔ [۲] نقش آزاد ص ۱۹۰۔ [۳] نقش آزاد ص ۱۹۰۔ [۴]
مالک رام صاحب تحریر کرتے ہیں کہ "غبار خاطر" پہلی مرتبہ مئی ۱۹۴۶ء میں چھپی تھی۔ مقدمہ غبار خاطر ص ۲۱

اگست	۱۹۴۲ء	چھ خط	مارچ	۱۹۴۳ء	تین خط
ستمبر	۱۹۴۲ء	× ×	اپریل	۱۹۴۳ء	ایک خط
اکتوبر	۱۹۴۲ء	تین خط	مئی	۱۹۴۳ء	× ×
نومبر	۱۹۴۲ء	× ×	جون	۱۹۴۳ء	دو خط
دسمبر	۱۹۴۲ء	دو خط	جولائی	۱۹۴۳ء	× ×
جنوری	۱۹۴۳ء	دو خط	اگست	۱۹۴۳ء	× ×
فروری	۱۹۴۳ء	× ×	ستمبر	۱۹۴۳ء	ایک خط

گویا گرفتاری کے دوران میں مولانا حبیب الرحمٰن کے نام کل بیس خط لکھے گئے جو غبارِ خاطر میں شائع ہوئے۔ ایک خط گرفتاری سے پہلے اور تین خط گرفتاری کے بعد کے بھی شامل کر لئے گئے ہیں، اس لئے غبارِ خاطر میں کل خطوط کی تعداد ۲۴ ہوئی۔

اس طرح ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ۱۳ مہینے میں کل سات مہینوں میں مولانا نے خطوط لکھے اور باقی چھ مہینوں میں ایک بھی خط نہیں لکھ سکے (ممکن ہے کہ ان مہینوں میں مولانا نے جو خطوط لکھے ہوں انہیں غبارِ خاطر میں شامل کرنا پسند نہ کیا ہو، یا دوسروں کے نام ہوں) ان خطوط میں سب سے زیادہ طویل خط مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ء کا ہے۔ جو سب سے آخر میں ہے اور جو ۴۴ صفحات (غبارِ خاطر مرتبہ مالک رام) پر مشتمل ہے باقی خطوط کی طوالت زیادہ سے زیادہ بیس[1] صفحے اور کم سے کم ۲ صفحے ہے۔ پہلے تین خط جو رہائی کے بعد ۱۹۴۵ء میں لکھے گئے تھے "کاروانِ خیال"[1] کے ساتھ میں بھی شامل ہیں لیکن ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ [illegible]

کے [illegible]

بیلار صاحب[1] مولانا آزاد لکھتے ہیں: دو بجے ہم احمد نگر پہنچے اور پندرہ منٹ کے بعد قلعہ کے اندر محبوس تھے اب اس ... اس دنیا میں جو قلعہ کے اندر تھی برسوں کی مسافت حائل ہو گئی۔ غبارِ خاطر مرتبہ مالک رام ص ۲۷

---

[1] کاروانِ خیال مدینہ پریس بجنور

ہے خود مولانا آزاد نے یا ناقل نے یا کاتب نے اس کا علم اب تک نہیں
ہو سکا ہے اور نہ اس کی وجہ معلوم ہو سکی ہے۔ یہ سارے خطوط جو قید کے دوران
میں لکھے گئے ہیں ان میں مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کو ہمیشہ صدیق مکرم
سے مخاطب کیا گیا ہے۔

"کاروانِ خیال"[1] میں سوائے پہلے خط کے جو ۴ ستمبر ۱۹۴۰ء کا لکھا ہوا ہے
مولانا نے "صدیقی العزیز" سے خطاب کیا ہے۔ غالباً مولانا "صدیق مکرم" صرف
مولانا شیروانی کو لکھتے تھے اسی لئے انہوں نے ۲ ستمبر ۱۹۴۵ء کے خط میں
مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کو تحریر کیا ہے:

"شملہ میں اخبار "مدینہ" بجنور کے اڈیٹر صاحب آئے تھے۔
انہوں نے مولوی اجمل خاں صاحب سے اس سلسلے کے پہلے مکتوب کی نقل
لے لی تھی وہ اخبارات میں شائع ہو گیا۔ شاید آپ کی نظر سے گزرا ہو۔
"صدیق مکرم" کے تخاطب سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ روئے
سخن آپ ہی کی طرف تھا۔[2]

"غبار خاطر" کی اشاعت جس طرح سے ہوئی اس نے کچھ لوگوں کو اس شبہ
میں ڈال دیا کہ دراصل مولانا آزاد نے ان خطوط کو اسی غرض سے لکھا تھا کہ رہائی کے
بعد انہیں کتابی صورت میں پیش کیا جائے گا۔ یہ کتاب گویا ان کی قید کی زندگی کا تحفہ
ہوئی۔ یہ شکوک بہت حد تک درست بھی معلوم ہوتے ہیں۔ خطوط کا مکتوب الیہ کی
نظر سے اشاعت سے پہلے نہ گزرنا، اشاعت میں عجلت سے کام لینا، پھر ابتدا
جن کا جا بجا [illegible] بعض خطوط میں طوالت، بعض خطوط میں مقالے کا رنگ،

---

[1] نقش آزاد ص ۱۸۷۔ [2] نقش آزاد ص ۱۹۰۔ [3] نقش آزاد ص [illegible] کی طرف
مالک رام صاحب تحریر کرتے ہیں کہ "غبار خاطر" پہلی مرتبہ [illegible] ۱۹۴۶ء میں چھپ [illegible]

کھینچتے ہیں۔ چنانچہ عام قصّہ اس کتاب کو مجموعۂ خطوط کہنے کے خلاف ہو گئی۔

لیکن اگر ہم بغور جائزہ لیں تو جہاں تک مکتوب نگار کی شخصیت کی بھرپور جلوہ گری کے مقابلے میں مکتوب الیہ کی شخصیت کی دھندلی پرچھائیں کا تعلق ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ یہ خطوط ایک ایسی جگہ بیٹھ کر لکھے گئے ہیں جہاں سے باہر کی دنیا کے تعلقات بالکل منقطع ہو گئے تھے[1] اور وقت کی فراوانی تھی، ماحول میں ایک گونہ سکون بھی تھا پھر یہ بھی یقین تھا کہ خطوط ابھی مکتوب الیہ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ اس لئے انہیں اسباب کی بنا پر یہ خطوط ایک طرفہ ہوتے چلے گئے اور خود کلامی کی سرحدوں میں داخل ہو گئے جس کی وجہ سے اکثر خطوط طویل ہو گئے ہیں۔

یہ بات سچ ہے کہ مولانا آزاد کے چند خطوط طویل ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا کوئی خط اس قدر طویل نہیں ہے جتنے کچھ خطوط "غبار خاطر" میں ہیں۔ پھر بھی یہ کہنا ناانصافی کی بات ہوگی کہ مولانا آزاد نے یہ خطوط محض اس لئے لکھے تھے کہ رہائی کے بعد دنیائے ادب کو قید فرنگ کا ایک عظیم تحفہ پیش کر سکیں گے۔

اگر مولانا آزاد کی تحفہ دینے ہی کی خواہش ہوتی تو پھر خط ہی کی صورت میں انہیں تحفہ دینے کے لئے کون مجبور کرتا۔ کسی اور صورت میں وہ بھی تحفہ دے سکتے تھے اور اس کی ضخامت میں بھی کافی اضافہ کر سکتے تھے بلکہ کئی جلدوں میں اسے پیش کر سکتے تھے کون ہوتا جو ان کا ہاتھ پکڑتا کہ اس کی طوالت اس سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے۔

بہرحال غبار خاطر کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا کے ان خطوط میں زبان کی سلاست، خیال کی پاکیزگی، انداز کی ندرت اور بے ساختگی کی جلوہ گری کے ساتھ

---

[1] مولانا آزاد لکھتے ہیں "دو بجے ہم احمد نگر پہنچے اور پندرہ منٹ کے بعد قلعہ کے اندر محسوس تھے اب اس دنیا میں جو قلعہ کے باہر تھی اور اس دنیا میں جو قلعہ کے اندر تھی برسوں کی مسافت حائل ہو گئی" غبار خاطر مرتبہ مالک رام ص ۷"

ساتھ مکتوب الیہ سے بڑی قربت اور اپنائیت پائی جاتی ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے اور مکتوب الیہ سے مکتوب نگار کے تعلق کا اندازہ لگایئے :

" رہی صبح چار بجے کا وقت ہے چائے سامنے دھری ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کو مخاطب تصور کروں اور لکھوں مگر لکھوں تو کیا لکھوں ؟ مرزا غالب نے رنج گراں نشیں کی حکایتیں لکھی تھیں، صبر گریزپا کی شکایتیں کی تھیں :

کبھی حکایت رنج گراں نشیں لکھیے
کبھی شکایت صبر گریزپا لکھیے[1]

لیکن یہاں نہ رنج کی گراں نشینیاں ہیں کہ لکھوں، نہ صبر کی گریزپائیاں ہیں کہ سناؤں، رنج کی جگہ صبر کی گراں نشینیوں کا خوگر ہو چکا ہوں۔ صبر کی جگہ رنج کی گریزپائیوں کا تماشائی رہتا ہوں ....[2]"

" اگر آپ مجھے اس عالم میں دیکھیں تو خیال کریں میری پچھلی زندگی مجھے قید خانے کے دروازے تک پہنچا کر واپس چلی گئی اور اب ایک دوسری زندگی سے سابقہ پڑا ہے[3]۔"

" آپ کہیں گے قید خانہ کی زندگی رواقیت کے لئے موزوں ہوئی[4]"

" لیکن میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ انسان کا اصل عیش[5]..."

" غور کیجئے تو یہ ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہے[6]۔"

" .... لیکن اگر دل زندہ پہلو میں نہ ہو تو نظارا !!
اس کا بدل کہاں ڈھونڈھیں[7]؟"

" میں آپ کو بتلاؤں اس راہ میں میری کامرانیوں کا ...

---

[1] دیوان غالب میں یہ شعر اس طرح ہے ۔ کبھی شکایت رنج گراں نشیں کیجے / کبھی حکایت صبر گریزپا کیجے

[2] غبار خاطر ص ۵۵ ۔ [3] غبار خاطر ۶۶ ۔ [4] غبار خاطر ص ۶۸ ۔ [5] غبار خاطر ص ۶۸ ۔

[6] غبار خاطر ص ۶۸ ۔ [7] غبار خاطر ص ۷۰ ۔

کیا ہے[۱]۔

"آپ کو معلوم ہے کہ میں چائے کے لئے روسی فنجان کام میں لاتا ہوں[۲]..."

"آپ کو معلوم ہے میں ہمیشہ صبح تین چار بجے اٹھتا ہوں اور چائے کے پیہم فنجانوں سے جام صبوحی کا کام لیتا ہوں[۳]۔"

"اگر آپ نے یہاں ہر حال میں خوش رہنے کا ہنر سیکھ لیا ہے تو یقین کیجئے کہ زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا ہے[۴]۔"

"جانتا ہوں کہ میری صدائیں آپ تک نہیں پہنچ سکیں گی تاہم طبع نالہ سنج کو کیا کروں کہ فریاد و شیون کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آپ سن رہے ہوں یا نہیں سن رہے ہوں میرے ذوق مخاطبت کے لئے یہ خیال بس کرتا ہے کہ روئے سخن آپ کی طرف ہے[۵]۔"

"میں نے جو خط انسپکٹر جنرل کو لکھا تھا وہ اس نے گورنمنٹ کو بھیج دیا تھا کل اس کا جواب ملا[۶]۔"

"مگر مجھے یہ قصہ یہاں نہیں چھیڑنا چاہیئے، میری آپ کی مجلس آرائی اس افسانہ سرائی کے لئے نہیں ہوا کرتی[۷]..."

"آج غالباً صبح عید ہے، عید کی تبریک آپ تک پہنچا نہیں سکتا البتہ آپ کو مخاطب تصور کر کے صفحۂ کاغذ پر نقش کر سکتا ہوں[۸]..."

"غور فرمائیے کیا عمدہ مثال دی ہے، آپ نے اکثر بے فصل کے میوے کھائے ہوں گے مثلاً جاڑے میں آم چونکہ بے فصل کی چیز ہوتی ہے، نایاب اور تحفہ سمجھی جاتی ہے لوگ بڑی بڑی قیمتیں دے کر خریدتے ہیں اور دوستوں کو بطور تحفہ کے

---

۱ غبار خاطر ص ۷۰۔ ۲ غبار خاطر ص ۷۱۔ ۳ غبار خاطر ص ۷۱۔ ۴ غبار خاطر ص ۷۲۔ ۵ غبار خاطر ص ۷۷۔ ۶ غبار خاطر ص ۸۶۔ ۷ غبار خاطر ص ۸۷۔ ۸ غبار خاطر ص ۸۹۔

بھیجتے ہیں....[۱]"

"صبح کے ساڑھے چار بجے ہیں اس وقت لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو معلوم ہوا سیاہی ختم ہو رہی ہے۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ سیاہی کی شیشی خالی ہو چکی تھی، نئی شیشی منگوانی تھی، مگر منگوانا بھول گیا، میں نے سونچا تھوڑا سا پانی کیوں نہ ڈال دوں؟ یکایک چائے دانی پر نظر پڑی، میں نے تھوڑی چائے فنجان میں انڈیلی اور قلم کا منہ اس میں ڈبو کر پچکاری دی، پھر اسے اچھی طرح ہلایا کہ روشنائی کی دھوون پوری طرح نکل آئے اور اب دیکھئے روشنائی کی جگہ چائے کے تند و تیز گرم عرق سے اپنے نفسہائے سرد صفحۂ قرطاس پر نقش کر رہا ہوں[۲]۔

"آپ اس طریقہ کار پر متعجب نہ ہوں....[۳]"

امید ہے کہ آپ کی عنبریں چائے کا ذخیرہ جس کا ایک مرتبہ رمضان میں آپ نے ذکر کیا تھا اس نایابی کی گزند سے محفوظ ہوگا[۴]۔"

"اس علاقہ میں عام طور پر سردی بہت ہلکی ہوتی ہے معلوم نہیں کبھی اس طرف بھی آپ کا گزر ہوا ہے، تو کس موسم میں! لیکن پونا تو آپ بارہا گئے ہوں گے۔ دسمبر ۱۹۱۵ء کا سفر مجھے یاد ہے۔ جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے موقع پر آپ سے وہاں ملاقات ہوئی تھی[۵]۔"

"میں آپ کو بتلاؤں میرے تخیل میں عیش زندگی کا سب سے

---

[۱] غبار خاطر ص ۹۰۔ [۲] غبار خاطر ص ۱۰۶۔ [۳] غبار خاطر ص ۱۰۶۔ [۴] غبار خاطر ص ۱۵۲

[۵] غبار خاطر ص ۱۷۲۔

بہتر تصور کیا ہو سکتا ہے[1]۔"

"یہاں تک لکھ چکا تھا کہ خیال ہوا تمہید میں گیارہ صفحے سیاہ ہو گئے اور ابھی تک حرف مدعا زبان قلم پر نہیں آیا، تازہ ترین واقعہ یہ ہے کہ ایک ماہ کی محرومی اور انتظار کے بعد پرسوں چینہ خاں نے مژدہ کامرانی سنایا کہ بمبئی کے آرمی اینڈ نیوی اسٹور نے وہائٹ جیسمین چائے کہیں سے ڈھونڈ ھ نکالی ہے اور ایک پونڈ کا پارسل وی پی کر دیا ہے[2]۔"

"حسن اتفاق دیکھئے کہ ادھر یہ پارسل پہنچا ادھر بمبئی سے بعض دوستوں نے بھی چند ڈبے چینی دوستوں سے لے کر بھجوا دیئے[3]۔"

"اس وقت خیال ہوا ایک فصل آپ کو سنا دوں[4]....."

"دیکھئے سمند فکر کی وحشت خرامی بار بار جادۂ سخن سے ہٹنا چاہتی ہے اور میں چونک چونک کر باگ کھینچنے لگتا ہوں[5]....."

"پھر خیال ہوا قلم اٹھاؤں اور کچھ دیر آپ سے باتیں کر کے جی کا بوجھ ہلکا کروں[6]۔"

"آپ باور کریں یا نہ کریں مگر یہ واقعہ ہے کہ عالم میں بارہا میں نے بر جیوں سے باتیں کی ہیں اور جب کبھی تاج کے گنبد خاموش کی طرف نظر اٹھائی ہے تو اس کے لبوں کو ہلتا ہوا پایا ہے[7]۔"

"اس زمانے کے کچھ عرصہ بعد لکھنؤ جانے اور کئی ماہ تک ٹھہرنے

---

۱ غبار خاطر ص ۱۷۲ ۔ ۲ غبار خاطر ص ۱۷۷ ۔ ۳ غبار خاطر ص ۱۷۷ ۔ ۴ غبار خاطر ص ۱۸۹ ۔
۵ غبار خاطر ص ۱۹۶ ۔ ۶ غبار خاطر ص ۲۳۴ ۔ ۷ غبار خاطر ص ۲۵۹ ۔

کا اتفاق ہوا، آپ بھولے نہ ہوں گے سب سے پہلے آپ سے وہیں ملاقات ہوئی تھی، آپ نے قلمی کتابوں کے تاجر عبدالحسین سے کلیات صائب کا ایک نسخہ خریدا تھا اور مجھے یہ کہہ کر دکھایا تھا کہ قلمی کتابوں کا بھی آپ کو کچھ شوق لگتا ہے"۔

"دیکھئے بات کیا کہنی چاہتا تھا اور کہاں سے کہاں جا پڑا؟ اب لکھنے کے بعد صفحوں پر نمبر لگائے تو معلوم ہوا کہ فل اسکیپ کے چھبیس صفحے سیاہ ہو چکے ہیں۔ بہرحال اب قلم روکتا ہوں"[۲]

اس طرح اور بھی بہت سے اقتباسات پیش کئے جا سکتے ہیں جن میں خطوں کا رنگ ڈھنگ اور مزاج ملتا ہے اور جو غبارِ خاطر کو خطوط کی سرحدوں میں داخل کرنے میں مدد کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی درست ہے کہ خط نمبر ۱۲ اور ۱۳ میں سوائے ابتدائی چند جملوں کے خط کی کیفیت نہیں بلکہ مضمون کی فضا پائی جاتی ہے۔ خط نمبر ۱۴ میں "صدیق مکرم" کے سوا باقی تمام حصہ "صلیبی جنگ" سے متعلق ہے۔ خط نمبر ۱۷ کا بھی یہی حال ہے۔ اس میں بھی "صدیق مکرم" کے علاوہ ایک طویل بحث انانیتی ادب سے متعلق ہے۔

آٹھ خط یعنی خط نمبر ۹ اور آخری سات خط ایسے ہیں جن کے آخر میں مولانا نے اپنا نام بھی نہیں لکھا ہے۔

یہ تمام باتیں اگرچہ اچھے خطوط کے لئے عیب ہیں لیکن پھر بھی انہیں خطوط میں شمار کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ خطوط کا طویل ہونا یا مختصر ہونا۔ یا اُن میں مضمون کا رنگ پیدا ہونا، حالات، مزاج کی کیفیت اور مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے باہمی رشتے پر منحصر ہے۔ ظاہر ہے کہ مولانا احمد نگر میں قید تھے اور وقت کی فراوانی تھی، جلد جواب آنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ پھر مخاطب مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی

---

[۱] غبارِ خاطر ص ۵۹ ۔ [۲] غبارِ خاطر ص ۲۸۳

جیسے سنجیدہ اور عمر میں بڑے عالم۔ ان حالات میں خطوط میں سنجیدگی بھی آئی اور طوالت بھی۔ مزاج میں یک رنگی بھی آئی اور اظہار میں یکسانیت بھی اس لئے اکثر خطوط نے مضمون کا انداز اختیار کر لیا خطوط کے آنے جانے کا سلسلہ ہوتا تو لب و لہجہ اور انداز میں یقیناً تبدیلی پیدا ہو جاتی چونکہ مولانا قید فرنگ میں ڈال دیئے گئے تھے اور خط و کتابت پر پابندی لگا دی گئی تھی اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ پابندی کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ اس لئے خط لکھتے وقت یقیناً مولانا کے ذہن میں یہ بات ہوگی کہ جیسے ہی پابندی ہٹا دی جائے گی وہ یہ خطوط مولانا شیروانی کی خدمت میں بھیج دیں گے لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ پورے زمانہ قید میں اس کا موقع نہیں آیا۔

بعض ناقدین اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ غبار خاطر کو خطوط کا مجموعہ اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے بعض خطوط طویل ہیں اور مضمون کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خط نگاری میں طوالت یا اختصار کی کوئی قید لگائی گئی ہے؟ کیا وہ خطوط جن میں مضمون کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے خط کہلانے کے مستحق نہیں ہوتے اور کیا مولانا نے اس سے پہلے طویل خطوط نہیں لکھے ہیں؟ تو جواب اس کے سوا کیا دیا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی کوئی قید یا پابندی نہیں لگائی گئی ہے اور مولانا نے ان خطوط سے پہلے بھی طویل خطوط لکھے ہیں۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ چونکہ یہ خطوط مولانا شیروانی تک نہیں پہنچ سکے اور مولانا کو اس کا علم تھا کہ یہ مکتوب الیہ تک نہیں پہنچیں گے اس لئے انہیں خطوط میں شمار نہیں کرنا چاہیے کیا وہ خطوط جو مکتوب الیہ تک کسی سبب سے نہیں پہنچ سکتے خط کہلانے کے مستحق نہیں ہوتے اور اگر قید فرنگ کی سختی میں کمی پیدا ہو جاتی اور مولانا تمام خطوط جو اس وقت تک لکھ چکے تھے مولانا شیروانی کی خدمت میں بھیج دیتے تو کیا ہم انہیں خطوط مان لیتے؟ جب ہم ان باتوں کا

ٹھنڈے دل سے جائزہ لیتے ہیں تو غبار خاطر کو خطوط کا مجموعہ کہنے میں ہم کو کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔

بہر حال مولانا آزاد کے خطوط کا مجموعہ غبار خاطر ان کی زندگی میں ان کی آخری کتاب ہے جو انہوں نے خود بڑی دلچسپی اور اہتمام کے ساتھ شائع کرائی ہے اور جو ہر اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ہمیں مولانا آزاد ان کا انداز فکر، ان کی زندگی کے مختلف حادثات اور واقعات، ان کے اثرات زندگی پر، ان کا بچپنا، ان کی جوانی، ان کے شب و روز، ان کے مشاغل ان کی دلچسپیاں، ان کے تجربات، ان کے احساسات، ان کے خیالات، اُن کی خوشیاں، ان کی رنجشیں، ان کی پسند، ان کی ناپسند، ان کی رغبت، ان کی نفرت، ان کے عزائم، ان کے حوصلے کا نہ صرف بخوبی اندازہ ہوتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو حرف بہ حرف صحیح ہوگا کہ یہ واحد کتاب ہے جس سے مولانا آزاد کی زندگی کی دھوپ چھاؤں سے ہمیں اچھی طرح آگاہی ہوتی ہے اور چونکہ یہ کتاب مولانا کی پختہ عمر کی یادگار ہے اس لئے ان کی پختگی کی جھلک ان تحریر اور اس کی تاثیر دونوں میں نظر آتی ہے۔

"غبار خاطر" میں مولانا کی زندگی کے بہت سے واقعات اور حالات جو آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے ان کے قلم سے بے اختیار ٹپک پڑے ہیں ان کے خاندانی اور ابتدائی ماحول کے بارے میں ان سے زیادہ اس انداز میں کہاں سے علم حاصل ہو سکتا ہے۔

> "میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو علم و مشیخت کی بزرگی اور مرجعیت رکھتا تھا اس لئے خلقت کا جو ہجوم و احترام آجکل سیاسی لیڈری کے عروج کا کمال مرتبہ سمجھا جاتا ہے وہ مجھے مذہبی عقیدت مندیوں کی شکل میں بغیر طلب و سعی کے مل گیا تھا میں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ لوگ پیرزادہ سمجھ کر میرے ہاتھ

پاؤں چومتے تھے اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے رہتے تھے۔ خاندانی پیشوائی، مشیخت کی اس حالت میں نو عمر طبیعتوں کے لئے بڑی ہی آزمائش ہوتی ہے۔ اکثر حالتوں میں ایسا ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے طبیعتیں بر خود غلط ہو جاتی ہیں اور نسلی غرور اور پیدائشی خود پرستی کا وہی روگ لگ جاتا ہے جو خاندانی امیر زادوں کی تباہی کا باعث ہوا کرتا ہے ممکن ہے اس کے کچھ نہ کچھ اثرات میرے حصے میں بھی آئے ہوں گے۔[1]"

"لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشے میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں، کلکتہ میں آپ نے ڈلہوزی اسکوائر ضرور دیکھا ہوگا۔ جنرل پوسٹ آفس کے سامنے واقع ہے اسے عام طور پر لال ڈگی کہا کرتے تھے۔ اس میں درختوں کا ایک جھنڈ تھا کہ باہر سے دیکھئے تو درخت ہی درخت ہیں، اندر جائیے تو اچھی خاصی جگہ ہے اور ایک بنچ بھی بچھی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں اب بھی یہ جھنڈ ہے کہ نہیں میں جب سیر کرنے نکلتا تو کتاب ساتھ لے جاتا اور اس جھنڈ کے اندر بیٹھ کر مطالعہ میں غرق ہو جاتا۔ والد مرحوم کے خادم خاص حافظ ولی اللہ مرحوم ساتھ ہوا کرتے تھے وہ باہر ٹہلتے رہتے اور جھنجھلا جھنجھلا کر کہتے: "اگر تجھے کتاب ہی پڑھنی تھی تو گھر سے نکلا کیوں؟" یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور ان کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔ دریا کے کنارے ایڈن گارڈن میں بھی اس طرح کے کئی جھنڈ تھے۔ ایک جھنڈ جو برسی پگوڈا کے پاس مصنوعی نہر کے کنارے

---

[1] غبار خاطر ص ۸۱۔

تھا اور شاید اب بھی ہو میں نے چن لیا تھا، اکثر سہ پہر کے وقت کتاب لے کر نکل جاتا اور شام تک اس کے اندر گم رہتا اب وہ زمانہ یاد آجاتا ہے تو دل کا عجیب حال ہوتا ہے[1]۔

" زندگی کے ابھی پندرہ برس پورے نہیں ہوئے تھے کہ طبیعت نئی خلشوں اور نئی جستجوؤں سے آشنا ہوگئی تھی اور موروثی عقائد جس شکل و صورت میں سامنے آکھڑے ہوئے تھے ان پر مطمئن ہونے سے انکار کرنے لگی تھی۔ پہلے اسلام کے اندرونی مذاہب کے اختلافات سامنے آئے اور ان کے متعارض دعووں اور متصادم فیصلوں نے حیران و سرگشتہ کر دیا، پھر جب کچھ قدم آگے بڑھے، تو خود نفسِ مذہب کی عالمگیر نزاعیں سامنے آگئیں اور انہوں نے حیرانگی کو شک تک اور شک کو انکار تک پہنچا دیا[2]۔

" میں نے ہوش سنبھالتے ہی ایسے بزرگوں کو اپنے سامنے پایا جو عقائد اور افکار میں اپنا ایک خاص مسلک رکھتے تھے اور اس میں اس درجہ سخت اور بے لچک تھے کہ بال برابر بھی ادھر اُدھر ہونا کفر و زندقہ تصور کرتے تھے میں نے بچپن سے اپنے خاندان کی جو روایتیں سنیں وہ بھی سرتاسر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں اور میرا دماغی ورثہ اس تصلب اور جمود سے بوجھل تھا میری تعلیم ایسی گرد و پیش میں ہوئی جو چاروں طرف سے قدامت اور تقلید کی چار دیواری میں گھرا ہوا تھا اور باہر کی مختلف ہواؤں کا وہاں تک گذر ہی نہ تھا۔ والد مرحوم کے علاوہ جن اساتذہ سے تحصیل کا اتفاق ہوا، وہ بھی وہی تھے جنہیں والد مرحوم نے پہلے اچھی طرح ٹھونک بجا کے دیکھ لیا تھا کہ ان کے معیارِ عقائد

---

[1] غبار خاطر ص ۸۰ - [2] غبار خاطر ص ۹۶

فکر پر پورے پورے اتر سکتے ہیں اور یہ معیار اس درجہ تنگ اور سخت تھا کہ ان کے معاصرین میں سے خال خال اشخاص ہی کی وہاں تک رسائی ہو سکتی تھی، پس ظاہر ہے کہ اس دروازے سے بھی کسی نئی ہوا کے گزرنے کا امکان نہ تھا۔ جہاں تک زمانے کے فکری انقلابات کا تعلق ہے میرے خاندان کی دنیا وقت کی راہوں سے اس درجہ دور واقع ہوئی تھی کہ ان راہوں کی کوئی صدا وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی اور اس اعتبار سے گویا برسوں پہلے کے ہندوستان میں زندگی بسر کر رہا تھا[1]۔۔۔"

"انگریزی تعلیم کی ضرورت کا تو یہاں کسی کو وہم و گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا لیکن کم از کم یہ تو ہو سکتا تھا کہ قدیم تعلیم کے مدرسوں میں سے کسی مدرسہ سے واسطہ پڑتا۔ مدرسہ کی تعلیمی زندگی گھر کی چار دیواری کے گوشۂ تنگ سے زیادہ وسعت رکھتی ہے اور اس لئے طبیعت کو کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقع مل جاتا ہے لیکن والد مرحوم یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ کلکتہ کے سرکاری مدرسہ عالیہ کی تعلیم ان کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی اور فی الحقیقت قابل وقعت تھی بھی نہیں اور کلکتہ سے باہر بھیجنا انہیں گوارا نہ تھا۔ انہوں نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ خود تعلیم دیں یا بعض اساتذہ کے قیام کا انتظام کر کے ان سے تعلیم دلائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں تک تعلیمی زمانہ کا تعلق ہے گھر کی چار دیواری سے باہر قدم نکالنے کا موقع ملا ہی نہیں[2]"

"میری عمر کا وہ زمانہ جسے باقاعدہ طالب علمی کا زمانہ کہا جا سکتا

---

[1] غبار خاطر ص ۹۵ — [2] غبار خاطر ص ۹۶۔

ہے وہ چودہ پندرہ برس کی عمر سے آگے نہیں بڑھا"[۱]

"تعلیم کی جو رفتار عام طور پر رہا کرتی ہے میرا معاملہ اس سے مختلف رہا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۰۰ء میں جب میری عمر بارہ تیرہ برس سے زیادہ نہ تھی، میں فارسی کی تعلیم سے فارغ اور عربی کی مبادیات سے گزر چکا تھا"[۲]

"... . اساتذہ میری تیز رفتاری سے پہلے جھنجھلاتے، پھر پریشان ہوتے، پھر مہربان ہو کر جرأت افزائی کرنے لگتے۔ جب کسی کتاب کا نیا دور شروع ہوتا، تو باہر کے چند طلبا بھی شریک ہو جاتے۔ لیکن ابھی چند دن بھی گزرنے نہ پاتے کہ میرا سبق دوسروں سے الگ ہو جاتا کیوں کہ وہ میری رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے میرے معقولات کے ایک استاد لوگوں سے کہا کرتے تھے" یہ چھوٹے حضرت مجھے آجکل صدرا سنایا کرتے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مجھ سے درس لیتے ہیں"[۳]

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا، اور شک و شبہہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہیئے، اور علم و حقیقت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے جتنی سامنے آکھڑی ہوتی ہے...."[۴]

"یہی زمانہ ہے جب پیرزادگی اور نسلی بزرگی کی زندگی بھی مجھے خود بخود چبھنے لگی اور معتقدوں اور مریدوں کی پرستاریوں سے طبیعت کو ایک گونہ توحش ہونے لگا"[۵]

---

[۱] غبار خاطر ص ۔۹۔ [۲] غبار خاطر ص ۹۸۔ [۳] غبار خاطر ص ۹۹۔ [۴] غبار خاطر ص ۹۹۔ [۵] غبار خاطر ص ۱۰۲

"چونتیس[1] برس کی عمر میں جب کہ لوگ عشرت شباب کی سرمستیوں کا سفر شروع کرتے ہیں اپنی وحشت نوردیاں ختم کر کے تلووں کے کانٹے چن رہا تھا۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں نمایاں طور سے حصہ لیا، ساری زندگی وہ وطن عزیز کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے کوشاں رہے اور آخر کار ۱۹۴۷ء میں کامیاب ہوئے۔ اس سلسلے میں انہیں کئی مرتبہ جیل جانا پڑا۔ غبار خاطر کے مختلف اوراق میں ان کا ذکر اس طرح ملتا ہے:

"قید و بند کی زندگی کا یہ چھٹا تجربہ ہے، پہلا تجربہ ۱۹۱۶ء میں پیش آیا تھا جب مسلسل چار برس تک قید و بند میں رہا پھر ۱۹۲۱ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۰ء میں یکے بعد دیگرے یہی منزل پیش آتی رہی اور اب پھر اسی منزل سے قافلہ بادپیمائے عمر گزر رہا ہے۔

بازمی خواہم ز سر گیرم رہ بیہودہ را

"پچھلی پانچ گرفتاریوں کی اگر مجموعی مدت شمار کی جائے تو سات برس آٹھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوگی، عمر کے تریپن برس جو گزر چکے ہیں۔"[2]

"۱۹۱۶ء میں جب یہ معاملہ پیش آیا تو مجھے پہلی مرتبہ موقع ملا کہ اپنی طبیعت کے تاثرات کا جائزہ لوں اس وقت عمر کے ۲۷ برس گزر رہے تھے، الہلال، البلاغ کے نام سے جاری تھا۔"[3]

"۱۹۲۱ء میں جب مجھے گرفتار کیا گیا تو مجھے معلوم تھا کہ قید خانے میں تمباکو کے استعمال کی اجازت نہیں۔ مکان سے جب چلنے

---

[1] غبار خاطر ص ۱۰۳۔ [2] غبار خاطر ص ۳۳۔ [3] غبار خاطر ص ۴۴-۴۵۔

لگا تو ٹیبل پر سگریٹ کیس دھرا تھا، عادت کے زیر اثر پہلے ہاتھ بڑھا کہ اسے جیب میں رکھ لوں پھر صورت حال کا احساس ہوا تو رک گیا، لیکن پولیس کمشنر نے جو گرفتاری کا وارنٹ لے کر آیا تھا اصرار کیا ضرور جیب میں رکھ لو۔ میں نے رکھ لیا۔ اس میں دس سگریٹ تھے، ایک کمشنر پولیس کے آفس میں پیا، دوسرا راستے میں سلگایا دو ساتھیوں کو پیش کئے باقی چھ رہ گئے تھے کہ پریسیڈنسی جیل علی پور پہنچا، جیل کے دفتر سے جب اندر جانے لگا تو خیال ہوا اس جیب کے وبال سے سبک جیب ہو کر اندر قدم رکھوں تو بہتر ہے۔ میں نے کیس نکالا اور مع سگرٹوں کے جیلر کی نذر کر دیا اور پھر اس دن سے لے کر دو برس تک سگریٹ کے ذائقہ سے کام و دہن آشنا نہیں ہوئے[1]۔"

"۱۹۲۱ء کے بعد پھر تین[2] مرتبہ قید و بند کا مرحلہ پیش آیا لیکن ترک کی ضرورت پیش نہ آئی۔ کیونکہ سگریٹ کے ڈبے میرے سامان میں ساتھ گئے وہ دیکھے گئے مگر روکے نہیں گئے۔ اگر روکے جاتے تو پھر ترک کر دیتا[3]۔"

"میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی ۱۹۴۱ء میں جب میں نینی جیل میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لئے تشویش خاطر کا موجب ہوگا مجھے اطلاع نہیں دی گئی[4]۔"

"۹ مہینے ہوئے دسمبر ۱۹۴۱ء کو نینی کے مرکزی قید خانے کا دروازہ میرے لئے کھولا گیا تھا۔ کل ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو سوا دو بجے قلعہ احمد نگر کے حصار کہنہ کا نیا پھاٹک میرے پیچھے بند کر دیا گیا[5]۔"

(باقی آئندہ)

۱؎ غبار خاطر ص ۱۶-۱۷۔ ۲؎ ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۲ء، ۱۹۴۰ء۔ ۳؎ غبار خاطر ص ۱۹

۴؎ غبار خاطر ص ۔ ۵؎ غبار خاطر ص ۱۹۔

بولی اماں محمد علی کی

پروفیسر خواجہ اسرار احمد

۱۱/۷، ۱۱-۳ ناظم آباد، کراچی ۱۸

زیر نظر مضمون ایک نہایت مقبول اور شہرۂ آفاق نظم کے شاعر کے تعین میں ہے۔ یہ نظم اب تک زبان زد خاص و عام ہے لیکن تا حال اس کے شاعر کی بابت کوئی متفقہ رائے نہیں پیش کی گئی ہے۔ فاضل مضمون نگار نے اس مضمون میں پہلی مرتبہ اس نظم کے خالق کے تعلق سے اپنے خاندانی روابط اور ذاتی یادداشتوں کی مدد سے بحث کو کچھ آگے بڑھایا ہے۔ ادارہ کے خیال میں اس میں بعض تسامحات اب بھی موجود ہیں لیکن یہ ہدیہ قارئین ہے تاکہ بعض نئے نکات کی روشنی میں کوئی حتمی فیصلہ ہو سکے یا سوچ کی راہیں کشادہ تر ہوں۔ پھر اس مضمون سے سہارنپور کی ادبی اور علمی زندگی کے بعض گوشے بھی سامنے آتے ہیں۔

م۔ ظ۔ ح

میری طالب علمی کا ابتدائی دور تھا۔ جیسا کہ سب بچوں کو ہوتا ہے مجھے بھی کہانیوں کی کتابوں سے جنون کی حد تک شوق تھا۔ تیز گرمیوں کی دوپہر ہوتی یا بارش، میں "سانپوں کا شہر" اور "گلفام کی واپسی" جیسی کتابوں کی تلاش میں مارا مارا پھرتا سلسلہ وار کہانیاں ہوتیں اور سلسلہ کا ٹوٹ جانا میرے پاؤں کا چکر بن جاتا۔ عجیب بات یہ تھی کہ میری دلچسپی کا سامان "بانگ درا" میں بھی تھا۔ اقبال کا یہ مجموعہ مجھے کہانیوں کی کتابوں ہی کی طرح عزیز تھا۔ یہ اشعار

اٹھی اول اول گھٹا کالی کالی
کوئی حور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی
فرشتے سکھاتے تھے شبنم کو رونا
ہنسی گل کو پہلے پہل آ رہی تھی

مجھے اس قدر دلچسپ معلوم ہوتے تھے جتنا کسی دیو، جن یا پری کی کہانی۔ ان کو ایک ایک کر پڑھنا مجھے بہت پیارا تھا۔ جہاں تک کلام اقبال کے سمجھ میں آنے کا تعلق تھا تو جب میں اقبال کے یہ اشعار پڑھتا۔

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

تو میں یہ سمجھتا کہ اقبال اس اقبال سے ناواقفیت کا اظہار کر رہا ہے جس اقبال کے ساتھ میں رہتا ہوں۔ اقبال اس اقبال کی جدائی میں اشک فشاں ہے اور اس اقبال کو دیکھنے کی تمنا کرتا ہے جس اقبال کے ساتھ رہنے کی سعادت میرے حصے میں آئی ہے۔ ایسا سمجھنے کی وجہ بھی تھی۔ دونوں کا تعلق صنف شاعری سے تھا۔ دونوں اقبال تخلص کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دونوں داغ مرحوم کے تلامذہ میں داخل تھے۔ ناموں سے قطع نظر نمایاں فرق یہ تھا کہ ایک کی شہرت نہ صرف یہ کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں بلکہ ہندوستان سے باہر بھی پھیلی ہوئی تھی اور دوسرے میں اگرچہ صلاحیتیں موجود تھیں مگر گوشہ گمنامی میں تھا۔ عجیب سی بات ہے کہ لوگ اس کی تخلیقات سے واقف تھے مگر خالق کون تھا اس سے ناواقف۔

تحریک خلافت کے دوران ہندوستان میں خورد و کلاں کی زبان پر

بولی امّاں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

کے الفاظ پڑھے ہوتے تھے مگر یہ نظم ایک لوک گیت کے مانند تھی جس کا تعلق کسی خاص خطہ یا علاقہ سے نہیں تھا۔ یہ کسی یوپی یا کسی پنجاب کا لوک گیت نہ تھا بلکہ پورے ہندوستان کا لوک گیت تھا اپنی مقبولیت کے اعتبار سے بھی اور اس اعتبار سے بھی کہ لوگ اس کے خالق سے ناواقف تھے۔

۱۹۶۶ء کی بات ہے۔ کراچی یونیورسٹی میں میرے محترم استاد ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کلاس لے رہے تھے۔ دورانِ درس اس شہرۂ آفاق نظم کا ذکر بھی آگیا اور کشفی صاحب نے متاسفانہ لہجہ میں فرمایا کہ خدا جانے اس نظم کا شاعر کون ہو؟ میں یہ توقع کرنے میں حق بہ جانب ہوں کہ کشفی صاحب کو یہ بات یاد بھی نہ رہ گئی ہوگی مگر مجھے آج تک یہ صدمہ ہے کہ میں نے کیوں نہ بتایا کہ یہ نظم اقبال کی ہے۔ وہ اقبال جو مولائے سخن کے نام سے جانے جاتے تھے جن کا اسم گرامی نیاز احمد اقبال تھا۔ جو سہارنپور کے محلہ قضاۃ کے شیخزادگان انصاریاں میں سے تھے اور شہر کے خاص شرفا میں شمار کئے جاتے تھے۔ جو یادگار داغ تھے اور جن کے لئے فصیح الملک نے تحریر کیا کہ آپ کی غزل میں اصلاح کی ضرورت نہیں تھی مگر ہر شاعر کی فطرت ہے جب اُس کے سامنے اپنی یا دوسرے کسی شاعر کی غزل آتی ہے تو اس میں کاٹ چھانٹ ضرور کرتا ہے میں نے بھی فطری طور پر آپ کی غزل کے ایک شعر میں کچھ ترمیم و تنسیخ کی ہے۔ آپ کا اصل شعر بھی صحیح ہے اگر آپ چاہیں تو اپنا اصل شعر رکھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد تحریر فرمایا کہ آپ کا کلام اصلاح کا محتاج نہیں ہے۔

ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، پنجاب یونیورسٹی لاہور کے زیرِ اہتمام ایک کتاب "تحریکِ پاکستان میں مسلم خواتین کا کردار" (Muslim Women Role in the Pakistan movement) کے نام سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوتی ہے جس کے مصنف سرفراز حسین مرزا صاحب نے تحریک خلافت سے

متعلق اس پوری نظم کو شائع کیا ہے۔ حاشیہ میں اس نظم کی بابت یہ تحریر دی گئی ہے۔

"یہ ہر دل عزیز نظم منشی نورالدین نور لدھیانوی کی تخلیق ہے اور تحریک خلافت کے دوران ۱۹۲۲ میں لدھیانہ سے شائع ہوئی۔"

یہ درست نہیں ہے کہ یہ نظم منشی نورالدین نور کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے۔ کسی بھی شاعر کا طرزِ بیان اپنے خالق سے خود متعارف کراتا ہے اور زبان حال سے پکار کر کہتا ہے کہ یہ سخن کس زبان سے نکلا۔ کیا میرؔ، دردؔ، غالبؔ، مومنؔ، داغؔ اور فانیؔ وغیرہ کے اشعار اپنے خالق کے غماز نہیں ہیں؟ یہ نظم جس کی دھوم ہندوستان کے گوشے گوشے میں بالعموم اور شہر سہارنپور اور اس کے مضافات میں بالخصوص مچی ہوئی تھی اسی قبیل کی دوسری نظموں کی ایک کڑی ہے۔ ذیل میں کچھ نظموں کے بعض حصے درج کئے گئے ہیں۔ اہل نظر دیکھیں اور انصاف کریں کہ کیا ان تمام نظموں کے پردۂ زنگاری میں کوئی ایک ہی ہستی کار فرما نہیں ہے۔

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی — ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو
آبروِ حق کے رستے یہ دے دی — ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو
ہم اگر یاد بچوں کو آئیں — آپ چھاتی سے اپنی لگائیں
پیاری اماں یہ رونے نہ پائیں — ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو
جرم ہم نے بس اتنا کیا تھا — دینِ احمد کا فتویٰ دیا تھا
کیا حکومت کا اس میں برا تھا — ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

کہہ رہی ہے یہ گوری حکومت — "ظلم کالوں پہ کرنا روا ہے"
ظلم کر لو ارے ظلم کر لو — صبر والوں کا ساتھی خدا ہے"
جیل میں اب بھر دو گے سیاٹا — ہے جہاں روٹی کپڑے کا گھاٹا
آدھی مٹی ہے اور آدھا آٹا — ظلم کالوں پہ کرنا روا ہے"
ہم نہیں کھائیں گے بھائی مٹی — پیٹ سے اپنے باندھیں گے پٹی
تم ہو ضدی تو ہم بھی ہیں ہٹی — صبر والوں کا ساتھی خدا ہے"

بولی اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
قید خانے میں جاؤ خوشی سے — سختیاں سب اٹھاؤ خوشی سے
ہے اسی میں خوشی بھی خدا کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہوتے مجھ کو اگر سات بیٹے — سب کو کرتی خلافت کے صدقے
ہیں یہی دینِ احمد کے رستے — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

بولی بیگم محمد علی کی — میرے آقا میرا غم نہ کھانا

گانٹھ ادرک کی "بندر" سے لیں گے — کام اللہ اکبر سے لیں گے

یہ نظمیں سہل ممتنع کلام کی بہت عمدہ مثالیں ہیں۔ سیدھے سادے الفاظ میں انسانی جذبات و احساسات کا پُر اثر اظہار ہے۔ جہاں تک میرے اور میری بڑی بہن کے حافظے نے ساتھ دیا اور جس ترتیب کے ساتھ، ساتھ دیا ہم نے یہ اشعار درج کئے ہیں۔ میں نے سرفراز حسین صاحب کی عبارت کا تذکرہ بھی اپنی ہمشیرہ سے کیا تو ان کے الفاظ میں "میں اس وقت کافی چھوٹی تھی، ہم نے یہ نظمیں زبانی یاد کر رکھی تھیں۔ اقبال مرحوم ایک سرکاری اپر پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور یہ نظمیں فرضی نام سے چھپیں۔" بات خاصی حد تک سمجھ میں آتی ہے اگر پریم چند نواب رائے کے نام سے افسانے لکھتے رہے اور "سوزِ وطن" پر محض اس لیے پابندی عائد کی گئی کہ آزادی کے نام پر بہنے والے خون کے قطرے کو دنیا کا سب سے انمول رتن بنایا گیا تھا اور اگر حسرت موہانی "اردوئے معلیٰ" میں شائع ہونے والے ایک مضمون کی پاداش میں جیل جا سکتے ہیں تو یہاں تو بات "بندر سے ادرک لینے" کی ہے "گوری حکومت کے ظلم کرنے" اور کانوں پہ ظلم ہونے کی" ہے مگر لدھیانہ سے یہ کیوں شائع ہوئی اس کا تشفی بخش جواب میرے پاس نہیں ہے۔ سرفراز مرزا صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ انھوں نے بچشم خود اس

شائع شدہ نظم کو دیکھا ہے یا محض اس کی بابت سنا ہے۔ بہر طور یہ بات قطعی وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس نظم اور ان تمام نظموں کے خالق منشی نیاز احمد اقبال مرحوم سہارنپوری ہیں۔ اہل الرائے حضرات مندرجہ بالا نظموں کے اقتباسات کی روشنی میں خود بھی ایک صحیح فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں۔ ابھی بہت سے بزرگ پاکستان و ہندوستان میں اور خصوصاً سہارنپور میں ایسے موجود ہوں گے جو میرے دعوے کی تصدیق کریں گے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ یہ نظمیں کچھ صاحبان ذوق کو ضرور یاد ہوں گی۔ کاش یہ شائع ہو جائیں تو ہماری قومی شاعری میں ایک خوش گوار اضافہ ہوگی۔ اور تحریکِ پاکستان و تحریکِ خلافت کی تاریخ میں اہم مقام حاصل کریں گی۔

سہارنپور خدا کی ایک برگزیدہ ہستی شاہ ہارونؒ کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا اصل نام ہی شاہ ہارون پور تھا۔ اگر اس ضلع کے دیہات و قصبات پر ایک نظر ڈالی جائے تو نانوتہ، گنگوہ۔ دیوبند اور کلیر جیسے نام سامنے آتے ہیں۔ دارالعلوم اور مظاہر علوم جیسی بے مثل عظیم دینی درس گاہیں یہاں موجود ہیں۔ ان دیہات و قصبات کے نام اپنی خصوصی نوعیت کی بنا پر اس بلندی پر جا پہنچتے ہیں۔ جہاں سے خود سہارنپور چھوٹا نظر آتا ہے۔ اس ضلع کا تمام تر ماحول دینی و روحانی اقدار میں لپٹا ہوا ہے۔ یہ اقدار نہ صرف مسلمانوں کے ساتھ منسوب ہیں بلکہ ہندو بھی عام طور سے اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کا مشہور تیرتھ ستھان "ہردوار" اسی ضلع میں ہے۔ اس سرزمین نے بڑی بڑی بلکہ بہت بڑی ہستیوں کی تربیت کی ہے شعروادب کے اعتبار سے سہارنپور ایک انفرادی شان کا حامل ہے۔ باوجود اس کے کہ اس کی حیثیت کسی دلبستان کی نہیں ہے۔ مولانا غریب[1] سہارنپوری،

---

[1] مولانا کا ایک مشہور نعتیہ شعر ہے۔

یہ مجال کس کی تیرے سوا کہ بھرے غریبوں کی جھولیاں
جو کبھی غریب ہوا نہ ہو وہ کسی غریب کو دے گا کیا؟

مولانا بیدلؔ سہارنپوری، کلامؔ سہارنپوری، عزیز بیگ مرزا، آزاد انصاری
منشی نیاز احمد اقبال،

---

۲ - مولانا حبیب الرحمٰن بیدلؔ سہارنپوری کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ آزاد انصاری کے استادِ اول ہیں۔ بیدلؔ کے دکن چلے جانے کے بعد آزاد نے مولانا حالی سے اصلاح لی۔ "پھر حالی و بیدل کا بدل ہی نہ ملا"۔ (آزاد)

۳ - کلامؔ بہت پُرگو شاعر تھے۔ رئیس المتغزلین کہلاتے تھے۔ بیک وقت کئی اصناف میں طبع آزمائی کرتے۔ کلام کے دو شعر مجھے یاد رہ گئے۔ پہلا شعر خاص غزلیہ انداز میں ہے۔

جہاں پر رات سوئے تھے وہیں ڈھونڈو کمر اپنی
لپٹ کر رہ گئی ہوگی کسی کے تار بستر سے

صنم خانے میں چندن کعبے میں کافور جلتا ہے
ہمارے خانۂ دل میں چراغِ طور جلتا ہے

---

۴ - غالبِ ثانی مرزا عزیز بیگ مرزا منشی سوزاں شاگرد غالب مرحوم کے شاگرد تھے۔ "روحِ کلامِ غالب" کے نام سے پورے دیوان کی تضمین کی ہے۔ یہ تضمین مخمس کی شکل میں ہے۔ روحِ کلامِ غالب تاریخی نام ہے۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۹۳۵ میں ہوئی دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۸ میں شائع ہوا۔

۵ - آزاد انصاری کا مجموعۂ کلام جس میں غزلیات و منظومات شامل ہیں۔ ان کی حیات میں حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۸ء میں "معارفِ جمیل" کے نام سے شائع ہوا۔ "معارفِ جمیل" کے آغاز میں آزاد نے اپنے حالاتِ زندگی دیئے ہیں۔

منشی نثار[6] احمد صبر۔ احمد سہارنپوری، سید علی عباس عباس[7]، سادھو رام آرزو[8] اور ادیب سہارنپوری وغیرہ شعرا اس سرزمین سے اٹھے۔ چمنستانِ اردو شاعری کی آبیاری میں ان تمام شعرائے کرام کی کاوشوں کا بڑا دخل ہے۔ مگر سوائے ادیب سہارنپوری کے دوسرا نام سنائی دے جائے تو سوئے اتفاق ہے اور ادیب کا نام بھی اسی حد تک سنائی دیتا ہے کہ ؎

جان کر ہم نے انھیں نامہرباں رہنے دیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ حضرات نام و نمود کی طرف سے قطعی بے پروا تھے تو ایک کلیہ کی نفی ہو جائے گی۔ یہ بات فطرتِ انسانی سے بعید ہے۔ ہاں اگر سہارن پور کے ماحول کو مدِ نظر رکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ بہ اعتبار روحانیت اس مقام پہ تھے کہ دنیوی برتری ان کی نظر میں کسی خاص اہمیت کی حامل نہ تھی۔ چنانچہ جن شعرائے کرام کے نام دیئے گئے ہیں۔ ان کے یہاں نعتیہ کلام اس کثرت سے ملتا ہے کہ دوسری

۶۔ منشی نثار احمد صبر۔ صبر کو دیکھ کر دو قدیم شعرا کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ مصحفی کی اور ناسخ کی۔ مصحفی کی اس لیے کہ دونوں ہم پیشہ تھے۔ اچھے اشعار بک جاتے تھے۔ ناسخ کی اس لیے کہ ہر ایک کو اپنا کلام سنانا کسرِ شان سمجھتے تھے۔ سنانے سے پہلے پوچھ لیتے کہ میاں کیا کرتے ہو! صنعتی شاعر تھے۔ اس لحاظ سے خوش قسمت کہ زندگی کے آخری ایام میں دیوان شائع ہو گیا۔

۷۔ سید علی عباس عباس۔ صاحب دیوان شاعر تھے۔ "گل و مل" مجموعے کا نام ہے۔ ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ غالب و اقبال سے اس درجہ متاثر ہیں کہ سہ لپنے ہی کو کھو آئے۔ ہدایت محسنی ایم۔ اے نے "مطالعہ" کے عنوان سے گل و مل کا بالتفصیل تعارف کرایا ہے۔

۸۔ سادھو رام آرزو۔ بقیدِ حیات ہیں۔ بیشتر کلکتہ میں رہتے ہیں۔ نام سے ہندو ہونا ظاہر ہے۔ مگر نعتیہ کلام لائقِ تعریف ہے۔ اس کثرت سے نعتیں کہی ہیں کہ دوسری اصناف پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔ کلکتہ سے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ "الہام سحر" ان میں سے ایک ہے۔

اصناف پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔ ورنہ یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ لوگ تحریک خلافت سے متعلق نظموں سے واقف ہوتے مگر اقبال سے نہیں۔ میری موجودگی میں تمکین کاظمی کا خطوط ان کے نام آیا وہ شاگردان داغ کے حالاتِ اور نمونۂ کلام کی اشاعت چاہتے تھے۔ میں نے ان کی توجہ اس طرف دلائی بھی مگر ان کے ردِ عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کو بے جا نام و نمود خیال کرتے تھے۔ اقبال سہارنپوری مرحوم کا کلام میرے سامنے نہیں ہے۔ جس قدر کلام میں نے پڑھا اور سنا ہے۔ اس کی بنیاد پر بآسانی ان کے کلام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ غزلیات و منظومات بشمول قطعات و رباعیات پر مشتمل ہے اور دوسرا نعتیہ کلام پر۔ اوائل عمر ہی سے شاعری سے فطری مناسبت تھی۔ طبع موزوں و ذہانتِ خداداد پائی تھی۔ اس لیے چند سال کی مشقِ سخن نے آپ کو بہت جلد بامِ عروج پر پہنچا دیا تھا۔ پیام یار لکھنؤ، زبان دہلی۔ زبانِ اردو۔ جلوۂ یار میرٹھ، پیام عشق وغیرہ اپنے زمانے کے مقبول عام اور بلند مقام رسائل تھے۔ ان تمام اور دوسرے اخبارات و رسائل میں آپ کا کلام اہتمام کے ساتھ شائع ہوتا۔ زبان اردو کی کئی جلدیں میری نظر سے گزری ہیں اس رسالہ کے سرِ ورق پر داغ مرحوم کا یہ مشہور شعر درج ہوتا تھا۔

کہتے ہیں اُسے زبان اردو
جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

اس میں طرحی غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ مصرعِ طرح دے دیا جایا کرتا تھا اور شعرا اس طرح میں غزلیں لکھتے پھر آئندہ اشاعت میں اگلے شمارے کے لیے مصرع طرح دیا جاتا۔ منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی، حسرت موہانی اور دیگر اساتذہ فن کا کلام میں نے ان جلدوں میں پڑھا۔ منشی امیر اللہ تسلیم کی وفات پر اقبال سہارنپوری نے تاریخ وفات بھی کہی جو زبانِ اردو کے منشی تسلیم اللہ نمبر میں میری نظروں سے گزری شاعر کا کلام اجتماعی اور اس کی اپنی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جب میں ان کا یہ شعر پڑھتا ہوں۔

رکھتے ہیں ایسا ذوقِ گدائی سدا سے ہم
رہتے ہیں بچ کے سایۂ بالِ ہما سے ہم

تو سوچتا ہوں کہ کس قدر سچی بات کہہ دی ہے حقیقت یہ ہے کہ کہ ان کی پوری زندگی اسی شعر کے مصداق تھی۔ نام نیاز تھا مگر فطرت میں بے نیازی تھی۔ جس غزل کا یہ خوبصورت مطلع ہے اس کا ایک شعر اور دیکھئے۔ فرماتے ہیں۔

رکھتے خیال ہیں شبِ غم زلفِ یار کا
کرتے ہیں یوں بلا کا تصادم بلا سے ہم

مقطع میں شاگردی داغ مرحوم پر فخر کا اظہار کیا گیا ہے۔ پہلا مصرعہ ذہن سے اتر گیا۔ دوسرا اس طرح ہے۔

..................فیض یاب ہیں
اقبال، داغِ بلبلِ شیریں نوا سے ہم

ایک دو اشعار اور ملاحظہ ہوں۔

شعاعیں آفتابِ حسن کی خود ایک پردہ ہیں۔
وہ بے پردہ بھی گر ہوتے تو پہچانے کہاں جاتے

رہے محفوظ وقتِ دیدہ دلبر بدنگاہی سے۔
وگرنہ مردمِ دیدہ کو نہلانے کہاں جاتے

فن شاعری کے معیار پر ہر طرح پورے اترتے ہیں۔ ان کی غزلیات مسودہ کی شکل میں ہونی چاہئیں۔ یہ مسودہ کہاں ہے، اس کا تذکرہ آگے آئے گا۔

اقبال مرحوم کا معیارِ زندگی بہت بلند تھا۔ ایک اعلیٰ اور بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ آپ صوم وصلوٰۃ کے پابند، روشن ضمیر، نہایت متین وسنجیدہ بزرگ اور گوشہ نشین فرشتہ سیرت انسان تھے۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ انھوں نے کبھی چاشت واشراق کی نمازیں تک قضا کی ہوں۔ فجر کی نماز کے بعد اوراد و وظائف میں مصروف ہو جاتے اور مسجد سے گھر اسی وقت آتے جب مذکورہ نمازوں کی ادائیگی ہو جاتی۔ بعض اوقات امام

مسجد پر اس لیے ناراض ہو جاتے کہ اس نے نماز جلد کیوں پڑھادی۔ اور ان کا انتظار کیوں نہیں کیا۔ اس لیے کہ جماعت کے لیے دیر میں پہنچنے کی توقع ان سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ پھر یہ ہوتا کہ دور کسی مسجد میں جاتے اور باجماعت نماز ادا کرتے۔

نعتیہ کلام پر اردو شاعری کا ایک بڑا حصہ مشتمل ہے۔ رسول اقدس کی ذات مقدس سے لگاؤ ہر مسلمان کا ایمان ہے مگر طویل عرصہ تک یہ بھی ہوتا رہا ہے کہ مجموعہ کلام خواہ کسی مسلم کا ہو یا غیر مسلم کا ابتدا حمد باری تعالیٰ سے ہوتی، پھر نعت کہی جاتی اس کے بعد پنجتن کی شان میں منقبت لکھی جاتی تب کہیں جا کر دوسری اصناف کی باری آتی۔ اسی طرح روایتی انداز میں نعت گوئی کی جاتی رہی۔ مضامین تو عرش معلیٰ پر پہنچتے رہے مگر اثر آفرینی میں کمی آگئی۔ اقبال سہارنپوری کو جو ماحول ملا وہ جن مجالس میں شریک ہوئے ان پر صوفیانہ رنگ کی گہری چھاپ تھی۔ سہارنپور کی گلیوں میں آئے دن سماع کی محفلیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ ایسی کتنی ہی محفلوں میں میں نے اقبال مرحوم کے ساتھ شرکت کی۔ اس ماحول کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس کے جو اثرات مرتب ہوتے۔ وہ ان کے کلام میں پورے طور پر جلوہ گر ہیں۔ رسائل کی شکل میں ان کے کچھ مجموعے بھی شائع ہوئے جن میں سے دو بالترتیب "شان فاروق اعظمؓ" اور "انعام ذوالجلال" ہیں۔ دونوں کی اشاعت دو دو بار ہوئی "شان فاروقؓ اعظم" میں تین نظمیں شامل ہیں۔ ایک نظم حضرت عمرؓ کے ایمان لانے سے متعلق ہے۔ دوسری نظم میں عمر فاروقؓ کے شکوہ خلافت، خدا ترسی اور غربا نوازی کا بیان ہے۔ آخری نظم حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے مشہور واقعے سے متعلق ہے۔ "انعام ذوالجلال" اکیس نعتوں پر مشتمل ہے جو بشکل مخمس لکھی گئی ہیں۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۲ء میں اقبال کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔

دنیا تے نعت کا بے مثل شعر ہے۔

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا۔

اقبال مرحوم کا انداز ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں۔

جو نافہمیدہ تھے وہ گئے سب جستجو کرتے
تلاشِ یار میں گم ہو گئے فہمیدہ فہمیدہ

یہ شعر ایک مخمس سے لیا گیا ہے۔ آخری بند میں نعتیہ کلام میں تغزل کی آمیزش کس خوبصورتی سے کی گئی ہے۔

اسی درجہ ہے ان کا ربط اس سے جس قدر ہے جس قابل
بقدرِ ظرف کرتے ہیں توجہ اہل دل حاصل
جہانِ عشق میں ان کے تصرف کے ہیں سب قائل
وہ اے اقبال محفل میں کسی سے بھی نہیں غافل
نگاہیں ان کی سب پر ہیں مگر دزدیدہ دزدیدہ

اقبال مرحوم کی رفیقہ حیات شبلی نعمانی کے محترم استاد مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی نواسی تھیں اور میری خالہ۔ ان سے ایک لڑکی "اختر" تولد ہوئی جو کم سنی ہی میں رحلت پا گئی۔ اگست ۱۹۵۵ء میں آپ کی اہلیہ کا انتقال ہوا اس صدمۂ جانکاہ کی تاب آپ نہ لا سکے۔ زیادہ تر خاموش رہنے۔ شعر و شاعری سے بھی زیادہ شغف نہ رہا۔ اولاد تھی نہیں۔ اس لیئے دل بستگی کا بھی کوئی سامان نہ تھا۔ مارچ ۱۹۵۶ء میں کمزوری کی وجہ سے آپ کی ٹانگوں میں درد رہنے لگا۔ اس کے بعد اختلاج قلب میں مبتلا ہو گئے۔ اور زبان پر فالج کا اثر غالب آگیا۔ پانچ چھ مہینے تک یہی حالت رہی۔ پھر کچھ کچھ افاقہ نظر آنے لگا۔ زبان بھی خاصی حد تک صاف ہو گئی مگر اختلاجِ قلب کا غلبہ بدستور رہا۔ ماہ اپریل ۱۹۵۸ء میں مرض نے دوبارہ زور پکڑ لیا۔ جو کچھ کہتے بدقت سمجھ میں آتا۔ بالآخر اسی سال اپریل کی ۱۶۔۱۷ تاریخ کو آپ نے تقریباً پچاسی سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

غالب مرحوم نے فرمایا تھا۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمّید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

میں نے اس ناامیدی کو بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ تصور کرتا ہوں تو انسانی بے بسی کا نقشہ آج بھی میرے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ علالت کے دوران انھوں نے اپنی آخری نعت یا آخری نظم کہی۔ وہ اپنی مفلوج زبان سے بمشکل بولتے جاتے تھے اور میں قلم بند کرتا جاتا تھا۔ ان کی اس آخری نظم کا ایک ایک لفظ درد و اثر سے مملو اور قلبی تاثرات کی ایک واضح مثال ہے۔

رہِ عشق ہے جھومتا جا رہا ہوں
اکیلا بلا رہنما جا رہا ہوں
ہوں مخمور جامِ شرابِ محبت
مگن ہوں جھکتا ہوا جا رہا ہوں
نہیں ڈگمگاتے ہیں راہِ طلب میں
قدم اپنے خود چومتا جا رہا ہوں
مری صرصرِ شوق ہے اور میں ہوں
بڑھا جا رہا ہوں اڑا جا رہا ہوں
نہ میرا پتہ لگ سکے گا کسی کو
مٹاتا ہوا نقشِ پا جا رہا ہوں
اسی میں مقاصد کے گوہر بھروں گا
فقیرانہ دامن کشا جا رہا ہوں
بڑی میری امداد ہے غائبانہ
ہوں ممنونِ احساں بچھا جا رہا ہوں
عجب ہے عقیدت شعاری کا عالم
زمیں پر جبیں ٹیکتا جا رہا ہوں

کروں گا اسے نذر چشم کرم کی
لیئے دل سوتے دل رُبا جا رہا ہوں
خدا جانے کیا کیا نوازیں گے مجھ کو
میں جن کا بلایا ہوا جا رہا ہوں
میں اقبال شامل تو ہوں قافلے میں
مگر قافلے سے جدا جا رہا ہوں

علالت کے دوران آپ کے ایک شاگرد نے جس کا نام عبدالشکور اور تخلص شاکر ہے۔ بڑی تن دہی سے آپ کی تیمار داری کی۔ اسی شاگرد کے زیر اہتمام آپ کے مذکورہ دونوں رسالے "شانِ فاروقِ اعظمؓ" اور "انعام ذوالجلال" شائع ہوتے تھے۔ آپ کا تمام تر کلام اسی شخص کے پاس ہے جس کے لیئے اقبال مرحوم نے ہدایت کی تھی کہ اس غیر مطبوعہ کلام کی طباعت کرا دی جائے اور خود ہی اس کا نام "عرب کا چاند" تجویز کیا تھا۔ آپ کے انتقال کے بعد عبدالشکور شاکر نے آپ کی سوانح "حیاتِ اقبال سہارنپوری" کے نام سے شائع کی جو یہ مضمون لکھتے وقت ایک دو مقامات پر میرے پیشِ نظر رہی ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ افسوس رہے گا کہ میں نے آپ کی بیاضوں کو ایسے ہاتھوں میں کیوں جانے دیا جن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے ایسا کیوں کیا' بات سے عذرِ گناہ بدتر از گناہ۔ کی ہے۔ اقبال کے انتقال کے وقت میں فرسٹ ایر کا طالب علم تھا۔ مجھے ادبیات سے دلچسپی ضرور تھی مگر قدر و قیمت کا احساس نہیں۔ میں نے شاکر کو اس سلسلے میں خطوط لکھے مگر سلسلہ جنبانی یکطرفہ ہی رہا۔ اگر "عرب کا چاند" شائع ہو جاتا ہے تو یقیناً اردو ادب میں ایک اچھے شاعر اور اردو کے نعتیہ ادب میں ایک گراں قدر شاعر کا اضافہ ہو جائے۔

کیا اس کے چہکنے کا ہے انداز سہانا
قمری کوئی جنت کی ہے میں نے تو یہ جانا
دلکش ہے عجب نعت محمدؐ کا ترانہ
گلشن میں مدینے کے ذرا دیکھ کر آنا
اقبالؔ ہے یا بلبلِ بستانِ محمدؐ

میں اپنا یہ مضمون ختم کر چکا تھا کہ میرے گرامی قدر دوست ڈاکٹر معین الدین عقیل نے جن کی تحریک پر میں نے یہ مضمون تحریر کیا ہے، مجھے جامعہ سندھ کے شعبۂ اردو کا ادبی مجلہ "صریرِ خامہ" کا ایک نسخہ فراہم کیا۔ یہ خصوصی مجلہ "قومی شاعری نمبر" ہے۔ اور ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا ہے، اس میں جناب نادمؔ سیتاپوری کا مضمون بعنوان "تحریک خلافت کی باغیانہ نظمیں" شامل ہے۔ اپنے اس مضمون میں نادم صاحب نے مذکورہ بالا نظم "بولی اماں محمد علی کی" جان بیٹا خلافت پہ دے دو۔" کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے جو کچھ کہا ہے۔ بحوالہ مولانا عبدالماجد دریا بادی کہا ہے، البتہ نادمؔ صاحب اس نظم کو تک بندیوں کی صف میں لا کر آگے بڑھے ہیں۔ مجھے یقین کرنا چاہیئے کہ نادم سیتاپوری اس نظم کو تک بندی نہیں سمجھتے اور اگر میرا یہ خیال غلط ہے تو مجھے ان تذکرہ نگاروں کا خیال آتا ہے جو نظیر اکبر آبادی کا ذکر تو کرتے ہیں مگر فحش گوئی کا لیبل چسپاں کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ہنگامی حالات کے تحت تک بندیاں کب نہیں ہوئیں اور کب کب نہیں ہوں گی۔ اپنا یہ نعرہ

بٹ کے رہے گا ہندوستان
لے کے رہیں گے پاکستان

ایک تک بندی کے جواب میں ہی وجود میں آیا تھا لیکن کیف بنارسی کی اس نظم کو جس کے یہ الفاظ ہیں تک بندی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم اور وہ نظمیں جن کے اقتباسات دیئے گئے ہیں اور وہ نظمیں بھی جن کا ذکر کیا جانا چاہیئے تھا۔ ہمارے اس قومی مزاج سے ہم آہنگ ہیں جو آزمائش کی گھڑیوں میں نکھر کر سامنے آتا ہے۔ مولانا دریا بادی کی یہ رائے کس درجہ صائب ہے کہ یہ نظم "محمد علی ہی کی طرح مقبول ہوئی" مولانا محترم نے جو رائے اس نظم کے بارے میں دی ہے۔ اس سلسلے میں میرا کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات ہو گی لیکن مولانا صاحب کا یہ فرمانا کہ نظم کوئی خاص شاعرانہ خوبی نہیں رکھتی تھی۔ فنی غلطیاں بھی تھیں۔ محلِ نظر ہے۔ وقت کا نبض شناس ہونا عالم کے لیئے بھی اور شاعر کے لیئے بھی شرطِ اولین ہے۔ اس نظم کا سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو یہ چیز سامنے آتی ہے۔ کہ شاعر نے فطرتِ انسانی کے پیشِ نظر نفسیاتی نکتہ سے کام لیتے ہوئے "خلافت پہ جان دے دو" کے الفاظ خود نہیں کہے بلکہ اپنی اس آرزو کو والدۂ محمد علی کی زبان سے کہلوا کر تحریک کی اہمیت و ضرورت اور محمد علی کے گھرانے کی عظمت لوگوں کے ذہن نشین کرانے کی سعی کامیاب کی ہے۔ محمد علی کی اماں ملت کی خاطر اپنے دل بند کو جان کی قربانی کی ترغیب دیتے ہوئے مادرِ محمد علی نہیں مادرِ ملت نظر آتی ہے اور مقصد کا یہی حصول اس نظم کی سب سے بڑی شاعرانہ خوبی ہے۔

۱؎ ادارہ فاضل مضمون نگار کی اس رائے سے متفق نہیں ہے کہ مذکورہ شعر کیف بنارسی کا تخلیق کردہ ہے۔ دراصل یہ شعر بھی ایسے ہی اشعار میں سے ایک ہے جو تحریک پاکستان کے دوران زبان زدِ عام و خاص ہو گئے تھے۔ جن کے شاعر کا نام متعین نہیں ہے۔ اسے متعدد شاعروں نے اپنی نظموں میں استعمال کیا تھا۔ جن میں سے ساغر صدیقی جالندھری، کوثر القادری امروہوی، رمزی الہ آبادی کی نظمیں ادارہ کے علم میں ہیں۔ یہ بھی تحقیق کا دلچسپ اور ضروری موضوع ہے۔ (ادارہ)

رہیں فنی خامیاں تو اگر کہیں مصرعوں میں کمی بیشی ہوتی ہے، کچھ مصرعے بحر سے خارج ہیں یا ردیف و قافیہ کا التزام نہیں ہے تو اس کی وجہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ یہ نظمیں طویل عرصے تک اور آج بھی گردِ گمنامی کی لپیٹ میں ہیں۔ یہ بات کہ یہ نظمیں منشی نیاز احمد اقبال مرحوم کی تخلیق ہیں۔ میں اسی وثوق سے کہہ رہا ہوں۔ جس وثوق سے یہ بات کہ سورج کے طلوع ہونے سے دن کا آغاز ہوتا ہے، رات نہیں۔ اور اقبال سہارنپوری کا کچھ کلام، افسوس کہ یہ ان کے آخری دور کا کلام نہیں، آپ کی نظروں سے اب گزر ہی چکا ہے۔ جس شاعر کا یہ کلام ہے وہ غیر معروف تو ہو سکا ہے۔ فنِ شعر گوئی سے ناآشنا نہیں۔ مولانا مرحوم نے شاعر کے لیے.... "مجہول الحال غیر معروف" کی ترکیب استعمال کی ہے۔ "مجہول الحال" سے مراد ایک ایسے شخص سے ہوگی جس کے حالات کا علم نہیں ہے اگر اس کے علاوہ کچھ اور معنی ہیں تو اس "صفت" کا موصوف غیر معروفیت نہیں ہو سکتی۔

میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ اقبال نے یہ نظمیں بر بنائے مصلحت فرضی نام سے چھپوائیں۔ نادم سیتاپوری رقمطراز ہیں۔

"کوئی دس سال ادھر ایک گمنام مراسلہ نگار نے مولانا عبدالماجد صاحب کے "صدق جدید" ہی میں یہ انکشاف کیا کہ یہ نظم مرزا طاہر بیگ مرادآبادی کی ہے (شاعر کے گمنام رہنے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ مراسلہ نگار کیوں گمنام رہنا چاہتا ہے۔ اور وہ بھی ۱۹۵۵ء میں۔ اس کی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔) اس پر مولانا صاحب نے لکھا تھا کہ 'پہلی بار یہ اطلاع ملی کہ ان کے مصنف طاہر بیگ مرادآبادی تھے'.........ایک کے آخری شعر میں تخلص یٰسین پڑا ہوا تھا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاعر کوئی یٰسین لکھنوی ہوں گے۔"

یٰسین سے مفہوم یٰسین ہی ہوتا ہے۔ یٰسین لکھنوی نہیں۔ اقبال مرحوم اپنے

ایک مجموعے "تذکرۃ الصابرین"[1] کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں کہ اس مجموعے میں شامل نظموں کو اکثر مجالسِ میلاد شریف میں عزیزان محمد لیسین و محمد یعقوب اور چھوٹے میاں وغیرہ ساکنان محلہ ڈولی کھال نے پڑھا جس سے سامعین مجالس نہایت لطف اندوز ہوتے اور چھپوانے کی فرمائش کی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ کہیں یہ لیسین وہی لیسین تو نہیں ہے جو منشی صاحب کا شاگرد تھا۔ اور جس سے اور جس کے مزاج سے میں بخوبی واقف ہوں۔ منشی صاحب کا یہ شاگرد طبیعت کے لحاظ سے شوخ اور ایک ٹانگ سے معذور تھا۔ شہر سہارنپور میں لوگ اس کو "لنگڑے لیسین" کے نام سے جانتے تھے۔ یہ شاعر نہیں تھا بلکہ اقبال مرحوم کی نظمیں اور نعتیہ کلام اپنی پارٹی کے ساتھ محافل میلاد میں پڑھتا تھا۔ آواز پر قابو نہیں تھا۔ سامعین زیادہ پسند نہیں کرتے تھے مگر اس کی اکھڑ طبیعت کے پیش نظر خواہ مخواہ سننا ہی پڑتا تھا۔ اب جس وقت میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں میرے ذہن میں نقشہ ابھر رہا ہے کہ کس طرح وہ اپنی ایک ٹانگ کے سہارے اچک کر اس تخت پر چڑھ جاتا تھا جو میلاد خواں حضرات کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ خود اقبال مرحوم اس کی پارٹی پر اپنے دوسرے شاگردوں کی پارٹیوں کو ترجیح دیتے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ اس نے اپنے استاد کی معلومات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی شعر میں اپنا نام شامل کر دیا ہو یا تک بندی کر کے اپنی طرف سے کسی بند کا اضافہ کر دیا ہو جس کی بنا پر مولانا دریابادی کو یہ کہنا پڑا کہ نظم میں کوئی شاعرانہ خوبی نہیں تھی۔ اور اس میں فنی خامیاں بھی تھیں۔ ظاہر ہے کہ مولانا صاحب کے سامنے پوری نظم نہیں تھی۔ بہرنوع میرا یہ کہنا کہ یہ نظمیں منشی نیاز احمد اقبال مرحوم کی ہیں اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔

---

1 تذکرۃ الصابرین۔ اقبال سہارنپوری کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ چار نظموں پر مشتمل ہے۔ یہ نظمیں حضرت ایوب علیہ السلام۔ شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام اور شہادت فرزندانِ حضرت مسلم سے متعلق ہیں۔ آخری نظم مرثیہ کے انداز میں لکھی گئی ہے۔

میراجی ـــــــ روپ بہروپ

جمیل کاشمیری

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

میراجی، ایک شخصیت کتنی روپ، بھانت بھانت کی بولیاں، جتنے منہ اتنی باتیں، سنیے اور سنتے چلے جاتیے۔ میراجی کیسے تھے مجھے معلوم نہیں۔ میری نسل نے ابھی لکھنا بھی نہیں سیکھا تھا کہ میراجی بمبئی کے ایک قبرستان میں صرف چار آدمیوں کے کندھوں پر سوار ہوتے اور پھر ہمیشہ کے لئے منوں مٹی کے نیچے سو گئے۔ شاید ان کا تخلیقی مشن بھی ختم ہو گیا تھا۔ اور اس لئے زندگی ان کے لئے بہت بڑا بوجھ بن کر رہ گئی تھی۔ جب وہ لاہور میں تھے تو رات گئے تک لکھنے پڑھنے کے مشاغل میں مصروف رہتے، دوست احباب کے استفسار پر بتاتے کہ میں سونے سے پہلے آخری لمحہ تک کو استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ انھوں نے اتنی تیزی کے ساتھ ان لمحوں کے بطن سے تخلیق کا رس نچوڑا کہ ان کے اعصاب شل ہو گئے۔ تخلیقی طور پر وہ تمام عمر ایک شدید کرب کا شکار رہے انھوں نے زندگی کا جو ڈھانچہ بنا لیا تھا اس کی وجہ سے وہ ہمیشہ خود اذیتی اور ناآسودگی کی الجھنوں میں مبتلا رہے۔ ناآسودگی ان کے لاشعور کا حصہ بن چکی تھی۔ انہیں اس سے پیار بھی تھا اس لئے کہ ان کے تمام پسندیدہ ہیرو جن میں باؤ لیر اور پو بالخصوص قابلِ ذکر ہیں اسی ناآسودگی اور خود اذیتی کے کرب میں عمر کے آخری لمحے تک گرفتار رہے، روایت ہے کہ میراجی بمبئی کے ایک ہسپتال میں زندگی کے آخری ایام میں شدید بیماری کی حالت میں علاج کے لئے داخل کئے گئے۔ ایک پادری صاحب ہدایت دینے میراجی کے پاس تشریف لائے اور پوچھا۔

"آپ یہاں کب سے ہیں؟"

میراجی نے بڑی متانت سے جواب دیا "ازل سے۔"

میراجی کی روح ازل سے کرب کا شکار تھی، کرب کا شکار رہی اور کرب کا شکار ہے۔ میری نسل نے میراجی کو بچشم خود نہیں دیکھا، ہم نے انہیں کتابوں میں دیکھا اور کتابوں میں پڑھا ہے، ان کتابوں اور رسالوں میں میراجی کیسے نظر آتے ہیں؟ یہ مت پوچھئے۔ جتنے منہ اتنی باتیں، ان کے دوستوں نے انہیں ایک بدشکل جنسی اشتہار بنانے کی پوری پوری کوشش کی ہے اور وہ کامیاب رہے ہیں۔ خود میراجی کا جنس سے کیا تعلق تھا؟ اور ان کے اس تجربے کی اصل نوعیت کیا ہے۔ اس کے بارے میں کاروباری لوگوں نے بالکل نہ سوچا اور یوں ایک خوبصورت شاعر کو بدشکل جنسی اشتہار میں بدل دیا۔ ان لوگوں نے میراجی کا صرف ایک روپ دیکھا ہے، وہ میراجی جس کے ہاتھوں میں گولے ہیں، اور ان پر سگریٹ کی پنی چڑھی ہوئی ہے۔ جنسی تشنگی کا شکار ہے۔ سر پہ لمبے لمبے بال ہیں جو میل سے غلیظ ہو چکے ہیں۔ بے ہنگم مونچھوں اور داڑھی نے چہرے پر ڈیرہ ڈال رکھا ہے، میلے کپڑے ہیں، گندی شیروانی ہے۔ ہاتھوں میں میلے مسودات کا ایک پلندہ ہے، اور منہ سے بیئر کی بو آرہی ہے۔

میراجی جب اپنے ہیرو شاعر ایڈگر ایلن پو پر مضمون لکھ رہے تھے تو میرے خیال میں وہ قدم قدم پر پو سے اپنی شناخت کر رہے تھے۔ انہیں پو کی زندگی کے ان پہلوؤں سے دلچسپی ہے جو خود میراجی کو اپنی زندگی کا نمایاں حصہ بن چکے تھے۔ پو کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ حقیقت میں اپنی علمی شخصیت کا اظہار کر رہے تھے۔ پو کی شخصیت کے اسرار پر بحث کرتے ہوئے میراجی لکھتے ہیں کہ پو پر جو کتاب بھی انگریزی ادب میں لکھی گئی ہے اس میں ایک نیا نظریہ بیان کیا گیا ہے۔ کوئی اسے شرابی کہتا ہے۔ کوئی اعصابی مریض، کوئی اذیت پرست اور کوئی جنسی لحاظ سے ناکارہ ثابت کرتا ہے...... اور ان رنگارنگ خیال آرائیوں کی وجہ سے اصلیت پر ایسے پردے پڑ گئے ہیں کہ اٹھائے نہیں

بنتا ہے۔ میراجی کی شخصیت پر ایسے ہی کالے پردے ڈال دیئے گئے ہیں۔ اصل میراجی کو ان پردوں میں دبا دیا گیا ہے اور ایک اذیت پسند، غلط کار، کج رو میراجی کو ان کے دوستوں نے پینٹ کر دیا ہے۔

میراجی کو یہ بھی علم تھا کہ پردے کیسے ڈال دیئے جاتے ہیں، وہ جانتے تھے کہ ذہین لوگوں کی ذہانت اور زندگی کی متضاد کیفیتیں خارجی دنیا پر بھی متضاد عکس ڈالتی ہیں اور یوں ایسے لوگوں کی زندگی کے گرد روایات کا جال تن جاتا ہے، ان کا خیال ہے کہ ایسے بدنصیب انسان جن کی ذہانت میں عظمت کا جوہر موجود ہو خاص طور پر لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت ایک حکایت بن جاتی ہے۔ ان کی زندگی کے اردگرد روایات کا جال بن جاتا ہے۔ اور پھر اس حکایت اور ان روایات کی ہر کوئی من مانی شرح کرنے پر اتر آتا ہے۔ ایسے لوگوں کی ذہانت میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی اپنے طور پر وہ خوش قسمت ذہین لوگوں کی مانند ہوتے ہیں، لیکن بظاہر ان کی ذات میں دنیا کی کتنی الجھنیں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کی ذہانت اور زندگی کی متضاد کیفیتیں بیرونی دنیا میں بھی متضاد عکس ڈالتی ہیں۔ میراجی کے نقاد آج تک ان کی ذہانت زندگی کی متضاد کیفیتوں اور خارجی دنیا کے عوامل پر ان کے متضاد عکس کا عمل نہیں سمجھ سکے ہیں اور یوں میراجی پر ایک بہت پیچیدہ الجھی ہوئی اور مبہم شخصیت کا خول چڑھ جاتا ہے۔ اب آپ اس خول کو لاکھ اتاریئے مگر اتارے نہ بنے، خول متھ myth بن گیا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ متھ کو توڑنا کتنا کٹھن کام ہے۔

میراجی ظاہری زندگی سے زیادہ باطنی زندگی پر یقین رکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اصل حقیقت خارج میں نہیں باطن میں ہے۔ اس لئے انسان کو جو کچھ خارج میں نظر آتا ہے وہ باطن میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ خارج اکثر دھوکہ دے جاتا ہے۔ اگر اصلیت کی تلاش ہے تو خارج سے باطن کا سفر اختیار کرو۔ اس باطنی سفر میں حقیقت مل سکتی ہے۔

ان کے خیال میں یہ حقیقت محبت ہے۔ جو انسان کو انسان بناتی ہے۔ میراجی کی نظر میں انسان عالم تخلیق کی روح میں زندہ ہے، جو ہر تخلیق ہے۔ اور ہمارے تخیل کو بھانے والے

بہترین اجزا کا مرکب۔ اس بہترین مرکب کے بارے میں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم میں سے اکثر اس کے ظاہر کو دیکھ کر دھوکہ کھا جاتے ہیں اور ان کی نگاہیں اس بھید تک نہیں پہنچ سکتیں جو انسانیت کی اصلی بنیاد ہے حقیقتاً محبت ہی انسان کو انسان بناتی ہے۔ میراجی کے اس تصور کو دیکھ کر مجھے یوں لگا کہ جیسے میراجی کے اس ظاہر سے ہماری دو نسلیں دھوکہ کھا گئی ہیں، ہماری نگاہیں میراجی کے جسم پر جم کے رہ گئی ہیں۔ ہم ظاہر پرست لوگ کیا جانیں کہ جسم کے اس طرف کیا ہے، ہم نے تو محض یہ دیکھا ہے کہ میراجی کے ہاتھوں میں گولے ہیں اور سر پہ غلیظ بال، میلے کپڑوں اور میلے مسودات کا پلندہ اٹھائے ایک دبلا پتلا شخص لاہور کی سڑکوں پر بحالت نشہ گھوم رہا ہے، مگر ہماری نگاہیں اس بہترین مرکب کے جوہر تخلیق کو نہ پہچان سکیں کہ یہ جوہر اس کے باطن میں بصورت محبت موجود تھا۔ میلے کپڑوں والا میراجی اپنے اجلے باطن کی گہرائیوں سے آوازیں دے رہا تھا۔ پیارے لوگوں کو پیار کی آوازیں۔

اے پیارے لوگو
تم دور کیوں ہو
کچھ پاس آؤ
آؤ کہ مل لیں
یہ سب ستارے
تاریکیوں کے
اس پار ہوں گے
اے پیارے لوگو
میں تم سے مل کر
بہتر رہوں گا
ایسے اکیلے
یوں روتے روتے

آنسو بہیں گے۔
اور کچھ نہ ہوگا
تم پاس آؤ
پھر دیکھ لیں گے۔
دنیا ہے کیا کچھ
اور دین کیا ہے
پھر جان لیں گے
ہر سانس کیسے
آنکھیں جھپکتے
ان مٹ بنا تھا
لیکن محبت
یہ کہہ رہی ہے
ہم دور ہی دور
اور دور ہی دور
چلتے رہیں گے۔

محبت میراجی کی زندگی اور ان کے فن کا کلیدی استعارہ ہے اسی استعارے سے ان کی زندگی کا تانا بانا تیار ہوتا ہے اور اسی سے ان کے فن کی نمو پذیری ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا استعارہ جس میں دوریوں اور نایافت کا ایک مسلسل عمل ہے۔ کبھی نہ ختم ہونے والا عمل خارج میں ہر منظر دوری کا احساس دلاتا ہے۔ زمین پر آنے والے سہانے سمے، چمکتے ہوئے ستارے ہر ایک شے میراجی کی ذات سے دور ہے۔ زمین پر مسلسل تبدیلیوں کا یہ عمل جاری رہنے والا ہے مگر ان کے دل میں ایک جذبہ کو استحکام حاصل ہے اور وہ ہے چاہت کا وحشی نغمہ۔

ترا دل دھڑکتا رہے گا۔

میرا دل دھڑکتا رہے گا
مگر دور دور
زمین پر سہانے سمے آکے جاتے رہیں گے
یونہی دور دور
ستارے چمکتے رہیں گے
یونہی دور دور
ہر اک شے رہے گی
یونہی دور
مگر تیری چاہت کا جذبہ
وہ وحشی سا نغمہ
رہے گا ہمیشہ
مرے دل کے اندر
مرے دل کے پاس

میراجی تصور پرست انسان تھے۔ ان کی شاعری کا بنیادی محور ان کی تصور پرستی ہے۔ تصور ان کے لئے ایک مقدس شے ہے جو عبادت کا درجہ رکھتی ہے ان کے نزدیک "تصورات کی پوجا انسان کے خون میں کچھ اس طرح گھل مل گئی ہے کہ اس کی جبلت ہی معلوم ہوتی ہے، تصورات تخیل کی پیداوار ہیں، خیال کی لہریں ہیں اور اگرچہ خیال اور عمل میں بظاہر ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے اور آج کل کے سائنٹیفک زمانے میں عمل ہی کو اکثر لوگ برتر سمجھتے ہیں لیکن ہمیں اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ عمل بھی تاریخ کے دائرے میں داخل ہوتے ہی محض خیال بن کر رہ جاتا ہے اور اس لحاظ سے تخیل ہی اس زندگی میں ایک بنیادی چیز ہے۔ میراجی نے تخیل پسندی کو برصغیر کے ذہن کی نمایاں خصوصیت قرار دیا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ ہندوستانی ذہن روزمرہ کی چیزوں سے بھی آدرشی تصورات قائم کرتا ہے اور پھر ان تصورات کو مجسموں کی صورت میں ڈھال کر پوجتا ہے اور اسی چکر میں اس کی ذہنی

ندگی کا جذبۂ عبودیت کی تسکین ہوتی ہے، میراجی کا نظریہ یہ ہے کہ ہر ملک کے تخیل کا سب سے پہلا گہرا اور وسیع نقش اس ملک کی دیو مالا ہے۔ میراجی کا تخیل اس ہندوستانی دیو مالا کے وسیع نقش کی پیداوار ہے اور اس نقش نے تخیل کو پرندہ بن بنا دیا ہے جس میں میراجی تمام عمر کھوتے رہے۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میراجی کے نزدیک تصور پرستی، انسانی خون میں شامل ہو کر ...ں کی تقریباً جبلت بن گئی ہے اور یہی تصور پسندی ہندوستانی ذہن کی نمایاں خصوصیت ہے۔ انہوں نے تصور پسندی پر کیوں زور دیا ہے؟ اس لئے کہ وہ خود اپنی شاعری میں اس کا جواز پیش کرنا چاہتے تھے۔ میراجی نے تخیل پسندی کا سفر کب شروع کیا، اس کے بارے میں ہمیں کچھ پتہ نہیں۔ لیکن یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابتدائے جوانی کا زمانہ ہوگا جب انسان پر تصور پسندی غالب آتی ہے۔ میراجی کے تخیل پسندی کے طویل سفر میں جو مدتوں جاری رہا بالآخر ایک موڑ آیا جہاں وہ اچانک رک گئے اور ان پر ایک خوشگوار حیرت طاری ہو گئی۔ انہیں ایک ایسا نقش مل گیا تھا جس کے لئے انہوں نے زمانوں کی خاک چھانی تھی۔ یہ میراسین تھی ... میراسین .... ایک دبلی پتلی سانولی بنگالی لڑکی ... جس نے میراجی کے ذہن کو بنا دیا۔ کہتے ہیں میراسین معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی۔ ہوگی۔ ہمیں اس سے کیا۔ پھر میراجی نے میراسین میں کیا دیکھا؟ عمر بھر میں صرف ایک بار اس سے مخاطب ہوتے۔ کبھی اس کا قرب حاصل نہ ہوا۔ پھر یہ کیسے ہوا کہ ثناء اللہ میراجی بن گیا؟ اس کا جواب بھی میراجی ہی سے سن لیجئے۔ وہ کہتے ہیں۔

"نفسیات کے ماہرین بتاتے ہیں کہ یہ اعصابی مریض کی بنیادی خصوصیت ہے کہ وہ ایک افسانے کے بل پر زندگی گزارتا ہے۔ اور اس کا یہ عمل اس افسانے کو حقیقت بنانے کے لئے ایک براہ راست یا بالواسطہ کوشش ہوتی ہے۔ اس کی تمام حرکات اور افعال کا یہی ایک مقصد ہوتا ہے۔ ابتدا میں احساس کمتری کے باعث اپنے آپ پر اعتماد پیدا کرنے کے لئے یا اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے وہ افسانہ طرازی کرتا ہے اور پھر اس کی یہی کوشش

ہوتی ہے کہ وہ اس افسانے کو حقیقت کی صورت دے دے:

میرا سین۔ محض افسانہ نہیں تھی، ایک زندہ حقیقت تھی، لیکن ایک لمحاتی حقیقت جسے میراجی نے افسانہ بنایا اور پھر اسے حقیقت کا روپ دے کر ایک ابدی حقیقت بنا دیا۔ میراجی کی ساری عمر پھر اسی افسانے اور حقیقت کے مختلف روپ اور بہروپ دکھاتے گزر گئی۔ چنڈی داس لکھتا ہے کہ "سچا عاشق بننا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی سانپ کے منہ میں کسی مینڈک کا ناچنا" میراجی آخری لمحے تک یہ مینڈک ناچ ناچتے رہے۔ محبت ان کی زندگی کا کلیدی استعارہ بن گئی تھی۔ اسی استعارے کے سہارے ان کا تخلیقی سفر جاری رہا، میراجی کے نقاد اگر اس استعارے کے اندر سفر کرتے تو میراجی کو پا لیتے۔ وہ میراجی جن کے اندر انسانوں کے لئے اور کائنات کی ہر شے کے لئے محبت کا ایک سمندر موجزن تھا مگر یہ نقاد میراجی کے ظاہری خول کو دیکھتے رہے، وہ خول جس پر ایک بد ہیئت تصویر چسپاں تھی۔

غالب لائبریری

میں

اس وقت آٹھ ہزار کتابیں اور کوئی پچیس ہزار رسائل ہیں۔ ان میں نوے پچانوے فیصد عطایا ہیں جو اداروں اور آپ جیسے اہل خیر نے دیئے ہیں۔ اس کتب خانے سے محققین، معلمین، متعلمین اور دوسرے ناظرین استفادہ کرتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اپنی مملوکہ کتابوں اور رسائل میں سے کچھ غالب لائبریری کو ضرور عطا فرمائیں گے۔

پوسٹ بکس ۲۲۶۸ ناظم آباد کراچی نمبر ۱۸۔

ٹرسٹن برنارڈ

پیرس کا سب سے بذلہ سنج ڈرامہ نگار

مسکراہٹوں کے سفیر کا لقب جس فرانسیسی ڈرامہ نگار کو دیا گیا اس نے ساری عمر سب کو ہنسایا مزاح اس کی زندگی کا جزو اعظم تھا جانے انجانے ہر قسم کے لوگ اسے اس کے نام کے پہلے جزو ٹرسٹن سے مخاطب کرتے تھے۔ کسی نے اسے ٹیلیفون کیا "میں آپ سے نیاز حاصل کرنا چاہتا ہوں" ٹرسٹن نے جواب دیا "شوق سے تشریف لائیں۔ بہتر ہوگا صبح کے وقت زحمت کریں وہی میرے کام کا وقت ہوتا ہے۔" ایک رات کام ختم کر کے سونے کی تیاری کرنے لگا اور اپنی ملازمہ سے کہا "ایلیزا مجھے صبح سات بجے جگا دینا۔ اگر میں آٹھ بجے تک نہ اٹھ جاؤں تو دوپہر تک میرے آرام میں مخل نہ ہونا۔"

ٹرسٹن کا ایک کھیل اسٹیج ہو رہا تھا۔ اس کے ایک دوست نے ٹیلیفون پر درخواست کی کہ اسے ایک مفت ٹکٹ دے۔ ٹرسٹن نے انکار کر دیا۔ دوست نے سبب پوچھا تو جواب دیا "اس لئے کہ ہم ایک ٹکٹ نہیں بلکہ پوری صف دیتے ہیں۔" لطف و مزاح اس کی نس نس میں تھا اور وہ کبھی نہیں چوکتا۔ ایک بار ٹرسٹن کہیں سے گزر رہا تھا کہ ایک قلی اس سے ٹکرا گیا جو اپنی پیٹھ پر بڑی بھاری گھڑیال لادے جا رہا تھا۔ اس ٹکر پر ٹرسٹن نے قلی سے کہا "ارے یار تمام لوگوں کی طرح تم ہاتھ کی گھڑی کیوں نہیں استعمال کرتے۔"

آپ ایک ہوٹل پہنچے کھانے کا آرڈر دیا۔ بیرا پہلے سوپ لایا۔ ٹرسٹن نے کہا "معاف کرنا میں سوپ نہیں پی سکتا۔" بیرا سوپ واپس لے گیا اور کوئی دوسری قسم کا سوپ لایا جس پر آپ نے کہا "میں دوبارہ معذرت خواہ ہوں سوپ نہیں پی سکتا۔" دوبارہ کے انکار پر ہوٹل کا مینیجر بھاگا بھاگا آیا کہ آج تک ہر کوئی اس کے ہوٹل کے سوپ کی تعریف کرتا رہا ہے مگر ٹرسٹن کو اس میں کیا خرابی نظر آئی تھی استفسار کیا تو ٹرسٹن نے جواب دیا "سوپ ضرور خوش ذائقہ ہوگا مگر میز پر سوپ کا چمچہ تو نہیں ہے۔"

اکیڈمی فرانس نہایت محترم ادارہ اور اس کی رکنیت کی شرائط بے حد کڑی ہیں۔ اس عہد میں سخت سکہ رکنیت کے تھے۔ جس ادیب کو اعلیٰ درجے کے کاغذ پر بڑی احتیاط کے ساتھ نفیس

خط میں درخواست لکھ کر اکیڈیمی کے مستقل سیکرٹری کے پاس بھیجنی ہوتی ہے۔ درخواست کے متن کی بابت یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ خود اپنی جگہ ایک ادب پارہ ہوگا۔ ٹرسٹن نے ایک معمولی کاغذ پر چند سطریں گھسیٹ ڈالیں۔ درخواست اکیڈیمی کے مختلف شعبوں سے گذر کر جہاں ہر ایک کو اس اول ٹپ درخواست پر حیرت ہو رہی تھی مستقل سیکرٹری تک پہنچی۔ سیکرٹری دیکھ سے جانبر ہوا ہی تھا کہ ٹرسٹن کی ایک اور تحریر پہنچ گئی جس میں اس نے لکھا تھا میں اپنی پچھلی درخواست پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اکیڈیمی کا رکن نہ بنوں۔ اس اکیڈیمی کے لئے جس قسم کا لباس مقرر ہے وہ بہت قیمتی ہے اس لئے میں اس وقت تک انتظار کروں گا جب تک کہ میرے قد و قامت کا کوئی رکن مر نہ جائے۔

لباس کے معاملے میں بہت لاپروا تھا۔ بری طرح خراچ بھی تھا۔ بہت روپیہ کمایا مگر معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کہاں خرچ یا ضائع ہوتا ہے۔ ایک ایسا وقت بھی آیا جب وہ قریباً دیوالیہ ہو چکا تھا۔ وکیل نے ٹرسٹن کو بہت ڈانٹا بالکل اس طرح جیسے بچوں کو ڈانٹتے ہیں اور سختی سے ہدایت کی کہ اپنے اخراجات میں کمی کرے۔ بینک دی فرانس میں اس کا کھاتہ تھا۔ وہاں پہنچا اور بچی کھچی پونجی نکال لی تاکہ قرض چکا سکے۔ دروازے پر بینک کا ایک مسلح سنتری کھڑا تھا۔ ہاتھ میں بندوق، کاندھے سے کارتوس کی پیٹی لٹکی ہوئی تاکہ بینک پر ڈاکہ نہ پڑ سکے۔ آپ نے اس سنتری سے کہا "شکریہ دوست اب تم گھر جا سکتے ہو"

ٹرسٹن کی فیاضی یا فضول خرچی کی کہانیاں آوارہ گردوں تک پہنچیں تو انہوں نے بھی خوب فائدہ کمایا۔ ایک آوارہ گرد مستقل طور پر اس جگہ کھڑا رہنے لگا جہاں سے ٹرسٹن روز گذرتا تھا۔ ایک دن اس آوارہ گرد کو اس کے روزانہ کے کھڑے رہنے کی جگہ پر دیکھ کر ٹرسٹن نے ایک اچھی خاصی رقم کا بینک نوٹ اسے دیا اور کہا میں کل نارمنڈی جا رہا ہوں۔ یہ وہ مہینے کی پیشگی رقم ہے۔ آخر تمہیں بھی تو چھٹی کرنے کا حق ہونا چاہیئے"

۱۹۴۴ء میں اس کی عمر ۷ سال تھی۔ وہ یہودی تھا اس لئے فرانس پر قبضہ پانے کے بعد جرمنوں نے اسے بھی گرفتار کر لیا اور ڈرینسی کے بدنام زمانہ "دہشت کیمپ" میں بھیج دیا۔ ریلوے ویگن کے دوسرے ٹھنسے ہوئے لوگوں سے اس نے کہا "دوستو اب تک ہم ہر اس

میں گنڈار سے مجھے اب نہیں کسی آس میں جینا ہے۔" دشمن کی جان بچ گئی۔ پیرس واپس آگیا مگر سماعت کی قوت کھو چکا تھا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ سننے کا آلہ لگا لو۔ کہنے لگا کیا فائدہ وہی سُنی ہوئی باتیں بار بار سننے کو ملیں گی۔ زندگی کے آخری دنوں میں کہتا تھا غموں نے مجھے تبدیل نہیں کیا۔ مجھے ایک چیز سے نفرت ہے۔ اور وہ ہے نفرت" (ماخوذ)

عربی ایرانی اور ہندی ڈرامہ

مخدوم محی الدین

[۱۹۳۰ء میں جامعہ عثمانیہ کے ایم اے کے امتحان کے لئے لکھے ہوئے مقالے کا ابتدائی حصہ ۔]

اردو میں بڑے بڑے باکمال شعرا پیدا ہوئے۔ جنہوں نے تمام اصناف سخن سے زبان کو مالا مال کیا۔ غزلیں، واسوخت، مرثیے اور مثنویاں لکھیں مگر ایک عرصہ تک کسی نے ڈرامہ نہ لکھا۔ واجد علی شاہ تاجدار اودھ کے عہد تک اردو زبان ڈرامہ کے عنصر سے ناآشنا ہی رہی۔ امانت پہلا شخص ہے جس نے اندر سبھا کے نام سے ایک غنائیہ لکھا اور ڈرامہ کی صنف کو مقبول بنایا۔ امانت کی اندر سبھا کا اردو میں وہی درجہ ہے جو نکولس اوڈل کے طربیہ "رالف رائسٹر ڈائسٹر" کا انگریزی ادب میں ہے۔ اس لئے ہم امانت کو اردو ڈرامہ کا ابوالاباء کہہ سکتے ہیں۔

یونانی اور ہندی ڈرامہ کی طرح اردو ڈرامہ کا آغاز معبدوں اور مذہبی تہواروں سے نہیں ہوا بلکہ اودھ کے نشاط افرین دربار میں جنم لیا اور عیش و عشرت شعر و موسیقی کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ یہی وجہ ہے کہ پہلا ہی ڈرامہ غنائیہ بجز اپنے زمانہ کے عیش پرستانہ واقعات کا سچا مرقع ہے

یہ سمجھنے کے لئے کہ کیوں ایک طویل عرصہ تک ڈرامہ سے اردو کا دامن خالی رہا ہمیں زبان کی ترکیب اور اس کی عنصری سرپرست زبانوں کے ادب پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

ہندوستان میں مسلمان حملہ آوروں اور فاتحین کی زبان فارسی تھی جس پر عربی کا اثر و تسلط تھا اور مفتوح ہندوؤں کی زبان مختلف پراکرتوں پر مشتمل تھی۔ ہندو اور مسلمانوں کے تصادم نے باہمی اجنبیت اور کھنچے پن کو دور کرنے کے لئے ایک درمیانی راہ نکالی۔ ہر فریق اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے مجبور تھا کہ فریق ثانی کی

زبان سے تعلق پیدا کرے اور اس سے کچھ لے۔ چنانچہ ضرورت کے اسی دباؤ نے ایک نئی
کی بنیاد ڈالی جس میں فارسی اور مقامی بولی برج بھاشا کی آمیزش تھی اور اسی نے ریختہ ریختہ اردو
کی شکل اختیار کر لی۔ عربی آمیزش فارسی اور کسی قدر سنسکرت آمیزش برج بھاشا اردو کے
اجزائے ترکیبی بن گئے۔

بہ نسبت سنسکرت اور ہندی کے عربی اور فارسی اردو کے زیادہ معاون رہے ہیں۔ اسی
وابستگی کا نتیجہ ہے کہ اردو شاعری اب تک فارسی سانچوں اور فارسی روایات سے خود کو
علیحدہ نہ کر سکی۔ چونکہ فارسی کے خون میں ڈرامہ کا عنصر تھا ہی نہیں اس لئے اردو بھی جو بالکل
فارسی کے قدم بہ قدم چل رہی تھی اس صنف ادب سے بیگانہ ہی رہی۔

عربی ڈرامہ

اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے ہمیں عربی اور فارسی ادب کا جائزہ لینا ضروری ہے۔
عربی ادب کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ اس میں ڈرامہ نہایت ہی ابتدائی مدارج سے
آگے بڑھ نہ سکا۔ چنانچہ اب تک بھی ڈرامہ کا یہ قحط موجود ہے۔ اب جو کچھ بھی سرمایہ پیدا
ہو گیا ہے اس کی نوعیت مغربی تراجم یا زیادہ سے زیادہ مغربی نمونوں کی تقلید میں لکھے ہوئے
ڈراموں سے بڑھ کر نہیں، ہاں اس سے پہلے ان کی بجائے مقامات یا چھوٹے چھوٹے افسانے
اور مکالمے رائج تھے جن پر مشکل سے ڈرامہ کا اطلاق ہوتا ہے۔

راوی

عرب میں زمانۂ قدیم میں راویوں کا گروہ تھا جو بازاروں، میلوں اور خاص خاص تقریبوں
کے موقع پر الف لیلا کے قصے بیان کرتا۔ جیسا کہ خود ان قصوں سے واضح ہوتا ہے۔ ان میں
خاص ڈرامائیت موجود ہے۔ راوی انہی قصوں کو ڈرامائی شان سے بیان کرتے تھے۔
جذبات کی مطابقت کے لحاظ سے چہرے کا اتار چڑھاؤ۔ آواز اور لہجے کا تغیر و تبدل، ہاتھ
پاؤں اور جسم کے دیگر اعضا۔ کی موزوں و مناسب حرکتیں بیان میں قوت اور ڈرامائیت پیدا

کرتی تھیں۔ اس قسم کے عوامی ادب کو "مقامات" کی صورت میں حریری، ہمدانی اور دیگر شعراء نے بام کمال پر پہنچایا۔ مقامات میں گداگروں، سیاحوں، عالموں اور قومی جاں بازوں کی تقریریں اور ان کے کارنامے نہایت واضح اور پُراثر انداز میں بیان کئے گئے ہیں، یہ جواہر پارے اب بھی عربی ادب کے ناقابلِ فراموش اجزاء ہیں۔

خیال الضل

ڈراماتی فن کی ایک شکل کو جسے عربوں نے ترقی دی وہ پتلیوں کے تماشے ہیں جسے "خیال الضل" کہا جاتا ہے۔ اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ فن خود عربوں کی اختراع نہیں بلکہ دوسروں سے ماخوذ ہے۔ ان تماشوں سے متعلق جتنی بھی معلومات ہیں وہ علامہ جیکب کی مرہونِ منت ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر تحقیق کی۔ ان ہی تحقیقات کی روشنی میں یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے یہ فن مشرقِ بعید سے حاصل کیا۔ مسلمانوں میں کس دور کے اور کہاں کے مسلمانوں نے اس عجیب و غریب ناٹکی فن کو ترقی دی کہنا مشکل امر ہے۔ مگر آثار اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب مسلمانوں نے اس فن کو حاصل کیا۔ ابنِ ہگر کی روایت ہے کہ بارہویں صدی عیسوی میں سلطان صلاح الدین کے سامنے قاہرہ میں اسی قسم کے تماشے دکھائے گئے۔

مقلدی یا حاکی

ابنِ ہگر کے قول کے مطابق عربوں میں اداکاری کا قدیم ترین نمونہ ان کے فن "مقلدی" میں ملتا ہے۔ حاکی یا مقلد اس شخص کو کہتے تھے جو مختلف قبیلوں کی زبان ان کے تلفظ اور مخرج کے علاوہ مختلف جانوروں اور پرندوں کی بولیوں کی نقل کیا کرتا تھا۔ جدید مصر میں اب بھی اس قسم کی دلچسپی پیدا کرکے روزی کمانے والے افراد پائے جاتے ہیں۔ گو اب ان کا نام مقلد نہیں رہا۔

لہ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن جلد ۴ عربی ڈرامہ

غرض ایسی ابتدائی شکلیں ہر ملک اور زبان میں موجود ہوتی ہیں مگر ہم انہیں حقیقی معنوں میں ڈرامہ نہیں کہہ سکتے۔ باوجود ان ابتدائی ڈرامائی عناصر کے عربوں نے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے باضابطہ ڈرامہ کی صورت نہ دیکھی اور اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ عرب کسی زمانہ میں بھی قومی اسٹیج کے مالک رہے ہوں۔ ڈرامہ کا یہ افلاس پوری سامی اقوام پر مسلط ہے واقعات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ڈرامہ سامی مزاج کے موافق ہی نہیں تھا۔

اسلام نے عربوں کی بت پرستانہ اور توہمانہ ذہنیت کا سدِ باب کر کے توحید کا ایسا اعلیٰ اور مکمل تخیل پیش کیا کہ زندگی کا سنگین سے سنگین واقعہ مشیت ایزدی کہہ کر ٹال دیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے افراد کی جذباتی آوارگی اور ذہنی بے چینی کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ محرکات فنا ہو گئے جس کی وجہ سے ڈرامہ یا اور کوئی تخلیقی ادب پیدا ہوتا ہے۔ اسلام عمل کا مکمل نمونہ بن کر طلوع ہوا اور عرب اس نئے نظامِ زندگی کو لے کر دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئے تاکہ دنیا کو اس کا عامل بنائیں۔ ان کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ انہوں نے اپنی انفرادیت کو گرنے نہ دیا۔ اسی انفرادیت، احساس خودی، مسلسل کش مکش اور رزم آرائی نے انہیں فرصت نہ دی کہ وہ غیر ملک کے اصناف ادب پر توجہ کرتے اور یوں بھی اسلام کا رجحان فنونِ لطیفہ کے مقابلہ میں ہمیشہ معاندانہ ہی رہا۔ اسلام کی اس افادیت پسندی نے جمالیاتی پہلو کو اس درجہ معطل کر دیا کہ اب تک یہ کمی پوری نہ ہو سکی۔ پہلے تو عربوں میں ڈرامہ تھا ہی نہیں اور اگر مفتوح اقوام سے تعلق پیدا ہونے کے بعد اس صنفِ ادب سے آشنائی ہوئی بھی تو اسے لہو و لعب اور اپنے مسلک کے خلاف تعبیر کر کے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔

ایران

علامہ دوزی کا بیان ہے کہ ایران میں ڈرامہ قدیم الایام سے ہے ممکن ہے ناٹک کی ابتدائی شکلوں کے آثار عہد عتیق میں پائے جاتے ہوں۔ مگر بعد اسلام فارسی میں عربی تمدن اور معاشرت کی بدولت ایک مدت تک ڈرامہ کا وجود کالعدم رہا۔ ایرانی ایک زمانہ تک عربوں ہی کی سنت پر کاربند رہے مگر جب سولھویں صدی عیسوی میں ایران میں شیعیت کو فروغ

ہوا تو اہل فارس نے شہدائے کربلا سے عقیدت کا اظہار کر کے ثواب دارین حاصل کرنے اور محبت اہل بیت کو مستحکم کرنے کے لئے تعزیہ ایجاد کیا۔

یہ مجالس تعزیہ محرم کے ابتدائی دس دن منعقد ہوتی ہیں جس میں شہدائے کربلا کی مصیبتوں کو تمثیل کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے۔

ایران میں ڈرامہ کو تمثیل کہتے ہیں جس کے لغوی معنی "صورت بستن کسے را" کے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک انفرادی اور دوسری مجلسی۔ انفرادی تمثیل مغرب کے مونولوگ، ہند کے بھاؤنا اور عرب کے راوی اور مقلد کے مترادف ہے۔ مجلس کی دو قسمیں ہیں ایک تماشا (طربیہ یا فارس) دوسرے تعزیہ (حزینہ)۔

تماشا کرنے والوں کو لوطی یا تماشچی کہا جاتا ہے جن کی حیثیت مداریوں، داستان گویوں سے زیادہ نہیں مگر جو لوگ محرم میں مصائب کربلا نہیں بیان کرتے ہیں انہیں مردمہ خواں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ گروہ ایرانی سوسائٹی کے لوازمات سے ہے۔

تعزیہ

سولہویں صدی سے انیسویں صدی تک تعزیہ میں صرف مرثیہ خوانی ہوا کرتی تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ساتھ تعزیوں نے تمثیلی رنگ اختیار کیا۔ ان تعزیوں کے لکھنے والے کون تھے نہیں بتایا جا سکتا عموماً ہوتا یہ تھا کہ اداکاروں کو واقعات سمجھا دیئے جاتے تھے اور ہر اداکار اپنا اپنا مکالمہ بروقت برجستہ اور فی البدیہہ خود ہی بنا لیتا تھا۔

تعزیئے عموماً کھلی ہوا میں پیش کئے جاتے تھے۔ باقاعدہ مستقل اسٹیج اور پردوں سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ ایک معمولی اور عارضی چبوترہ اسٹیج (مصطبہ) کا کام دیتا ہے۔ ایکٹر کے آنے جانے کے لئے اس کے گرد کچھ فاصلہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ چبوترے سے باہر تماشا بینوں کی نشستوں کا انتظام ہوتا ہے۔ تمثیل شروع ہونے کے اعلان کے لئے بندوق یا توپ سر کی جاتی۔ اصل تمثیل شروع ہونے سے پہلے پرولوگ یا مکمہ کے طور پر تعارفی تمثیلچہ ہوتا ہے تاکہ آئندہ واقعات کے لئے فضا پیدا ہو جائے۔ مثلاً تیمور اسٹیج پر آ کر حضرت حسینؑ کی شہادت

کا ماتم کرتا ہے۔ خوارج کے خلاف انتقام اور غصے کے جذبات بھڑکاتا ہے۔ یا برادرانِ یوسف کی بے وفائی کا نظارہ دکھا کر امتِ محمدیہ کے ایک گروہ کی آلِ رسولؐ سے برسرِ پیکار ہونے کا امکان ظاہر کیا جاتا ہے۔ پھر خود حضرتِ امام تشریف لا کر دعا کرتے ہیں کہ قیامت کے دن ان کی شفاعت ہو۔ آخر میں ایک منظر دکھایا جاتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دعا مستجاب ہو گئی۔ اور ان لوگوں کے لئے جنت کے دروازے کھل گئے جنھوں نے سید الشہداء کی مدد کی یا ان کی یاد میں ایک آنسو بھی بہایا۔ اس کے بعد اصلی تعزیہ شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے سقوں کی ایک جماعت مشکیزے اٹھائے "یاد تشنہ لب کربلا" کے نعرے لگاتی ہوئی داخل ہوتی ہے۔ یہیں سے ماتم شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد تعزیے کے دوسرے ارکان داخل ہوتے ہیں جن میں رسول اللہؐ، دیگر انبیاء، فرشتے، پنج تن پاک، دیگر اہلِ بیت، اصحاب ثلاثہ، حرؒ، معاویہ، یزید اور شمر ابن سعد شامل ہوتے ہیں۔ احتراماً پیغمبروں، فرشتوں اور عورتوں کے کردار چہرہ پر نقاب ڈالے ہوئے ہوتے ہیں۔ مکالمے بہت پُر اثر اور دلدوز ہوتے ہیں جس کی وجہ سے حاضرین کے جذبات میں انتہائی ہیجان پیدا ہوتا ہے اور انتقام کے جذبہ کی فراوانی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ شمر اور یزید کے ایکٹروں پر زبانی لعن طعن کی بارش ہوتی ہے اور آخر میں مار پیٹ سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا۔ اس لئے یہ کام قیدیوں کو دیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے رام لیلا، کرشن لیلا، یورپ کے پیشن پلے اور ایران کے تعزیوں کی ایک ہی نوعیت ہے۔ جس طرح ہندو اور عیسائی ڈراموں میں پنڈت، برہمن اور کلیسا کے پادری ہی اداکاری کی خدمات انجام دیتے تھے اسی طرح تعزیوں میں بھی شرفاء اور معززین ہی کام کرتے تھے۔ ایسا کرنا حصولِ برکت اور ثوابِ دارین کا وسیلہ خیال کیا جاتا تھا۔ غرض یہ طرزِ تمثیل پورے اسلامی تمدن میں آپ اپنی مثال ہے۔ جو سرتاپا عجمی ہے۔ افسوس کہ ان روایات کی بنیادوں پر ادبی ڈرامہ کی مستقل عمارت کھڑی نہ ہو سکی۔

تعزیہ اودھ میں

جب مذہبی اعتبار سے اودھ کی سلطنت دولتِ صفویہ کی جانشین قرار پائی اور حکومت

کا مذہب شیعہ ہو گیا تو وہ تمام مراسم جو شیعہ تمدن کے جزو تھے لکھنؤ میں بھی منتقل ہو گئے۔ چنانچہ ایران کا تعزیہ بھی ہندوستان میں آیا۔ جس میں امراء کی جدت طراز طبیعتوں نے بہت کچھ اضافے کئے۔

جب شیعیت کو شاہی سرپرستی نصیب ہوئی تو لکھنؤ کے امام باڑے مذہبی اسٹیجوں کا منبر بن گئے۔ شرر کا بیان ہے کہ "غفران مآب کے امام باڑے میں نویں محرم کو جو مجلس ہوتی تھی وہ خاص شان اور امتیاز رکھتی تھی۔ جس میں شریک ہونے کے لئے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ اثنائے بیان میں حاضرین کے سامنے اونٹ لائے جاتے تھے جن پر سیاہ پوش کجاوے اور محملیں ہوتیں اور مومنین کو وہ منظر یاد آجاتا کہ دشتِ کربلا میں اہلِ بیت کا لوٹا مارا تباہ شدہ قافلہ کس مظلومی اور ستم زدگی کی شان سے شام کی طرف چلا تھا۔ مجلس پر اس المناک منظر کا ایسا اثر پڑتا کہ ہزارہا حاضرین میں سے دس بیس کو غش ضرور آجاتا جو بڑی مشکلوں سے اٹھا کر اپنے اپنے گھروں کو پہنچائے جاتے تھے۔"

"محرم کی مجلسوں میں اسی ڈرامائی عنصر کے شامل ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجلسوں میں وقتاً فوقتاً تھیٹر کے ایسے پردے کھلتے جن کے ذریعہ واقعات کربلا کے پُرالم مناظر پیشِ نظر کر دیئے جاتے۔ زنانی اور مردانی مجلسوں میں ذاکروں کی حدیث خوانی کی بجائے اسٹیج پر کربلا کے واقعات کی تمثیل کے ذریعہ دکھلایا جاتا تھا۔"

تعزیہ اور دکن

ہندوستان میں ان تعزیوں کا ایک اور بڑا اہم اور قدیم مرکز قطب شاہیوں کا دکن ہے۔ تاجدارانِ قطب شاہی کی سرپرستی میں مراسم عزا نے بھی خاص ترقی کی۔ غلامی، ہاشم، قادر، وجہی جیسے عدیم المثال مرثیہ گو شاعر پیدا ہوئے۔ اور محرم نے اتنی اہمیت حاصل کر لی کہ یہ کسی خاص فرقے کا تہوار نہ رہا بلکہ اس میں ہندو، شیعہ، سنی سب برابر کے حصہ دار بن گئے۔ سب علم ... کرتے ہیں۔ مرثیے پڑھتے ہیں۔ علموں پر منتیں چڑھاتے ہیں۔ ان مراسم کے ساتھ ساتھ دکن میں ایرانی تعزیہ کی صورت بھی برابر جاری رہی۔ پندرہ سال پہلے تک حیدرآباد میں ایسی مجلسیں ہوتی تھیں جن میں واقعات کربلا کو تمثیل کے ذریعے پیش کیا جاتا تھا۔ جس میں باضابطہ اسٹیج اور

پردے استعمال کئے جاتے۔ خوش اعتقادی کے ساتھ شرفا۔ اداکار بنتے۔ چنانچہ عون و عباس کے ہاں محرم میں دسویں تک اسٹیج اور پردوں کے ساتھ روزانہ واقعات کربلا اداکاری کے ذریعہ پیش کئے جاتے تھے۔ مناظر ایسے دردناک ہوتے اور ان کا اثر حاضرین پر ایسا ہوتا کہ ماتم میں اداکاروں اور مجلسیوں کا امتیاز اٹھ جاتا۔ جس کی وجہ سے منظر صد درجہ دل ہلا دینے والا بن جاتا۔

اعلیٰ حضرت حضور نظام میر عثمان علی خاں بہادر نے اپنی اصلاحات کے سلسلہ میں اس قسم کی مجلسوں کو موقوف فرما دیا۔

اداکارانہ مظاہروں کے سلسلہ میں محرم بہت اہمیت رکھتا ہے، سانگ اور رنگ ڈرامہ کی ابتدائی شکلیں کچھ عرصہ پہلے تک عوام میں رائج تھیں جن کے مظاہرے لیلیٰ مجنوں اور گونہ کے ناچ کی صورت میں محرم کے دنوں میں سڑکوں پر ہوا کرتے تھے۔ ان واقعات پر آئندہ صفحات میں روشنی ڈالی جائے گی۔ یہاں صرف ایرانی ڈرامہ پر تبصرہ کرنا مقصود تھا۔ مگر تعزیہ کے سلسلہ میں ضمناً ہندوستان کا ذکر بھی ناگزیر ہو گیا۔

مندرجہ بالا واقعات کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ قدیم ایران میں باضابطہ ڈرامہ کا وجود نہیں ہے۔ البتہ تعزیوں کا وجود ملتا ہے جن کا دائرہ عمل واقعات کربلا اور مصائب اہل بیت تک ہی محدود ہے۔ یہ تعزیے انیسویں صدی کی پیداوار ہیں جن کی حیثیت ادبی نہیں بلکہ روایتی اور صرف تمثیلی ہے۔ اگر موضوع کو بدلا جاتا تو انہیں بنیادوں پر مستقل قومی ڈرامہ کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی۔ اور زندگی کے مختلف النوع پہلوؤں کو تمثیل اور اداکاری کے ذریعہ پیش کیا جا سکتا تھا۔ یورپ کے تمدن اور تہذیب کے زیر اثر ہندوستان، مصر، ترکی اور ایشیا کے دیگر نو بیدار ممالک کی طرح اب ایران نے بھی یورپی ادب سے خوشہ چینی شروع کی ہے۔ اپنی زبان کو مغربی ادبیات کے تراجم سے مالا مال کر رہی ہے۔ جدید ایران میں طبع زاد ڈرامہ لکھنے والے بھی موجود ہیں جو فنی اعتبار سے مغرب کے پیرو ہیں۔

ہندی ڈرامہ

عربی اور فارسی ڈرامہ کے ذکر کے بعد ہندی ڈرامہ کا تذکرہ ضروری ہے۔ کیونکہ اردو

ڈرامہ کی پیدائش میں ہندی ڈرامہ کا اتنا ہی درجہ ہے جتنا کہ خود اردو زبان کی تعمیر میں دور برج بھاشا کا۔ ہندی ڈرامہ قدیم الایام سے نہایت مدون اور ترقی یافتہ شکل میں موجود ہے۔ ہندوستان میں فن ڈرامہ کی ابتدا۔ چوتھی صدی قبل مسیح سے ہوتی ہے۔ مو چہ کٹک (مٹی کی رتھ) قدیم ترین ہندی ڈرامہ ہے جس کی تصنیف دو سال قبل مسیح بتلائی جاتی ہے۔ بکرما جیت کے زمانہ میں کالی داس نے اعلیٰ پایہ کے ڈرامے لکھے۔ کالی داس کے ڈراموں میں شکنتلا اور وکرم اروسی مشہور ڈرامے ہیں۔ جو اپنی شاعرانہ اور نفسیاتی نزاکتوں اور رفعتِ خیال کی وجہ سے عدیم المثال ہیں۔

فرخ سیر کے زمانہ میں نواز نامی ایک درباری شاعر نے شکنتلا کا ترجمہ فارسی آمیز پراکرت میں کیا تھا جس کو بعد میں فورٹ ولیم کالج کے صدر گلکرائسٹ نے اردو میں ترجمہ کروایا۔ مترجمین لطف علی جوان اور للولال کوی ہیں۔ نواز کا ترجمہ دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ البتہ فورٹ ولیم کالج کا ترجمہ اردو نثر کی صورت میں اب بھی موجود ہے۔ وکرم اروسی کو عزیز مرزا نے اردو میں منتقل کیا ہے۔ جس کے ساتھ ہندو ڈرامہ پر ایک پر از معلومات مقدمہ بھی ہے۔ بعد میں سری ہرش دیو۔ بھوبھوتی دکھنی۔ رام بھیلا دکھنی، ہنومان بھٹ کنچن اچاریہ ملاتی۔ دشکاوت، کرشن مصر جیسے اعلیٰ ڈرامہ نگار پیدا ہوئے۔

ہندوؤں نے اور فنون لطیفہ کی طرح ڈرامہ کو بھی دیوتاؤں سے منسوب کر کے اسے مذہبی رنگ دیا ہے۔ چنانچہ بھرت نامی ایک رشی اس فن کے باوا آدم بتاتے جاتے ہیں جنہوں نے "بھرت نٹ شاستر" کے نام سے فن ڈرامہ پر ایک کتاب (ناٹک ساگر) لکھی۔

ہندوؤں نے شاعری (موسیقی) کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک درسیا سنگتا، دوسرے سرو یا سنگتا۔ درسیا سنگتا کا تعلق بصارت اور سماعت دونوں سے ہے۔ جس میں ابھی نایا (اداکاری) کے ذریعہ اعلیٰ اور اسفل کردار اسٹیج پر پیش کئے جاتے ہیں۔

اس کی دو قسمیں ہیں ایک روپک دوسرے اپ روپک پھر روپک کی دس اور اپ روپک کی اٹھارہ قسمیں کی گئی ہیں۔

ہندو واضعان قوانین ڈرامہ نے نہ صرف پلاٹ قصہ، کردار، موضوع اور جذبات کی

رنگارنگی کی مناسبت سے اس فن کو تقسیم کیا بلکہ اداکارانہ پہلو کو بھی علم کا مرتبہ بخشا۔

زندگی کے مختلف واقعات کے تحت انسانی جذبات کے تغیرات اور ان کے اداکارانہ اظہار کو بالکل نفسیاتی طور پر بوز کر دیا تاکہ جذبات اور حرکات میں نفسیاتی یگانگت اور واقعیت پیدا ہو۔ اور تماشائیوں پر ڈرامہ کا وہی اثر ہو جس کا اظہار مدنظر ہے، نظریہ رساد (جذبہ) کے تحت بھاؤ اور انا بھاؤ کی تقسیم کی گئی۔

بھاؤ سے مراد قلبی کیفیت ہے اور انا بھاؤ اس کا اظہار ہے۔ یعنی وہ ظاہری علامات جو بھاؤ سے پیدا ہوتے ہیں۔ غرض ہندوؤں نے ناٹک، ابھی نایا، روپ، سنگت سال یا رنگ بھومی (اسٹیج) کے ہر جزوی اور فروعی تعلقات کو بھی قواعد و ضوابط کے احاطہ میں لا کر نہایت اعلیٰ قسم کی مدون اور منظم صورت میں پیش کیا۔ اور ہندو راجاؤں نے اس فن کو اپنی سرپرستی میں لے کر اسے ترقی کے انتہائی اعلیٰ مرتبوں پر پہنچایا۔

ہندو ڈرامہ کی خصوصیات کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ڈرامہ میں مذہب کے بنیادی معتقدات کو پیش کیا جاتا تھا۔ اکثر ڈراموں میں کرما (اعمال) اور اواگون (تناسخ) کے نظریہ کی تبلیغ ہے۔

۲۔ یہ شکل ڈرامہ موسیقی اور شاعری کا امتزاج کیا جاتا تھا۔

۳۔ کردار کا تنوع۔ ڈرامہ کے کردار سماج کے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں کے مرد اور عورتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ناٹک (ہیرو) اور نائکہ (ہیروئن) کی صورت، سیرت اور سماجی مرتبہ کے لحاظ سے اعلیٰ اور بلند ہونا ضرور تھا کیونکہ وہ تماشائیوں کے لئے نمونہ بنا کر پیش کئے جاتے تھے بادشاہوں، امیروں اور وزیروں کے علاوہ ادنیٰ طبقہ کے لوگ نوکر چاکر بھی ڈرامہ کے عناصر ہوتے تھے۔ ہندو ڈرامہ کی یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو اسے یونانی ڈرامہ سے ممیز کرتی ہے۔

۴۔ ہندو دیومالا کے کردار اور ان کے مافوق الفطرت اعمال، خوارق عادات بھی ہندو ڈرامہ کے جزو تھے۔

۵۔ کردار کے سماجی مرتبہ کے لحاظ سے اس کی زبان بھی ویسی ہی ہوتی تھی تاکہ واقعیت پیدا ہو۔ شہزادے اور برہمن سنسکرت اور عورتیں عموماً پراکرت بولتی تھیں۔ دوسرے اسفل کردار

اپنے اپنے مفروضہ صوبوں کی بولی میں گفتگو کیا کرتے تھے۔

دوسری یا تیسری صدی قبل مسیح سے لے کر بارھویں صدی عیسوی تک ہندو ڈرامہ نے راجاؤں کی سرپرستی میں برہمنوں کے ہاتھوں خوب ترقی کی۔ گو جین اور بدھ مت کے آغاز نے ہندو ڈرامہ کو نقصان پہنچایا۔ مگر ان مذاہب کے پیشواؤں نے ڈرامہ کی اہمیت اور افادیت کو بہت جلد ہی پہچان لیا اور اس کو تبلیغ کا آلہ بنایا۔ بدھ مت کے عروج کے ساتھ ساتھ ڈرامہ نے بھی ترقی کی جس کا ثبوت اجنٹا کی مصوری سے بھی ملتا ہے۔ مگر جب بدھ مت کو زوال ہوا اور برہمنوں کا ستارہ پھر چمکا تو انہوں نے بدھ ڈراموں کو ہٹا کر رام اور کرشن کی زندگیوں کو پیش کر کے اپنے ڈرامہ کو زندہ کیا۔ انھیں برہمنوں اور بدھ مت والوں کی کش مکش سے ہندو ڈرامہ سنبھلنے ہی نہ پایا تھا کہ بارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہندوؤں کو مسلمان حملہ آوروں کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلمانوں کے حملوں کے سیلاب نے ہندوؤں کے تمدن اور معاشرت میں وہ پراگندگی پیدا کر دی کہ ہندوؤں کی پوری توجہ اپنے سیاسی تحفظ اور دفاع پر مرتکز ہو گئی اسی زمانہ میں ہندو ڈرامہ نے بھی اپنی رفعت کھوئی۔ اور بلندی سے گر کر اس نے بھان اور برہمن کی شکل اختیار کر لی۔ یہی وہ دور ہے جب ہندو ڈرامہ پنڈتوں اور برہمنوں کے پنجہ سے چھٹکارا پا کر عوام میں داخل ہوا۔ اور ہندو کلاسیکل ڈرامہ کی شائستگی، نزاکت آفرینی، شاعرانہ صنعت گری۔ رفعت موضوع۔ دلنواز تغزل، پلاٹ کی چستی۔ اور بے عیب سیرت کشی غائب ہو گئی۔

ولیم گارگن

زندگی کا بہترین رول کس طرح ادا کیا

سنہ ۱۹۶۰ کی ایک رات تھی۔ سین فرانسسکو کے ایلکازا تھیٹر میں ایک ڈرامہ "دی بیسٹ مین" اسٹیج کیا گیا۔ جس کا ایک کردار سرطان کا مریض سابق صدر امریکہ تھا۔ ولیم گارگن نے جو اپنے وقت کا مشہور اداکار تھا یہ کردار کیا۔ اس کا آخری مکالمہ یہ تھا۔

"وہ ٹیلی فون اٹھاؤ اور پوچھو ڈاکٹر لیتھم موجود ہیں۔ ڈاکٹر سے کہو کہ فوراً آئیں اور اسٹریچر بھی لائیں۔ کیونکہ اب مجھ میں حرکت کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔ کیونکہ میری حالت مُردے کی سی ہے"

ولیم گارگن نے متذکرہ کردار یعنی سرطان کے مریض اور سابق صدر امریکہ کے یہ جملے بڑی دردناک آواز اور دکھ بھرے لہجے میں ادا کئے جس پر تھیٹر تالیوں سے گونج اٹھا ڈراپ کرٹن گرا دیا گیا اور کھیل ختم ہوگیا۔ ولیم گارگن سمیت کسی کو علم نہیں تھا کہ یہ اسٹیج کے آخری جملے تھے جو اس کی زبان سے ادا ہوئے اور اس کی پینتیس سالہ تمثیلی سرگرمیوں کا ڈراپ کرٹن گر گیا ہے اور کھیل ختم ہوگیا ہے۔

چند دن بعد ہی کھیل شکاگو میں اسٹیج کیا جانے والا تھا۔ اس لئے ہدایت کار، اداکار اور دوسرے متعلقہ اشخاص نے دوسرے دن سے اپنا اپنا رخت سفر باندھنا شروع کر دیا۔ ولیم گارگن نے گھر پہنچ کر اپنی بیوی سے کہا چند ہفتوں سے میرا حلق مجھے تکلیف دے رہا ہے میری نے کہا "تم کسی ڈاکٹر سے مشورہ کیوں نہیں کرتے"؟ ولیم نے جواب دیا شکاگو کے لئے ابھی ... نے کام لگا یا ہیں فرصت نہیں ہے جو ڈاکٹر سے ملوں صبح کو کمپنی کے مینیجر نے اطلاع دی کہ شکاگو کا سفر چند روز کے لئے ملتوی کر دیا گیا ہے کیونکہ وہاں سرِ دست ڈرامہ اسٹیج نہیں کیا جا ... میری نے فوراً حلق کے ماہر ڈاکٹر سے رابطہ قائم کر کے تاریخ اور وقت طے کیا اور ولیم کو بتا دیا کہ

اسے ڈاکٹر سے ملنا ہے۔ معائنہ کے بعد ڈاکٹر نے حلق کے سرطان کی تشخیص کی ڈو ایک امتحان ہو جانے کے بعد جب سرطان کا یقین ہو گیا تو ولیم نے پوچھا اس مرض اور اسکے علاج کے عواقب کیا ہیں ڈاکٹر سمجھ گیا کہ مریض صاف صاف جواب چاہتا ہے اور اس سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہیئے اسلیے کہا "آپریشن۔ آپریشن جس میں ہوا کی نالی نکال دی جائیگی۔ اس وقت بیس ہزار اشخاص ایسے ہیں جو ہوا کی نالی کے بغیر زندہ ہیں۔ آپریشن کے پانچ برس بعد اگر سرطان کا دوسرا حملہ نہ ہو تو سمجھ لو کہ سرطان کا صفایا ہو گیا اور تم صحت پا گئے۔"

ولیم نے کہا آپریشن کا مطلب ہے کہ میرا اداکاری کا پیشہ ختم ہو جائیگا۔ اگر آپریشن نہ کرایا جائے تو کیا ہو گا؟ ڈاکٹر نے اس قسم کا سرطان جسم میں بہت تیزی کے ساتھ پھیلتا ہے۔ وہ فوری آپریشن کے لئے تیار ہو گیا۔ دوسری شام اسے لاس اینجلس کے ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ملاقاتیوں کا وقت ختم ہونے کے بعد بھی میاں بیوی آپس میں بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پرانے قصے دہرائے، پیار و محبت کی کہانیاں کہیں، اپنے بچوں کا بچپن یاد کیا...

... اور پھر یہ قصہ بھی کہ۔

جن دنوں لاس اینجلس میں ڈیموکریٹک کنونشن ہو رہا تھا۔ اسپورٹس ارینا کے قریب ولیم گارگن نے ایک اپارٹمنٹ عارضی طور سے کرائے پر لے لیا۔ کیونکہ اسکے اسٹیج کئے جانے والے کھیل دی بیسٹ مین کے ریہرسل بھی وہیں کہیں ہو رہے تھے۔ ٹی وی پر کنونشن کی کارروائی دکھائی جا رہی تھی میاں بیوی ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا کیا میں اندر آسکتا ہوں۔ عین وقت پر میرا ٹی وی خراب ہو گیا ہے یہ جان ایف کینیڈی تھے جنہوں نے ولیم گارگن کے کمرے میں اور ٹی وی پر دیکھا اور سنا کہ انھیں صدارتی امیدوار نامزد کیا گیا ہے

عمر پچیس سال قد چھ فٹ ایک انچ، ٹینس کا بہترین کھلاڑی، گالف کے کھیل سے شغف، ہنس مکھ۔ دس لاکھ ڈالر کمائے مگر کمائی کہاں خرچ ہوتی پتا نہ چلا۔ اب وہ آپریشن کے بعد بے آواز اداکار ہو گا۔ کیا کریگا کس طرح زندگی بسر ہو گی؟ آپریشن ہو گیا اور ولیم گھر واپس آ گیا۔ اب اسے جو کچھ کہنا ہوتا کاغذ پر لکھ دیا کرتا تھا۔ کیونکہ آواز کی دولت سے محروم ہو گیا تھا

ایک شام، خاتون آئیں اور ولیم سے کہا مجھے آپ کے ایک دوست نے بھیجا ہے کہ

آپ کو "آواز کے اسباق" میں دلچسپی ہوگی۔ میں امریکن کینسر سوسائٹی کی رضاکار ہوں اس نے ESOPHAGEAL SPEECH پر تفصیل گفتگو کی اور سمجھایا کہ وہ درس لینا شروع کردے۔ ولیم راضی ہوگیا۔ سولہ ہفتوں کے اسباق کے بعد وہ گریجویٹ ہوگیا اور متذکرہ طریقے کے مطابق گفتگو کرنے کے قابل ہوگیا۔ سوسائٹی کی طرف سے کام کرنے لگا سوسائٹی نے اُسے بڑھیا ہوٹل میں ٹھہرنے اور دوسرے اخراجات کے لئے بڑی رقم پیش کی مگر اس نے لینے سے انکار کردیا کہ میں حق تعالیٰ کا مقروض ہوں کہ اس نے مجھے نئی زندگی عطا کی مجھے خدمت خلق کرنا چاہیئے وہ جگہ جگہ جاکر لیکچر دیتا سرطان کے مریضوں کو دلاسہ دیتا اور ESOPHAGEAL-SPEECH کے تعلق سے معلومات فراہم کرتا اور امریکن سرطان سوسائٹی کے لئے چندہ جمع کرتا۔ دو سال میں اس نے امریکہ اور کناڈا میں تین لاکھ پچاس ہزار میل سفر کیا۔ دو لاکھ پچاس ہزار طلباء اور ریڈیو اور ٹی وی کے لاکھوں سامعین کو مخاطب کیا۔

واشنگٹن پہنچا جہاں ایک عشائیہ میں تقریر کرکے سوسائٹی کے لئے فنڈ جمع کرنے والا تھا۔ ایوان صدر سے ٹیلی فون آیا کہ صدر امریکہ دریافت کررہے ہیں کہ کیا آپ چند منٹ کے لئے وہائٹ ہاؤس تشریف لاسکتے ہیں؟ ولیم گارگن جب وہائٹ ہاؤس پہنچا تو جان ایف کینیڈی اپنی کرسی پر سے اٹھ گئے اور کہا مجھے پتا چلا کہ آپ شہر میں ہیں۔ اخبار میں آپ کی تصویر بھی دیکھی۔ جی چاہا کہ آپ سے ملوں۔ خدا آپ کو اس عظیم کام میں جو آپ کررہے ہیں کامران کامیاب بنائے۔

ولیم گارگن اس سے اتنا متاثر ہوا کہ وہ ESOPHAFGEAL-SPEECH کے ملنے کے باوجود صدر سے گفتگو نہ کرسکا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ صرف "تھینک یو مسٹر پریسیڈنٹ" کہہ سکا۔ ولیم گارگن نے زندگی کا بہترین رول امریکن سرطان سوسائٹی کے کارکن کے روپ میں ادا کیا۔ (ماخوذ)

دوسری کایا

دھلی سے خاص جریدہ غالب کے لئے

جوگندر پال

۱۰۵۹، نیو فرینڈز کالونی، نئی دہلی ۱۴

میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول لی ہیں اور سارے شہر کو قہقہے لگاتے ہوئے سن رہا ہوں لیکن مجھے ایک بھی چہرہ دکھائی نہیں دے رہا ہے اور میرے کمرے کا نیم تاریک سناٹا مجھے بوکھلایا ہوا پاکر کھل کھلا کے ہنس پڑا ہے اور میں خوف زدہ سا ہو کر پھر سو گیا ہوں ـــــ نہیں، سویا نہیں ہوں، ساری رات جاگ جاگ کر اپنے آپ کو یقین دلا رہا ہوں کہ سویا ہوا ہوں ـــــ تم سو رہے ہو ـــــ سو جاؤ! آنکھیں بند کر لو! ـــــ لو! ـــــ اب ذہن کے کواڑ بھیڑ لو! ـــــ لو! ـــــ اب ذہن کی ساری بتیاں گل کر دو! ـــــ لو بھائی، لو! ـــــ نہیں، بتیاں گل کرنے کا کیا فائدہ ؟ تم نے پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں گھورنا شروع کر دیا ہے! ـــــ کیا کروں ؟ آنکھیں بند کر لوں تو مجھ سے سانس لینا بھی نہ ہوگا ـــــ تو پھر سانس لینا بند کر دو لیکن آنکھیں موند لو! ـــــ نہیں، آنکھیں موند لوں گا تو مجھے ڈر ہے میری بیوی بھاگ جائے گی ـــــ بھاگ جائے گی ؟ اسے کیا پڑی ہے کہ جینے کی ساری سہولتیں چھوڑ کر بھاگ جائے، تمہارا اتنا بڑا بنگلہ، یہ ساز و سامان، دولت، نوکر چاکر ـــــ کسی نوکر سے منہ کالا کرنے سے تو یہی اچھا ہے کہ بھاگ جائے ـــــ مگر بھائی، وہ اپنا منہ کالا کیوں کرے

گی ہے وہ تو اپنے خوبصورت منہ کو اور خوبصورت بنانے کے لئے دنیا بھر کے کاسمیٹکس استعمال کرتی رہتی ہے ـــ اسی لئے تو استعمال کرتی ہے کہ روسیاہی کا موقع ہاتھ آئے۔ مجھے اس پر رتی بھر بھروسہ نہیں ـــ کبھی کھانے کی کوئی شئے سجا کر میرے سامنے رکھتی ہے اور بڑے پیار سے کہتی ہے کھائیے۔ تو مجھے یہی ڈر رہتا ہے کہ اسے منہ کی طرف لے جاتے ہوئے اس کا زہر میری رگ رگ میں سرایت ہو جائے گا ـــ یہ تمہارا وہم ہے۔ خیر، اب تم آرام سے سو جاؤ ـــ آرام سے کیسے سو جاؤں؟ سو جاؤں تو میرا بڑا بھائی یہاں آئے اور میرا گلا گھونٹ کر اپنے کمرے میں لوٹ کے بڑے چین سے اپنی بیوی کے پہلو میں ـــ یا اس بھوری بھینس نے سارا بستر گھیر رکھا ہو تو اس کے پیروں میں جا کر سوئے، چلو، چھوٹے بھائی کا سارا قرض ایک پائی بھی ادا کئے بغیر ادا ہو گیا۔ حرام خور لوٹ کا سارا مال اپنی اس بھوری بھینس کے پھولے ہوتے پیٹ میں جمع کرتا جاتا ہے کہ شاید کبھی جادو ٹونے سے دھن دولت خود آپ ہی وارث بن کے پیدا ہو جائے ـــ اپنے کسی حرامی پلّے کو سب کچھ سونپ کے چل بسے گا مگر اپنے سگے بھائی کا پیسہ اسے نہیں لوٹائے گا۔ پورے چار روز سے کام کاج چھوڑ کے اس کے یہاں آیا ہوا ہوں مگر وہ جھوٹ موٹ کا دل کا دورہ لے کر پڑ گیا ہے، لو اکر لو وصول اپنا پیسہ!

بھائی صاحب، اب تو آپ کی صحت پہلے سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔

نہیں، راجیش، اب تو اوپر والے کے پاس پہنچ کر ہی اپنی صحت بہتر ہوگی ـــ تم آج کی گاڑی سے لوٹ جاؤ، میری فکر میں کیوں اپنا وقت برباد کر رہے ہو بھئے ـــ یعنی اپنے پیسے دھیلے کو بھول کر اب چلتے بنو برخوردار!

کچھ بھی ہو، میں اپنی پائی پائی وصول کئے بغیر یہاں سے ٹلوں گا نہیں ـــ بھابی کا پیٹ چاک کر کے اپنی ساری رقم نکال لوں گا۔ تانبے کا ایک پیسہ بھی کسی غریب کے حلق سے اتر جائے تو اس کی جان پر بن آتی ہے پر یہ عورت تو ساری دنیا کے خزانے ہضم کئے ہوئے ہے۔ پیٹ میں سانپ ہی سانپ ہوں گے ـــ میرے پیٹ میں اتنے زیادہ راؤنڈ ورم ہو گئے ہیں۔ راجیش، کہ ذرا سا بھی کھاتی ہوں تو قے ہو جاتی ہے۔ اس دن تو یہ ہاتھ بھر لمبا راؤنڈ ورم سانپ کی طرح منہ سے اچھل کر باہر آگرا۔

ہہ ہا ——— ہہ ہہ ہہ ! پرسوں اور کل سویرے بھی میری آنکھ کھلی تھی تو باہر کئی لوگ لگاتار قہقہے لگاتے جا رہے تھے۔ پرسوں تو میں نے اسے اپنے وہم پر محمول کیا اور اپنے آپ کو بتایا کہ میں ہی ہنسے جا رہا ہوں۔ دراصل جاگنے سے تھوڑی دیر پہلے میں نے اپنے ایک بزنس پارٹنر کو سپنے میں دیکھا تھا۔ بے چارہ بازار میں بڑھتے ہوئے مندے سے اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ ایک لاکھ کے گھاٹے سے اس نے اپنے سارے حصے مجھے بیچ دیئے، اور بیچ کر دماغ چل نکلا تو اپنے اس باؤلے یقین سے کہ مجھے دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا ہے، اپنے وہی حصے قیمت کو ایک لاکھ بڑھا کے مجھ سے واپس خرید لئے ——— یہ سلسلہ تھوڑا اور چلتا مگر اس کے بیٹے کو معلوم ہو گیا ——— ٹھیک ہی ہوا انکل، جو یہ پیسے آپ لے اڑے ——— آپ اتنے شریف ہیں کہ کبھی نہ کبھی پھنس ہی جائیں گے اور ہمارے پیسے دگنے ہو کر واپس آ جائیں گے۔

میں ہنسے جا رہا تھا۔ اپنی ساری عمر میں مجھے کوئی بھی ایسا دن یاد نہیں جب میں نے رات بیتنے پر اس طرح ہنستے آنکھ کھولی ہو۔ بس یہی لگتا ہے کہ اپنے آپ سے بچنے کے ایک گھٹاٹوپ اندھیرے سے دوسرے میں گھستے جا رہے ہوں اور بہت پریشان ہوں کہ مجھ سے میرا چھٹکارا کب ہو گا ——— اور پھر جونہی میں اچھل کر اپنے آپ کو اپنی دبوچ میں لے لیتا ہوں اسی وقت دیکھ کر میری آنکھ کھل جاتی ہے اور اسی دبوچ میں پڑے پڑے میرا دن شروع ہو جاتا ہے۔

ایک بار ایک مہاتما پرش مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔ میں تمہیں مکت کروا سکتا ہوں بیٹے! ——— مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اسے کیونکر معلوم ہو گیا کہ اپنی دبوچ میں بے بس سا پڑے میں اپنی ہڈی بوٹی نوچ رہا ہوں میں کوئی سیدھا آدمی نہیں ہوں لیکن اس مہاتما کو میں بڑی شردھا سے اپنے گھر لے آیا اور سات روز دن رات اس کی سیوا میں جٹا رہا ——— آٹھویں روز میں نے ہاتھ باندھ کر اس

بے پار تھا کہ اگر آپ مجھے مکت کر دیتے تو وہ دیو اسے گرو دیو نے
جواب دیا، تم نے سیوا بھاؤ سے ہمیں اس طرح باندھ لیا ہے آنا بھی؟
کہ اب پہلے ہمیں اپنے آپ کو تم سے مکت کرنا ہے۔ میں خوش ہو کر
چپ ہو گیا مگر دوسرے ہی دن مہاتما کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ سامان
رات میرے گھر کی صفائی کر کے رفو چکر ہو چکا ہے ۔۔۔ میں بڑا کامیاب
بزنس مین ہوں اور ہمیشہ سو فیصد پرافٹ والا بزنس کرتا ہوں پھر معلوم
کیوں مہاتما کی ایکشن کے چکر میں پھنس گیا۔ اب تو مجھے ان سے بڑی نفرت
کا احساس ہے۔ میں نے اس پر واضح کر دیا ہے کہ اس دنیا میں پیسے کے
لئے ایک کی بجائے دس مندر بنوا لو، پر ان کی ملکیت کے کاغذ اپنے پر دوں گا
جب اصل بیاج اور نفع کی ساری رقم ادا کر دو گے ۔۔۔ میاں اتنا دولتمند
ہوں، اس دنیا میں مرنے جینے کے لئے بھی ۔۔۔ نہیں پایا۔ خالی
ہاتھ جاؤں گا تو سارے دن کے لیبر کے بعد دو وقت کی روٹی کے پیسے بھی
نصیب نہ ہوں گے۔

میں آپ کو پرسوں سویرے کا واقعہ سنا رہا تھا، چونکہ میں کبھی ہنس ہنس
کر نہیں جاگا ہوں، اس لئے میں نے جھٹ یہی باور کر لیا کہ میں نہیں ہنس رہا
ہوں بلکہ مجھ سے پیسے کے دام وصول کرنے کی امید پر میرے لئے اور لوگ ہنسنے
جا رہے ہیں اور میں خوش ہوں کہ بغیر محنت میں ہنسنا ہو گیا، دام کیسے؟
۔۔۔ لیکن کل سویرے میری آنکھ یہی اس لئے کھل کر ہنسو گیوں کے باوجود
قہقہوں کی وجہ سے کہ میں جل تھل ہو گیا تھا۔ خلاف عادت میرا دل ہنوز
دھل دھل کر صاف اور اجلا ہو گیا اور اپنے آپ آکاش میں ہوا کی سمت پر پھیلا
کرانے لگا اور میں نے پکڑ کر کندھوں کی طرف کھینچ لیا اور اپنے خواب کے
عالم سے میں چمٹ گیا اور اس طرح سو گیا کہ کوئی مجھ سے جگا دے مجھے
مسافر ہوں تھک کا ۔۔۔ بے رکھی ہو گئی، ساری رات ہو گئی ہے

ہم دوام کہتے ہیں شاید وہ بھی کوئی مختصر کیفیت ہوگی ـــــ جب مجھے میرے بڑے بھائی کا بوڑھا نوکر جگا رہا تھا تو دوپہر ہونے کو آ رہی تھی، یعنی گھڑی کی سوئیاں جہاں تھیں وہاں سے دوام کو پھلانگ کر سیدھی یہاں آ پہنچی تھیں، وہ درمیانی اوقات سرے سے تھے ہی نہیں، بس کوئی بھرم تھا جو میرے جاگتے ہی کھل گیا۔ میں پھر وہی بوجھل میں ہو گیا اور نیم دراز ہو کر بوڑھے نوکر سے بیڈ ٹی لیتے ہوئے پوچھنے لگا "تم نے مجھے جلدی کیوں نہیں جگا دیا کاکا؟"

آپ اتنے مجے سے خراٹے لے رہے تھے بابو جی، مانو جندگی میں پہلی بار سونا ہوا ہو۔

نہیں کاکا، مزے کا سونا تو آخری بار ہوتا ہوگا جب جاگنے کا فکر ہی نہ رہے۔

نہیں، میری یہ نیند آخری ہی تھی لیکن پھر ٹوٹ کیوں گئی؟ ـــــ نہیں، میں واقعی مکت ہو چکا تھا لیکن اس دوران مجھے اچانک یاد آ گیا کہ انکم ٹیکس بھیجنے کی آخری تاریخ بیت چکی ہے مگر میرا وکیل ابھی تک سویا پڑا ہے ـــــ ہاں، کاکا سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے میں یہی سوچ رہا تھا کہ آج اپنے وکیل کو تار بھیج دوں گا ـــــ

ہہ ہا ہہ ـــــ ہہ ہہ ہا ـــــ کل اور پرسوں کی طرح آج بھی قہقہوں کی آواز میرے کانوں میں بار بار گونج رہی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کوئی آواز ہو ہی نہ، میرے کان ہی گونج رہے ہوں ـــــ اکثر ایسے ہوتا ہے کہ کوئی کچھ بھی نہیں بول رہا ہوتا ہے لیکن میں سب کچھ سن رہا ہوتا ہوں۔ جیسے نیند نہیں آتی ـــــ نہیں، میں مذاق نہیں کر رہا ہوں ـــــ وہ ایک طرح کا عذاب ہوتا ہے ـــــ ٹھیک ہے میں اچھا آدمی نہیں ہوں لیکن اپنی برائیوں کا عذاب بھی سہہ کر اب میرے اندر ہر دم پانچ ہزار واٹ کا بلب جلتا رہتا ہے۔ میرا عذاب دراصل میری برائیوں کا نہیں، میرے اندر جلتے ہوئے اس سورج کا ہے جس سے مجھے

نیند نہیں آتی۔ دوپہر سدا کی ہو جائے تو کوئی کیسے سوئے ؟ —— ہاں، کل اتفاقاً
گھٹا چھا گئی تو ذرا سا سو گیا —— نہیں، وہ بھی شاید اپنی سو جانے کی شدید خواہش
سے مجھے یونہی لگا ہو کہ سو گیا ہوں، یا روشنی ہی روشنی سے میری آنکھوں میں تاریکی
چھا گئی ہو اور میں بے ہوش ہو گیا ہوں —— روشنی کا یہ گولہ بجھا دو تاکہ مجھے
نیند آ جائے۔ اس روشنی میں مجھے بند آنکھوں سے بھی سب کچھ صاف دکھائی
دیتا ہے —— بجھاؤ تاکہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے بھی دیکھوں تو کچھ دکھائی نہ دے۔
جاگ جاگ کر میری یہ حالت ہو گئی ہے کہ خاموشی بھی بول بول کر مجھے ڈسٹرب
کرتی رہتی ہے —— میری بیوی ہمیشہ چپ رہتی ہے لیکن مجھے اس کی
ساری باتیں معلوم ہیں۔ میں سبھی رشتہ داروں، دوستوں، واقف کاروں کو
اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں ایک طرح کا مہاتما ہی ہوں۔ کوئی مجھے کچھ بھی نہ
بتائے لیکن میں سب کا سارا حال جانتا ہوں۔ میں —— ہہ ہہ ہا —— !
میں سوگیانی ہوں —— ہہ ہہ ہا ! —— پتہ نہیں میں ہنس رہا ہوں، یا
کوئی اور قہقہے لگا رہا ہے، یا محض میرے کان بج رہے ہیں —— ہہ ہا ہہ!
اچانک مجھے یاد آ گیا ہے کہ کل اپنے وکیل کو تار بھیجنا بھول ہی گیا۔ آج کسی
وقت اُسے فون ہی کر دوں گا۔ اندھوں کے اسکول سے ابھی تک چندے
کی رسید بھی نہیں ملی۔ عجیب زمانہ آ گیا ہے۔ اپنے ہی پیسے گنوا کر جھوٹے دھندے
کرنا پڑتے ہیں کہ انکم ٹیکس کم بیٹھے۔ اس یتیم خانے سے معاملہ پکا ہو جاتا تو
صرف ڈھائی ہزار دے کر پچیس ہزار کی رسید مل جاتی۔ اندھوں نے پورے
پانچ اینٹھ لیے ہیں —— آج کسی وقت ضرور فون کر دوں گا —— نہیں،
آج کسی گاڑی سے وہیں چلا جاؤں گا۔ بڑے بھائی نے کچھ دینا دلانا ہوتا تو
دل کے دورے کا ناٹک [illegible]۔ بیماری کو دھندا بنا کے استعمال کرنا کہاں
کی شرافت ہے ؟ —— ہہ ہہ ہا بھائی نہیں، بیٹے ہو راجیش —— مطلب
یہ کہ میں تمہیں اپنا بھائی تسلیم نہیں کرتا —— میرے کوئی اولاد نہیں راجیش،

تم ہی میری اولاد ہو ــــ نہیں، میں اُس سانپوں بھری کوکھ سے کیونکر برآمد ہو سکتا تھا؟ ــــ میرا یہ دل کی بیماری کا چیچہ ذرا رک لینے دو، تمہارے سارے پیسے لوٹا دوں گا، تمہیں کچھ اور کی بھی ضرورت ہو گی تو دے دوں گا ــــ نہیں، بھائی کا پیٹ چیر کر میں خود ہی وصول کر لوں گا، خواہ مجھ پر سانپوں کے انبار جھپٹ پڑیں ــــ ڈاکٹر نے مجھے ہدایت کی ہے راجن، کہ ہر وقت مسکراتے رہو، جان بھی نکل جائے تو مسکراتے رہو، اُسے معلوم نہیں کہ اپنی اسی عادت سے ہی تو مجھے یہ روگ لگا ہے ــــ

ہہ ہہ ہا ــــ ہہ ــــ ہہ! ــــ ہمارے باپ کی موت پر تم اس لئے مسکرا رہے تھے بڑے بھائی، کہ میں ابھی چھوٹا سا ہی تھا اور اُس کے مرنے سے سارا بزنس تمہارے کنٹرول میں آگیا ــــ اور ہماری ماں کے مرنے پر اس لئے، کہ اُس نے گھر کے سارے زیور بھابی کے پاس رکھے ہوئے تھے ــــ ہماری یتیم بہن کے مرنے پر اس لئے، کہ اس کی شادی پر خواہ مخواہ اتنا خرچ ہو جاتا ــــ اب دل کی بیماری پر مسکرا مسکرا کر دم توڑنا باقی ہے بڑے بھائی، سو مسکراتے جاؤ، تمہارا دم ٹوٹ گیا تو میں مسکراؤں گا، خوشیاں مناؤں گا ــــ سنو، میرا بڑا بھائی مر گیا ہے۔ میں اس کی نفع خور محبتوں سے آزاد ہو گیا ہوں ــــ ہہ ہا ہہ ہہ! ــــ کس نے قہقہہ لگایا ہے؟ میں نے؟ یا میں نے کسی اور کے قہقہے کی آواز سنی ہے؟ ــــ ہہ ہہ ہا ــــ ہہ ا ــــ مجنوں کے مانند گدگدی کی اذیت سے بے قابو ہو کر میں بے اختیار ہنسنے لگا ہوں اور ہنستے ہنستے میرا دھیان اپنے ڈاکٹر کی نصیحت کی طرف چلا گیا ہے ــــ آپ پاگل تو نہیں، لیکن آپ کو پاگل پن کا احساس ہونے لگے تو کھلی ہوا میں آ کر پرانایام کرنا شروع کر دیجئے۔

باہر بوچھاڑ رہی ہے اور میرے وجود کے گنبد کی دیواروں سے قہقہوں کے گولے ٹکرا رہے ہیں۔ یہ گولا سینے پر آ لگا ہے، یہ پیٹ میں، اور یہ دیواروں

سکے اوپر گنبد کے عین مرکز میں گونجنے لگتا ہے اور بستر سے اٹھ کر، کپڑے تبدیل کر کے اپنے آپ کو بڑی مشکل سے سنبھالتے ہوئے میں بنگلے کے باہر لان میں آگیا ہوں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق لمبے لمبے سانس کھینچنے لگا ہوں —— —— ایک، —— پہلا سانس آہستہ آہستہ اندر کھینچ کر مجھے کچھ راحت محسوس ہوئی ہے لیکن مجھ سے دوسرا سانس کھینچا نہیں ہو پا رہا —— اور میں اپنے اٹکے ہوئے سانس میں بے اختیار ہنس دیا ہوں، جو سانس کھینچ رکھا ہے پہلے اُسے چھوڑو گے نہیں تو دوسرا کیسے لے پاؤ گے ؟ —— میرے ساتھ ہمیشہ یہی ہوتا ہے، جو کچھ انجانے میں فطرتاً کرتا ہوں اُسے جب شعوری طور پر کرنے لگتا ہوں تو میری سمجھ گھاس چرنے لگتی ہے —— میرے بھائی کا لان اتنا عمدہ ہے کہ جی چاہتا ہے دونوں ہاتھ بھی زمین پر ٹکا کر گھاس چرنا شروع کر دوں —— ایک، —— میں نے دوبارہ سانس کھینچتے ہوئے اپنے آپ کو سمجھایا ہے کہ ایک وقت ایک ہی سانس لیا جا سکتا ہے، عمر کے سارے سانس ایک دم لینے کی کوشش کرو گے تو دم گھٹ کر رہ جائے گا —— دو، —— قہقہوں کی آواز میری کلاتھ ملز کی بوڑھی مشینوں کی یونیفارم کھانسی میں ڈوبنے لگی ہے۔ میں گورنمنٹ کے انسپکٹر کی مٹھی میں سو کا نوٹ تھماتے ہوئے اُسے یقین دلا رہا ہوں کہ میری بوڑھی مشینیں ابھی چار پانچ سال اور کام میں لائی جا سکتی ہیں —— چار پانچ سال میں تو ملز کو آگ لگوا کے بیمے کی رقم سے ساری نئی مشینیں نصب کروائی جا سکتی ہیں —— تین، —— اگلے ماہ اپنے جنرل منیجر کو کام سے الگ کر کے ڈپٹی منیجر کو جنرل منیجر بنا دوں گا —— یہ دونوں کام اب تم اکیلے کرو —— نہیں ؟ —— تو جاؤ، تم بھی چھٹی کرو، میرا چوکیدار چوکیداری بھی کرے گا، جنرل منیجری بھی اور ڈپٹی منیجری بھی —— چار —— دھک دھک ! دھک دھک ! —— میری گلاس فیکٹری کی نئی مشینوں کی دھڑکن اتنی جوان اور تندرست ہے کہ جی چاہتا ہے کہ دل کی جگہ خالی کر کے انہی کو وہاں فٹ کر لوں —— پانچ —— پرانایام صحت

کے لئے نہایت مفید ہے ــــ وَیری گڈ! ــــ سانس کو اور لمبا کرو! ــــ وَیری گڈ! ــــ کیا اب چین محسوس نہیں ہو رہا؟ ــــ وَیری گڈ! ــــ جب بھی دماغ جواب دینے لگے اسی طرح فوراً پرانا یام شروع کر دو۔ پرانے وِیگ میں تو آدمی مرتے مرتے بھی پرانا یام کی مدد سے سو سال اور جی لیتا تھا ــــ وَیری گڈ! اب کیسے لگ رہا ہے ــــ پھر ــــ یہ ہیلتھ ٹرسٹ کے لوگ پاگل ہیں کیا؟ ــــ یا مجھے پاگل سمجھتے ہیں؟ ــــ بھئی، اتنے پیسے مانگ رہے ہو تو کم سے کم اپنے نئے اسپتال کا نام ہی میرے نام پر رکھ دو۔ لینا تو سبھی چاہتے ہیں پر دو گے تو دو گے کیا؟ ــــ سیدھی سی بات ہے، اِدھر یہ دو، اُدھر یہ لو ــــ

ہہ ہا ہہ ہہ ــــ ہہ ــــ ہہ! ــــ ایک ساتھ بیسیوں قہقہے یکبارگی میرے کانوں کے پردے پھاڑ کر میرے اندر آ گئے ہیں اور میں نے اپنی حیران نظریں اِدھر اُدھر اٹھائی ہیں۔ میری پیٹھ پر مالی لان کو پانی پلا رہا ہے مگر اب تک اپنے دھیان میں میرا اس کی طرف دیکھنا ہی نہیں ہوا ہے۔ اس نے ہنس ہنس کر مجھے بتایا ہے کہ ان بنگلوں کے پیچھے ایک بہت بڑا پارک ہے جہاں یہاں کے بہت سے مالک لوگ ہر روز سویرے قہقہوں کی ورزش کرتے ہیں۔

قہقہوں کی ورزش؟

ہاں، صاب، صحت بنانے کے لئے کھکھے پر کھکھے لگائے جاتے ہیں۔ ــــ جائیے، جا کے دیکھئے، بہت مجا آتا ہے ــــ

مَیں لان سے نکل کر باہر روڈ پر آ گیا ہوں اور اس پارک کی طرف جانے کے لئے پشت کی گلی کی طرف ہو لیا ہوں۔

ہہ ہہ ہا ہہ ــــ ہہ!

گلی کو تیز تیز پار کر کے مَیں پارک میں داخل ہو گیا ہوں تو راستے کا ایک کتا بھی میرے ساتھ اندر آ گیا ہے۔

کیوں جی، اِن لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟

ہوتا کیا ہے۔؟ ـــــ کچھ بھی نہیں ہوا۔

کچھ بھی نہیں ہے ـــــ کتا اپنی دم کے پاس خارش کرنے کے لیئے ذرا رک گیا ہے اور میں بھی ٹھہر گیا ہوں کہ خارش کر لے تو اس کی بات کا جواب دوں۔

تو پھر پاگلوں کی طرح آسمان کیوں اٹھائے ہوئے ہیں؟ ـــــ اطمینان سے خارش کر کے وہ پھر میرے ساتھ ہو لیا ہے۔

اسی لیئے میرے بھائی، کہ انہیں کچھ پیش کیوں نہیں آتا۔ کچھ پیش آتا ہے تو ہنسنا رونا ـــــ ہاتھ اوپر نیچے کرنا، اچھلنا کودنا ـــــ ساری ورزش آپ ہی آپ ہو جاتی ہے۔

ہاں، ان کوٹھیوں کے سارے کتے ربڑ کی گیندوں کے پیچھے دوڑتے پھرتے ہیں۔ اس طرح بدن کیا خاک کھلے گا؟ ـــــ وہ پتھر پڑا ہے نا، اُسے اٹھا کے نفرت اور غصّے سے میرے منہ پر زور سے دے مارو ـــــ ارے بھئی، دوستی اپنی جگہ ہے۔ میں ذرا بدن کھولنے کی بات کر رہا ہوں ـــــ میں چوٹ سے بلبلاتے ہوئے زور سے بھاگنا شروع کر دوں گا، پھر تھوڑی دور ٹھہر کر تمہاری طرف دیکھ دیکھ کر غرانے لگوں گا، اور اس سے پہلے کہ تم ایک اور پتھر میری طرف پھینک سکو، میں لپک کر تم پر حملہ کر دوں گا اور تم زور سے بھاگنا شروع کر دو گے ـــــ بھوں ـــــ بھو ـــــ بھاؤں! ـــــ!

مجھے محسوس ہوا ہے کہ کتا بھونک کر قہقہے لگا رہا ہے۔

اس طرح ہم دونوں کے بدن اپنے آپ کھل جائیں گے ـــــ وہ بنگلہ دیکھ رہے ہو؟ ـــــ کتے نے دائیں عقب کی طرف منہ اٹھا کر مجھ سے پوچھا ہے ـــــ وہاں ایک بہت بڑا اور خونخوار شکل پالتو کتا رہتا ہے۔ ذرا بھی ہلتا جلتا نہیں ـــــ کیا نام ہے تمہاری اس بیماری کا؟ ـــــ ہائی بلڈ پریشر سے بیٹھے بیٹھے پھولتا جا رہا ہے۔ ایک بار میں ڈرتے ڈرتے اس کے قریب گیا

تو حرام کی ذات نے بھونکنے سے بھی انکار کر دیا۔ بولا، غصہ تو بہت آ رہا ہے، پر آج سویرے مالک کے ساتھ پچاس بار بھونکنے کی مشق کر چکا ہوں، اس لئے اپنی اگلی دونوں ٹانگیں جوڑ کر منت کرتا ہوں کہ چلے جاؤ ــــ بھوں ــــ بھو ــــ بھاؤں بھو! ــــ ہنس ہنس کر کتا بے حال ہو رہا ہے ــــ اُس پالتو ذات کے آس پاس ڈھیروں گوشت اور ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ وہ نامرد ــــ میرا مطلب ہے، تا کتا ــــ منہ دیکھنے کی ورزش کرتا رہ گیا اور میری ــــ کیا کہتے ہو تم؟ مسلمان ہو گیا ہے ــــ عید ہو گئی ــــ نہیں، ہندو ہو ــــ تو دیوالی ہو گئی۔ نہیں، ہمیں تمہاری مٹھائیاں پسند نہیں۔ ذیا بیطس ہو گیا تو سالی کوئی کتیا خدمت پر آمادہ نہ ہو گی ــــ میں تمہیں کیا بتا رہا تھا؟ ــــ ہاں، میری عید ہو گئی، پر میں نے اتنا ہی کھایا جتنی بھوک تھی اور جو چھوڑ آیا وہ اُس ورزشی نا کتے جیسے دس اور کے لئے بھی کافی تھا۔

پھر؟ ــــ مجھے لگتا ہے کہ اپنے انہاک میں مَیں نے اُسی کی کسی زبان میں غرّا کر پوچھا ہے۔

پھر کیا؟ وہ پالتو کتا مجھ سے بہت نفرت محسوس کر رہا ہو گا لیکن اُس نے بڑی محبت سے اپنے مالک کے الفاظ میں مجھے تنبیہ کی، دیکھو تھوڑی سی بھوک رکھ کے کھاؤ ورنہ ــــ وہ کیا کہتے ہیں ــــ وہ ــــ ہاں ــــ ایسی ڈیٹی سے دل کی بیماری لے بیٹھو گے ــــ بھوں ــــ بھاؤں ــــ بھو! ــــ کتا بھونک بھونک کر بے اختیار ہنسنے لگتا ہے ــــ بے وقوف کو پتہ نہیں کہ چاروں طرف کتیاؤں کی پوری پلٹن موجود ہو تو دل کی بیماری کیسے ہو گی؟ ــــ بولا، کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرو، تم مجھے کوئی پاگل معلوم ہوتے ہو ــــ پاگل کو معلوم نہیں کہ پاگل وہ ہوتا ہے جسے پاگل ہو جانے کا خوف ہو۔ اسے کتے کی ذات کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ طبیعت اتنی جلی کہ پھر کبھی اُس کے پاس جانے کو جی نہیں چاہا۔ گوشت اور ہڈیوں کا لالچ ضرور آتا ہے پر ڈر لگا رہتا ہے کہ اس کی سوگھی ہوئی

خوراک کھا کھا کے میں بھی بس ورزش ہی ورزش کے قابل ہو کر رہ جاؤں گا۔ مجھ سے زندگی کرنا نہیں ہو پائے گا۔

ہہ ہہ ہا ـــــ ہہ ہا ہا ـــــ ہہ !

باتوں باتوں میں ہم ان لوگوں کے پاس آ پہنچے ہیں۔

بھوں ـــــ بھاؤں ـــــ بھو ـــــ بھوں ! ـــــ کتا اُن کی طرف دیکھ دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑا ہے ـــــ تمہاری آدمی کی ذات واقعی بہت احمق ہے ـــــ

ہہ ہہ ہا ـــــ ہہ !

دیکھو، دھیان سے دیکھو، ہر ایک کے چہرے سے کچھ کھو جانے کا ملال ٹپک رہا ہے اور ہر ایک کسی فائدے کے لالچ سے بے تحاشہ قہقہوں کی ورزش کئے جا رہا ہے۔ تم لوگ محض نفع اور نقصان کے لوگ ہو اس لئے جھیل جھیل کر جینا تمہارے بس کی بات ہی نہیں۔

ہہ ہا ہہ ہہ ـــــ ہا !

بھوں ـــــ بھاؤں ـــــ ں ! اُس بگلے کے منہ کو غور سے دیکھو ـــــ وہ دایاں کونہ ! یہاں سے اس کا رونا بہے جا رہا ہے لیکن اوپر اوپر سے وہ اپنی توپ کے دہانے سے قہقہوں کا بارود چھوڑ رہا ہے ـــــ اور وہ دیکھو ـــــ وہ ! ـــــ وہ صرف اس لئے قہقہائے جا رہا ہے کہ اس کے خالی خالی دل میں ہنسنے کی کوئی بات ہے نہ رونے کی ـــــ اور اُسے بھی دیکھو! وہ شاید جلدی میں اپنی تجوری کو کھلا چھوڑ آیا ہے اور اس طرح قہقہا رہا ہے جیسے لُٹ پُٹ کر فریاد کر رہا ہو ـــــ اور اُسے دیکھو ! ـــــ اُسے بھی ـــــ اُسے ! ـــــ بھوں ـــــ بھو ـــــ بھاؤں ـــــ بھر ! ـــــ کیا یہ مخلوق خدا کی بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہے ؟ ـــــ اچھا، ایک بات بتاؤ ! ـــــ سنا ہے تمہاری ذات نے سائنس کے کئی کرشمے کر دکھائے ہیں۔

ایسا تو نہیں کہ خدا کے بنائے ہوئے سبھی آدمی اپنی تجربہ گاہوں میں حادثوں سے مرکھپ گئے ہوں اور ـــــ اور یہ آدمی جو ہمارے دیکھنے میں آتے ہیں یہ اُن ہی کے بنائے ہوئے ہوں ـــــ ؟ ! ـــــ ارے واہ ! ـــــ کیا کرشمہ ہے ! ـــــ میری طرف سر اٹھا کہ حیرت اور خوشی سے کتے کی آنکھیں چمکنے لگی ہیں ۔

اور اس کے پہلو میں کھڑے کھڑے مجھے صاف دکھائی دیا ہے کہ میں بھی اُن ہی لوگوں کی قطار میں ـــــ وہ سب سے آخر میں کھڑے قہقہا رہا ہوں ۔

اب چھوڑو اُنہیں اور خدا کا شکر بجا لاؤ ـــــ چاروں ٹانگیں مزے سے زمین پر ٹکا لئے ہو تو کتنی پیاری صورت نکل آئی ہے ! ـــــ آداب سے میرے ساتھ زور زور سے بھونکنا شروع کردو !

زہرہ جمال

حیدر آباد

" لڑکا دیکھنے میں ہزاروں میں ایک قابلیت اخلاق ہر معاملے میں لاثانی ماشاء اللہ ولایت سے انجینئری کر آیا ہے۔ ہزار بارہ سو تنخواہ ہے۔ جائداد ہزاروں کی الگ ہے"۔

خالہ بی نے امی جان کی طرف دیکھ کر شبانہ کو سناتے ہوئے کہا۔ شبانہ انجان بنی مشین چلاتی رہی۔

امی بولیں" لوگ کہاں کے ہیں؟"

"نواب ہیں خاندانی۔ حیدرآباد کے"۔

شبانہ کا جی دھک سے ہو گیا۔ "حیدرآباد، نہ بابا"

حیدرآباد کے ہیں تو اُن کے ابا جان ضرور واقف ہوں گے۔ حیدرآباد کے رؤسا سے بڑا ربط ضبط تھا ان کا۔

"نواب صفدر جنگ"

شبانہ اٹھ کر اپنے کمرہ میں چلی آئی اور مسہری پہ اوندھی ہو گئی۔

"نہیں ہرگز نہیں.... صاف صاف انکار کر دوں گی۔ خواہ کچھ ہی ہو۔

اور ہوا بھی یہی کہ جب ابا جان اور امی جان نے ہر طرح کی واقفیت بہم پہنچا کر اپنی اکلوتی بیٹی شبانہ کے لئے سرور علی کا رشتہ منظور کر لیا اور اس کی سہیلی سے اس تک بات پہنچا دی۔ تاکہ رسمی منظوری حاصل ہو جائے اس کی۔ انھیں معلوم تھا کالج میں ایم اے تک تعلیم پانے کے باوجود شبانہ کا رجحان کسی لڑکے کی طرف نہیں تھا۔ وہ یقیناً والدین کی

پسند پر اقرار کرے گی اور کمی کونسی ہے ؟ ہاں اگر شبانہ خود کسی کو پسند کر آتی تو اور بات تھی۔ والدین روشن خیال تھے ضرور اُس کی بات مان لیتے۔

لیکن جب شبانہ نے سرور علی کی حسین اور وجیہہ تصویر دیکھنے کے بعد انکار کر دیا تو ماں باپ کا ماتھا ٹھنکا۔ بہت کرید اگر کوئی چنگاری ہاتھ نہ آئی۔ آخر لڑکی کے انکار کی وجہ کیا ہے ؟

حیدر آباد ..." یا اللہ بچی تو نے حیدر آباد کی شکل نہیں دیکھی اور للٰہی بغض پال لیا حیدر آباد والوں سے"۔

خالہ بی نے سمجھایا۔

سہیلیوں نے بھی منتیں کیں : " شبانہ اتنے اچھے رشتے قسمت سے ہی ملتے ہیں"۔

شبانہ کا ایک ہی جواب تھا " جہنم میں جانا منظور ہے مگر حیدر آباد نہیں"۔

ابا جان حیدر آباد گئے اور صفدر جنگ کے خاندان سے مل کر آئے صفدر جنگ نے سیرت النبیؐ پر کتاب لکھی تھی وہ انہیں دی۔

اس نیک ایماندار خاندان کے وہ تو اور بھی گرویدہ ہو گئے تھے، ایسا خوبرو برسر روزگار، دیندار، شائستہ، خوش مزاج، بااخلاق لڑکا ــــ بھلا کیا کمی ہے اس کو لڑکیوں کی ــــ پھر کوئی مطالبہ نہیں جبکہ معمولی لڑکے گھوڑے جوڑے کے ہزاروں مانگتے ہیں۔ یہ تو اتفاق تھا کہ خالہ بی کے بڑے لڑکے سلیم نے سرور کے ساتھ ہی انجینئرنگ کا ڈپلوما لیا تھا اور اس کی دلی خواہش تھی کہ شبانہ کی شادی سرور سے ہو جائے۔ خود سلیم نے لندن میں ایک فرانسیسی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ خالہ بی تو شبانہ کو اپنی ہی بہو بنانا چاہتی تھیں، مگر سلیم نے شاید اسی لئے اپنا نعم البدل سرور کو منتخب کر لیا تھا۔

خالہ بی کی رائے پر سرور کو دہلی مدعو کیا گیا۔

شبانہ نے سلیم کو دیکھا، ملی۔ اکثر گھومنے پھرنے میں بھی وہ ساتھ رہی لیکن امی جان خود

کر رہی تھیں کہ اس کا ہر رویّہ رسمی تھا۔ آخر انھوں نے سختی سے پوچھا کہ سرور علی میں اسے کیا عیب نظر آیا ہے؟ اگر اس نے اس رشتے کی پرواہ نہیں کی تو پھر وہ اسی پر چھوڑ دے گی۔ کرے یا بیٹھی رہے۔

امّی کا پارہ چڑھتے دیکھ کر پھر شبانہ نے یہی دہرایا۔ "حیدرآباد اچھا نہیں لگتا" اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

شام کو وہ باغ میں اُداس بیٹھی اپنی بے بسی پر غور کر رہی تھی۔ "اباجان اور امّی کو کیا ہو گیا نہ جانے کیوں زبردستی اس دوزخ میں جھونکنے پر آمادہ ہیں ——— حیدرآباد" اس کے بدن پر کانٹے کھڑے ہو رہے تھے۔

اچانک سرور علی ٹہلتے ہوئے آگئے۔

"معاف کیجئے گا، سُنا ہے آپ کو حیدرآباد سے بڑی نفرت ہے۔ کیا میں وجہ دریافت کر سکتا ہوں"؟

وہ گھبرا گئی۔ سنبھل کر بولی "مجھے جاگیردارانہ ماحول سے نفرت ہے۔"

"لیکن وہ تو کب کا ختم ہو چکا۔ وہ قدریں جن میں کچھ خوبیاں اور خامیاں۔ ہو سکتا ہے، خامیاں زیادہ ہی ہوں۔ اب تو ماضی کی قبر میں مدفون ہیں ——— پچیس سال میں ایک نئی پود، نیا ماحول جوان ہوا ہے۔"

"تہذیبی اثرات صدیوں میں فنا ہوتے ہیں۔"

"آپ مجھ میں کیا اثرات پا رہی ہیں، میں دوسرے کی طرح شستہ اُردو میں بات کر رہا ہوں ۔ آپ فرمائیں تو ہندی میں بات چیت ہو۔"

"آپ مذاق کر رہے ہیں دراصل مجھے ——— بس مجھے وہاں کے ماحول سے نفرت ہے۔"

"دیکھئے۔ آپ نے تو ماحول دیکھا ہی نہیں۔ لیکن آج دُنیا میں جو ماحول ہے میرا مطلب ہے اچھائیاں اور بُرائیاں وہ ہر جگہ تقریباً یکساں ہے ——— یورپ میں بھی جہاں آپ کو بھی نظر

نظر آئیں گے۔ بڑے اچھے مخلص ذی شعور باعمل صاحب کردار انسان ملیں گے — اب آپ بھی اِزم کو یورپ کا ترجمان کہیں تو غلطی ہوگی۔ اسی طرح —"

"معاف کیجئے گا، بھئی تو اچھے ہوتے ہیں لیکن بظاہر کچھ — آپ بُرا مت مانیئے گا، دراصل ...... خیر جانے دیجئے ......"

"آخر آپ کو کس نے حیدرآباد سے اسقدر بدظن کر دیا ہے۔ چلئے آپ کچھ دن ہمارے یہاں رہیئے چل کر۔ وہاں میری بہنیں ہیں۔ آپ کی ہم عمر — شاید ہم مذاق بھی ہوں گی۔ اتنی ہی تعلیم یافتہ، اتنی ہی شرمیلی اور مہذب جسقدر آپ ہیں۔ لیکن ..... وہ حیدرآباد سے محبت کرتی ہیں۔ دیکھیئے پنجابی، پنجاب سے، سندھی سندھ سے محبت کرتا ہے۔ اسی طرح دہلی اور رامپوری۔ ہر انسان اپنے ماحول سے زیادہ مانوس اور وابستہ ہوتا ہے، بسا اوقات اسکی خامیاں اسکا جھول بھی پیارا لگتا ہے...... آپ ہماری زبان پر جتنا چاہیں ہنسیں لیکن لندن میں ہم سب حیدرآبادی اکٹھے ہو کر اسی لب ولہجہ میں گفتگو کرتے تھے تو کیا لطف آتا تھا۔ آپ نہیں اندازہ کر سکتیں۔ اب یہ ضروری تو نہیں کہ جو حیدرآباد جائے وہ کھٹا کھائے۔ فرشی سلام کرے اور حیدرآبادی میں "باتاں" کرے۔"

سرور علی کے تکلم میں ایک عجیب خلوص تھا۔ شبانہ سنتی رہی۔ پھر کچھ بولا نہ گیا۔ کہتی بھی کیا — ؟

منگنی ہوگئی — شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ دن قریب آگئے۔ دولہا والوں نے یہ بات مان لی تھی کہ دولہا شیروانی اور طرّہ دار صافہ کے بجائے سوٹ پہنے گا۔

برات آئی۔ دھوم دھام سے شادی کی رسومات ادا ہوئیں رخصت شام کو ہوگئی اور دولہا دلھن ہوائی جہاز سے حیدرآباد پہنچ گئے۔

سسرال کا بہت بڑا پکا محل تھا۔ اسی طرح آراستہ پیراستہ — وہ جانے کتنی ڈیوڑھیوں سے گزر کر دلھن اندر گئی۔ باندیاں، ملازمائیں کانی نظر آرہی تھیں۔ ہر وہ سب جب لگا کر رہی

صدقہ واری ہو جاتی آکر۔ لیکن شبانہ کا دل دھڑکے ہی جا رہا تھا۔ وہ ہر باندی کو غور سے دیکھتی کم سن خوبصورت ــــ کتنی لڑکیاں تھیں۔

رات کے کھانے کے بعد اسے دُولھا کے کمرہ میں پہونچا دیا گیا۔ نند نے کہا "بھابی جان کچھ دیر آرام کر لیجئے۔ بھائی جان قوالی کی محفل میں گھرے ہوئے ہیں۔" کسی نے کہا "دُلھن بیگم آرام کیجئے۔ نوشہ میاں کو آج نہیں آنے دیں گے۔"

ــــ اور شبانہ کا دل دھڑک اُٹھا۔ سب نے اسے آرام کی خاطر تنہا چھوڑ دیا۔ لیکن آرام اور سسپنس خیز بن گیا۔ وہ ارد گرد کے دروازوں پر نگاہ ڈالنے لگی ــــ

کمرہ در کمرہ کافی طویل سلسلے تھے۔ پھر اس کے ذہن پر غبار چھا گیا۔ گھڑی کی سوئیاں چل رہی تھیں۔ لیکن اس کی سانسیں رک رہی تھیں ــــ شاید دُولھا میاں محفل سے اُٹھے ہوں ــــ اور پھر کسی ڈیوڑھی سے گزر رہے ہوں ــــ جوان حسین باندی راہ میں آگئی ہو۔ لاحول ولا قوۃ ــــ کیسے خیال آرہے ہیں ــــ اسے جھپکی سی لگی ــــ اس نے دیکھا دُولھا میاں نے اپنی انگوٹھی ایک نیم عریاں خوبصورت عورت کی انگلی میں پہنا دی ــــ اسے ایسا لگا کہ ساری باندیاں لونڈیاں ہنس رہی ہیں۔ دُولھا میاں کو دیکھ کر ــــ ان کی ہنسی میں طنز ہے، غرور ہے ــــ دولھن بیگم کے حصے میں اُترن آئی ہے ــــ لاحول ولا قوۃ۔

اُس نے پھر شیطان کو بھگانا چاہا جو بُری طرح حواس پر چھا رہا تھا ــــ

وہ سوچنے لگی۔ ساری زندگی یہ تصور لے کر ایک شریف لڑکی پروان چڑھتی ہے کہ وہ کسی کی امانت ہے اور ــــ اپنے روم روم کی حفاظت کرتی ہے۔ وہ بھی ایسی ہی ایک مشرقی لڑکی تھی۔ مغربی تعلیم کے باوجود اپنے معیار و اقدار کی پرستش کرنے والی ــــ آہ یہ جنتِ حیدرآباد۔ اس کا یہ پاکیزہ بدن جیسے ایک گندی نالی میں ڈال دیا گیا ہے۔

ــــ اس کی غیرت تو اس قسم کا ماحول برداشت نہیں کر سکے گی۔

اُف ــــ لوگ کیسے ہوتے ہیں۔ بظاہر اُجلے ــــ سرور علی کو دیکھ کر کون سوچ سکتا

ہے۔ اس شخصیت کی تہہ میں حیدر آباد کی غلاظت کی تہیں بھی ہوتی ہیں یا نہیں ——
نہیں اگر —— اگر آج وہی سب ہوا تو وہ —— وہ قول صبح ہوتے ہی میکے چلی جائے گی۔

اور پتہ نہیں اسے کیا ہُوا کہ جب اس نے خود کو شوہر کی مضبوط بانہوں میں مقید پایا تو مُنہ سے نکل پڑا : "آپ کو قسم ہے مجھے ہاتھ نہ لگائیے گا اگر —— اگر آپ نے کسی باندی کو ہاتھ لگایا ہے۔"

"توبہ توبہ —— اسقدر خوبصورت ہونٹوں سے ایسی بدصُورت بات!"

اور پھر سرور علی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا : "گھر کی خادمائیں تو بہن بیٹیاں ہوتی ہیں۔ یہ ہاتھ لو۔"

یورپ کی کوئی میم صاحب بھی نہ کھینچ سکیں اپنی طرف —— شاید ایسی صبر وضبط کا صلہ یہ خوبصورت گٹھری بندھی ملی ہے، سرور نے مُسکرا کر کہا۔ پھر بڑی سنجیدگی سے اس کی ٹھوڑی اُٹھا کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا بدگمانی گناہ ہے۔ تقدیس کا تصوّر صرف لڑکیوں کے لئے ہی نہیں ہے، لڑکوں کی زندگی میں بھی ہوتا ہے۔"

شبانہ کو اُن آنکھوں کی گہری جھیلوں میں بے کراں محبت، معصُومیت اور پاکیزگی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ اُس نے شرمندہ ہو کر نظریں جھکالیں۔

سرور نے اس کے کان میں پوچھا : "مگر یہ سب واہیات باتیں آپ کے دماغ میں آئیں کس طرح؟ —— سمجھا —— حیدر آباد سے آپ اسی لئے نفرت کرتی تھیں۔"

"مَیں نے تو کہانیوں میں پڑھا تھا کہ ......"

"ہش! دیوانی!" سرور علی نے اپنی دلھن کو اپنی بانہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔ "وعدہ کرو، آئندہ کبھی ایسے خیالات جی میں نہیں لاؤ گی۔"

شبانہ نے نفی میں گردن ہلا دی —!

شیخ محمد اکرام بنام مولانا عرشی

رام پور سے خاص جریدہ غالب کے لئے

اکبر علی خان عرشی زادہ

شیخ محمد اکرام غالب کے سب سے اہم نقاد ہیں۔ انھوں نے غالب کا مطالعہ اس وقت کیا جب مولانا حالی کی یادگار غالب اور بجنوری اور ڈاکٹر لطیف کی انتہا پسندانہ تصنیفات کے سوا کچھ نہ تھا۔ اگرچہ ان کی کتاب غالب نامہ کی اشاعت سے کچھ ہی قبل مولانا مہر مرحوم کی غالب شائع ہو گئی تھی مگر ان دونوں کے انداز کار میں بین فرق تھا۔ شیخ محمد اکرام کا مطالعہ اتنا معتقدانہ نہیں تھا جتنا ناقدانہ تھا۔ اس لئے اکرام صاحب کی کتاب شائع ہوتی تو ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اور آج جب کہ غالب پر کتابوں اور مضامین کا انبار لگ گیا ہے، اکرام صاحب کی مقبولیت اور اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ غالب نامہ جو بعد میں حیاتِ غالب حکیم فرزانہ اور ارمغان غالب کے نام سے تین حصوں میں چھپی ہے، تفہیم غالب کے لئے بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے اور غالب کی ذہنی اور فنی گتھیوں کو سمجھنے کے لئے جدید تعلیم یافتہ طبقے کی پسندیدہ کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ وہ اپنی کتاب میں نہ بجنوری بنے ہیں اور نہ ڈاکٹر لطیف اس لئے غالب سے عقیدت اور محبت کے باوجود بھی ان کی گفتگو میں وزن ہے۔ گزشتہ سال کے آغاز (جنوری یا فروری) میں ان کا پاکستان میں انتقال ہو گیا اور ہم غالب کے ایک بہترین سوانح نگار اور نقاد سے محروم ہو گئے۔

شیخ صاحب سے غالب صدی تقریبات کے موقع پر وگیان بھون نئی دہلی میں اچانک ملاقات ہو گئی۔ ان کے دہلی آنے کی کوئی خبر نہیں تھی۔ معلوم ہوا کہ امریکہ سے واپسی میں وہ دہلی اتر گئے۔ ان کا جی نہیں مانا کہ اس میں شرکت کئے بغیر اوپر ہی اوپر گزر جائیں۔ میں اکرام صاحب

سے اس شاہنشاہِ سخن کے نتائج فکر کے ساتھ یہ شاہانہ سلوک بڑا قابل تعریف ہے۔
لیکن مجھے ایک حسرت رہی کہ میں ایک تفصیلی مقدمے اور تنقیدی حواشی کا متلاشی تھا مکاتیب غالب کے بعد ان کی امید ایک قدرتی امر ہے لیکن غالباً ان کی گنجائش نہ تھی۔
آپ نے انتخاب کے اخیر میں لکھا ہے کہ دوسرا مطبوعہ ایڈیشن (دیوان غالب اردو) سٹیٹ لائبریری کے لئے نقل ہو رہا ہے لیکن جس نسخے سے نقل ہو رہا ہے، اس میں دو ورق غائب ہیں۔ یہ نسخہ تو کثرت سے ملتا ہے۔ مولانا حسرت اور مسٹر اسد علی انوری کے پاس دو نسخے ہیں۔ لاہور میں بھی ایک صاحب کے پاس ہے۔ آپ غالباً بغیر کسی دشواری کے مکمل کر لیں گے۔
غالب کی قید کے سلسلے میں ماصی نے جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کروا کر بھیج دیں تو بہت مشکور ہوں گا۔ آپ کے ہاں تو اجرت پر نقل کرنے والے ہوں گے۔ جو کچھ انھیں ادا کرنا ہو گا میں کر دوں گا۔
میرا خیال ہے کہ حکیم احسن اللہ خان کو خط کلکتے سے لکھا گیا۔
(۱) حالی کہتا ہے اور
(۲) خط کی عبارت اس کی موید ہے۔ مثلاً (ب) جہاں اپنی طویل غیر حاضری کی طرف اشارہ کیا ہے یا (ہ) گل رعنا کے دیباچے کا ماضی قریب میں ذکر کیا ہے۔ یا (ج) قتیل وغیرہ کی بحث کا بیان ہے۔
(۳) گلشن بے خار ۴۳-۱۸۳۲ء میں لکھی گئی وہ بھی اس کی موید ہوتی ہے یا
(۴) گل رعنا میں خارج شدہ اشعار کا منتخب ہونا کوئی قطعی دلیل نہیں۔ کیونکہ انتخاب، قیام کلکتہ کے دوران میں گل رعنا کے انتخاب کے بعد مرتب ہو سکتا ہے۔
ویسے میں مانتا ہوں کہ بظاہر ۱۲۴۸ ہجری کی تاریخ کے حق میں بھی کئی دلائل ہیں اور دلائل نمبر ۱ اور نمبر ۲ کا یہ جواب ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ حکیم احسن اللہ خان کے خط میں کسی اور دیباچے کی طرف اشارہ ہو تا اس دیباچے میں دیوان منتخب کرنے کے بعد ایک دو سطریں اضافہ کی گئیں ہیں۔ اس خط میں منتخب دیوان کا ذکر نہیں۔

آپ ان سطور پر غور کر کے اپنی رائے سے اطلاع دیں افسوس کہ میں اس وقت بے حد مصروف ہوں۔ دل جمعی سے اس مسئلے پر کچھ نہیں لکھ سکتا کاتب لاہور سے بلایا ہوا ہے اور نامکمل کتابیں مکمل کر رہا ہوں۔ انشاءاللہ آپ کا جواب آنے پر تفصیل سے لکھوں گا۔

آپ اپنے منتخب دیوان (۱۲۴۸ ہجری) کی نسبت مجھے سب تفصیلات بھیجیں۔ میرا ارادہ ہے کہ میخانۂ شباب کے اشعار کو دو یا تین حصوں میں تقسیم کر دوں۔ ۱۸۲۷ء تا ۱۲۴۸ ہجری ر تا ۱۸۴۱ء تا ۱۲۴۷ء اس لئے مجھے ان اشعار کی نسبت جو ۱۲۴۸ھ میں نہیں اور ۱۸۴۱ء میں ہیں۔ مکمل واقفیت درکار ہے۔ میں کتاب آپ کے خط کا حوالہ دے رہا ہوں اس لئے اگر کوئی اندراج نامکمل پڑا رہا تو اس کے آپ ذمہ دار ہوں گے۔ آپ کی سہولت کے لئے میں علیحدہ کاغذ پر سوالات لکھ رہا ہوں۔ اسی کاغذ پر جواب لکھ دیں۔

افسوس ہے کہ آپ کو بڑی تکلیف دے رہا ہوں لیکن اگر ایک مُبتدی کی کتاب غلطیوں سے بچ گئی تو آپ کو ضرور خوشی ہوگی۔ براہ کرم جلد جواب ارسال کریں۔

بڑی عجلت سے دفتر میں بیٹھ کر یہ خط لکھ رہا ہوں خدا کرے بہت سی غلطیاں نہ ہوں۔ محمد اکرام

سوال نامہ [مع جوابات]

سوال ۱۔ منتخب دیوان کا جو نسخہ رام پور لائبریری میں ہے (۱۲۴۸ ہجری والا) کیا اس میں نواب ضیاء الدین کی تقریظ شامل ہے؟

جواب ۱۔ جی نہیں یہ تقریظ اس میں نہیں ہے

سوال ۲۔ اگر یہ تقریظ شامل ہے تو اس میں اشعار کی کتنی تعداد درج ہے؟

جواب ۲۔ ×

سوال ۳۔ آپ کی گنتی کے مطابق اس نسخے میں کل کتنے اشعار ہیں؟

جواب ۳۔ ۱۰۶۷ شعر ہیں۔

سوال ۴۔ آپ نے ذیل کی غزلوں وغیرہ کی نسبت لکھا ہے کہ وہ مندرجہ بالا نسخے میں نہیں۔ دیتا ہوں (نو اشعار) ہم رشک کو اپنے (۳ اشعار) گئے وہ دن (۲ اشعار) تاہم

کو شکایت (۲ اشعار) زندگی اپنی (ایک شعر)

جواب:۔ یہ ۱۸۴۷ء کے نسخے میں ہیں۔

سوال:۔ ایک دفعہ براہ کرم یہ نسخہ پھر دیکھ لیں کہ آیا کوئی اور شعر تو ایسا نہیں جو اس نسخے میں نہ ہو اور نسخہ طبع اول ۱۸۴۱ء میں ہو یعنی غالب نامہ کے خمخانۂ شباب تک آ گیا ہو۔

جواب:۔ لاغر اتنا ہوں (۴ شعر) یہ غزل بھی ہمارے ۱۸۴۷ء کے نسخے میں نہیں ہے۔ سیاہی جیسے گر جاوے (اشعر) یہ بھی ندارد ہے۔

سوال:۔ رباعیات کو خاص طور پر احتیاط سے دیکھیں بالخصوص جن اشعار کا میں نے غالب نامہ (اشاعت ثانی) ص ۱۶۱ کے قریب ایک فٹ نوٹ میں ذکر کیا ہے۔ انھیں بھی ضرور دیکھیں۔

جواب:۔ دو رباعیات جو ۱۸۴۱ء کے نسخے میں ہیں۔

بھیجی ہے جو الخ اور ہیں شہ میں صفات الخ یہ دونوں ۱۸۴۷ء کے نسخے میں نہیں ہیں بقیہ ہیں۔

سوال:۔ غالباً آپ مطبوعہ ایڈیشن ۱۸۴۷ء کی بنا پر کہتے ہیں کہ ذیل کی غزل ۱۸۴۷ء سے پہلے کی ہے۔

کی وفا ہم نے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں۔

براہ کرم اس ایڈیشن کا غالب نامہ اشاعت ثانی سے مقابلہ کر کے دیکھیں کہ کیا کوئی اور غزل یا رباعی وغیرہ تو ایسی نہیں جو ۱۸۴۷ء سے پہلے لکھی گئی اور اس کی نسبت غالب نامہ میں اشارہ نہیں۔

جواب:۔ کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں ۱۸۴۷ء والے نسخے میں ہے اور غالب نامہ میں اشارہ نہیں ہوا ہے۔ وہ زہد امن ہے بیداد دوست الخ یہ بھی ہے اور اشارہ نہیں ہوا ہے۔

(۲)

پورنہ

۲۹ اگست [۱۹۴۳ء]

مکرمی

سلام علیکم :- عنایت نامہ ملا۔ شکر ہے آپ نے پنج آہنگ کی ترتیب نئے سرے سے شروع کر دی ہے۔

نئے خطوط کے انتظار میں دیر نہ کریں۔ لیکن مشہور اخبارات اور رسائل میں ایک اطلاع نامہ شائع کرا دیں تو بہتر ہو تا کہ جس کے پاس غیر مطبوعہ فارسی خطوط ہوں وہ آپ کو ارسال کر دیں۔ پروفیسر مہیش پرشاد صاحب اس مسئلے میں مفید مشورے دے سکیں گے۔

یادگار غالب میں ایک غیر مطبوعہ فارسی خط کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔ (واقعہ قید سے متعلق) کوشش کرنی چاہیئے کہ اس طرح کے خطوط تو ضرور دستیاب ہو جائیں۔

ویسے اگر کوئی غیر مطبوعہ خط نہ ملے اور تاریخی ترتیب میں بھی آپ کامیاب نہ ہوں تب بھی میرا خیال ہے کہ آپ کو یہ کام مکمل کرنا چاہیئے۔ ایک تو خطوط صحیح چھپیں گے دوسرے اس زمانے کی بہت سی شخصیتیں آپ کے حواشی کے ذریعے لوگوں سے روشناس ہو جائیں گی۔ سوانحی نقطۂ نظر سے میں پنج آہنگ کو اردوئے معلی سے بھی زیادہ کارآمد سمجھتا ہوں۔

آپ نے کتابت اور مضمون کی جن فروگزاشتوں کی طرف توجہ دلائی ہے ان کے لیے دلی شکریہ۔ میں نے انھیں درست کر لیا ہے ویسے میرا خیال ہے کہ شاید غالب نامہ (اشاعت ثانی) کے شروع میں جو غلط نامہ ہے وہ شاید آپ کی نظر سے نہیں گزرا کیونکہ ۱۸۴۷ء سے پہلے کی غزلوں کی نسبت اس میں تصریح ہے۔

میں نے آج ہی ایک پوسٹ کارڈ مہتمم کتب خانہ رام پور کے نام اس مضمون کا لکھا ہے کہ مجھے انتخاب غالب بذریعہ وی۔ پی بواپسی ڈاک ارسال کیا جائے۔ اگر ہو سکے تو آپ کتب خانے والوں سے کہہ دیں کہ فی الفور کتاب ارسال کریں۔ آپ کے بمبئی والے کتب فروشوں کے وعدے پر بہت دن ضائع ہو گئے۔

غالب کی غیر معروف مثنوی (ترجمہ) کے متعلق آپ کا مضمون ملا شکریہ۔ میں نے آثار غالب میں اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور بھی اگر کچھ لکھیے گا یا کوئی اہم مضمون نظر سے گزرے تو اس کے متعلق ایک سطر لکھ دیا کریں۔ میں یہاں شہر سے دور شہر یار سے دور"

ایک ایسے ماحول میں ہوں جو ادبی دلچسپیوں کے لئے زہر قاتل کا اثر رکھتا ہے۔ کبھی اردو رسائل میں دیکھتا رہتا ہوں۔ لیکن اردو کا ہر ایک رسالہ علمی اور ادبی ہے ہر ایک رسالہ دیکھا نہیں جا سکتا اس لئے بہت سے مضامین نظر سے اوجھل ہوتے ہوں گے۔

نیاز مند

محمد اکرام

(۴)

پونا۔ صوبہ بمبئی

۲۵ رمئی [۱۹۴۷ء]

مکرمی

سلام علیکم۔ قاضی عبدالودود صاحب پونا تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ آپ کے مرتب کردہ مکاتیب غالب کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے اور پہلے سے مختلف ہے دہلی سے پتہ (کذا) منگایا تو چوتھا ایڈیشن ملا۔ اس حسن قبول پر مبارک باد قبول ہو۔

اس نسخے کو دیکھ کر بعض نئی باتوں کا پتہ چلا انھیں دیکھ کر آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔

(۱) آپ کے مرتب کردہ پنج آہنگ (فارسی مکتوبات) کی کب تک توقع کی جائے؟

(۲) اگر اس کے چھپنے میں دیر ہے تو کیا باغ دودر (کذا) کا وہ حصہ جو سبد چیں مرتبہ مالک رام سے زائد ہے اجرتاً نقل کرانے کا آپ انتظام کر سکتے ہیں؟ کیا اس حصے میں کوئی خاص چیز ہے؟

(۳) نواب فردوس مکاں (یوسف علی خان ناظم) کے دیوان کا ایک نسخہ بذریعہ وی پی بھجوا دیں۔ امید ہے مزاج بخیریت ہوگا۔

نیاز مند

محمد اکرام

آئی سی ایس۔ پونا (جی۔ آئی۔ پی۔ ریلوے)

کی پرانی تصویر غالب نامہ میں اور ایک نسبتہً بعد کے رسالہ آج کل کے غالب نمبر میں دیکھ چکا تھا۔ اور ان کے نقوش دماغ میں محفوظ تھے۔ میں نے سیمنار کے کمرے کے باہر انھیں سرور صاحب کے ساتھ مصروف گفتگو دیکھا تو پہچاننے میں ذرا بھی تامل نہ ہوا اور عجیب مسرت اور عقیدت کے ساتھ میں ان کی طرف بڑھا۔ سرور صاحب نے میرا تعارف کرایا تو بے حد شفقت سے ملے اور بہت خوش ہوئے۔ ابا کی خیر و عافیت دریافت کی اور کہا کہ سوچا تھا دوسرے احباب کے ساتھ ان سے بھی یہاں ملاقات ہو جائے گی۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ علیل ہیں، اور شریک نہیں ہو سکتے۔ آپ میری طرف سے مزاج پرسی کیجئے گا۔ اور سلام کہیئے گا۔

خیر خیر عافیت کے بعد پہلا سوال خطوط فارسی کی تدوین کے بارے میں کیا کہ وہ کام کس منزل میں ہے؟ میں نے بتایا کہ صحت متن اور تاریخی ترتیب تو ہو چکی ہے مگر حواشی اور مقدمہ نہیں لکھے گئے۔ فرمانے لگے کہ بھئی عرشی صاحب سے کہیئے کہ اس کام کی تکمیل جلد کر دیجئے۔ ہم لوگوں کو بڑا اشتیاق ہے۔ دوران گفتگو میں سرور صاحب نے میرے بارے میں بتایا کہ ان سے ہم نے فارسی خطوط کا ترجمہ کرایا ہے اور اسے انجمن ترقی اُردو ہند کی طرف سے چھاپ رہے ہیں۔ یہ سنا تو اور بھی خوش ہوئے اور کہا کہ مجھے ضرور بھیجئے گا۔ اسی زمانہ میں نقوش کا غالب نمبر نیا نیا شائع ہوا تھا۔ جس میں ابا کا مضمون "دیوان غالب فارسی نسخہ عرشی کے چند اوراق" شامل تھا۔ فرمانے لگے عرشی صاحب اسے بھی نبٹا دیں۔ ان کی تصحیح کے بعد اشعار کی قرأت اور تاریخی ترتیب کی طرف سے پورا اطمینان ہو جائے گا۔ دیوان فارسی کے نام کا بھی ذکر آگیا تو اپنے خیال کا اعادہ کیا کہ میں عرشی صاحب سے ابھی تک متفق نہیں ہو سکا۔ میری رائے میں "میخانۂ آرزو" ہی نام رکھا گیا تھا۔ "میخانۂ آرزو سرانجام" نہیں۔ اکرام صاحب کی رائے میں یہ مہمل تھا۔ اس پر سرور صاحب نے کہا کہ بیدل نے ایک مصرعے میں "غم خانۂ ملکفت سرانجام" لکھا ہے۔ اس کی روشنی میں غور کرنا چاہیئے مگر وہ کچھ زیادہ مطمئن نہیں معلوم ہوتے۔

میں اکرام صاحب سے فرط مسرت میں ملنے کے لئے آگے بڑھ تو گیا تھا مگر جتنی دیر گفتگو ہوتی رہی دل میں ایک چور رہا۔ ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا۔ وہیں میں نے پہلی بار انجمن ترقی اردو کی شائع کی ہوئی کتاب نقد غالب پڑھی۔ اس میں شیخ محمد اکرام صاحب

کا مضمون بعنوان "دیوان ناظم میں غالب کا حصہ" شامل ہے۔ مضمون کا موضوع عنوان سے ظاہر ہے۔ مطالعے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اکرام صاحب نے بعض ایسی معلومات کو در پردہ رکھا ہے، جن کا حوالہ دینے سے خطرہ تھا کہ انھیں اپنے اثبات مدعا میں کامیابی نہ ہوگی۔ انھوں نے تحریر فرمایا تھا۔

"۱۹۳۷ء میں مکاتیب غالب کے نام سے غالب کے خطوط کا مجموعہ شائع ہوا جو انھوں نے فرماں روایان رام پور کو لکھے تھے۔ اس مجموعۂ مکاتیب میں ناظم کی اصلی غزلیں اور غالب کی اصلاحیں درج نہیں ممکن ہے وہ دفتر انشا رام پور میں موجود ہوں مگر قرائن سے خیال ہوتا ہے کہ جن معاملات میں خاص احتیاط کی ضرورت تھی ان کا اندراج دفتری مسودات میں نہ ہوتا تھا......"

حقیقت یہ تھی کہ غالب نے مسودات ناظم پر جو اصلاحیں کی تھیں وہ مکاتیب غالب کی طبع دوم (۱۹۴۳ء) سے طبع ششم (۱۹۴۹ء) تک تمام اشاعتوں میں شامل ہیں۔ میں نے اپنے اس شک کا اظہار اس مضمون میں کیا تھا جو "کیا دیوانِ ناظم عطیۂ غالب ہے؟" عنوان سے اردو ادب علی گڑھ اور صحیفہ لاہور میں شائع ہوا ہے۔ ملاقات کے دوران میں مجھے برابر یہ خیال رہا کہ کہیں وہ میرے اس شک پر افسردہ نہ ہوئے ہوں اور شکایت نہ فرمائیں لیکن انھوں نے اس کا کوئی ذکر ہی نہ فرمایا۔

البتہ میرا یہ شک نکلا درست۔ چنانچہ پچھلے سال جب پرانے خطوط میں اکرام صاحب کے خطوط مجھے ملے تو ان میں ۵ / مئی ۱۹۴۷ء کے تحریر کردہ خط سے پتا چلا کہ اکرام صاحب نے مکاتیب غالب کا چوتھا ایڈیشن ملاحظہ فرمایا تھا۔ اور اسے پڑھ کر انھیں نواب یوسف علی خان ناظم کے دیوان کی ضرورت بھی پیش آئی تھی اور انھوں نے یہ دیوان خرید بھی تھا میرا خیال ہے مذکورہ مضمون لکھنے کا ارادہ بھی اکرام صاحب نے اسی وقت کیا ہوگا اس لئے کہ مجملاً یہ بحث غالب نامہ کے ایک حصے میں موجود ہے۔

اکرام صاحب نے ابا کے نام اور بھی خطوط لکھے ہوں گے، مگر ان میں سے صرف چار خطوط ہی میرے ہاتھ آسکے۔ سوچا کہ اکرام صاحب کی یادگار کے طور پر محفوظ کر دوں۔

سو ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں کسی خط پر اکرام صاحب نے سنہ تحریر نہیں فرمایا۔ ایک خط میں صرف تاریخ ہے مہینہ بھی نہیں۔ میں نے ان خطوں کے لفافوں سے ڈاک خانے کی مہریں پڑھ کر یہ اضافہ کر دیا ہے۔

(۱)

۲ کوئنز گارڈنز

پونا

۱۹ جولائی [۱۹۴۳]

مکرمی سلام علیکم۔ عنایت نامہ ملا بہت بہت شکریہ۔

آپ کا سورت والا خط مجھے ملا تھا مجھے افسوس ہے کہ اس کا جواب نہ دے سکا۔ آپ نے فارسی خطوط (غالب) کی نسبت میرے نوٹ مانگے تھے۔ چونکہ مجھے جلد ہی اس کے بعد پنجاب خریداری گندم کے سلسلے میں جانا پڑا اور وہ نوٹ یہاں تھے۔ اس لئے جواب میں تاخیر ہوتی رہی حتیٰ کہ اتنی دیر ہو گئی کہ میں نے خاموشی میں ہی مصلحت سمجھی۔

وہ نوٹ اب بھی حاضر ہیں۔ آپ کے لئے بیکار ہوں گے چونکہ میں نے انھیں کام کے ابتدائی دور میں جمع کیا تھا۔ اس لئے چنداں مفید نہ ہوں گے اور بہت جگہ غلط بھی ہوں گے لیکن جیسے بھی ہیں میں انھیں ایک دو دن میں بذریعہ بیمہ پارسل بھیج دوں گا۔ جب آپ کو ضرورت نہ رہے انھیں واپس بھیج دیں۔

غالب کا کوئی غیر مطبوعہ فارسی خط میرے پاس نہیں ایک منظوم خط ہے جو غالب نے کسی دوسرے کی طرف سے شاید اس کے بیٹے کو لکھا تھا۔ میں نے پٹنہ کے کسی نسخے سے نقل کیا تھا لیکن وہ تو آپ کے کام کا نہ ہوگا۔

پروفیسر حمید احمد خان کے پاس میں نے ایک غیر مطبوعہ فارسی خط دیکھا تھا۔ شاید اب انھوں نے کچھ اور بھی جمع کیا ہو۔ وہ اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر ہیں۔

آپ فارسی خطوط کی تدوین غیر مطبوعہ خطوط ملنے تک ملتوی نہ کیجیے۔ اس میں زیادہ کام کی چیز تو آپ کے مفصل حواشی اور تعلیقات ہوں گے۔ اور تاریخی ترتیب۔

انتخاب غالب دیکھا۔ بے شک بہت شاندار چھپا ہے اور ریاست رام پور کی طرف

(۴)

سکریٹریٹ پاکستان

کراچی

۱۹ر دسمبر [۱۹۴۷ء]

مکرمی

سلام علیکم :۔ آج جناب قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر پٹنہ کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ کی فرہنگ غالب شائع ہو چکی ہے۔ اور مسعود حسن صاحب رضوی کی متفرقات غالب بھی آپ سے مل سکے گی۔ آپ براہ کرم ان دونوں چیزوں کو (جس حالت میں بھی ہوں) یک جا بذریعہ وی پی بھجوا دیں۔

فارسی مکتوبات کب شائع ہوں گے؟ ان کا بہت انتظار ہو رہا ہے۔

نیاز مند

محمد اکرام (آئی سی ایس)

انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ ڈویژن۔

حفیظ ہوشیار پوری بنام حکیم موسیٰ امرتسری

ذیل میں حفیظ ہوشیار پوری مرحوم کے پانچ غیر مطبوعہ خطوط شائع کیے جا رہے ہیں۔ انہیں مرحوم نے حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کے نام تحریر کیا تھا۔ حکیم صاحب لاہور کے معروف اہل قلم بزرگ ہیں۔ آپ کی تصانیف میں ”مولانا غلام محمد ترنم“، ”ذکر مغفور“ (تذکرہ سید مغفور القادری)، ”اذکار جمیل“ (تذکرہ سید برکت علی شاہ خلیجیانوی) ”تذکرہ علمائے امرتسر“ (غیر مطبوعہ) اہل علم کی توجہ کا مرکز ہیں۔ حکیم صاحب نے یہ خطوط پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب کے توسط سے ”غالب لائبریری“ کی نذر کیے ہیں۔

یہ خطوط زیادہ تر پیر غلام دستگیر نامی مرحوم کے ذکر اور ان کی ولادت اور وفات کے تعلق سے کہے گئے تاریخی قطعات پر مشتمل ہیں۔ غلام دستگیر نامی، لاہوری نامور عالم اور کتب کثیرہ کے مصنف تھے۔ تصانیف میں ”یادگار اشرف“، ”بزرگان لاہور“ ”قرآن کی معنوی تحریف و انکار حدیث“، ”تاریخ مدینہ منورہ“، ”دعوت کلیم“، ”تاریخ جلیلہ“، ”اسلامی قانون وراثت“، ”اذکار قلندری“، ”سیاحت کشمیر“، ”کتاب متبرکہ“ اور ترجمہ ”سفینۃ الاولیا“ ان سے یادگار ہیں۔

(م۔ ظ۔ ح)

۱۷۔ گارڈن روڈ کراچی

۷/اپریل ۱۹۶۲ء

مکرمی و محترمی حکیم صاحب، السلام علیکم

میں سخت نادم ہوں کہ نہ اب تک نامی مرحوم کی تعزیت کا خط لکھ سکا اور نہ آپ کے گرامی نامہ مورخہ ۱۲ ردسمبر کی تعمیل کر سکا۔ پیر صاحب کے انتقال کی خبر مجھے آپ کے خط سے ملی۔ ایک دو مادہ ہائے تاریخ ذہن میں آئے جو آپ کے خط ہی پر درج کر دیئے۔ اس کے بعد وہ خط کاغذات کے انبار میں ایسا گم ہوا کہ آج ملا۔

نامی مرحوم کا وجود غنیمت تھا۔ انہوں نے تاریخ، ادب اور تصوف کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس قسم کے خاموش کام کرنے والے بہت کم ملیں گے۔ انہوں نے ایسی ایسی نادر چیزیں شائع کی ہیں جو اب تک دنیا کے سامنے نہیں آئی تھیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اور مرحوم کے لواحقین نشر و اشاعت کے اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔ اور جو چیزیں چھپنے کے بعد ناپید ہو چکی ہیں۔ انہیں دوبارہ شائع کریں گے۔

دو قطعات تاریخ بھیج رہا ہوں۔ رسید سے مطلع فرمائیں۔ جواب میں غیر معمولی تاخیر کے لئے ایک بار پھر معذرت چاہتا ہوں۔

نیازمند

حفیظ ہوشیارپوری

آپ نے گرامی نامے میں دو رسالوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ مجھے نہیں ملے۔ ایسی چیزیں دفتر کے پتے پر اکثر نہیں ملتیں۔ تمام رسالے اور کتابیں میرے گھر پر آتی ہیں جس کا پتہ یہ ہے۔

۲۱۔ انٹیلیجنس اسکول

کوئنسز روڈ کراچی

قطعات تاریخ وفات

(پیر غلام دستگیر نامی مرحوم)

(۱)

حاصل حسن عمل ہے راحت باغ نعیم
گلشن جنت ہے انعام غلام دستگیر

اور کیا ہو نامیؔ مرحوم کا سال وفات
زندۂ جاوید ہے نام غلام دستگیر

۱۹۶۱ء

(۲)

دستگیر ادید اللہ از کرم
شامل او رحمت رب قدیر

چوں ازیں دنیائے رنگ و بو برفت
جانب فردوس آں روشن ضمیر

برلبم برسید بادست دعا
نام نامیؔ غلام دستگیر

د = ۴

۱۹۵۷ء + ۴ = ۱۹۶۱ء

حفیظ ہوشیارپوری

۴۱۔ انٹےلیجنس اسکول
کوئنز روڈ۔ کراچی
۱۳/اپریل ۱۹۶۲ء

مکرمی و محترمی حکیم صاحب السلام علیکم

کل آپ کا گرامی نامہ ملا۔ آج کتابیں بھی پہنچ گئیں۔ شکریہ۔ مجھے علم نہ تھا کہ "تاریخ جلیل" کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔ آپ نے اچھا کیا یہ کتاب بھی بھیج دی۔ پہلا ایڈیشن میرے پاس ہے۔ عرصہ ہوا "تذکرۂ قطبیہ" پیر صاحب مرحوم نے مجھے بھیجا تھا جو میرے ایک صاحب ذوق دوست لے گئے۔ اگر اس کی کوئی جلد باقی ہو تو ارسال فرمائیں۔ "تذکرۂ حمیدیہ" اصل فارسی میں شائع ہوا ہے یا نہیں؟ حضرت مرادؔ کے اردو کلام کی اشاعت کس مرحلے پر ہے؟ ان امور سے مجھے مطلع کریں (اور کرتے رہیں)۔ آپ کو خط لکھ چکا تھا کہ ایک اور قطعۂ تاریخ ہو گیا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

رہبر راہ اتقا نامی
دستگیر خجستہ پا نامی

سال مرگ است از سر الہام ـ "پیر روشن ضمیر ما نامی"

ل = ۱ ـ ۱۹۶۰ + ۱ = ۱۹۶۱ء

نیاز مند

حفیظ ہوشیار پوری

---

۲۱ - اسٹیٹ لیجنس اسکول

کوئنز روڈ ـ کراچی

۷/ مئی ۱۹۶۲ء

مکرمی و محترمی حکیم صاحب السلام علیکم

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۱۷/ اپریل مل گیا تھا۔ شکریہ۔ مصروفیت کے باعث جواب میں تاخیر ہوئی۔ جن کتابوں کا آپ نے ذکر فرمایا ہے وہ سب میرے پاس ہیں۔ بھیجنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائیں۔ کسی اور کے کام آجائیں گی۔ اب انہیں کون چھاپے گا۔ "مراد العاشقین" مطبوعہ "تذکرہ قطبیہ" کئی سال ہوئے پیر صاحب مرحوم نے مجھے بھیجا تھا۔ لیکن میرے دوست پیر حسام الدین شاہ صاحب راشدی نے مجھ سے لے لیا۔ اس کی جلدوں کے ضائع ہو جانے کی خبر سے بہت افسوس ہوا۔ بہر حال تلاش جاری رکھیں۔ اگر ایک جلد کہیں سے مل جائے تو بھیج دیں۔

میں اس بات سے بہت مطمئن ہوں کہ میری کہی ہوئی تاریخیں آپ کو پسند آئیں اس کے بعد میں اس فکر میں ہوں کہ مرحوم کا پورا نام "غلام دستگیر نامی" کسی طرح تاریخ کے ایک پورے مصرعے میں آجائے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس پورے نام کو وزن اور بحر کی قیود میں لانا بہت مشکل ہے۔ بہر حال ایک بحر سوجھی۔ اس بحر میں نام کو لانے کے لئے ضروری تھا کہ "نامی" کے بعد کا لفظ "الف" سے شروع ہو۔ تاکہ لفظ "نامی" کی "یا" ساقط نہ ہونے پائے۔ بفضل خدا اس میں کامیابی ہوئی۔ قطعہ بھیج رہا ہوں۔ اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔ اور یہ بھی لکھیں کہ کیا کسی اور تاریخ کو

نے مرحوم کا پورا نام اضافتیں وغیرہ لانے کے بغیر مصرعے تاریخ میں باندھا ہے یا نہیں اور اگر ہو تو متعلقہ قطعہ بھی لکھ بھیجیں۔ آپ کا

حفیظ ہوشیارپوری

تاریخِ وفات

پیر غلام دستگیر نامی مرحوم

چراغِ بزمِ صدق و صفا گل ہوا حفیظ	امامِ عاشقاں نظر سے ہو گیا نہاں
سوال اہلِ درد ہے کہ سالِ انتقال	"غلام دستگیر نامی آج ہے کہاں؟"

۱۹۶۱ء

حفیظ ہوشیارپوری

۲۱۔ اے پیٹے بیجنس اسکول
کوئنز روڈ ۔ کراچی
۱۲؍ مئی ۱۹۶۲ء

مکرمی و محترمی حکیم صاحب۔ السلام علیکم

میں خط لکھ چکا تھا کہ آپ کا کارڈ مورخہ ۵؍ مئی پہنچا۔ دوسرے روز "پیامِ مشرق" کا تازہ پرچہ بھی مل گیا۔ آپ کے مضمون سے مرحوم کی ولادت کی تاریخ معلوم ہو گئی۔ ایک اور قطعہ بھیج رہا ہوں جس کے آخری مصرعے سے چار تاریخیں برآمد ہوتی ہیں۔ دو ولادت کی (ہجری و عیسوی)۔ اور دو وفات کی (ہجری اور عیسوی) اس کے علاوہ مرحوم کی عمر بحساب قمری و شمسی بھی معلوم ہوتی ہے۔ مرحوم کی عمر بحساب قمری اسی برس نو ماہ اور گیارہ دن اور بحساب شمسی ۷۸ برس سات ماہ اور پندرہ دن ہوتی ہے۔ لیکن عمر کے تعین کا عام طریقہ یہی ہے کہ سال وفات میں سے سال ولادت منہا کیا جائے۔ اس حساب سے ان کی عمر ۸۱ برس اور ۷۸ برس ہوتی ہے۔ تاریخ گوئی میں تعین کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

ایک اور قطعے میں مرحوم کے اپنے مصرعے سے ان کی ولادت اور وفات کی تاریخیں برآمد کی ہیں۔ وہ بھی بھیج رہا ہوں۔ رسید سے مطلع کریں۔

آپ کا

حفیظ ہوشیارپوری

سنین تاریخ

۱۳۸۱ھ

غلام دستگیر نامی مرحوم

ذیل کے قطعے سے نامی مرحوم کے متعلق یہ معلومات حاصل ہوتی ہیں:-

(۱) تاریخ ولادت، ہجری (۱۳۰۰ھ)
(۲) تاریخ وفات، ہجری (۱۳۸۱ھ)
(۳) تاریخ ولادت، عیسوی (۱۸۸۳ء)
(۴) تاریخ انتقال، عیسوی (۱۹۶۱ء)
(۵) عمر بحساب قمری (۸۱)
(۶) عمر بحساب شمسی (۷۸)

قطعہ

فخرِ زماں نامیٔ جنت مکاں
بندۂ حق طالب خیر کثیر

سلسلۂ عمر، ولادت، وصال
علمِ بشر، طبعِ محبت ضمیر

۸۱ + ۱۳۰۰ھ

۵۰۲ + ۱۳۸۱ھ

۷۸ + ۱۸۸۳ء

۱۹۶۱ء

حفیظ ہوشیارپوری

تاریخ ولادت و وفات
پیر غلام دستگیر نامی مرحوم

نامیؔ مرحوم کا شعر ہے ؎

زادم و گشتم غلام دستگیر — من شدم نامی بنام دستگیر

ذیل کے قطعات میں اس شعر کے مصرع ثانی سے مرحوم کی تاریخ ہائے ولادت و وفات بطریق تخرجہ و تعمیہ برآمد ہوتی ہیں :۔

(۱)

بہر تاریخ ورودش در جہاں — صوفیؔ نامی غلام دستگیر
گفت خود "بے باک" از روئے ادب — من شدم نامی بنام دستگیر

۲۳ — ۱ : ۱ — ۱۳۲۲ - ۱۴۲۳ = ۱۳۰۰ھ

(۲)

زیر بار منت یاراں نشد — صوفیؔ نامی غلام دستگیر
گفت تاریخ وفاتش از "دہن" — "من شدم نامی بنام دستگیر"

۵۹ — ۱۳۲۲ + ۵۹ = ۱۳۸۱ھ

حفیظ ہوشیار پوری

۱۰۹۔ بازار روڈ
سیالکوٹ چھاؤنی
۴/اپریل ۱۹۶۸ء

محترمی حکیم صاحب السلام علیکم

آپ کا خط مورخہ ۲۵/جنوری مل گیا تھا۔ میں بہت سی پریشانیوں اور مصروفیتوں میں مبتلا رہا۔ جس کی وجہ سے جواب نہ لکھ سکا۔ مولوی شمس الدین صاحب کے انتقال کی خبر مجھے کئی روز کے بعد اتفاق سے اخبار جنگ کے ذریعے معلوم ہوئی۔ میں اسد اخبار

کم ہی پڑھتا ہوں۔ اس کے بعد بشیر احمد خاں صاحب کے خط سے مرحوم کے انتقال کی تفصیلی اطلاع موصول ہوئی۔ کیا خوب آدمی تھے۔ خدا مغفرت کرے۔

میں نے کاغذ لے کر کم ہی تاریخ کہی ہے۔ کیونکہ اس کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ گزشتہ چند سالوں میں میرے اپنے کئی قریبی عزیزوں کا انتقال ہو چکا ہے جن کی تاریخیں میں کئی برس گذر جانے کے بعد اب تک نہیں کہہ سکا۔ کوئی مادہ ذہن میں آجاتا ہے تو قطعہ موزوں کرنے کے لئے وقت نکالنا ہی پڑتا ہے۔ مولوی صاحب مرحوم کی تاریخ وفات کا خیال میرے ذہن میں ہے۔ جیسے ہی کوئی موزوں مادہ ہاتھ آیا۔ قطعہ موزوں کر دوں گا۔

میں کوئی تین ہفتے سے سفر میں ہوں۔ لائل پور، لاہور، گوجرانوالہ سے ہوتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔ اب دو ایک روز میں آپ سے لاہور میں ملاقات ہوگی۔

آپ کا حفیظ ہوشیارپوری

نماز اور غزل

تاثر:- ڈاکٹر ابوالخیر کشفی

مکتوب: پروفیسر رشید احمد صدیقی

اکثر نمازوں کے آخر میں میں نفل کی رکعتیں ادا نہیں کرتا۔ آج یوں محسوس ہوا جیسے آخری نفلوں کے بغیر نماز بلا مقطع کی غزل کی طرح ہے، اور نماز کی ابتدائی سنتیں فرض سے پہلے مطلع کی طرح ہیں۔ ان کے بغیر نماز "بے سروپا" (بے معنی نہیں) غزل کی مانند ہے۔

غزل اور نماز... دونوں کا ایک پیکر ہے۔ یہ پیکر غزل کی طرح نماز کو بھی ایک وحدت بناتا اور ایک فضا عطا کرتا ہے۔

پھر دونوں کی داخلیت (موضوعیت) بھی قابل توجہ ہے۔ ایک آدمی اپنے معبود کے حضور سربسجدہ... اور یوں کہ "ہر دو جہاں سے بے نیاز اس کا دل غنی" اور دوسری طرف ہر واقعہ اپنے اظہار کے لئے کسی ذات کے فلٹر (FILTER) سے چھنتا اور گذرتا ہوا۔

مگر یہ موضوعیت مریضانہ نہیں۔ اس سربسجدہ آدمی کے دل میں کائنات کا غم ہے۔ سب کے لئے ایمان، زندگی، سعادت، برکت، صحت اور رزق کی دعائیں۔ اور ادھر اس کے ذہن میں غم ذات میں غم کائنات سمویا ہوا۔

چہار شنبہ ۱۱ر اکتوبر ۱۹۷۲ء

مشفق و مکرم۔ تسلیم۔ یکم اکتوبر کا والا نامہ پرسوں شام صادر ہوا۔ کتنے دنوں بعد آپ نے یاد فرمایا اور اپنی یاد دلائی۔ گذشتہ دنوں کی کیسی اچھی یادیں اور باتیں ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ اس لئے اور کہ اس دوران میں کیسے کیسے سانحات سے دوچار ہونا پڑا! آپ نے اپنی کتاب کے انتساب میں میرا نام شامل کیا۔ کس انداز اور کس سطح سے۔ اس سے بہت خوش اور متاثر ہوا۔ ماں کے بعد باپ اور استاد سے زیادہ کون مکرم ہوتا ہے۔ آپ نے موخر الذکر کی یادگار میں مجھے جگہ دی۔ اس سے زیادہ کون کس کی عزت اور محبت کر سکتا ہے! یہ سب ایسی حالت میں جب آپ کے سود و زیاں سے میرا دور دور کا تعلق اب سے پہلے کبھی نہیں رہا۔

نماز کے بارے میں آپ کے تاثرات بڑے دل آویز اور گرانقدر ہیں۔ نماز کے یہی آداب ہیں اور یہی انعام بھی تا وقتیکہ اور بھی کوئی انعام نہ ہو جس کا علم صرف خدا کو ہے اور کسے معلوم خدا کے ہاں کیسے کیسے انعامات ہیں جن کی اس کے سوا کسی کو خبر نہیں۔ آخر حضورؐ نے کچھ محسوس ہی کر کے یہ بشارت دی ہے کہ صلوٰۃ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے! آپ نے اس سلسلے یا سیاق و سباق میں غزل کا ذکر کیا ہے۔ نماز ایک مکمل حسن ہے۔ حسن خیالی اور حسن عمل دونوں۔ اس حسن سے ہر حسن کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ہر حسن اسی حسن اوّل اور حسن آخر سے مستعار و مستنیر ہوتا ہے۔ آپ نے غزل کو نماز سے ربط دے کر اپنی بعض بڑی فکر انگیز اور ثمر آفریں صلاحیتوں کو غالباً غیر شعوری طور پر بے نقاب کیا ہے۔ جو باتیں جتنی غیر شعوری ہوتی ہیں اکثر اتنی ہی مخلصانہ ہوتی ہیں۔ خدا مبارک کرے۔ آمین۔ آپ ایسے لوگوں میں ہیں جو ARTIST MYSTIC یا MYSTIC ARTIST کہلاتے ہیں۔ ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔ میری کتابوں کے بارے میں آپ نے جو تفصیلات طلب فرمائی ہیں ان کا بتانا میرے بس کی بات نہیں۔ احسان سے دریافت فرمایئے۔ شاید وہ آپ کی مدد کر سکیں دعا کرتا ہوں کہ آپ جس منصب پر فائز ہیں اس کی ذمہ داریوں سے بوجوہ احسن عہدہ برا ہو سکیں۔ خدا حافظ۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

غالب اور نماز

جو اس تشبیہ سے بھی داغ ان دونوں کو آتا ہو
اسے وقت نماز صبح اور اس کو عشا کہیے
صومعے میں اسے ٹھہرایئے گر مہر نماز
میکدے میں اسے خشت خم صہبا کہیے
بے صلوٰۃ اے مہرباں اسم نماز
جس کے پڑھنے سے ہو راضی بے نیاز

ایک خط، ایک غزل

سکندر علی وجد

۵۵ ساؤتھ ایوینیو، نئی دہلی

پیارے ظفر۔ خوش رہو

فیض نمبر بہت پسند آیا۔ ایک نقاد فرما رہے تھے پاکستان ابھی فیض پرستی میں مبتلا ہے فیض شناسی کا فرض ہم ادا کریں گے۔ میں نے عرض کیا کہ فیض شکنی کا ثواب پھر کون حاصل کریگا۔ ہمارے نقاد مجھ سے بہت خفا ہیں کیونکہ میں نے اپنی ریڈیو کی ایک تقریر میں کہہ دیا تھا کہ اردو تنقید کا بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے ناکام شاعر نقاد بن گئے ہیں اس لئے ان سے انصاف پسندی اور ادبی ایمانداری کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ فیض نمبر میں تمہارے یہاں کے مشہور و معروف تنقید نگار کم نظر آئے۔ امید ہے سب کا مزاج بخیر ہوگا۔ مجھے تو ابراہیم جلیس کا مضمون بہت پسند آیا۔

۱۹ ستمبر ۱۹۷۶ء کو اورنگ آباد میں نیا ریڈیو اسٹیشن کھلا۔ تم بہت یاد آئے۔ ۱۹۴۰ء میں جب پہلی بار وہاں (دکن ریڈیو، اورنگ آباد) اسٹیشن کھلا تھا اس کا افتتاح مرحوم سر اکبر حیدری صدر اعظم دولتِ آصفیہ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کیا تھا (اس وقت) میں نے اورنگ آباد پر نظم سنائی تھی۔ ہیرا بائی بڑودکر نے کلاسیکی موسیقی سنائی تھی اور مرحوم رفیق غزنوی نے دو غزلیں گائی تھیں کیا محفل تھی اور کیا منظر تھا وہاں۔ اس مرتبہ افتتاحی رسم میں کم سے کم دس ہزار اورنگ آبادی شریک تھے۔ مجھے (نظم) اجنتا سنانی پڑی اور وہ ترنم سے۔

شان الحق حقی کو میرا بہت بہت سلام کہنا۔ میری ۴۵ سالہ شاعری کا انتخاب "جمال اجنتا، جلال ہمالہ" زیر طبع ہے۔ شان صاحب کو میری ساری شاعری پر اظہار خیال کا اس وقت اچھا موقع ملے گا۔ بیاضِ مریم کے تبصرے (مشمولہ جریدہ غالب شمارہ نمبر ۴۰) سے ان کی محبت اور دوستی ٹپکتی ہے۔

مخدوم پر مضمون لکھنا اپنی سوانح عمری لکھنا ہے اور یہ کام مجھ سے شاید ہی ہو سکے۔
سردار جعفری کے گفتگو میں ڈاکٹر وحید اختر نے مخدوم پر بے مثال مضمون لکھا ہے۔ ایسا مضمون شاید ہی کسی موجودہ شاعر پر لکھا گیا ہو۔ لکھنے کے لئے شاعر سے عقیدت اور محبت ہی کافی نہیں۔ لکھنے والے کی ادب پر گہری نظر ہونی چاہیئے۔ پھر قلم بھی جادو رقم چاہیئے۔

میر حسن (مخدوم کے شریک قلم اور ہمدم دیرینہ) کے انتقال سے رہا سہا حیدر آباد بھی جاتا رہا۔ خاص کر عثمانیہ والوں کا حیدر آباد۔ تم لوگوں کے چلے جانے کے بعد میں نے کہا تھا

سہ
عروسِ شہر کا رنگین بانکپن لے کر
چلے گئے مرے یارانِ کج کلاہ کہاں

اب پاکستان والوں کے سامنے یاران کج کلاہ کی تشریح کرنے والا تمہارے سوا کون ہے۔ خدا تم کو، فیض کو، دوستوں کو اور تمہارے بال بچوں کو خوش اور تندرست رکھے۔

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تن درست

تمہارا سکندر

مختصر سوانحی خاکہ

وجد کی پیدائش ۲۲ جنوری ۱۹۱۴ء بمقام ریجاپور۔ ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں ہوئی اور بی اے جامعہ عثمانیہ سے کیا۔ ۳۶ء میں حیدر آباد سول سروس سے منسلک ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ و سیشن جج ہو گئے۔ ۵۶ء میں سیشن جج کی حیثیت سے مہاراشٹر منتقل ہو گئے اور آٹھ برس بعد وقت سے پہلے پنشن لے لی۔

شاعری کا آغاز ۲۹ء میں ہوا۔ چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ لہو ترنگ، آفتاب تازہ اوراق مصور اور بیاض مریم جس پر اتر پردیش اردو اکیڈیمی نے تین ہزار روپے کا پہلا انعام دیا۔ پانچویں مجموعے کی آمد آمد ہے "بجمال رجعنتہ و بجلال عالیتہ: آپ کا شمار جدید نظم کے باکمال شاعروں میں ہوتا ہے اور غزلیں سہل ممتنع کا نمونہ ہوتی ہیں"۔

غزل

(نذر فیض احمد فیضؔ - ۶۵ ویں سالگرہ پر)

حسیں یادوں سے خلوت انجمن ہے
خموشی نغمہ زارِ صد سخن ہے
نگارِ گلبدن، گل پیرہن ہے
دھنک رقصاں چمن اندر چمن ہے
ہوا میں کیفِ صہبائے کہن ہے
فضا آئینہ دارِ فکر و فن ہے
یہی شہرِ غزالوں کا وطن ہے
نیستانِ غزل ارضِ دکن ہے
خوشی ارزاں ہے بازارِ جہاں میں
بہائے غم متاعِ جان و تن ہے
مری دیوانگی پر ہنسنے والو
یہاں فرزانگی دیوانہ پن ہے
ازل سے وجد ہر قطرے کے دل میں
قیامت خیز طوفاں موجزن ہے

شاعر بمبئی
سالنامہ ۱۹۶۵ء

افق لکھنوی میری نظر میں

غلام احمد فرقت کاکوری

تقریباً دو مہینے ہوئے جب ایک صاحب نے مجھ سے آکر کہا کہ کچھ لوگ، دلی لکھنؤ اور حیدرآباد میں افق ڈے منانے جا رہے ہیں۔ مجھے یہ سن کر بڑی ہنسی آئی کہ ایک چیز جو ابتدائے آفرینش سے خود اپنا نائٹ اور ڈے مناتی چلی آرہی ہے اس کا صد سالہ ڈے منانا کیا معنی؟ افق کا صد سالہ ڈے منانے کے معنی یہ ہوئے کہ آپ کی دانست میں افق کو پیدا ہوئے سو سال کا عرصہ ہوا ہے حالانکہ جہاں تک افق کی پیدائش کا تعلق ہے اس کا یوم ولادت تو آج تک بڑے بڑے پیغمبر اور رشی بھی نہیں بتا سکتے چہ جائیکہ ہم آپ۔

مگر جب ایک دن منور لکھنوی میرے غریب خانے پر تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد افق کا یوم پیدائش نومبر کی آخری تاریخوں میں منانا طے پایا ہے تب مجھے احساس ہوا کہ اچھا یوم افق سے مراد افق صاحب کے یوم پیدائش سے ہے جن کے ہم وطن ہونے کا شرف مجھے بھی حاصل ہے اور جو اپنے دور کے (جسامت سے قطع نظر) ایک بھاری بھرکم استاد فن تھے اور جن کا کلام میں اب سے پچاس برس قبل کے بعض رسائل اور اخبارات میں پڑھ چکا ہوں۔ پھر جب لمعات افق پر میں نے نگاہ دوڑائی اور افق صاحب کا شجرۂ نسب دیکھا تو اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ ہمارے ہندوستان میں ذرہ افق کو جنم دئے بیٹھا ہے۔ آج تک میں یورپ کے سائنسدانوں کی اس تحقیق پر حیران تھا کہ انھوں نے ذروں سے

ایٹم کیسے تیار کر لیے۔ مگر جب معلوم ہوا کہ ان سائنس دانوں کی تحقیق سے قبل ہمارے ہندوستان میں ذرہ افق کو پیدا کر چکا ہے تو ان کی تحقیق میرے سامنے لونڈا نظر آنے لگی۔ افق صاحب کے خاندانی سلسلے کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر بھی پہنچا کہ اگر آج ولی دکنی سے لے کر گوپی ناتھ امن تک کوئی شاعر بھی نہ پیدا ہوا تھا تو بھی صرف ہمارے لکھنؤ کے محلے نولبستے کی مردم خیز سرزمین ہی اس کمی کو پورا کرنے کو کافی تھی جس نے مطلع سے مقطع تک شعر و ادب میں وہ گل کھلائے رنگارنگ کھلائے ہیں کہ اب اردو شاعری کسی دوسرے ادب کی دست نگر نہیں اور ان اساتذۂ فن نے ایسے ایسے ایٹم چلائے کہ بڑے بڑے دیوان، دیوان خانوں کی زینت و سامت بن کر رہ گئے۔ اب افق صاحب کے شجرۂ نسب کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ ان کے دادا کے دادا اودے راج مطلع تھے۔ یعنی جہاں سے سورج اور چاند نکلتے ہیں۔ اس کے بعد افق صاحب کے پردادا منشی ایشوری پرشاد شعاعی پیدا ہوئے جو سپہر ادب پر آفتابِ سخن بن کر طلوع ہوئے اور جنہوں نے اپنی شعاعوں سے اردو اور فارسی شاعری کو جگمگا دیا۔ اس کے بعد افق صاحب کے دادا منشی پورن چند ذرہ تشریف لائے جو اپنے دور میں ذرے سے آفتاب بن کر چمکے۔ اس کے بعد خود افق صاحب کی آفاقیت جو شاعری کی ہر صنف میں ہم کو چھائی چھائی نظر آتی ہے۔ غرض دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک محلہ نولبستہ ہم کو آباد نظر آیا۔ افق صاحب کے بڑے بھائی منشی رام سہائے تمنا کی یہ دلی تمنا تھی کہ یہ سلسلہ جاری رہے اور اس ابر نیساں سے کوئی ایسا موتی پیدا ہو جو اپنی آب و تاب سے دنیا کے سخن کو تابناک اور منور کر دے۔ چنانچہ افق صاحب کے بعد ان کے صاحب زادے منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی پیدا ہوئے جو اس وقت ہم میں اور آپ میں موجود ہیں اور جو ہندی ادب کی مشہور تصانیف کو اردو دنیا میں روشن اور منور کر رہے ہیں۔ ان کی رفیقہ حیات تک شاعرہ ہیں اور میاں بیوی اب تک اس درجہ شعر و ادب میں گم ہیں کہ انھوں نے اولاد تک کی پرواہ نہ کی اور دونوں نے اشعار ہی کو اپنی اولادِ حقیقی سمجھ

لیا۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ نجیب الطرفین شاعر کسے کہتے ہیں۔ تو میں کہہ دوں گا کہ جناب منور لکھنوی۔ بقیہ شعراء تو وہ ہیں جن کے سلسلہ نسب میں کئی گلیارے اِدھر اُدھر مڑ گئے ہیں۔

مگر جناب منور لکھنوی سے مجھے اس معاملے میں شکایت ضرور ہے کہ انھوں نے جہاں اپنے میں اپنے والد ماجد کے تمام اوصاف حمیدہ پیدا کئے تھے وہاں کاش تھوڑی بہت رندی بھی اختیار کر لیتے تو کیا حرج تھا۔ بھلا باپ بیٹوں میں آپ نے کہیں ایسا بُعد بھی دیکھا ہے کہ ایک طرف محلہ نوبستہ لکھنؤ میں رندبلانوش باپ قسمیں کھا رہے ہیں اور دوسری طرف صاحبزادے دریا گنج دلی میں کھڑے لوگوں سے اپنے تقوٰی کا حلف اٹھوا رہے ہیں۔

تفو بر تو اے چرخِ گردوں تفو۔

بہر حال اس میں منور صاحب کی خطا بھی نہیں بلکہ اس کی تمام تر ذمہ داری اس فلک کج رفتار پر عائد ہوتی ہے جو سیدھے سادے میں کجی پیدا کرنا اپنا مسلک سمجھتا ہے مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ منور صاحب چہرے مہرے میں خواہ اپنے والد سے ملتے جلتے ہوں یا نہ ہوں مگر اپنی صلاحیتوں میں تو اس درجہ اپنے والد سے قریب ہیں کہ اتنا قریب شاید ہی کوئی باپ اپنے بیٹے سے رہا ہو۔ وہ ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر، ناظم اور نثر نگار بھی تھے۔ ایک بلند مرتبہ رند، ڈراما نگار بھی۔ صحافت نگاری، ناول نویسی اور مزاح نگاری ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ انھوں نے رامائن کئی انداز سے نظم کی مگر ان کی رامائن ایک قافیہ منظوم جو انھوں نے اپنی کم عمری میں تصنیف کی تھی، ایک شاہکار ہے۔ میری دانست میں ایک شاعر جو ایک قافیہ میں ہزاروں شعر نظم کر سکتا ہو وہ کلام کی کونسی ایسی صنف ہے جس کا قافیہ نہیں تنگ کر سکتا۔ انھوں نے مسدس مثنویوں اور قصائد میں بھی طبع آزمائی کی اور اپنے ہم عصروں سے اپنا لوہا منوا لیا۔ وہ سناتن دھرمی بھی تھے اور رند مشرب بھی۔ گویا دونوں کے درمیان ڈھنڈا چیرے کھڑے تھے۔ سنجیدگی کے علمبردار بھی تھے اور بذلہ سنجی کے طرف دار۔ ان کی تصانیف

وتراجم کی کثیر تعداد اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ہر فن مولا تھے۔ انھوں نے ملکی، قومی، مذہبی، درسی اور اصلاحی موضوعات میں جس پر قلم اٹھایا، اس کا ناطقہ بند کر دیا۔ مہابھارت والمیکی، ٹاڈ راجستان اور شریمد بھگوت گیتا کے جو فاضلانہ تراجم پنجاب میں رہ کر کیے ان کی عظمت آج تک دلوں میں نقش ہے۔

معارف افق میں افق صاحب کا جو مزاحیہ کلام درج ہے وہ اگرچہ بہت مختصر ہے اور صرف چار پانچ نظموں تک محدود ہے مگر اسے پڑھ کر ان کی قادر الکلامی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

انکم ٹیکس

ہے انکم ٹیکس اہلِ ہند کے افلاس کا بانی
یہ ہے ہندوستان کی بہتری کا دشمن جانی
یہ دولت لوٹنے کے واسطے ہے نادر ثانی
شہ محمود غزنوی ہے نہ احمد شاہ درانی
ہتا ہو کے لوٹے قافلہ جو یہ وہ ڈاکو ہے
رعایا کو یہ جیتا جاگتا گویا ہلاکو ہے
اُدھر تو زور ہے بیروزگاری کا گرانی کا
اِدھر نرغہ گروہِ فاقہ مست خاندانی کا
ٹیکس ہے اس پہ طرہ اور باعث نیم جانی کا
سواری نوکری بیوپار گھر ناج اور پانی کا
کہاں تک کوئی دے کچھ انتہا ہے ٹیکس دینے کی
نہ جانے دیگا منہ تک بخت کیا پھکی جینے کی

ٹیکس کا "پولیٹیکل نوحہ"

اللہ کرے ٹیکس کی جڑ پیڑ سے ہو ناس، کچھ بھی نہ کیا پاس
کمبخت نے لی گاڑھے پسینے کی کمائی، اے وائے دریغا
چولھے کی یہاں فکر اُدھر ٹیکس کا جنجال، ہو کیوں نہ بُرا حال
سرکار اُدھر اور اِدھر گھر کی لگائی، اے وائے دریغا
یکساں ہوا پانی کا برسنا نہ برسنا، چھوٹا نہ ترسنا
غلے کی گرانی ہوئی بنیوں کی بن آئی، اے وائے دریغا
ماں ہو گئیں شاہنشۂ جرمن کی نظر بند، ملکہ کی جگر بند
کیسی خبر اللہ نے افق ہم کو سنائی، اے وائے دریغا۔

انیق اجمیری

احمد رئیس

۴ ڈی ۵/۲۸ - ناظم آباد - کراچی ۱۸

میں نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو اجمیر میں میرے آس پاس علم و عرفان اور شعر و ادب کی ہلکی ہلکی سی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ اس چاندنی کا محور و مرکز "بیت المعنیٰ" تھا جہاں حضرت علامہ خواجہ معنیٰ اُب بھی تشنگانِ ادب کو سیراب کر رہے تھے۔ ملک تقسیم ہو چکا تھا، اجمیر اپنی تہذیب کے معماروں سے خالی ہو چکا تھا مگر ابھی کچھ باقیات الصالحات موجود تھے اور ان میں سب سے زیادہ محترم اور با اثر شخصیت حضرت معنیٰ کی تھی جو اپنے مستقر پر پورے طمطراق سے ڈٹے ہوئے تھے۔ حضرت معنیٰ کی سربراہی میں ۲۶-۲۷سنہ میں علم و ادب کا جو قافلہ گامزن ہوا تھا وہ اپنی منزل کی جانب اب بھی کشاں کشاں آگے بڑھ رہا تھا۔ علم و شعور کے اس سفر کا ایک زرّیں عہد مولانا الیاس رضوی، رفیقؔ اجمیری، میراؔ مدنی، حکیم رفیق ابراہیم، کاملؔ اجمیری، عنایت علی رضوی، اور مولانا حمید اللہ خاں عرشی وغیرہ پر ختم ہوا۔ پھر ان لوگوں کے قدم سے قدم ملا کر جو تازہ دم اور توانا اہلِ قلم اُبھر کر سامنے آئے ان میں حضرت عرشیؔ (محمود علی) حضرت اعجازؔ، حضرت خنداںؔ، حضرت زاہدؔ، ڈاکٹر آثمؔ، جناب سلطان احمد اور جناب انیقؔ اجمیری لائقِ ذکر ہیں۔ یہ اصحاب علم و دانش حضرت معنیٰؒ کے قلب و جگر اور دست و بازو تھے۔ جو ان کے انتقال کے وقت (یعنی ۱۹۵۳ء) تک ان کے سائے کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ مگر حضرت معنیٰؒ کے انتقال کے بعد یہ یادگار محبتیں منتشر ہو گئیں۔ حضرت عرشیؔ اور حضرت آثمؔ نے بمبئی کا رُخ کیا اور فلمی نگارخانوں کی زینت بن گئے۔ حضرت خنداںؔ ٹونک تشریف لے گئے اور استاذی سلطان کے رتبہ پر فائز ہوئے۔ حضرت اعجازؔ اور حضرت زاہدؔ اجمیر ہی میں رہے مگر حضرت معنیٰؒ کے غم نے ان لوگوں کو ذہنی طور پر اوقات

کردیا۔ ان کے علاوہ اس دور میں مولانا فضائی بھی اجمیر میں موجود تھے مگر وہ بھی تنہائی کا شکار تھے۔ جناب سلطان احمد ہجرت کرکے پاکستان چلے آئے۔ پہلے کراچی میں اخبار ‘نئی روشنی’ اور ‘انجام’ سے وابستہ رہے۔ پھر جنوری ۵۶ء سے جنوری ۵۸ء تک کراچی سے ایک بلند پایہ علمی و روحانی جریدہ ماہنامہ ‘معین’ نکالا جس کے مدیر شفیق احمد تھے مگر یہ حقیقت ہے کہ ادارت کا سارا بار سلطان صاحب کے کاندھوں پر تھا۔ آج کل سلطان صاحب ملتان میں روزنامہ ‘امروز’ میں جناب مسعود اشعر کے شریک کار ہیں۔ اور اب پاکستان کے سینئر صحافی ہیں ـــــ سلطان صاحب کی پاکستان تشریف آوری کے بعد جناب افق اجمیری جے پور منتقل ہو گئے مگر جے پور میں جب یہ کیفیت ہوئی کہ ؎

دلِ خرابِ نظر کو سکوں نہیں ملتا　　　کوئی بھی محرمِ رازِ جنوں نہیں ملتا

تو ہجرت کرکے ۱۹۵۸ء میں پاکستان چلے آئے۔ اور کراچی کو اپنا وطن ثانی بنایا۔ کراچی میں ان کے اہلِ خاندان پہلے سے موجود تھے۔ ان کے برادر معظم جناب شاہ محمد خاں اختر جو اجمیر میں نوجوان شاعروں میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے اور اختر شیرانی کے بڑے یار غار تھے کراچی میں جا کی کلب آف پاکستان کے سکریٹری تھے (غالباً اب بھی ہیں) ان کے علاوہ رفیقانِ اجمیر میں ممتاز صحافی جناب نصر اللہ خاں، قیسی رامپوری، (جو پہلے قیسی اجمیری تھے) بہار کوٹی، اثر جلیلی، حکیم نصیر الدین ندوی، حکیم شفائی، عارف جلالی، سلطان احمد، مضطر اجمیری، قابل اجمیری، پیکر واسطی، غلام علی، خان مانی، برق اجمیری، وقار صدیقی، اختر مودودی، ساحر عباسی، نسیم جمالی، شفیق احمد اور دیگر احباب راجپوتانہ میں علامہ رندی جے پوری (والد بزرگوار جناب الیاس عشقی)، حکیم محمود میاں برکاتی، سالک الہاشمی ایڈوکیٹ، قمر ہاشمی، مسعود احمد برکاتی وغیرہ پہلے سے موجود تھے۔ ان سب عزیزان اجمیر و احباب راجپوتانہ کی محبت افق صاحب کو کراچی کھینچ لائی۔

مجھے اجمیر میں افق صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے بلکہ یوں کہیے ان کی انگلی پکڑ کر جوان ہوا ہوں۔ افق صاحب اجمیر سے ۵۰ میل دور موضع محمد گڑھ کی جاگیرات کے نگراں بلکہ مالک تھے۔ نواب صاحب محمد گڑھ کی کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ اس لئے نواب

صاحب کے انتقال کے بعد بیگم صاحبہ محمد گڑھ نے تمام جاگیرات و اراضی کی نگہداشت افق صاحب کے سپرد کر رکھی تھی۔ محمد گڑھ سے افق صاحب ہر دوسرے تیسرے دن اجمیر آتے تھے اور اجمیر میں سحر و شام "بیت المعنیٰ" ان کی آوک جاوک رہتی تھی۔ لہٰذا ان سے تقریباً روز ہی گپ شپ ہوتی رہتی تھی — ایک مرتبہ افق صاحب نے حضرت مولانا معنیؒ کو بطور خاص محمد گڑھ مدعو کیا۔ مولانا کے ساتھ اس سفر میں مجھے بھی محمد گڑھ جانے کی سعادت حاصل ہوئی تو افق صاحب کے جاگیرانہ ٹھاٹ باٹ دیکھے۔ وہ جس مکان میں رہتے تھے وہ بڑا عالیشان قلعہ تھا۔ افق صاحب عام جاگیرداروں کی طرح بہت اچھے شکاری تھے۔ اور گھوڑ سوار بھی۔ ان کے گھوڑے کا نام اقبال تھا جسے انھوں نے مہاراجہ جودھپور سے خریدا تھا۔

شعر و شاعری کا شوق افق صاحب کو ورثتاً ملا ہے۔ ان کے والد جناب اللہ نور خاں افسوس شعر گوئی کا اچھا ملکہ رکھتے تھے۔ ان کے ماموں جناب الطاف حسین خاں رشدی بڑے صاحب علم اور ممتاز افسانہ نگار تھے۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "محبّت کے افسانے" عرصہ ہوا اجمیر سے شائع ہوا تھا۔ ان کے بھائی جناب شاہ نور خاں اخترؔ ایک ہونہار اور پُرگو شاعر ہیں۔ ان کی بہن اقبال نگارؔ بھی بہترین شاعرہ ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے خاندان میں ہر دور میں کئی ایسے صاحب علم گذرے ہیں جو شعر و ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ افق صاحب نے جب ہوش سنبھالا تو اجمیر میں طرحی مشاعروں اور نظم گوئی کے مقابلوں کی گرم بازاری تھی۔ کہیں حضرت ارمان اجمیری کے شاگردوں کا جگھٹا تھا تو کہیں حضرت عرشی کے پرستاروں کا ہجوم۔ کہیں علامہ سیماب اکبرآبادی اپنے حلقہ بگوشوں اور شاگردوں کا غول لئے بیٹھے تھے۔ کہیں بہار کوٹی، اثر جلیلی اور شاہ نور خاں اخترؔ جیسے جوان فکر و جوان خیال شاعروں کی غزل سرائی اور نظم خوانی کی دھوم تھی۔ شعر و سخن کی ان تمام محفلوں کی روحِ رواں حضرت معنیؒ کی ذات گرامی تھی۔ اجمیر کے تقریباً تمام و کمال مشاعرے اور ادبی اجلاس حضرت معنیؒ کی صدارت میں منعقد ہوتے تھے۔ اس ماحول شعری سے متاثر ہو کر افق صاحب بھی شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ پہلی غزل جس کا مطلع ہے ؎

میرے ضبطِ شوق کا یہ مختصر افسانہ ہے جس نے دیکھا کہہ دیا دیوانہ ہے' دیوانہ ہے

جناب بہار کوٹی سے دوستانہ اصلاح لی۔ پھر اس کے بعد ہمیشہ حضرت علامہ معنیؔ کو اپنا کلام دکھایا۔ اور ان کی حیات تک عام صحبتوں میں اٹھتے بیٹھتے اور انھیں سے اکتساب فیض کرتے تھے۔ کوئی علمی نکتہ ہو، کوئی تاریخ وادب کی گتھی ہو ہمیشہ حضرت معنیؔ ہی نے حل کی اور جو کچھ ان کی صحبت سے حاصل کیا اسی کا نتیجہ ہے کہ آج افقؔ صاحب اجمیر کے تمام شعراء میں اپنی ایک منفرد آواز رکھتے ہیں۔ اجمیر کے شعرائے متاخرین میں قابلؔ اجمیری کو بڑا مقام حاصل ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ قابلؔ نے زندگی بھر افقؔ صاحب کو اپنے سے بہتر اور عظیم شاعر سمجھا ہے اور ہمیشہ ان کے چراغ سے چراغ جلانے کی کوشش کی ہے مگر یہ افقؔ صاحب کی فنکارانہ بلندی ہے کہ انھوں نے ہمیشہ قابلؔ ہی کو اچھا شاعر کہا ہے۔ اور جب ان کی موت پر مرثیہ لکھا تو اس ابدی حقیقت کا بلا جھجک اظہار کیا ؎

عالم دیدۂ بیدار نہیں مر سکتا
موت مر سکتی ہے فن کار نہیں مر سکتا

اجمیر کے زمانۂ قیام کا واقعہ ہے کہ افقؔ صاحب ٹونک گئے ہوئے تھے کہ اطلاع ملی کہ مولانا ابو الکلام آزادؔ کوٹہ سے دہلی جاتے ہوئے مادھو پور ریلوے سیلون میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس موقع پر افقؔ صاحب، حکیم ظہیر برکاتی میاں، حبیب الرحمٰن ایڈوکیٹ، منظور عالم اور مولانا خنداں مولانا آزاد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا مطالعے میں غرق تھے کہ اطلاع ملی کہ ٹونک سے چند صاحبانِ علم آئے ہیں۔ فوراً ملاقات کے لئے بلایا اور بہت دیر تک مسلمانوں کے دینی و ملّی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس دوران جب انھیں معلوم ہوا کہ افقؔ صاحب شاعر ہیں تو مولانا نے خلافِ طبیعت شعر سنانے کی فرمائش کی۔ افقؔ صاحب نے جب یہ غزل سنائی تو مولانا بہت متاثر ہوئے ؎

دلِ خراب نظر کو سکوں نہیں ملتا ۔۔۔ کوئی بھی محرمِ رازِ جنوں نہیں ملتا
فسانۂ غمِ دل ناتمام ہے شاید ۔۔۔ کہ آنسوؤں میں ابھی رنگِ خوں نہیں ملتا
یہ کیا مقامِ محبت ہے ان دنوں اے دوست ۔۔۔ ترے حضور میں آکر سکوں نہیں ملتا
بچا کے تلخیٔ رنجِ حیات مدت سے ۔۔۔ اشارۂ نگہِ چارہ سکوں نہیں ملتا

ہزار کوشش پیہم کے باوجود اُفق
نشانِ منزلِ مقصود کیوں نہیں ملتا

پھر مولانا نے اور کلام سننے کی فرمائش کی تو افق صاحب نے دو غزلیں سنائیں جن کے چند اشعار مجھے یاد ہیں ؎

نہ عقل و ہوش بجا اور نہ دل ٹھکانے سے
تمھارے ہو کے بُرے ہو گئے زمانے سے

میں یہ سمجھ کے مسلسل فریب کھاتا ہوں
فریب دینا بُرا ہے فریب کھانے سے

ہجوم یاس نے اس درجہ کر دیا مجبور
کہ دل پہ چوٹ سی لگتی ہے مسکرانے سے

نہ چھیڑ شمع تمنائے قلبِ مضطر کو
یہ شمع اور بھڑک جائے گی بُجھانے سے

زمانہ کیوں مجھے پامال کر رہا ہے افق
مجھے تو کچھ بھی اُمیدیں نہ تھیں زمانے سے

رُخِ آتشیں پہ بکھر گئے جہاں ان کے گیسوئے عنبریں
کبھی جھُوم جھُوم اٹھا فلک، کبھی کانپ کانپ گئی زمیں
مجھے گریۂ شب و روز کا، نہ ملا صلہ تو کسی کو کیا
میرا خونِ دل، میری چشمِ تر، میرے اشکِ غم، میری آستیں

مولانا آزاد نے یہ کلام سُن کر بہت داد دی اور فرمایا کہ تعجب ہے راجپوتانہ کی سنگلاخ سرزمین پر ایسے ایسے گلِ ہر سبد کھلے ہیں ــــ اس شعر و شاعری کے بعد مولانا نے افق صاحب سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ دلّی آکر ان سے ملیں تو وہ وزارتِ تعلیم کے کسی محکمے میں انھیں اچھے عہدے پر لگا دیں گے ــــ دلّی جاکر خود مولانا نے یاد دہانی کے طور پر افق صاحب کو اجمیر خط لکھا مگر موصوف نے کوئی توجہ نہیں دی اور اپنی دنیا میں مگن رہے ــ علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، اور ظ۔ انصاری وغیرہ سے افق صاحب کے بڑے مخلصانہ روابط تھے۔ ان لوگوں نے سرتوڑ کوشش کی کہ افق صاحب مستقل طور پر بمبئی چلے آئیں مگر انھوں نے اپنی بے نیازانہ طبیعت کی وجہ سے کسی پیشکش کو قبول نہیں کیا۔ ترقی پسندوں کے مخالف گروہ کے سالار گوپال متل بھی افق صاحب کی شعری صلاحیتوں کے بڑے قدرداں رہے ہیں اور ہمیشہ کوشاں رہے کہ افق صاحب مستقل دلّی چلے آئیں تو بڑی ترقی کریں گے مگر

افقؔ صاحب نے کوئی دھیان نہیں دیا ـــ گوپال متل کے علاوہ بسمل سعیدی صاحب نے افقؔ صاحب کو دلی میں باندھ کر رکھنا چاہا تو یہ دامن جھٹک کر واپس اجمیر چلے آئے ـــ

جے پور میں افقؔ صاحب کو اپنا مزاج داں کوئی نہیں ملا، ہاں، ناظم عزیزی سنبھلی کے ساتھ افقؔ صاحب کا اچھا یارانہ رہا۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ دونوں ہم مذاق تھے۔ جے پور میں احمرؔ جے پوری اور شمیمؔ جے پوری کو آگے بڑھانے میں افقؔ صاحب کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ان لوگوں کے علاوہ جے پور کے تمام اہلِ کمال افقؔ صاحب کے قدردان رہے ہیں۔ مولانا کوثرؔ جے پوری، مولانا رزیؔ جے پوری، چاند بہاری لال صبا، الطاف حسین خیری، اور مولانا احترام الدین شاغل بھی افقؔ صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے۔ رزیؔ صاحب قبلہ تو پاکستان میں موجود ہیں۔ اور اب بھی ان کے رطب اللسان ہیں اور ہر محفل میں یہی کہتے ہیں کہ "افقؔ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں لیکن شاعری میں وہ مجھ سے بہت بڑے ہیں۔"

جے پور میں نواب مکرم علی خاں والئی پہاسو پرانی قدروں کے حامل ایک بڑے رئیس تھے۔ ان سے افقؔ صاحب کی بڑی یاد اللہ تھی۔ نواب صاحب کسی کو کم ہی خاطر میں لاتے تھے مگر پہلی ہی ملاقات میں افقؔ صاحب کے گرویدہ ہو گئے۔ اور اعترافِ کمال کے طور پر کچھ ماہانہ وظیفہ مقرر کرنا چاہا تو افقؔ صاحب محفل سے اٹھ کر چلے آئے۔ چونکہ نواب صاحب موصوف کی مجلس خاص میں افقؔ صاحب ناظمؔ سنبھلی کی وساطت سے پہنچے تھے اس لئے ناظمؔ سنبھلی زیرِ عتاب آ گئے۔ اجمیر پہنچ کر افقؔ صاحب نے ناظمؔ سنبھلی کے نام ایک منظوم معروضہ لکھا جس میں نواب مکرم علی خاں کی مجلس آرائیوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر تھا اور اپنے مزاج و مسلک کا اظہار بھی۔ ناظمؔ سنبھلی نے اپنی پوزیشن کو بحال کرنے کے لئے فوراً یہ معروضہ نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ نواب صاحب افقؔ صاحب کے اس منظوم معروضے یا قصیدے کو سن کر بہت محظوظ ہوئے اور اپنے رویہ پر سخت شرمندہ و متاسف ہوئے اور انھوں نے افقؔ صاحب کے اس قصیدے کو بہترین خطاط سے لکھوا کر اپنے دیوان خانہ میں آویزاں کر دیا۔ سارے جے پور میں افقؔ صاحب کے اس خط یا قصیدے کی دھوم مچ گئی ـــ اس کے بعد نواب صاحب سے افقؔ صاحب کو ہمیشہ ملاقات

رہیں۔ مگر پھر کبھی تحفے تحائف یا نذر نذرانے کی بات نہیں آئی ۔ وہ یادگار منظوم خط ملاحظہ فرمائیں ؎

عبرت بدہ دہر میں اِک عمر سے ناظم!
تھا قلب میں انساں سے ملاقات کا ارماں

اس بزمِ خراباتِ جہانِ گذراں میں
رہتا تھا اسی فکر سے سرگشتہ و حیراں

دُنیا میں ہر اِک سمت سے آتی تھیں صدائیں
یہ درد ہے وہ درد کہ جس کا نہیں درماں

ہے آج تری سعی و رفاقت کی بدولت
ہر غم سے سبکدوش دلِ سوختہ ساماں

مدّت سے تصوّر میں تھی جو محفلِ رنگیں
اُس محفلِ رنگیں میں ہوا میں بھی غزلخواں

جس محفلِ رنگیں کے چھلکتے ہوئے ساغر
غیرت دہِ تابندگیٔ مہرِ درخشاں

جس محفلِ رنگیں کے قرینے سے ہے ثابت
اصل سببِ برتریٔ عظمتِ انساں

وہ مردِ خوش اوقات وہ نوّابِ مُکرّم
اس بزمِ طرب ریز میں ہے جس سے چراغاں

وہ جوہرِ آئینۂ اخلاق کا حامل
دُنیائے شرافت کا ہے جو نیّرِ تاباں

صد جام بکف جس کی ہر اِک موجِ تبسّم
افتادِ نظر جس کی حریفِ رمِ پیکاں

ممکن ہو تو اس قافلہ سالارِ وفا کو
رُودادِ الم میری سُنا دے کسی عنواں

ہر چند ہوں پابستۂ زنجیرِ مصائب
ہر چند ہوں وقتِ ستمِ گردشِ دوراں

ہر چند کہ طوفانِ حوادث کی زدوں میں
ہستی ہے میری مثلِ چراغِ تہِ داماں

ہر چند کہ بے مائگیٔ عقل کے باعث
ہر ذرّۂ ناچیز ہے ہمدوشِ بیاباں

ہر چند نہیں مجھ میں کوئی جوہرِ ذاتی
ہر چند کمالاتِ اب و جد پہ ہوں نازاں

صد شکر کہ اس خاک نشینی پر بھی مجھ کو
سر کر نہ سکی سطوتِ اورنگِ سلیماں

ہوں اصل میں دریوزہ گرِ نقدِ محبت
اعزاز کا طالب نہ زر و سیم کا خواہاں

وہ گم شدۂ راہِ محبت ہوں کہ جس کو
ویرانیٔ صحرا بھی ہے رشکِ چمنستاں

سلطان ٹونک کے یہاں نظر باغ میں حضرت جوش ملیح آبادی کی صدارت میں ایک طرحی محفلِ شعر و سخن آراستہ تھی ۔ مصرعِ طرح خود جوش صاحب نے فرمایا تھا ؏ " اتنی ظالم تھی محبت مجھے معلوم نہ تھا " اس مشاعرے میں افق صاحب کا یہ شعر حاصلِ مشاعرہ تھا ؎

آج یوں پڑتی ہے انجامِ محبت پہ نظر
جیسے انجامِ محبت مجھے معلوم نہ تھا

جوش صاحب نے افق صاحب کو سینے سے لگا لیا اور کہا "ایسے شعروں کے لئے مشاعرے ہوتے ہیں" جوش صاحب کے اس فرمان پر بسمل سعیدی ٹونکی نے جوش صاحب سے کہا کہ "مدہرنی تو پہلے ہی لیگل تھی آپ نے اور گھنگھرو باندھ دیئے"۔

افق صاحب اجمیر بلکہ تمام راجپوتانہ کے مقبول ترین شاعر رہے ہیں۔ جس مشاعرے میں افق صاحب پہنچ جاتے وہاں بازی ان کے ہاتھ رہتی۔ اچھا انسان، اچھا کلام، اچھی آواز، یعنی افق صاحب ہر لحاظ مشاعروں کے لئے موزوں ترین شاعر تھے۔ مگر مشاعروں میں ہمیشہ یہ دو تین شعر سے زیادہ نہ سناتے تھے۔ سارا پنڈال شور مچاتا مگر انھوں نے کبھی اپنی روش نہیں بدلی۔ اور لوگوں کو ہمیشہ تشنہ ہی رکھا۔ پاکستان آنے کے بعد تو یہ عالم ہوگیا ہے کہ یہ مشاعرے کے نام ہی سے بدکتے ہیں۔ وعدہ اس انداز سے کریں گے کہ جیسے مشاعرے میں آنے والوں میں یہ سب سے پہلے شاعر ہوں گے مگر آنکھیں انھیں آخری وقت تک تلاش کرتی رہیں گی اور یہ کہیں دکھائی نہ دیں گے۔ جب ملاقات ہوگی تو بڑی سادگی سے یہی کہیں گے کہ میں گھر سے اس نیت سے چلا تھا کہ آپ کے جلسے میں آؤں گا مگر جب دفتر سے نکلا تو بے ارادہ قدم گھر کی طرف اُٹھ گئے۔

پاکستان میں جن رفیقانِ اجمیر یا احباب راجپوتانہ کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ ہر چھوٹے بڑے شاعر و ادیب سے افق صاحب کی ملاقات ہے مگر معلوم نہیں کیوں اب یہ کھچے سے گئے ہیں۔ ہر شناسا چہرے سے کتراتے ہیں۔ جہاں تک لکھنے لکھانے کا تعلق ہے تو یہ مشغلہ بدستور جاری ہے مگر چھپنے چھپانے سے پہلے بھی گریزاں تھے۔ اور اب بھی دور بھاگتے ہیں۔ ان کا کچھ کلام ظ۔ انصاری نے بطور خاص ماہنامہ "شاہراہ" دہلی میں کافی عرصہ ہوا چھاپا تھا اور ان کے شاعرانہ محاسن پر ایک مقالہ بھی سپردِ قلم فرمایا تھا۔ گوپال متل نے ادھر ادھر سے ان کا کلام حاصل کرکے ماہنامہ "تحریک" دہلی کے بعض شماروں میں بالتزام شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے بعض احباب کی

جسارت سے ماہنامہ "شمع" دہلی۔ ہفت روزہ "آئینہ دہلی"۔ ماہنامہ "بیسویں صدی" دہلی۔ ماہنامہ "شعلہ و شبنم" دہلی۔ اور روزنامہ "الجمعیۃ" دہلی۔ کی بعض اشاعتوں میں ان کا کلام شائع ہو چکا ہے ۔۔ گوپال متل کے شریک کار اور میرے عزیز دوست محمود سعیدی اب بھی دہلی سے افق صاحب کا کلام طلب فرماتے رہتے ہیں ۔۔ اور میں انھیں افق صاحب کی عدم توجہی کی وجہ سے ہمیشہ یہی لکھتا ہوں کہ مستقبل قریب میں بھجواؤں گا ۔۔ کراچی میں افق صاحب روزنامہ "حریت" سے شروع سے وابستہ ہیں مگر اس تعلق و وابستگی کے باوجود "حریت" کے ایک آدھ شمارے میں ان کی غزل دیکھی تھی اور بس ۔

جس طرح افق صاحب بات کرنے اور ملنے جلنے سے کتراتے ہیں اسی طرح خط لکھنے کے معاملے میں بڑے چور ہیں۔ یعنی یہ سب کی سنتے ہیں مگر اپنے من کی دادنہیں دیتے' اپنے اندر کسی کو نہیں جھانکنے دیتے '' افق صاحب میں مزاجاً یہ تبدیلی پاکستان آنے کے بعد ہوئی ہے ورنہ پہلے یہ اتنے اَن سوشل ۔ (UN SOCIAL) نہیں تھے۔ انھیں دیکھ کر ایسا احساس ہوتا ہے کہ جیسے یہ اپنے کسی "گمشدہ ساتھی" کو تلاش کر رہے ہوں۔ ویسے ان کے مزاج میں بے نیازی اور لاابالی پن شروع سے ہے اور کچھ انا اور تکبر کا بھی مادہ ان میں زیادہ ہی ہے بلکہ یوں کہیئے کہ فطرتاً یہ بڑے خود دار واقع ہوئے ہیں۔ کسی کا احسان اُٹھانا انھیں گوارا ہی نہیں۔ کوئی ان کی مدد کرنا چاہے گا تو یہ کان بند کر لیں گے۔ کوئی انھیں خراج تحسین ادا کرنا چاہے گا تو یہ موقع پاکر کھسک جائیں گے۔ کوئی ان کی تعریف کرے گا تو یہ ناراض ہو جائیں گے۔ کوئی ان سے خفا ہوگا تو یہ خوش ہوں گے یعنی عجیب و غریب طبیعت پائی ہے ان حضرت نے ۔۔

پاکستان آنے کے بعد دلّی سے کئی بڑے ادیبوں نے انھیں بڑے پیار سے خطوط لکھے مگر انھوں نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ بمبئی سے ان کے ادیب دوستوں نے حال احوال پوچھا تو خاموشی اختیار کر لی۔ علی سردار جعفری نے انھیں ایک تفصیلی خط لکھا جس میں پاکستان میں ترقی پسند ادبی تحریک کی تجدید احیاء کا تذکرہ تھا اور خصوصیت سے بعض بڑے ادیبوں کے بارے میں لکھا تھا کہ افق صاحب ان سے مل کر تحریک کے لئے

ساز گار ماحول پیدا کریں مگر انہوں نے اس خط کو غیر اہم چیز کی طرح کہیں ڈال دیا ۔
میں جعفری کا وہ اہم اور یادگار خط ہمیشہ ان سے طلب کرتا رہتا ہوں مگر افق صاحب یہی کہہ کر تسلی دیتے ہیں کہ تلاش کروں گا ۔ اختر شیرانی اور احسان دانش نے بڑے پیار سے افق صاحب کو کئی خط لکھے ہیں مگر نہیں معلوم وہ سب کہاں غارت ہوگئے ۔ مجروح سلطان پوری کا ایک خط میرے ہاتھ لگ گیا تھا جسے میں نے اٹھالیا ۔ اس خط کی ایک فوٹو کاپی میں نے مرزا ظفر الحسن صاحب معتمد ادارۂ یادگار غالب کو "غالب لائبریری" کے شعبۂ مکتوبات میں محفوظ کرنے کے لئے دے دی ہے ۔ مجروح کا یہ بڑا اہم اور دلچسپ خط ہے ۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ افق صاحب کا کتنا قدر دان ہے ۔ اور پاکستان میں واحد افق صاحب کو اپنی پانچ سالہ پانچ غزلیں بھیج کر کتنا خوش ہے ۔ مجروح کا خط آپ بھی ملاحظہ فرمائیں : —

۶ ۔ چینوئے کالونی

جوہو روڈ ۔ بمبئی ۔ ۲۳

۲۱ — ۱۰ — ۶۹ء

پیارے افق ! تمہارے خط کے لئے مجھے کم از کم دو گھنٹے درکار تھے اس لئے یہ یقین کر لینا چاہیئے تھا کہ یہ خط بھی تمھیں ملتا ہے یا کہ پھر کہیں ضائع ہو جاتا ہے ۔ اس لئے آزمائشی طور پر جب دو خطوط لکھ چکا اور دیکھا کہ ہاں کبھی خطوط مل جاتے ہیں پہلے کی طرح ضائع نہیں ہوتے تو ایک بار پھر تفصیل سے بات کرنے کی ہمت ہوئی ۔

جس زمانے میں تم میرے گھر بمبئی آئے تھے اسی زمانے سے ۱۹۵۱ء تک مکمل پانچ سال خاموش رہا ۔ بہتری کوششیں کیں لیکن شعر نہیں ہوتے تھے ۔ پھر آپ ہی آپ طبع کھل گئی اور پانچ غزلیں چھ مہینے کی مدت میں ہوگئیں ۔ میں نے چاہا کہ پاکستان میں سب سے پہلے تمھیں نذر کروں ۔ اور اس پر اپنی خیر و عافیت کا اضافہ کر کے اپنا تعارف تم سے پھر کراؤں ۔

چنانچہ میری ذہنی ترقی صرف یہی ہے ۔ خانگی حالات یہ ہیں کہ نوگل ، نوبہار ، صبا تین بیٹیاں علی الترتیب اور ایک صاحبزادے آدم صاحب ہماری جسمانی تخلیق ہیں اور چاہو تو روحانی بھی کہہ لو ۔ اس لئے کہ عشق بیوی سے کرتا ہوں اور نتیجے کے طور پر یہ روحانی رابطہ

بقول اکبر مرحوم "جلوۂ کثرت اولاد" پر عمل ہو رہا ہے۔

نوگل ۔ نو بہار دونوں کی خیریت ہے کہ یہاں سے دو سو میل دور چند گنی ایک ہل اسٹیشن ہے وہاں پڑھتی ہیں۔ تیسرے مہینے پندرہ دن کے لئے اور سال میں دو مہینے کے لئے آتی ہیں۔

تمہارے بارے میں میں اور میری بیوی فردوس بعد سلام تفصیل سے جاننا چاہتے ہیں۔ اپنی بیگم سے ہم دونوں کا سلام کہو اور بچے جتنے بھی ہوں، میری طرف سے گلوں کو بہت دعا کہیے۔

نوٹ: پانچ غزلیں بھیج رہا ہوں، اگر رسائل میں نظر سے گذری ہوں تو پھر اب کیا کروں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ مجروح

مجروح

مجروح نے جن پانچ غزلوں کا تذکرہ کیا ہے وہ یہ ہیں: عمر گذار دی کے حسینوں کی انجمن میں رہے؛ وہ شعلۂ آوارہ ہماری ہی زباں ہے؛ موج کو گیسو بھنور کو چشم جانانہ کہیں؛ مری طرف سے گلوں کو بہت دعا کہیے۔ اور، جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے۔

افق صاحب کے شاعرانہ محاسن پر گفتگو کرنا چھوٹا منہ اور بڑی بات ہوگی۔ ان کا تازہ کلام حاضر ہے۔ آپ خود پڑھیے اور فیصلہ کیجئے کہ وہ کن اعلیٰ شاعرانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ شعر پر ان کی گرفت کتنی مضبوط ہے۔ وہ محض شوقیہ شعر نہیں کہتے بلکہ ان کے اندر کا حقیقی فنکار جب بھی بیدار ہوتا ہے تو وہ کاغذ پنسل سنبھالتے ہیں بلکہ مجروح کی طرح مدتوں جمود اور خاموشی کا شکار بھی رہتے ہیں اور اکثر بعض تنہا مصرع مدتوں ان کے ساتھ سفر کرتے رہتے ہیں۔ مگر غزل نہیں ہوتی ــ افق صاحب ایسے ماہر فن اور مشاق شاعر بھی ہیں کہ چلتے پھرتے شعر کہہ لیتے ہیں۔ "چاربیت" کی کسی محفل میں اگر لوگ افق صاحب کو گھیر گھار کر لے آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا ہے جو بڑی کوملتا کے ساتھ رواں دواں ہے۔ افق صاحب لمحہ لمحہ یوں تخلیق شعر فرماتے ہیں کہ جیسے آسمان شبنم افشانی کر رہا ہو یا نرم و لطیف ہوا ہولے ہولے چل رہی ہو ــ

ممکن ہے افق صاحب کے تذکرے پر بعض لوگ ناک بھوں سکیڑیں اور آج کے کئی مستند اور معروف شاعر (بزعم خود) اس نام کے شاعر سے اپنی کم مائگی کے سبب لاعلمی کا اظہار

کریں گے مجھے یقین ہے کہ جب وہ افق صاحب کے کلام کا خلوصِ دل سے مطالعہ فرمائیں گے تو بیساختہ اس شاعر کے لئے ان کے دلوں سے دعائیں نکلیں گی ۔

افق کا کچھ کلام تازہ ہیں نے دو تین مخصوص نشستوں میں ٹیپ کیا تھا وہ نذرِ قارئین ہے۔ ان کی مشہور طویل نظم "چہرے" اور دیگر تابندہ نظموں اور غزلوں کی مجھے تلاش ہے۔ افق صاحب نے اگر بہ کمال عنایت یہ مطلوبہ کلام عطا فرمایا تو انشاء اللہ پھر کسی صحبت میں اس پر گفتگو ہوگی۔

کلامِ افق

رباعی:۔ مغرور کرے اوج تو پستی اچھی — گمراہ کرے ہوش تو مستی اچھی
جس زہد سے ٹوٹے نہ طلسمِ پندار — اُس زہد سے اصنام پرستی اچھی

قطعہ:۔ یادِ ماضی کے ہلکے ہلکے نقوش — دامنِ دل پہ یوں اُبھرتے ہیں
جیسے پُرہول راہ سے ہوکر — بے نوا قافلے گذرتے ہیں

اجمیر سے ظہور احمد صاحب زیدؔ کے سانحۂ ارتحال خبر سن کر:۔

تصویرِ نہاں خانۂ ارژنگ ہے دُنیا — اک دائرۂ آتشِ بے رنگ ہے دنیا
ہر دل کے لئے جس میں قیامت کی کشش ہے — وہ نغمگیِ سازِ خوش آہنگ ہے دُنیا
دُنیا سے بھی پوشیدہ ہے دُنیا کی حقیقت — دُنیا سے ابھی سینکڑوں فرسنگ ہے دُنیا

اکلوتے مطلعے:۔ سانس لینا بھی یہاں باعثِ دشواری ہے — بوئے گُل کا وہی اندازِ سُبک ساری ہے
ان کی جانب سے اگر پرسشِ حالات ہوئی — بے زبانی سببِ ترکِ ملاقات ہوئی
آسماں ہی کا رکھا اور نہ زمیں کا رکھا — دلِ حسّاس نے ہم کو نہ کہیں کا رکھا

غزل:۔ دہر سے اپنی وفاؤں کا صلہ مانگا ہے — ہم نے صحرا سے نشانِ کفِ پا مانگا ہے
آج ہر شخص کے دروازے پہ دستک دیکر — مانگنے والوں نے کیا کہیئے کہ کیا مانگا ہے
اپنے پرچم کو بہ ہر رنگ سجانے کے لئے — ہر قبا پوش سے کچھ رنگِ قبا مانگا ہے
شہرِ خوباں کی لرزتی ہوئی دیواروں سے — بدلِ سُرخیٔ خونِ شہدا مانگا ہے
مانند چلنے ہی کو ہے تاج زرافشاں کی ذمک — پیاس کے ماروں نے پھر آبِ بقا مانگا ہے

گلِ پژمردہ نے سورج سے تقاضا کیا شبنم
از زمیں تا بہ سرِ عرشِ علا مانگا ہے

حرفِ شکایت بھول گئے جب ہم اپنی زباں پر لائے ہیں
اہلِ کرم کے ہاتھوں دل پر کیا کیا زخم اُٹھائے ہیں

دیپ سے دیپ جلانے والو یہ تو بتاؤ دنیا میں
من کی جوت جگا کر تم نے کتنے دیپ جلائے ہیں

اپنے سائے کو بھی ترسیں گے ایسا زمانہ آئے گا
دورِ خزاں میں جن کے سروں پر لالہ و گل کے سائے ہیں

بطنِ زمیں سے کتنے سورج روز اُبھرتے ہیں لیکن
روئے زمیں پر حدِ نظر تک گھور اندھیرے چھائے ہیں

شہرِ نگاراں کی گلیوں میں اہلِ جنوں کا حال نہ پوچھ
جتنے وفا کے گُن گائے تھے اتنے ہی پچھتائے ہیں

راہِ طلب میں جب بھی کسی مظلوم کے دل کو ٹھیس لگی
…دں سے کتنے پتھر اُڑ اُڑ کر ٹکرائے ہیں

ملتی ہیں اربابِ ہنر کو کسبِ ہنر کی تعزیریں
ہم بھی افقؔ تقدیر کے مارے کس نگری میں آئے ہیں

جنسِ ہنر کے تولنے والے اب تو پورا تول
سونا چاندی بیچ رہے ہیں ہم مٹی کے مول

اُن کے اشاروں پر بٹتی ہے آدم کی میراث
سر پر جن کے تاجِ خودی ہے ہاتھوں میں کشکول

کتنا طوفاں خیز ہے بحرِ ہستی کا طوفان
ہوش کی چادر جب پھیلائی پڑ گئے لاکھوں جھول

اُٹھ اے ساقی راہِ طلب کو اور کریں ہموار
ہم بھی کانٹے بین رہے ہیں تو بھی موتی رول

وقت کا مطرب چھیڑ رہا ہے کیسے کیسے راگ
تو نے کیوں چپ سادھ رکھی ہے اے دل کچھ تو بول

اور کہاں تک روکے رہیں گی اہلِ جنوں کی یلغاریں
ہم بھی دیکھیں کام آتی ہیں کب تک ریت کی دیواریں

ننھی کلیوں کے ہونٹوں پر جب سے تبسم آیا ہے
سارے جہاں میں گونج رہی ہیں زنجیروں کی جھنکاریں

قلبِ حزیں کو کرنا پڑا ہے کتنے شہیدوں کا ماتم
کس کس کا خوں چاٹ چکی ہیں اہلِ ہوس کی تلواریں

رنگ محل پر مٹنے والو انسانوں کا پاس کرو
وقت پڑا تو ساتھ نہ دیں گی رنگ محل کی دیواریں

سورج نے انگارے اُگلے چھاؤں سمیٹی درختوں نے
وقت کے ہاتھوں ہم کو ملیں جب وحشتِ جنوں کی بیگاریں

شیشوں کے زخم اٹھا کر ان کے بدن بھی چور ہوئے
جن کی نگاہوں سے مرجھاتیں تھیں شمشیروں کی دھاریں

…مع اد بجھانے والو یہ بھی تمہیں معلوم نہیں
تاریکی میں بڑھ جاتی ہیں رہگیروں کی رفتاریں

…کرو اے شیشہ گرانِ عصرِ حاضر شرم کرو
بازاروں میں رہن پڑی ہیں اہلِ ہنر کی دستاریں

ہم بھی نہ ہوتے دل سے افقؔ تاثیرِ محبت کے قائل
جیت میں گر تبدیل نہ ہوتیں راہِ محبت کی ہاریں

سروں پہ رقص کناں ہیں جو ظلمتوں کے پرے
کوئی نقیبِ سحر ہے تو ان کو دُور کرے

وہ کیا کریں گے مداوائے زخمِ دل اے دوست
کہ جن کی باتوں سے ہوتے ہیں دل کے زخم ہرے

اسی کا نام ہے تنظیمِ میکدہ ساقی
لہو چھلکنے نہ پائے کہ اپنا جام بھرے

جگر ٹپکتا ہے یوں آنکھ سے لہو بن کر
کہ جیسے سخت چٹانوں سے کوئی جھرنا جھرے

وہ شخص مجرمِ تہذیبِ عصرِ حاضر ہے
عروسِ فن کی جو خونِ جگر سے مانگ بھرے

مصافِ زیست میں کل جن کی کوئی حد نہ تھی
وہ کھوٹے سکے نظر آ رہے ہیں آج کھرے

مسیح و خضر بھی دیکھیں تو رشک آجائے
جو مر رہا ہے زمانہ تو ایسی موت مرے

ہراس و خوف سے بالا ہے آدمی کا مقام
وہ آدمی ہی نہیں ہے جو حادثوں سے ڈرے

یہاں تو سنگ تراشوں کا دورہ دورہ ہے
اس انجمن میں آفق کوئی کس سے بات کرے

آثر جلیلی حال مقیم کوئٹہ کے نام :-

لعل و الماس ہیں صرفِ کلۂ بے ہنراں
فرقِ اربابِ ہنر پر ہے وہی گردِ ملال
خس و خاشاک سے اٹھکیلیاں کرتی ہے صبا
شورشِ بادِ صبا سے ہے گلستاں پامال
اوجِ افلاک پہ ہے نعرۂ عیسیٰ نفسی
عظمتِ آدمِ خاکی ہے مگر رُو بہ زوال
ان کو حاصل ہے زمانے کی قیادت کا شرف
ذہن ہیں جن کے غبی ، عقل ہے جن کی کنگال
الغرض عالمِ امکاں پہ مسلط اے دوست
وہ زمانہ ہے کہ جس کا کوئی ماضی ہے نہ حال

نظم — جمود :-

یہ نشہ بار فضائیں یہ دامنِ کہسار
یہ آبشار کے نغمے یہ رقصِ ابرِ بہا-

محیطِ محفلِ کون و مکاں پہ رنگِ جمود
اسیرِ دامِ تحیّر یہ عقلِ شعبدہ کار

یہ دلکشی، فضائے سکوتِ ارض و سما
یہ دورِ ساغرِ لبریزِ بادۂ گلنار

قدم قدم پہ یہ نظارۂ نشاط آگیں
نقوش نقش پہ یہ تنویرِ حسنِ صاعقہ بار

ہزار مرکزِ فکر و نظر سہی لیکن
بدل چکا ہے کچھ اس طرح زندگی کا شعار

ہجومِ محفلِ عیش و طرب سے دل کو گریز
فروغِ جلوۂ رنگیں سے ہے نگاہ کو عار

نہ اب نگاہ میں شام و سحر کی رنگینی
نہ اب زباں پہ حکایاتِ کاکل و رخسار

نہ اب وہ کشمکشِ احتیاطِ رازِ جنوں
نہ اب وہ شورشِ فکرِ سلیقۂ گفتار

نہ اب خیال میں تصویرِ شامِ مے خانہ
نہ اب دماغ میں سودائے ساغرِ سرشار

نہ اب وہ ذہن میں خاکے غمِ محبت کے
نہ اب وہ چشمکِ اہلِ وطن سے سینہ فگار

نہ اب وہ پاس تقاضائے عافیت کوشی
نہ اب وہ شکوۂ غارت گریٔ لیل و نہار

نہ اب وہ حسنِ صداقت کی گرم بازاری
نہ اب وہ گرمیٔ جوشِ بلندیٔ کردار

نہ وہ خروشِ تمنّا نہ وہ جنونِ خودی
نہ وہ جسارتِ تسخیرِ ثابت و سیّار

ہے یوں شعور پہ طاری جمود کا عالم
کہ جیسے حضرتِ انساں پہ بعدِ مرگ قرار

بیدِ مجنوں

مرزا ظفر الحسن غالب لائبریری، کراچی

پرانے زمانے کے لوگوں پر لکھنا شروع کریں تو اولین الجھن ان کی پیدائش سے ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ پیدا ہوتے تھے یا نہیں؟ یہ بھی نہیں کہ کیوں پیدا ہوتے؟ بلکہ کب؟

صہبا لکھنوی نے کہ عصر حاضر کے ممتاز مدیر ہیں حضرت مجنوں گورکھپوری کی دو پیدائشیں دریافت کر ڈالیں۔ ان ہی کی تحریر کے مطابق ایک "دستاویزی" ہے اور دوسری "اصلی" ہے۔ میں محقق تو ہوں نہیں کہ اس موضوع پر کوئی مقالہ لکھ ڈالوں۔ نقاد بھی نہیں ہوں کہ "تنقیدنامہ" ڈال کر پوچھوں کہ "دستاویزی" کی اصل کیا ہے۔ اور "اصلی" کا "دستاویزی" ثبوت کہاں محفوظ ہے۔ اور یہ بھی استفسار کروں کہ وہ ثبوت اگر مخطوطے کی شکل میں ہے تو کیا مشفق خواجہ نے جو بجا طور پر ابو مخطوطہ کا خطاب پانے کے مستحق ہیں اس کی بابت کوئی سند دی ہے۔ مجھے تو اسی انکشاف سے اطمینان ہو گیا کہ دستاویزی اور اصلی میں سال مشترک ہے۔ ۱۹۰۴ء۔ اگر سال بھی دو ہوتے، ایک دستاویزی سال اور دوسرا اصلی تو ہم صہبا لکھنوی کا کیا بگاڑ لیتے۔

مجنوں صاحب یا تو جنوری کے جاڑوں میں پیدا ہوتے جب کہ ہر ایک لحاف میں دبکا پڑا رہتا ہے یا پھر جیسے ہی شاعر نے ارشاد فرمایا۔ مئی کا آگیا ہے مہینہ یا پھر عین بجٹ کی تیاری والے مہینے جون میں تولد ہوتے۔ جب یہ یقین ہے کہ حضرت پیدا ہوتے اور یہ نہیں معلوم کہ کس ماہ میں تو ۱۹۰۴ء کی پہلی ششماہی پر متفق ہو جانے میں کیا حرج ہے کہ وہ جنوری تا جون ہوتی ہے اور یہی تو جنوری تا جون کی پیدائش

کا ثمر ہے کہ مجنوں صاحب زمانے کے سرد و گرم چشیدہ ہیں اور خود فرماتے ہیں۔ ع
یکساں ہے مرے واسطے کیا سرد ہو کیا گرم

دور حاضر کا ہر بچہ باٹل والا ہے۔ کھڑی بوتل کا دودھ پیتا ہے۔ تیس چالیس سال پہلے کے بچوں کے لئے ایک طرح کی لیٹی ہوئی بوتل ہوتی تھی۔ فیڈر کہلاتی تھی۔ اس کے ایک سرے پر ربر کی چسنی ہوتی اور دوسرے سرے کو ربر ہی کی نیم چسنی نما چیز سے بند کیا جاتا تھا۔ ستر اسّی سال پہلے کے بچے بہ شمول جوش اور مجنوں گھٹی کے عہد کی پیداوار ہیں۔ پیدا ہوتے ہی انہیں گھٹی پلائی جاتی تھی۔

یوں سمجھئے مجنوں صاحب پیدا ہوئے، اپنی تشریف آوری کا اعلان بہ آواز بلند کیا، حوائجِ ضروری سے فارغ ہوئے، غسل فرمایا اور زندگی میں پہلی بار کپڑے پہننے نصیب ہوئے۔ شاید نوجوان نسل کے لئے حوائجِ ضروری کا ترجمہ کرنا ہوگا۔ آج کل کی زبان میں حوائجِ ضروری کو نمبر۔ ون اور نمبر۔ ٹو کہتے ہیں۔ مثلاً امّی دیکھتے بابا نے نمبر۔ ون کر کے اپنے کپڑے گیلے کر لئے ہیں۔ ابّو ذرا سنبھل کر اٹھائیے بی بی کو اس کے پیروں میں سارا نمبر۔ ٹو لگا ہوا ہے۔ اسکول کے بچے باتھ روم کہتے ہیں۔ سر مجھے باتھ روم آ رہا ہے، جا سکتا ہوں؟ اس نمبر۔ ون، نمبر۔ ٹو اور باتھ روم کے لئے مجنوں صاحب کے بچپن میں حوائجِ ضروری کہتے تھے۔

مجنوں صاحب کی دادی نے چاندی کی طشتری میں گھٹی ڈالی، ململ کی پتلی سی بتی بنائی اُسے گھٹی میں بھگویا اور دے دیا مجنوں میاں کے منہ میں۔ نو مہینے کا فاقہ تھا چوسنے لگے۔ دادی نے نانی کو مخاطب کر کے کہا۔ "لے بوا دیکھو ماشاءاللہ نواسہ کتنا سمجھ والا ہے اور سعادت مند بھی۔ بغیر کہے گھٹی یوں پی رہا ہے جیسے نو مہینے اس نے اسی کے انتظار میں گزارے۔"

اُن دنوں نہ مٹرنٹی ہوم تھے نہ لیڈی ڈاکٹر اور نہ نرس۔ صاف سیدھا سا تھا۔ گھر کے کمرے یا برآمدے میں پردہ تانا۔ کھاٹ بچھائی، پرانے گھڑے کے دو برابر کے ٹکڑے کر کے اوپر کا ٹکڑا فرش پر اوندھایا۔ اس کے اوپر نیچے کا ٹکڑا

رکھ کر انگیٹھی بنائی ۔ اس میں چولہے کی راکھ بھری، کوئلے جلائے، کمرے کو گرم کیا اور زچہ خانہ تیار۔

پرانے زمانے کی بھی کیا بات تھی۔ چار چار چولہے راکھ سے پٹے پڑے ہوتے۔ ہر طرف کے پچھواڑے پھینکی جانے والی راکھ کے ٹیلے نظر آتے جن میں سے چند ایک کھجلی بھرے کتوں کے مسکن ہوتے۔ آج صرف سگریٹ کی راکھ نظر آتی ہے اور وہ بھی اگر راکھ دان میں جھٹکنے کی بجائے فرش پر جھٹکی جاتے۔ ورنہ کہاں راکھ اور کہاں ہم۔

ہندوستان اس معاملے میں خوش قسمت ملک ہے کہ روز کسی نہ کسی کے مرنے پر ڈھیر ساری راکھ مل جاتی ہے۔ میں تو جانوں راکھ ہی کے ڈسپوزل کے لئے دسہرے کا تہوار ایجاد کیا گیا ہے۔

ہاں تو میں زچہ خانے کا ذکر کر رہا تھا۔ کمرہ تیار ہوا، دائی بلائی گئی گھنٹہ دو گھنٹے کی دیر سویر سے دائی نے ہاتھ کی صفائی دکھائی اور ایک نئی اور ننھی آواز سننے کو ملی۔ آج کل کی ڈاکٹرنیوں اور نرسوں کے ناز نخرے نہ تھے کہ اتنی دیر ویٹنگ روم میں بیٹھئے پھر لیبر روم میں لیٹئے، نام پہلے سے رجسٹر کرائیے وغیرہ وغیرہ جب نئی آواز گونجی تو نانا کی باچھیں کھل گئیں۔ دادا مونچھوں پر تاؤ دینے لگے کہ "لڈے نے لڈا پیدا کیا شاباش۔" کرزن فیشن آیا اس کے بعد صفا چٹ میدان اور اب یہ حال ہے کہ سوائے ہمارے میر رسول بخش تالپور کے کسی کی مونچھیں تاؤ دینے کے قابل نہیں ہیں۔ بعض یاروں کو یہ مونچھیں بھی منظور نہیں۔ سنا ایک بار ایرپورٹ پر سارا تاؤ واؤ نکال دینے کی کوشش کی۔ یارو یاد کرو سردار نشتر کی مونچھوں کے بعد اب ان ہی کی مونچھیں تو بچی رہی ہیں یا حسین امام صاحب کی جنہوں نے کبھی تاؤ دیا ہی نہیں۔ عہد قدیم کی دائی اور ہیجڑوں میں نہ جانے کیا ملی بھگت تھی کہ ادھر وہ فراغت اور اپنا ابتدائی انعام پا کر اپنے گھر پہنچی ادھر ملاتے کے ہیجڑے ڈھول بجا کر تالی پیٹ کر اور ناک پر انگلی رکھ کر پہنچ گئے اور گانے لگے "کہاں ہماری ماں بیٹا۔" جناب کا معروف نام مجنوں گورکھپوری، نانا کا اسم مبارک احمد صدیق۔ مجنوں صاحب

ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "میری جسمانی ساخت روزِ اوّل سے خطرناک حد تک نازک رہی۔ اس کا احساس اور تردد مجھ سے زیادہ (میری) دادی کو تھا۔" ہمیں تو آج بھی احساس اور تردد ہے کہ فقط ساخت ہے مجنوں صاحب کا جسم کہیں نظر ہی نہیں آتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کسی شاخِ نازک پر شیروانی لٹکا دی گئی ہے۔ تب ہی تو ابن انشا نے کیا خوب لکھا کہ مجنوں صاحب نے "صہبا صاحب کو آدمی کی بجائے ایک پرچھائیں قرار دیا لیکن یہ بھول گئے کہ وہ خود تو پرچھائیں کی بھی پرچھائیں ہیں" اس کے لئے انگریزی میں مقولہ ہے۔ get calling black

پوتے کی چاہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اصل سے بیاج سود ہوتا ہے۔ درست ہی ہو گا جب ہی تو مجنوں صاحب، کو ان کی دادی بہت چاہتی تھیں۔ چاؤ کی انتہا یہ کہ اچھی خاصی اور خالص گھٹی میں عربی فارسی اور ہندی ملا ڈالی اور وہ بقول مجنوں "اعلیٰ نصاب کے مطابق" چنانچہ جب جناب والا پی پلا کر ترنگ میں آتے تو بارہ برس کی عمر سے شعر کہنے لگے۔ وہ تو خیر ہوئی کہ فقط اردو میں شوق فرمایا۔ فارسی عربی اور ہندی میں بھی نزولِ شعر ہوتا تو دورِ حاضر کے طلبا کی شامت آجاتی۔ تبھی میں اکثر تو یہ سمجھتے ہیں کہ قاضی عبدالغفار صاحب نے مجنوں صاحب کی ڈائری اپنے نام سے شائع کر دی ہے۔

شاعری کے معاملے میں موصوف غالب کی طرح بے استادے ہیں بلکہ غالب سے بڑھ گئے ہیں کہ کسی فرضی استاد کو بھی روا نہ رکھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "دوسرے کی اصلاح سے شعر دوغلا ہو جاتا ہے۔" مجھے مجنوں صاحب سے بوجہ اختلاف ہے کہ دوغلاپن تو ہمارے محققین کا سرمایۂ تحقیق ہے۔ وہ نہ ہو تو پھر اہلِ تحقیق کس منطقی پہ مکھی ماریں گے۔ غالباً لفظ دوغلا کا الٹ اردو زبان میں موجود نہیں۔ کیوں نہ ایک لفظ "اوغلا" رائج کیا جائے یعنی ایسا شعر جو مجنوں صاحب کے شعر کی طرح جس میں دوسرے کی اصلاح شامل نہ ہو اوغلا کہلاتے۔ چونکہ ہم رسمی ذہن کے لوگ ہیں اس لئے ہم صرف اوغلو صاحب ہوا کرتے تھے لیکن

لئے یہ لفظ نامانوس نہیں معلوم ہوگا۔

ابن انشا نے اپنے اور فیض کے متعلق لکھا ہے "ہم دونوں پڑھے لکھے ہیں۔ پر اتنا فرق ہے کہ فیض پڑھے زیادہ اور لکھے کم ہیں اور ہم لکھے زیادہ اور پڑھے کم ہیں۔" ایسے پڑھے لکھے کے معاملے میں فیض + انشا = مجنوں گورکھپوری ہیں۔ مجنوں صاحب نے پڑھا کتنا اس کا اندازہ ہر ایک نہیں لگا سکتا مگر لکھنے کی تو حد ہی کر دی۔ پڑھنے والے حیران کہ مجنوں کو آخر کتنا پڑھیں۔ نہ پڑھنے والے پریشان کہ جہاں دیکھو مجنوں کی کتابیں موجود۔

یہ سلسلہ جاری ہے۔ ایک دن مجھ سے فرمانے لگے "تم فیض کے بہت قریب ہو میرا ایک پیغام پہنچا دو۔ یہ کہ میں نے ان پر کچھ لکھا ہے۔ چند ایک مقامات ایسے ہیں جن کی بابت مجھے ان سے گفتگو کرنی ہے۔ اور یہ گفتگو "ان کیمرہ ہوگی"۔ میں نے حیرت سے پوچھا "ان کیمرہ" یعنی تخلیے میں؟ ایسی کیا راز کی بات ہے؟" فرمایا "تم ہم دونوں کے راز و نیاز نہیں جانتے بس پیام پہنچا دو۔" میں نے فیض کو بتا دیا۔ فیض کہنے لگے "ہاں ضرور ملیں گے اور صیغہ راز میں گفتگو بھی کریں گے۔"

مجنوں صاحب نے جو کچھ پڑھا ہے اس کا نہیں بلکہ جن جن کو پڑھا ہے اسی کا اشاریہ تیار کیا جائے تو ان قبلہ سے زیادہ ضخیم ہوگا۔ اس لفظ جن پر یاد آیا —— انگریزی جن نہیں جو پی جاتی ہے اور جنجر کے ساتھ پی جائے تو نشہ کم ہوتا ہے —— بلکہ اردو جن —— کہ مجنوں صاحب نہ صرف لکھنے پڑھنے کے معاملے میں جن ہیں بلکہ لکھنو سے کبھی نکلنے والے رسالے "جن" کے پس پردہ مدیر بھی رہ چکے ہیں اور ایسے مدیر کہ چٹکی بجائی، اس کی گونج ہوا میں ابھی تحلیل بھی نہ ہوئی اور ایک دم چار شمارے تیار ہوگئے۔ ایسا کام ادب کا جن ہی کر سکتا ہے جو مجنوں صاحب ہیں مگر مجنوں صاحب معاف کریں دور حاضر میں ان کا متذکرہ جناتی عمل بہ اعتبار ضخامت ویسا ہی ہے جیسے فیض کے کلام کے تمام مجموعوں کے مقابلے میں کلیاتِ میر۔ آج کل کے ابوالجنات قسم کے مدیر ضخیم نمبر نکالتے ہیں۔ میں نے سوچ سمجھ کر "ضخیم" لکھا

ہے۔ اسے کاتب کی غلطی سمجھ کر ضخیم نہ پڑھ جائیے۔ ضخیم سے جو بڑا ہوگا اسے ضیغم کہیں گے۔ وجہ صاف ظاہر ہے حرف خ کے عدد چھ سو ہوتے ہیں اور اس کے مقابلے میں غ کے ایک ہزار۔

میں جب بھی مجنوں (گورکھپوری) سے نیاز حاصل کرتا ہوں مجھے مجنوں (غیر گورکھپوری) سے زیادہ بید مجنوں کی ترکیب یاد آتی ہے۔ اس کا ایک سبب وہ چھڑی ہے جو اکثر موصوف کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ مجنوں صاحب پیر جواں ہیں اس لیے اسے عصائے پیری نہیں کہہ سکتے۔ بہ اعتبار پیشہ اور مزاج استاد ہیں اس لیے چھڑی سے چھٹکارا مشکل ہے۔

ایک دن غالب لائبریری تشریف لائے۔ مجھے دور سے دیکھ کر اپنی چھڑی سے میری طرف یوں اشارہ کیا جیسے فوجی صاحب قرولی دکھا رہے ہوں۔ جلو میں کچھ شاگرد تھے اور چند پہلے سے لائبریری آ گئے تھے۔ پوری پلٹن کے ساتھ یلغار کا منظر۔ میں نے آداب و استقبال کیا تو فرمایا "میں تم سے خفا ہوں۔ آج تمہاری خبر لینے آیا ہوں۔" پوچھا "کیا گستاخی کی خادم نے، کچھ قصور تو بتائیے۔" فرمایا "ایسی ویسی گستاخی۔ میں کراچی یونیورسٹی سے اپنے شاگردوں کو یہ طمانیت دلا کر یہاں بھیجتا ہوں کہ میرا نام بتاؤ مرزا تمہیں کتابیں دے دیں گے اور تم ادھر ادھر کی میٹھی میٹھی باتیں کر کے انھیں ٹرخا دیتے ہو۔" میں نے عرض کیا "اس لائبریری کا قاعدہ یہ ہے کہ یہاں کتاب آتی ہے، یہاں سے جاتی نہیں ہے۔ میں کس طرح کتابیں گھر لے جانے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ ایک کو اجازت دوں تو سب کے ساتھ رعایت کرنی ہوگی۔ آپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں تو اصول ٹوٹتا ہے۔"

مجنوں صاحب کے ساتھ آئے ہوئے شاگرد ادھر ادھر ہو کر کتابوں کا انتخاب کرنے لگے تو مجنوں صاحب نے میرے کان میں فرمایا "اچھا کرتے ہو جو کسی کو کتابیں نہیں دیتے ورنہ تمہاری لائبریری خالی ہو جائے گی۔ میں نے تو فقط تمہاری قوت ارادی اور اخلاقی جرأت کا امتحان لینے کے لئے ڈانٹا تھا۔ تم پاس ہو گئے۔"

لائبریری کی باتیں شروع ہوئیں تو میں نے عرض کیا اگر یکمشت دو تین لاکھ روپے مل جائیں تو تمام بنیادی اور اہم ضرورتیں پوری ہو جائیں گی اور سارے کام وقت پر، سلیقے اور خوش اسلوبی سے ہونے لگیں گے۔ بس اتنی رقم چاہتے اور یکمشت" فرمایا۔ "تمہیں یکمشت دو تین لاکھ مل جائیں تب بھی اپنے افلاس کا رونا روتے رہنا اور کہنا بہت سی بنیادی اور اہم ضرورتیں ابھی پوری نہیں ہوئیں۔ یاد رکھو لائبریری کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔" اس کے بعد مجنوں صاحب اپنی چھڑی ہلاتے ہوتے چلے گئے۔ دو تین لاکھ روپے ملے نہیں، افلاس کا رونا جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔ سچ ہے۔

"لائبریری کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا"

محفوظات غالب لائبریری

حضرت مجنوں گورکھپوری کی یہ کتابیں غالب لائبریری میں موجود ہیں۔ (۱) نقوش و افکار (۲) نکات مجنوں (۳) ادب اور زندگی (۴) شعر اور غزل (۵) غزل سرا (۶) سخن پوش (۷) گردش (۸) غالب شخص اور شاعر

مطلوبات غالب لائبریری

جناب مجنوں کی ان کتابوں کی ضرورت ہے۔ کوئی اہل خیر فراہم کر دے۔ شکریہ (۱) شوپنہار (۲) تاریخ جمالیات (۳) افسانہ (۴) اقبال (۵) تنقیدی حاشئے۔ (۶) دوش و فردا (۷) پردیسی کے خطوط (۸) خواب و خیال (۹) نقش ناہید (۱۰) مجنوں کے افسانے (۱۱) سوگوار شباب (۱۲) حیدیلیلی (۱۳) سر نوشت (۱۴) سراب۔ (۱۵) زیدی کا حشر (۱۶) سلومی (۱۷) آغاز ہستی (۱۸) ابوالغمر (۱۹) قابیل (۲۰) مریم مجدلانی (۲۱) سنگھاسن بتیسی (۲۲) کنگ لیئر (۲۳) شمسون مبارز (۲۴) زہر عشق (۲۵) حسن فطرت۔

ایک خط، دو نظمیں، تین مضمون

یوسف ناظم

بمبئی سے خاص جریدۂ غالب کے لیے

خط مرزا ظفر الحسن کا موسومہ ہے جنہوں نے اپنی کتاب ذکرِ یار چلے میں لکھا ہے "یوسف ناظم (دکن کے) ان فرزندوں میں سے ایک ہیں جن کے متعلق میرا عقیدہ آج بھی یہ ہے کہ یہ لوگ دکن میں نہیں کہیں اور مثلاً یوپی یا پنجاب میں پیدا ہوتے تو آج بہت آگے نظر آتے یا بہت پیچھے نہ رہتے۔ (مقام اقبال اور اقبال اور انسان کا مصنف) اشفاق یوسف ناظم کو بچھو پکارتا تھا۔ واقعی یوسف طنز نہیں کرتا ڈنک مارتا تھا اور اس سے تڑپ نہیں ہوتی لطف آتا تھا۔" ے۔ ص ۳۹۴ یوسف ناظم کے مضامین کا مجموعہ "سائے اور ہمسائے" غالب لائبریری میں موجود ہے

ــــــــــــ ادارہ۔

خط

بمبئی ۲۵ر جون ۱۹۷۶

حضرت!

آپ نے، آپ کو یاد ہوگا، لکھا تھا کہ آپ فروری یا مارچ میں ادھر آئیں گے۔ آجاتے تو آپ کا کیا بگڑتا۔ مخدوم محی الدین مرحوم کے ہمدم دیرینہ ۔حسن سے ملاقات ہو جاتی۔ ۲ر جون کو ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اچانک میں مئی کے پہلے ہفتے میں حیدرآباد گیا تھا۔ تین دن ٹھہرا۔ روزانہ ان سے ملاقات

ہوتی رہی۔ وہی فراخ دلی، مسکراہٹ، بے تکلفی، قہقہے، جملے۔ مزاحیہ مشاعرہ بھی تھا۔ ہم ساتھ ہی بیٹھے اور خوب ہوٹنگ کی۔ ان کی صدارت میں ایک جلسہ بھی اردو ہال میں ہوا۔ بس یہی جلسہ آخری ملاقات تھی۔ پرسہ کسے دیا جائے، آپ کو یا اپنے آپ کو؟"

دو نظمیں اور تین مضمون بھیج رہا ہوں۔ اگر آپ کے معیار کے نہ ہوں تو کسی ایسی جگہ بھیج دیجئے جس کا شمار اعلیٰ پرچوں میں ہوتا ہو۔

آپ کی کتاب چھپی یا نہیں۔ نہ بھی چھپی ہو تو جلد بھیجئے۔ آپ کا مضمون "لڈو نے الائچی کے پان تک" کی یہاں کافی شہرت ہے۔ کئی جگہ نقل ہوا ہے۔

[گریز]

خوشی، بہار، محبت، خلوص، آسائش
ہمیں نہ ان کا سلیقہ نہ ان کی خواہش ہے
ہمیں تو ان کے تصور سے ہول ہوتا ہے

وہ زندگی جو نہائی ہوئی تھی شبنم میں
وہ زندگی جو چٹکتی ہوئی کلی کی طرح
بڑی حسین تھی خوشبو کا ایک جھونکا تھی
وہ زندگی جو مسرت کا ایک تحفہ تھی
ہمارے ساتھ بہت دور تک چلی لیکن
ہمیں نے راہ میں دامن جھٹک دیا اپنا
اور اس کے بعد بھی ہم کو یہ یاد پڑتا ہے

ہمارے گھر کے دریچوں سے اس نے جھانکا تھا
ہمارے نام سے اس نے ہمیں پکارا تھا
ہمارے کانوں میں آئی تھی اس کی یہ آواز
خوشی، بہار، محبت، خلوص، آسائش
سبھی ہیں ساتھ میں میرے، کہو تو آجاؤں
ہمیں نے شرم سے چہرہ چھپا لیا اپنا
کہ ہم کو ان کا سلیقہ نہ ان کی خواہش ہے
ہمیں تو ان کے تصور سے ہول ہوتا ہے

مصوّر

کوئی تدبیر بتاؤ کہ میں تصویرِ جہاں
اس طرح کھینچوں کہ ہر زخم زباں پا جائے
درد جو سب کا مقدر ہے سطح پر ابھرے
آگ جو غم کی سلگتی ہے قلم سے چھلکے
کون سے رنگ چنوں کیسی لکیریں کھینچوں
آہ کو چیخ کو جن میں میں مقید کر دوں
کس علامت سے ظاہر کروں دولت کی ہوس
جبر و بیداد کو کس طرح مجسّم کر دوں
کانپتے ہونٹوں پہ سسکی جو ابھر آتی ہے
اس کو آواز کو کس طرح مشکل کر دوں
جھوٹ کے فاصلے میں رنگ سیہ یوں یا سفید
مکر کو کیسے میں تقریر میں عریاں کر دوں

عدل و انصاف کے اُس رُخ کو دکھاؤں کیسے
جس سے حق جینے کا قاتل کو ملا کرتا ہے
کیسے تقدیر کے پردے پہ اتاروں وہ سب
بند دروازوں کے پیچھے جو ہوا کرتا ہے
کوئی تدبیر بتاؤ کہ میں تصویرِ جہاں
اس طرح کھینچوں کہ ہر زخم زبان پا جائے

پتھر کی لکیر

انسان قدرت کی کاری گری کا نمونہ ہے (وہ جیسا بھی ہے۔ اُسے نمونہ ہی کہا جائے گا۔ بعض لوگ اِسے قدرت کی کاری گری کا شاہ کار کہتے ہیں۔ لیکن اس میں مبالغہ ذرا زیادہ ہے)۔ قدرت نے انسان کے علاوہ اور بھی کئی جان دار چیزیں پیدا کی ہیں جنھیں مخلوقات کہا جاتا ہے۔ ان مخلوقات کے علاوہ قدرت کی سینکڑوں تخلیقات بھی ہیں جو جمادات، نباتات، معدنیات وغیرہ جیسے ثقیل عنوانوں کے ساتھ دنیا میں رائج ہیں۔ انسان اِن سب چیزوں کو بلا تکلف استعمال کرتا ہے اور اپنی دانشوری میں یہ سمجھتا ہے کہ وہ اِن سب چیزوں کا صحیح استعمال کر رہا ہے۔ (انسان جب خود اپنے اعضائے جسمانی کے استعمال میں غلطیاں کرتا ہے تو اس سے دوسری چیزوں کے برتنے کے معاملے میں صحت کی توقع زیادتی ہے)۔ مثلاً کاغذ لکھنے کی چیز ہے لیکن وہ اِسے سِکّے کے طور پر استعمال کرتا ہے اور پھر کاغذ کی کمی کا رونا بھی روتا ہے۔ نوٹوں کی چھپائی پر جتنا کاغذ خرچ ہوتا ہے (کتنے تو اِن کے ایڈیشن چھپتے ہیں) اگر اُس کا عشرِ عشیر کتنا ہوتا ہے۔ کسے خبر؟ ابھی شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کو تحفے کے طور پر دے دیا جائے تو ادب اور صحافت کے ذریعے کتنے ہی مسائل پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ جن کے پیدا ہونے کے بعد مزید مسائل کے پیدا ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ادیبوں اور صحافیوں

کو سیکھنے کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں دی جانی چاہئیں۔ وہ جب تک لکھتے رہیں گے مسائل پیدا ہوتے رہیں گے۔

انسان تین چیزوں کو بڑے شوق سے استعمال کرتا ہے۔ ان میں ایک پتھر بھی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب انسان صرف پتھروں ہی سے کام لیتا تھا۔ شروع شروع میں انسان کے منہ کا مزا اور اس کی عادتیں اتنی بگڑی ہوئی نہیں تھیں اس لئے اُس زمانے میں نہ اچار، چٹنیوں کا رواج تھا نہ مسالوں کا۔ اساس کا رواج پہلے بھی تھا لیکن اُسے کھایا نہیں جا سکتا تھا۔

تاریخ لکھنے والوں نے اُس زمانے کو پتھروں کا زمانہ لکھا ہے جو غلط ہے۔ پتھروں کا زمانہ تو اصل میں اب آیا ہے۔ اب ہر شخص بخیر و خوبی دوسرے شخص کے راستے کا پتھر بنا ہوا ہے۔ بھوک لگتی ہے تو کتنے ہی لوگ پیٹ پر پتھر باندھ لیتے ہیں جب کبھی عقل سے کام لینے کا وقت آتا ہے عین اُسی وقت آدمی کی عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں۔ (وہ تو غنیمت ہے کہ عقل سے کام لینے کی نوبت بہت کم آتی ہے۔) عقل پر پڑنے والے پتھر پتہ نہیں کدھر سے آجاتے ہیں۔ دل سے کام لینے کا موقع آتا ہے تو آدمی سنگ دل بن جاتا ہے۔ جہاں وہ بڑی تہذیب اور شرافت کے ساتھ ایک گالی سے کام نکال سکتا ہے، وہ ہاتھ میں پتھر اٹھا لیتا ہے۔ اینٹ کے جواب میں وہ اینٹ نہیں پتھر ہی پھینکتا ہے۔ (یہ الگ قسم کی بیت بازی ہوتی ہے) اُسے کسی کے انتظار کا شوق ہوتا ہے۔ تو وہ اِس انتظار میں اتنا مصروف ہو جاتا ہے کہ اس کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ بعد ازاں وہ یہ شعر کہتا ہے۔

گئے دن ٹکٹکی کے باندھنے کے
اب آنکھیں رہتی ہیں دو دو پہر بند

بعض صورتوں میں تو آدمی پتھر کا بت بن جاتا ہے۔ ڈاکٹروں نے آدمی کے جسم سے کنکر پتھر بھی نکالے ہیں۔ آدمی پتھروں سے صرف یہی کام نہیں لیتا۔ وہ پتھروں کو نیکی کے کاموں میں بھی استعمال کرتا ہے۔ اِن کاموں کو فلاح و بہبود کے کام کہا جاتا ہے۔ مثلاً اناج

کو زیادہ مقوی بنانے کے لئے وہ اس میں پتھر پیس کر ملا دیتا ہے اور اسے دھرم کانٹے پر تولتا ہے۔ وہ اِس اناج کے تول میں بالکل کمی بیشی نہیں کرتا۔ اِسے وہ بے ایمانی سمجھتا ہے جو لوگ اناج میں پتھر پیس کر ملانے کو مفید نہیں سمجھتے وہ سمنٹ میں پتھر ملاتے ہیں۔ یہ نسخہ پہلے نسخے سے زیادہ مفید ہوتا ہے۔ پتھر ملے ہوئے سیمنٹ سے جو بھی عمارتیں اور پل بنتے ہیں۔ چار پانچ سال تک وہ مضبوط رہتے ہیں۔ یہ معمولی بات نہیں ورنہ عام طور پر کسی بھی سامان کی گارنٹی ایک سال سے زیادہ کی مُدت کی نہیں ہوتی۔ یہ پل ٹوٹ جائیں تو انہیں پتھر ملے ہوئے سیمنٹ سے دوبارہ جوڑا بھی جاسکتا ہے۔ عمارتیں گر جائیں تو زیادہ نقصان نہیں ہوتا۔ صرف چند جانیں ضائع ہوتی ہیں۔

پتھر صرف اس پتھر کو نہیں کہتے جو صرف پتھر ہوتا ہے۔ پتھروں میں بھی آدمیوں کی طرح رتبے ہوتے ہیں۔ سنگِ مرمر بھی ہوتا پتھر ہی ہے لیکن بہت کم لوگ اپنی زندگی میں اِس سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ ہاں قبر یا قبر کا کتبہ سنگِ مرمر کا ہوسکتا ہے۔ (یہ بالکل انشورنش پالیسی کی طرح کی چیز ہوتی ہے۔) سنگِ مرمر نے اب پیدا ہونا موقوف کر دیا ہے۔ اچھے دیکھو اِس پر ہاتھ پھیرا کرتا تھا) سنگِ خام بھی اسی بلند مرتبے اور اونچی حیثیت کا پتھر ہے جو اتنا ہی چکنا ہوتا ہے۔ جتنا کہ سنگِ مرمر ہوا کرتا ہے۔ ان پتھروں نے اگر پیدا ہونا بند کر دیا تو آدمی کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ آدمی کے پھسلنے کے لئے دوسرے کئی بہانے ہیں۔ آدمی میں اتنی قابلیت تو ہوتی ہی ہے کہ وہ بات بات پر آسانی سے پھسل جایا کرے۔

پتھروں میں ایک اور بھی ذات ہوتی ہے جیسے آدمی کلیجے سے لگائے رکھتا ہے (کلیجہ صرف محاورہ ہے۔ ورنہ آدمی کے جسم میں بھی ہوتی کلیجی ہی ہے۔ جسے شاعری اور طب میں جگر کہتے ہیں۔ لیکن یہ بات آپ کسی طبیب ہی سے طے کیجئے۔ یہ پتھر بہت قیمتی ہوتے ہیں۔ اور ان میں بہت زیادہ قیمتی پتھر ہیرا ہوتا ہے۔ ہیرا آدمی کی صفت بھی بن جاتا ہے۔ اور جس آدمی کے بارے میں یہ کہہ دیا جائے

کہ وہ شخص تو ہیرا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ستار العیوب نے اس کے ساتھ بڑی رعایت کی ہے یا ہیرا دولت کی نمائش کے علاوہ خودکشی میں بھی بہت ساتھ دیتا ہے۔ دولت مند لوگ ہیرا چاٹ کر ہی خودکشی کیا کرتے ہیں۔ (ٹرین کی پٹری پر لیٹ کر یا گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرنا عوام الناس کا کام ہوا کرتا ہے۔ شرفا ہیرے ہی سے خودکشی کرتے ہیں۔) ہیرا چاٹ کر خودکشی کرنے کا تخمینہ کم سے کم پندرہ ہزار روپے ہوتا ہے لیکن دولت مند لوگ مرتے وقت خرچ کی پروا نہیں کرتے۔

بڑے شہروں میں جہاں سیمنٹ اور تارکول کی سڑکوں کا رواج ہے عین وقت پر پتھر آسانی سے نہیں ملتے جس کی وجہ سے عوام کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انھیں مجبوراً سوڈے کی بوتلوں سے کام لینا پڑتا ہے ـــــ ضرورت ایجاد کی ماں ہے ـــ پیدائش کا سلسلہ ضرورتوں میں بھی رائج ہے۔ سوڈے کی بوتلیں یوں بھی زیادہ مفید ہوتی ہیں۔ پتھر سے صرف ایک ہی آدمی کو فیض پہنچتا ہے۔ وہ لوگ جنہیں انتظام کا سلیقہ ہوتا ہے جب بھی کبھی جلوس نکالتے ہیں پتھروں کا پہلے سے بندوبست کر لیتے ہیں۔ دور اندیشی اور کس وقت کام آئے گی؟ جن لوگوں کو جلوس میں شریک ہونا نہیں ہوتا وہ اپنے گھروں میں پتھروں کا انتظام کر کے جلوس کا انتظار کرتے ہیں۔ پتھروں کے بغیر انسان زندگی گزار ہی نہیں سکتا۔ دورِ حجر پتھر کی لکیر ہے اور آدمی لکیر کا فقیر۔

آفسٹ کی چھپائی

انگریزی میں لفظ آف عام طور پر مثبت نہیں، منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جہاں کوئی کام غلط یا غلط کے قریب ہوا، فوراً آف لگا دیا۔ فٹ بال یا ہاکی کھیلتے وقت کوئی کھلاڑی آف سائڈ ہو جائے۔ تو ریفری اس زور سے سیٹی بجاتا ہے کہ کھلاڑی تو کھلاڑی خود تماشائیوں کے دل دہل جاتے ہیں اور آف سائڈ والا کھلاڑی شرم

سے دہرا دہرا ہو جاتا ہے۔ (فٹ بال اور ہاکی کے کھلاڑیوں کے جسم کی ساخت ہی کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ جب چاہیں دُہرے اور جب چاہیں تہرے ہو سکتے ہیں۔) اچھی بھلی طبیعت کسی مزاحیہ مضمون کے پڑھنے کی وجہ سے مکدر ہو جائے تو اُسے موڈ آف ہونا کہتے ہیں۔ سڑک سے ہٹ کر کوئی مکان ہو تو پتہ لکھا جائے گا۔ آف عابد روڈ اب پہلے آپ عابد روڈ ڈھونڈتے اور اُس کے بعد آف عابد روڈ کی تلاش کیجئے۔ (اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اصلی روڈ تو مل جاتی ہے لیکن اس کی آف نہیں ملتی کیونکہ آف کی کوئی خاص سمت نہیں ہوتی یہ ہر طرف آفت کی طرح پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔) کسی کو رخصت کرنا ہو تو اس کارگزاری کو سی آف کرنے کا عنوان دیا جائے گا۔ ریلوے پلیٹ فارم کی الٹی جانب اپنی غلط سمت میں اُترئے تو آف پلیٹ فارم اترنے کی خوشی میں آپ کی بہادری کی داد سرکاری طور پر دی جائے گی۔ اب جانے بھی دیجئے میں ڈکشنری تھوڑے ہی مرتب کر رہا ہوں کہ آف والے سارے الفاظ لکھ کر آپ کو آنا بور کروں کہ آپ لائٹ آف کر دیں۔ مجھے تو صرف یہ بتانا ہے کہ آف ہر جگہ منفی صورت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ آفسٹ کا جہاں تک تعلق ہے انگریزی زبان میں اس کے ساتھ بڑی رعائت برتی گئی ہے۔ (اقربا نوازی کی بہترین مثال یہی لفظ ہے) آفسیٹ چھپائی دنیا کی سب چھپائیوں میں قلوپطرہ چھپائی سمجھی جاتی ہے۔ قلوپطرہ بھی اسی چھپائی کی طرح حسین تھی اور اس پر سے نظر نہیں ہٹتی تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں اس پر نظر ٹھیرتی نہیں تھی۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔) آفسیٹ چھپائی میں خوبی یہ ہوتی ہے کہ کوئی خبر بھی جھوٹی نہیں معلوم ہوتی۔ اس لئے اب سب اخبار آفسیٹ پر چھپنے لگے ہیں۔

ادیبوں اور شاعروں نے بھی اب یہ وطیرہ بنا لیا ہے کہ اپنا مضمون یا کلام صرف اس رسالے میں بھیجتے ہیں جو آفسیٹ پر چھپتا ہو۔ خراب شاعری کے لئے ضروری ہے کہ وہ آفسیٹ پر چھپے۔ آفسیٹ میں بھی کتابت کی غلطیاں ہوتی ہیں لیکن یہ بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہیں اور ان سے کسی کا دل نہیں دُکھتا۔ حسن بہر حال حسن ہوتا ہے

آفسیٹ کی لکھائی، چھپائی اور پڑھائی سبھی معرکے کی چیزیں ہوتی ہیں۔ اور فلش کھیلنے والے آفسیٹ پر چھپا ہوا اخبار ہاتھ میں لے کر یہ سمجھتے ہیں کہ تین اکے ہاتھ آ گئے۔ دوسرے لوگ اسے دستر خوان کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

آفسیٹ پر تصویریں بھی بہت اعلیٰ درجے کی چھپتی ہیں اور ہر شخص تصویر میں آدمی اور ہر آدمی، فلمی ستارہ نظر آتا ہے۔ (اخبار کا مطالعہ کرنے والوں کو صبح صبح تارے نظر آ جاتے ہیں۔ آفسیٹ کی تصویریں، میک آپ بالکل خراب نہیں ہوتا۔ رخسار پر کاجل کا لگایا ہوا تل بھی اصلی تل دکھائی دیتا ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ کن تلوں میں تیل ہوتا ہے۔ پلکیں بھی اصلی پلکوں کی طرح نظر آتی ہیں۔ آفسیٹ کے کمالات کی کوئی حد نہیں۔

بعض پرنٹنگ پریس ایسے ہوتے ہیں۔ جہاں صرف آفسیٹ چھپائی ہوتی ہے (سنار لوہے کے زیور نہیں بنایا کرتے) ان چھاپے خانوں میں معمولی لوگوں کا آنا جانا منع ہوتا ہے۔ بہت سے ہوٹل بھی ایسے ہوتے ہیں جن پر تختی لگی ہوتی ہے کہ یہاں فلاں فلاں کا آنا منع ہے۔ پریس اور ہوٹل میں اب بھی تھوڑا ہی سا فرق رہ گیا ہے۔ آفسیٹ کی چھپائی مرغن چھپائی کی تعریف میں آتی ہے۔ آفسیٹ پر چھپی ہوئی چیز پڑھئے تو تندوری مرغ کی طرح دیر تک یاد رہتی ہے۔ کورس کی کتابیں بھی اب آفسیٹ پر چھپنی چاہئیں یا پھر بغیر کورس کی تعلیم رائج ہونی چاہئے (اگر تعلیم ضروری ہو تو)

بہت سے خوش نصیب ایسے ہیں جنہیں معمولی چھپائی اور آفسیٹ کی چھپائی کا فرق معلوم نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ڈر کے مارے ہر وہ کھانا کھا لیتے ہیں جو بیوی پکا کر سامنے رکھ دے۔ یہ لوگ کوئی اچھی چیز کھا ہی نہیں سکتے۔ بری عادتیں مشکل سے چھوٹتی ہیں۔

آفسیٹ پر چھپے ہوتے اخبار میں بس ایک خرابی یہ ہوتی ہے کہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔ اٹک اٹک کر پڑھنے کا لطف اس اخبار سے نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ اس

کام کے لیے وہی اخبار پڑھنا چاہیے جس پر روشنائی پھیل گئی ہو یا کہیں کہیں بالکل آف ہو گئی ہو۔

آفسیٹ پر چھپے ہوئے اخبار کی مختصر تعریف یہ ہے کہ وہ ہمارے اعمال نامے کی طرح سیاہ نہیں ہوتا۔

..... جینے کا مزا کیا

مطالعے کے لیے دو چیزیں بے حد ضروری ہیں۔ آنکھیں اور کتابیں۔ کتابیں تو خیر آپ دوسروں کی استعمال کر سکتے ہیں بلکہ کہا گیا ہے کہ کتابیں دوسروں کی ہی استعمال کرنی چاہئیں۔ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب کتابیں خریدنے والوں کو ناپسندیدہ قرار دے دیا جائے گا اور جو شخص بھی کتاب خریدتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا جائے گا اس کا راشن کارڈ ضبط کر لیا جائے گا۔ بہرحال مطالعے کے معاملے میں یہ طے ہے کہ کتابیں دوسروں کی ہوں گی لیکن آنکھیں اپنی ہی ہونی چاہئیں۔ یہی مطالعے کی خرابی ہے کیونکہ مطالعہ کرتے کرتے اگر آنکھیں خراب یا کمزور ہو جائیں تو فلمیں دیکھنے اور عورتوں کو گھورنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اس لیے سمجھ دار لوگ مطالعے میں پڑنے کی بجائے ڈاک کے پرانے ٹکٹ، دیا سلائی کی ڈبیوں کے لیبل یا تتلیوں کے پر جمع کرتے ہیں۔ ٹکٹ اور لیبل جمع کرنے کے شوق میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس میں بھاگنا دوڑنا نہیں پڑتا۔ یہ دونوں شوق آرام کرسی والی سیاست کی طرح ہیں اور تتلیوں کے پر جمع کرنے کے شوق میں فائدہ یہ ہے کہ پر جمع نہیں ہوتے صرف بھاگ دوڑ ہوتی ہے۔ اور اگر پر جمع ہوتے بھی ہیں تو ان کا رنگ شوہروں کے چہروں کے رنگ کی طرح فق ہو جاتا ہے۔ قدرت نے تتلیوں کے پروں کی صنعت میں پختہ رنگ استعمال نہیں کئے۔ پختہ رنگ ان معمولی سے پرندوں کے پروں میں بھی خرچ کئے جاتے تو پھر

افریقیوں اور ہندوستانیوں میں بیدرنگ اتنی فراخ دلی سے تقسیم نہ کئے جاسکتے تھے۔ ان لوگوں کا بھی تو خیال رکھنا ضروری تھا۔

ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے میں جارج پنجم نے بہت نام کمایا۔ (بادشاہوں کو کسی اور چیز کے کمانے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔) جارج پنجم دنیا میں خود اتنے مشہور نہ تھے۔ جتنا اُن کا ٹکٹ البم مشہور تھا۔ ان کی داڑھی بھی بہت مشہور تھی کیونکہ یہ بھی مشکل سے جمع ہوئی تھی۔) کہا جاتا ہے کہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کی طرح اس البم کی بھی کئی جلدیں تھیں۔ مشہور ہے کہ انہوں نے اس البم کے بنانے بلکہ سجانے میں بڑی محنت کی۔ جہاں بھی اور جس کسی کے خط پر انہیں کوئی نیا ٹکٹ نظر آتا وہ اسے معہ خط کے حاصل کر لیتے۔ اس مشغلے کو اختیار کرنے والے سبھی لوگ ٹکٹ جمع کرنے کے لئے یہی راستہ استعمال کرتے ہیں۔ (اس کے علاوہ دوسرا راستہ ہے بھی نہیں) لیکن لوگ اب ذرا ڈرپوک ہو گئے ہیں۔ اب وہ صرف دوسروں کے خطوں پر لگے ہوئے ٹکٹ نکال لیتے ہیں۔ خط نہیں اڑاتے۔ (بادشاہوں اور رعایا میں کچھ تو فرق ہونا ہی چاہئے۔) حالانکہ دوسروں کے خط جمع کرنا بھی ایک اچھا مشغلہ ہے۔ کوئی شخص یہ خطوط جمع کرتا اور ان کا انتخاب چھاپتا تو ادب میں مراسلاتی ادب کی ایک شاخ قائم ہو جاتی۔ اس مجموعے میں وہ خط بھی شامل ہوتا جو ایک بیوی نے اپنے شوہر کو لکھا تھا۔ اس خط میں سوائے شوہر کے پتے کے اور کچھ نہ تھا۔ بیوی نے سادہ پوسٹ کارڈ اس لئے بھیجا تھا کہ ان دنوں میاں بیوی میں بات چیت بند تھی۔ مراسلاتی نظام میں کبھی کبھی اس قسم کی گڑبڑ ہو جایا کرتی ہے۔

ہندوستان میں جب ہندوستان کی آبادی کے برابر ریاستیں تھیں اور ہر ریاست اپنے ٹکٹ شائع کرتی تھی۔ لوگ اس مشغلے میں خود کو مبتلا رکھ کر اتنے خوش رہتے تھے کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے بائیس گھنٹے ان کی باچھیں کھلی رہتی تھیں۔ (باقی کے دو گھنٹے وہ باچھوں کو آرام دینے کے لئے استعمال کرتے تھے)

دیاسلائی کی ڈبیوں کے لیبل جمع کرنے کا مشغلہ شاہانہ رتبہ حاصل نہیں کرسکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خواص میں دیا سلائی رکھنے کا رواج تھا ہی نہیں۔ بڑے لوگوں کی سگریٹیں سلگانا کسی اور کا کام ہوتا ہے۔ (بڑے لوگ معمولی آگ لگاتے بھی نہیں۔) اور اب تو بادشاہ بھی کم ہو گئے ہیں اور دیا سلائی کا رواج بھی باورچی خانے کی حد تک محدود ہو گیا ہے۔ بلکہ بعض گھروں سے تو باورچی خانے بھی اٹھ گئے ہیں کیونکہ سب شوہروں کو کھانا پکانا کہاں آتا ہے۔ اِس مشغلے میں ایک اور نقص یہ بھی ہے کہ لیبلوں کے لئے بہت بڑے سائز کا البم بنانا پڑتا ہے۔ اس البم میں بیڈ شیٹ (Bed Sheet) کے سائز کا کاغذ لگانا پڑتا ہے۔ اِس مشغلے کو اب پوشیدہ کاموں کی طرح ہی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اِس میں عزت کی بات تو ایک طرف رہی بے عزتی کا اندیشہ ہے۔

پرانے سکے جمع کرنے کی عادت بھی بری نہیں۔ اس میں بس اتنی خرابی ہے کہ آدمی قدامت پسند بن جاتا ہے اور جدید معاملات میں دخل نہیں دے سکتا۔ (جدید معاملات وہ ہوتے ہیں جن کا ذکر کرتے وقت آدمی قدرے شرماتا ہے۔) لیکن اِس مشغلہ کا روشن پہلو یہ ہے کہ آدمی پرانے سکے جمع کرنے کی لت کو اختیار کر کے مطالعے سے بچ سکتا ہے۔ البتہ پرانے سکے نہ تو ڈاک کے ٹکٹوں کی طرح چرائے جاسکتے ہیں نہ مانگے جاسکتے ہیں۔ اگر کسی کے ہاں آباؤ اجداد کی غفلت کی وجہ سے ایک آدھ پرانا سکہ رہ بھی گیا تو اِس سکے کو پانے اور پالنے والا شخص اپنی بیوی سے علیحدگی پر راضی ہو سکتا ہے لیکن اِس سکے سے نہیں۔ وہ شخص یہ بھی مانتا ہے کہ اِس ایک سکے کی تعداد میں وہ کوئی اضافہ نہیں کر سکتا لیکن اِس اکلوتے کی پاسبانی کو بھی وہ مشغلہ ہی مانتا ہے۔ وہ اس نظریے کا حامی ہوتا ہے کہ ایک بچے کا باپ بھی باپ ہی ہوتا ہے، باپ سے کم نہیں ہوتا۔

پرانے سکوں میں خاص بات یہ ہوتی ہے کہ پرانے جوتوں کی طرح یہ بھی نہیں چلتے۔ پرانے جوتے کم سے کم کسی جلسے میں ناظر تواضع کے لئے تو استعمال ہو سکتے

ہیں۔ لیکن پرانے سکّوں کے تو ہار بھی نہیں بنتے۔ (یہ اور بات ہے کہ اِن سکّوں کی قیمت کا عورتوں کی طرح کوئی ٹھکانہ نہیں۔) بازار میں چلنے والے سکوں کی قیمت آدمی کی عزت کی طرح مسلسل کم ہوسکتی ہے لیکن پرانے سکوں کی قیمت پر کوئی سیلنگ نہیں ہوتی۔ اِن سکّوں کے خریدار کے دماغ میں جتنا زیادہ خلل ہوگا اتنی ہی ان کی قیمت زیادہ ہوگی۔ پرانے سکوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ سکّہ وہ ہوتا ہے جو نہایت بھدّا، بدوضع، وزنی اور بدرنگ ہو اور جسے دیکھ کر کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ یہ سِکّہ ہے۔ (پہلے زمانے میں لوگ شاید صرف سکّے کی قیمت پر توجہ دیتے تھے اُس کے لب و رخسار اور نقش و نگار پر نہیں)۔ جو لوگ سکوں کا مشغلہ کیا کرتے ہیں وہ راتوں میں سویا نہیں کرتے صرف اپنے مجموعے کی حفاظت کیا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پُرانے سکّوں سے بینک اکاؤنٹ نہیں کھولا جاسکتا۔ اور اگر انہیں بینک کے لاکر میں رکھ دیا جائے، یہ مشغلہ کب ہوا۔ (یوں بھی پُرانے سکوں میں بلیک سکّے نہیں ہوا کرتے کہ انہیں لاکر میں رکھا جائے)۔ کون بار بار بینک جاکر لاکر دیکھا کرے گا۔ مشغلہ میں اپنی جمع کی ہوئی اشیاء کو دن میں کم سے کم دو مرتبہ ضرور دیکھنا چاہیئے۔ فرحت ہوتی ہے اور یہ بھی یاد رہتا ہے کہ عمر کا کتنا حصّہ ضائع ہوا۔ اپنے گھر آنے جانے والوں کو بھی اس مشغلے کا دیدار کروانا چاہیئے۔ جب یہ چیزیں اُنہیں دکھائی جارہی ہوں تو ملاقاتیوں پر کڑی نظر رکھنی چاہیئے۔ اس میں دو فائدے ہیں۔ مشغلہ محفوظ رہتا ہے اور داد بھی زیادہ ملتی ہے۔ مشغلہ پر جو داد ملے اس کے جواب میں آداب عرض کرنا یا سلام کرنا یا کورنش بجالانا ضروری نہیں۔ (یہ پابندی صرف شاعروں پر ہے۔ داد حاصل کرکے سلام کرنا اور سلام کرکے داد حاصل کرنا دو علیحدہ مضامین ہیں۔ اکثر شاعر صرف ایک مضمون جانتے ہیں۔)

اِن مشغلوں کے علاوہ بھی کئی اور مُنفرد قسم کے مشغلے دنیا میں رائج ہیں۔ انہیں میں سے ایک مشغلہ قلمی دوستی ہے۔ اس مشغلے میں مُنفرد بات یہ ہے کہ قلمی دوست ایک دوسرے سے محفوظ رہتے ہیں۔ لیکن قلمی دوستی میں جو لوگ حصّہ لیتے ہیں وہ خود

اسے مشغلہ نہیں سمجھتے اور ہر قلمی دوست، دوسرے قلمی دوست کو خط لکھ کر یہی پوچھتا ہے کہ پیارے دوست تمہارا مشغلہ کیا ہے اور پیارے دوست کو مجبوراً ایک اور مشغلہ کا نام بتانا پڑتا ہے۔ ورنہ عدم مشغلہ کی وجہ سے قلمی دوستی کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے ـــــ دو قلمی دوستوں کی اس طرح کی دوستی کو کئی سال گزر جاتے ہیں تو انہیں اندازہ ہوتا ہے کہ اس مدت میں انھوں نے کتنا جھوٹ لکھا اور اگر وہ اتنا ہی جھوٹ اپنے روزمرہ کے کاموں میں استعمال کرتے تو آج ان کی حالت اتنی بری نہ ہوتی۔ آدمی کو اپنی حماقت کی اطلاع بڑی دیر سے ملتی ہے۔

قلمی دوستی، جھوٹ بولنے کا سب سے محفوظ طریقہ ہے۔ اس میں آرام بھی بہت ہے (قلمی دوست تو ایک دوسرے کو اپنی پاسپورٹ سائز تصویر بھیجتے وقت اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ جو تصویر اُن کی اپنی نہ ہو) لیکن اس مشغلہ میں منافع کچھ بھی نہیں۔ ہینڈ رائٹنگ اور خراب ہو جاتی ہے۔

لوگ کہتے ہیں مشغلے کے بغیر بھی زندہ رہا جا سکتا ہے لیکن بے مشغلہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ یوں آدمی چاہے تو صرف بکری کا دودھ پی کر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن آدمی کا ایک مشغلہ ہونا ہی چاہئے جس پر وہ اپنی جان چھڑکے ورنہ ؎

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا۔

سموسہ مرے آگے

مرزا ظفر الحسن

"یہ مضمون غالب لائبریری میں شاہد احمد دہلوی مرحوم کی یاد میں منائے جانے والے جلسے میں پڑھا گیا تھا۔" (ادارہ)

ایک صاحب کا میرے پاس ٹیلی فون آیا۔ فرمانے لگے جناب اب غالب لائبریری میں بالکل ایک ہی قسم کے جلسے ہونے لگے ہیں ذرا کچھ تنوع پیدا کیجیے۔ میں نے عرض کیا نوازش ہوگی اگر دوسری قسم کے جلسوں کی کوئی تشریح فرمادیں۔ بولے بہت دنوں سے کوئی تعزیتی جلسہ نہیں ہوا۔ میں نے اعتراف کیا جی ہاں یہ کمی ضرور ہوئی ہے اور انشاء اللہ بہت جلد پوری کردی جائے گی۔ پوچھا کس طرح؟ عرض کیا میں خود اپنا ایک تعزیتی جلسہ کرنے والا ہوں۔ بہت خوش ہوکر اونچی آواز میں فرمایا خوب خوب بہت خوب مگر فوراً ہی کچھ ٹھٹکے، سنبھلے اور بولے ارے ارے مرزا صاحب آپ یہ کیا فرمارہے ہیں۔ خدا آپ کو سوا سو سال کی عمر عطا کرے۔ میں نے حیرت کے انداز میں کہا۔ سوا سو سال۔ ایسی دعا تو نہ کیجیے۔ گاندھی جی نے سوا سو برس کی آرزو کی تو گولی کا نشانہ بنا دیے گئے۔ بولے اجی حضرت آپ کو بھلا کون گولی مار سکتا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ ماننے کو تو میں خود گولی ماروں مگر لائسنس نہیں ہے بندوق ضبط ہو جائے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ مجھے پوسٹ مارٹم سے بہت ڈر لگتا ہے۔

اتنے میں ٹیلی فون خراب ہوگیا۔ میرا نمبر نہیں ملا۔ اور ڈاکٹر اسلم فرخی کو موقع مل گیا تو ایک فون انھوں نے کھڑکا دیا۔ کہنے لگے بھئی آپ غالب لائبریری میں کوک کا انتظام کس طرح کرتے ہیں۔ میں نے کہا جو شخص ناداری کی وجہ سے جون جولائی کی گرمیوں میں برف کا اہتمام نہ کر سکے وہ بھلا کوک پلائے گا۔ کہنے لگے۔ جلسے میں کوک نہ سہی

تو لوگ منہ بناتے ہیں۔ میں نے کہا پلاؤ گے تو لوگ باتیں بنائیں گے کہ کوک پلایا ایک نہیں کھلایا۔ بولے مرزا صاحب شاہد بھائی کی یاد میں جلسہ کیا جارہا ہے کچھ نہ کچھ تو پلانا ہی ہوگا۔ میں نے جواب دیا دیکھو بھئی۔ شاہد بھائی پینے پلانے والے آدمی تو تھے نہیں۔ کیوں اس جھنجھٹ میں پڑتے ہو۔ یا پھر یوں کرو۔ جس طرح شام ہمدرد کے دعوت ناموں میں لکھا ہوتا ہے، اپنے ہمراہ یہ کارڈ ضرور لائیں اسی طرح تم اپنے رقعوں میں لکھ دو اپنے ہمراہ کوک کی ایک بوتل ضرور لائیں۔ اور اگر خاطر کرنا بے حد ضروری سمجھو تو پھر وہی چیز پلاؤ جو شاہد بھائی کو پسند تھی۔ پوچھا کون سی چیز؟ میں نے کہا بیڑی۔

۱۹۵۸ء میں میرے افسانوں کا مجموعہ محبّت کی چھاؤں شائع ہوا تو تبصرے کے لیئے اس کے دو نسخے شاہد بھائی کو دلّی بھیجے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ میں نے کتاب کے دیباچے میں لکھا تھا یہ افسانے میں نے لکھے نہیں کسی نے مجھ سے لکھوائے ہیں۔ ان دنوں تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں۔ اگر یہی بات میری بیوی کی عدم موجودگی میں اور دوسروں کی بیویوں کی موجودگی میں آپ بالکل صاف صاف لفظوں میں مجھ سے سننا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں جس کو عشق بس وہی خلل ہمارے دماغ میں تھا۔ کتاب میں نے اپنی دل نواز کے نام معنون کی تھی اور اسی باعث دیباچے میں لکھا تھا افسانے میں نے لکھے نہیں کسی نے مجھ سے لکھوائے ہیں۔ شاہد بھائی بہت سمجھدار آدمی تھے۔ انھیں یہ نکتہ بھانپ لینا چاہیئے تھا مگر سمجھدار لوگوں کی ایک ناسمجھی یہ ضرور ہے کہ وہ عشق نہیں کرتے۔ نوجوانوں کے عشق کے نکتے بھی نہیں سمجھتے۔ ایک تو سمجھداری کا کڑوا کریلا اس پہ ان کے ثقہ مزاج کا نیم چڑھا تو شاہد بھائی نے کاہے کو کبھی عاشقی کی ہوگی۔ وہ سمجھے یہ لونڈا کالج سے نیا نیا نکلا ہے اور کسی استاد کے گمراہ کرنے پر افسانے لکھ مارے ہیں۔ چنانچہ ساقی کے تبصرے میں انھوں نے لکھ دیا جب کسی کے لکھوانے پر لکھیں گے تو ایسے ہی افسانے ہوں گے۔

کراچی میں پہلی بار شاہد بھائی سے ملاقات ہوئی اور میں نے انھیں یہ سب یاد دلایا تو بولے تم جس جملے کا حوالہ دے رہے ہو اس سے تو عشق عاشقی کا کوئی پتا چلا نہیں،

ایک وزیر ایک ادیب اور ایک ادیب زادہ۔ ادیب زادے تو آغا جان ہیں، حضرت یگانہ کے فرزند اور اپنے وقت کے بہت بڑے سگریٹ شکن۔ ان سے لاکھ کہا کہ اپنے والد پر کچھ لکھو یا اُن کا لکھا ہوا ہمیں شائع کرنے کے لئے دو مگر انھیں بیڑی سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ ادیبوں میں اپنے شاہد بھائی تھے جو ترکِ بیڑی پر کبھی راضی نہ ہوئے۔ شاعروں میں ایک تو ن م راشد تھے جو اکثر آغا جان سے مانگ کر بیڑی پیا کرتے تھے۔ دوسرے شاعر اندور کے تھے۔ بے دھڑک اندوری۔ ان کا ایک شعر ہے۔

وہ آتے جب کہ وصل کی شب ہو کے نا امید

بیڑی جلا رہے تھے چراغِ سحر سے ہم

وزیر کا حال بھی سن لیجئے۔ ایک دن خبر آئی وزیر اطلاعات و نشریات گانوں کے ریکارڈ سننے کے لئے ریڈیو اسٹیشن آ رہے ہیں۔ اس زمانے میں کراچی اسٹیشن کا شعبہ موسیقی مجھ سے متعلق تھا۔ تمام انتظامات مکمل ہو گئے۔ وزیر باتقدیر ایک شعلہ رخ کے ساتھ آئے اور اسٹوڈیو نمبر چودہ میں تشریف فرما ہوئے۔ بخاری صاحب مرحوم ان کی دائیں طرف بیٹھے تھے۔ بائیں طرف وزیر کا خاص الخاص چپراسی ہاتھ میں پانچ سو پچپن سگریٹ کا ایک ڈبہ لیئے بیٹھا تھا۔ اس دن وزیر موصوف موسیقی یا اُس شعلے کی وجہ سے جو کہ بار بار ان کی طرف لپک رہا تھا ترنگ میں تھے اور اسی باعث دو کرسیوں پر براجمان تھے۔

دو کرسیوں پر یاد آیا پطرس بخاری آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ ان سے ملنے کے لئے ایک خرانٹ قسم کا آئی سی ایس افسر آیا۔ مطالعہ میں غرق بخاری صاحب نے اپنے کاغذات پڑھتے ہوئے افسر سے کہا کرسی حاضر ہے تشریف رکھئے۔ آئی سی ایس افسر کو ایک غیر آئی سی ایس کی یہ بے التفاتی بدتمیزی معلوم ہوئی کہ ہم ملنے آئے ہیں اور یہ شخص ہم سے مخاطب ہونے کی بجائے فائل پڑھ رہا ہے۔ اس نے کہا جناب والا میں مسٹر فلاں آئی سی ایس ہوں۔ بخاری صاحب نے کہا تب تو دو کرسیاں پیش کرتا ہوں تشریف رکھئے۔

تم نے ذرا کھل کر لکھا ہوتا۔ میں نے عرض کیا کھل کر کس طرح لکھتا۔ اس لڑکی کے والد نے دو دو پٹھان چوکیدار رکھے تھے۔ ایک چوکیدار گھر کی اور دوسرا چوکیدار پوری گلی کی نگرانی کرتا۔ پھر میں نے کہا خیر کوئی بات نہیں گذشتہ را صلوٰۃ، آئندہ را اس لحاظ سے احتیاط کہ عاشقی اور فسانہ نگاری دونوں سے تائب ہو چکا ہوں۔ بس اسی بات پر پلائیے ایک بیڑی بیڑی کو آپ کوئی حقیر چیز نہ سمجھیں۔ آئے دن اخباروں میں لکھا ہوتا ہے کسٹم والوں نے چھاپہ مار کر بیڑی کا اتنے من پتا اپنے قبضے میں لے لیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ پتا کہاں چلا جاتا ہے۔ میں نے آج تک کسی کسٹم والے کو بیڑی پیتے نہیں دیکھا۔ ہاں پینے پلانے کی بڑھیا سے بڑھیا چیز کسٹم افسر کیا بڑے بڑے افسروں کو پیتے دیکھی ہے۔

کچھ کسٹم ہاؤس کی خلوت میں کچھ ڈسی سی کے گھر جاتی ہے
کیوں غالب و فیض کے حصے اب جام میں کم آتی ہے

اس بات کا پبلک کو بہت غم ہے۔ میں نے پبلک سے کہا۔

غم نہ کر، غم نہ کر
دن نکل آئے گا۔
ابر کھل جائے گا۔
رات ڈھل جائے گی۔
رُت بدل جائے گی۔
غم نہ کر غم نہ کر۔

تو پبلک کا غم غصے میں بدل گیا کہ تو ہمیں مال و منال کا غم ہے اور اس شخص کو شاعری سوجھی ہے۔ میں نے دست بستہ عرض کیا اے لوگو! شاعری غم غلط کرتی ہے اور غصہ ٹھنڈا کرتی ہے۔ اس پر ایک صاحب بولے ٹھنڈک کہاں۔ ۵۸ کے مارشل لا میں جو ٹھوک دل بجر پر لگائے گئے تھے وہ بھی غائب ہو گئے۔ مختصر یہ کہ پبلک میں بد مزگی پیدا ہو گئی ہے اس کے منہ کا مزہ بدلنے کے لئے ایک آدھ بار کسٹم والوں پر بھی چھاپہ مار کر دیکھیں کہ کس جگہ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے۔

زندگی میں یا [illegible]

ہاں تو وزیر موصوف مع دو کرسیوں پر اس طرح بیٹھے تھے کہ ان کے جسم کا نصف اول ایک کرسی پر اور نصف آخر دوسری کرسی پر ریل کی دو پٹریوں کے مانند۔ کچھ دیر بعد اس چپراسی نے سگریٹ کا ڈبہ کھولا اس میں سے ایک بیڑی نکالی اور جلانے لگا تو میں نے اسے ٹوکا کہ اسٹوڈیو میں بیڑی سگریٹ پینا منع ہے۔ اس نے مجھے حقارت سے دیکھتے ہوئے بیڑی جلائی خود اس کے دو کش لیے، دھواں میرے منہ پر چھوڑا اور بیڑی وزیر محترم کے منہ میں لگا دی۔ میں نے پریشانی میں بخاری صاحب کی طرف دیکھا۔ بخاری صاحب نے پشیمانی میں اپنی نظریں نیچی کر لیں کہ

تری ایک بیڑی سے اے ابن آدم
وزارت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

مجھے اردو رسم الخط بہت پسند ہے۔ مگر اس خط سے پریشانیاں بھی بہت ہوتی ہیں۔ ابھی جو میں نے آپ کو بے دھڑک اندوری کا شعر سنایا ہے وہ جب کتابت کے بعد پروف ریڈر صاحب کے پاس پہنچا تو موصوف مجھ سے کہنے لگے یہ شعر بالکل غلط ہے۔ پوچھا کیا غلطی ہے۔ بولے۔ دوسرا مصرع بحر سے خارج ہے اور مہمل بھی ہے۔ میں نے کہا ذرا وضاحت کر دیجئے تو حضرت نے شعر اس طرح پڑھا۔

وہ آتے جب کہ وصل کی شب ہو گئے ناامید
Battery جلائے تھے چراغ سحر سے ہم

کہنے لگے چراغ سحر سے بیٹری جلانا کیا معنی؟

میں نے اپنی گفتگو کوک سے شروع کی تھی جو اگر جلد ختم نہ کردوں تو ڈر ہے کہ مسلسل اضافہ حاضرین سے منتظمین اور کافی پہلے سے آتے ہوتے سامعین کی بے چینی نہ بڑھنے لگے۔ ادبی جلسہ جب شروع ہوتا ہے تو جلسے کے منتظمین کو حاضرین کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے ہیں۔ جلسے کے ختم پر جب ملاقات کا دور آتا ہے تو بعض دیر سے آنے والے حاضرین اس لئے جلدی واپس نہیں جاتے کہ

اور اک کوک دے بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

ڈاکٹر اسلم فرخی، مجھے خدشہ ہو چلا ہے کہ، اب کوک کی منزل سے گزر کر ہمارے حکیم محمد سعید صاحب کے نقش قدم پر چل کر ہمدرد کی طرح کوئی شام نہ منانے لگیں۔ مگر وہ یہ بات یاد رکھیں کہ ایسی شام ان کے لیئے شام بے درد نہ بن جائے۔ میں نے بار ہا دیکھا ہے کہ اچھی خاصی خاطر مدارات کے بعد حکیم سعید صاحب اور ان کے رفقا پورے خلوص اور خندہ پیشانی سے ایک ایک کو خدا حافظ کہتے ہیں مگر مہمانوں کو کھانے پینے کی بہت سی بچی ہوئی چیزیں جو نظر آتی رہتی ہیں۔

لفظ کوک کے املا پر غور فرماتیے ۔ ہے یہ وہ کوک کہ الٹا بھی ہے اسکا سیدھا

اس لیے بہتر ہوگا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی اپنی الٹی سیدھی تجویزوں سے باز آجائیں۔ اگر باز نہیں آسکتے تو جہاں ستیاناس وہاں سوا ستیاناس ایک مرتبہ شام بے درد منا کر مزہ چکھ لیں اسلم فرخی بھی اور حاظرین بھی جس میں

کٹ لیٹ مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کوک
لبسکٹ مرے پیچھے ہے سموسہ مرے آگے

یاد منانے کا طریقہ

شاہ احمد دہلوی مرحوم نے اردو ادب کو بہت مالا مال کیا ہے۔ ان کی یاد تازہ کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ دلی سے نکلنے والے ساقی کی جلدیں اگر آپ کے پاس ہوں تو غالب لائبریری کو عطا فرمائیں جہاں ادب کے رسیا ان سے استفادہ کرتے ہوئے یاد رکھیں گے کہ شاہد احمد صاحب نے زبان و ادب پر بہت احسانات کئے ہیں۔

بالکل نئی کتاب

کون سی؟ کس کی؟ کب تک

۱

سرِشام

رضیہ فصیح احمد کی ناول نگاری کی ابتدا "آبلہ پا" سے ہوئی تھی، جسے ۶۴-۶۵ کا آدم جی ادبی انعام ملا۔ اس کے بعد ان کے ناول "انتظارِ موسم گل"، "ایک جہاں اور بھی ہے"، "متاعِ درد" مزاحیہ ناول "آزارِ عشق" ایک ناولٹ "تپتی چھاؤں" طبع ہوئے۔ افسانوں کا پہلا مجموعہ "دو پاٹن کے بیچ" ۶۶ء میں شائع ہوا اب دوسرا مجموعہ سرِشام ۱۹۷۷ء کی پہلی ششماہی میں شائع ہو رہا ہے۔ اس میں زیادہ تر ان کے غیر مطبوعہ افسانے شامل ہیں۔ ایک صفحے کا مختصر افسانہ "صوفی" بھی اور طویل افسانہ "پہچان" بھی۔ بڑھاپے کے عشق کے بارے میں "ایک شاخِ نہالِ غم" بھی اور یورپ کی معاشرت سے متاثر ہو کر یونان کے پس منظر میں ایک نیا افسانہ "نام میں کیا دھرا ہے" بھی، افسانہ "بازیافت" کوہ نور سے متعلق ہے۔ "دیو اور پریاں" اور "سبق" دو اور غیر مطبوعہ افسانے خالص اپنے معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں چند ایسی کہانیاں بھی شامل ہیں جو مصنفہ نے ابتداء میں انگریزی میں لکھیں اور پھر خود ہی انہیں اردو میں لکھا مثلاً "بدبلا"، "ردی کے نوٹ" اور "لندن جو ایک شہر تھا" آخرالذکر ایک فینٹیسی ہے کہ جو اس کے خوابوں کا شہر ہے۔ مصنفہ کو کس حالت میں ملتا ہے اور اسے دیکھ کر اس پر کیا گزرتی ہے سرِشام کی اشاعت سے اندازہ ہوگا کہ مصنفہ دنیا کی سیر کے ساتھ ساتھ ادبی دنیا کی سیاحت میں مگن اور نئے نئے تجربے کرنے میں مصروف ہیں۔

۲

اردو ڈرامہ اور اسٹیج

مخدوم محی الدین نے ۱۹۳۶ء میں جامعہ عثمانیہ سے اردو ادب میں ایم اے کرتے ہوئے اردو ڈرامے اور اسٹیج پر ایک تحقیقی اور تنقیدی مقالہ لکھا جو ۱۹۷۷ء کی پہلی ششماہی میں شائع ہوجائے گا۔ یہ مقالہ پاکستان میں صرف غالب لائبریری میں اور ہندوستان میں صرف جامعہ عثمانیہ میں محفوظ ہے۔ کسی اور جگہ دستیاب نہیں ہوتا۔ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے اور ضخامت دو سو صفحات کے قریب۔ پہلے باب میں عربی، ایرانی اور ہندی ڈرامے کا مختصر ذکر ہے۔ دوسرے باب میں ہندی ڈرامے کا اردو ڈرامے سے تعلق بتایا گیا ہے۔ بعد کے ۲ دو باب امانت کی اندر سبھا سے متعلق ہیں جن میں اس کے ماخذوں پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ پانچویں باب میں جدید تھیٹر کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مخدوم محی الدین نے لکھا ہے کہ جنگ پلاسی سے پہلے کلکتہ میں ایک انگریزی تھیٹر موجود تھا۔ اسی باب میں تھیٹر کی دوسری تفصیلات لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ بمبئی اور کلکتہ میں مقیم انگریز شیریڈن کے طربیہ اور شیکسپیئر کے حزنیہ کھیل اسٹیج پر دیکھ کر اپنا جی بہلایا کرتے تھے۔ چھٹا باب اردو کے ان ڈراموں اور ڈرامہ نگاروں کی بابت ہے جو ۱۸۷۷ء اور ۱۹۱۴ء کی پیداوار ہیں۔ ساتویں باب میں اسی عہد کے ڈراموں کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ شیکسپیئر کی تمثیلی تخلیقات کے بے شمار تراجم ہو چکے ہیں۔ آٹھویں باب میں ان تراجم پر گفتگو کی گئی ہے۔ نواں باب دیگر انگریزی ڈراموں کے تراجم کی بابت ہے۔ دسواں اور آخری باب عہد جدید کی بابت ہے جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۶ء تک کی مدت کا احاطہ کرتا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے ڈرامے زود پشیمان (۱۹۱۷ء) کو مخدوم نے متذکرہ عہد کا اوّلین اور ایک اہم ڈرامہ قرار دیا ہے۔ امتیاز علی تاج کے ڈرامے کے متعلق لکھا ہے "انارکلی ایک مرصع غزل اور عہد مغلیہ کی شاہی زندگی کی زندہ تصویر ہے"۔ باب کے ختم پر حیدرآباد دکن کی اس وقت کی ڈرامائی سرگرمیوں کا ذکر ہے جن سے مصنف بہ حیثیت ڈرامہ نگار اور اداکار وابستہ رہے ہیں۔

مخدوم محی الدین کا تعارف فیض احمد فیض اور دیباچہ مرزا ظفر الحسن لکھیں گے۔

مغربی بنگال کے اخبارات اور رسائل کے چند خاص نمبر

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

فورٹ ولیم کالج کے دور میں کلکتہ کو اردو ادب میں جگہ ملی ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے کلکتہ سے کئی اخبارات اور سیکڑوں رسالے و کتابیں نکلی ہیں۔ تقسیم کے بعد اردو دان طبقے میں سے لاکھوں پاکستان چلے گئے لیکن پھر بھی کلکتہ مغربی بنگال میں اردو کا اہم مرکز رہا ہے اور آج بھی ہے۔ اب بھی یہاں سے اردو کے سات روزنامے اور درجن بھر دیگر جریدے شائع ہوتے ہیں اور پھر ہر سال ۵، ۶ علمی کتابیں بھی منظرِ عام پر آتی ہیں۔ لہٰذا اردو ادب کے کسی بھی دور میں کلکتے کی اہمیت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس مضمون میں تقسیم ہند کے بعد مغربی بنگال سے شائع شدہ اخبارات اور رسائل اور بعض ادبی انجمنوں کے سوونیروں کا ذکر کرتا ہوں جو میرے گھریلو کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ اس سے تقسیم کے بعد مغربی بنگال میں اردو کی رفتار کا ایک اندازہ لگایا جا سکے گا۔

اخبارات کے خاص نمبر

ہر سال عید الفطر، عید قربان، دیوالی، درگا پوجا، یوم آزادی اور یوم جمہوریہ کے موقع پر اخبارات اور رسائل کے خصوصی شمارے نکلا کرتے ہیں لہٰذا میں نے یہاں ایسے خاص شماروں کا ذکر نہیں کیا ہے۔

(۱) "اخوت" کلکتہ کا سالگرہ نمبر ۱۹۵۹ء

روزنامہ "اخوت" یکم اگست ۱۹۵۷ء کو آسمانِ صحافت پر طلوع ہوا تھا اور ۲۲۔ دسمبر ۱۹۶۲ء کو غروب ہوگیا۔ اس کے مدیر ناظر الحسینی تھے۔ اس کا مذکورہ سالگرہ نمبر ۸۴ صفحات پر ۱۵ اگست ۱۹۵۹ء کو نکلا جس کے قلمکاروں میں دیگر لکھنے والوں کے علاوہ پروفیسر احتشام حسین، شجاعت علی سندیلوی، خواجہ احمد عباس، پرویز شاہدی، نشور واحدی، اثر لکھنوی، رام لال، سید محمود طرزی، نریش کمار شاد اور کوثر چاندپوری جیسے نامور اہلِ قلم کی نگارشات ہیں۔

اس کے مدیر ناظر الحسینی، شاگردِ رضا علی وحشت کلکتوی بنگال کے ایک نامور ترقی پسند شاعر تھے جو "اخوت" کے بعد روزنامہ "عصرِ جدید" کے مدیر ہوئے تھے۔ افسوس کہ وقت سے پہلے ہی ۱۹ اگست ۱۹۷۳ء کو اُن کا وقت آگیا اور اللہ کو پیارے ہوگئے۔

(۲) آبشار کلکتہ کا اُردو کانفرنس نمبر

یہ نمبر ۱۰ مارچ ۱۹۵۹ء کا ہے۔ ۲۸ فروری تا ۲ مارچ ۱۹۵۹ء کلکتہ کے پارک سرکس میدان میں ہند و پاک سہ روزہ اُردو کانفرنس ہوئی تھی۔ اور یہ اُس کی یادگار ہے۔ اس میں کانفرنس کی رپورٹ کے علاوہ افتتاحی تقریر (ڈاکٹر بدھان چندر رائے مرحوم وزیرِ اعلیٰ مغربی بنگال) خطبۂ استقبالیہ (علامہ سید احمد اکبر آبادی) خطبۂ صدارت (پنڈت سندر لال) اور دیگر حضرات (مثلاً پروفیسر آل احمد سرور) کی تقاریر، مختلف مضامین اور ہند و پاک مشاعرے میں پڑھے گئے شعراء کا کلام شامل ہے۔

(۳) روزانہ ہند کلکتہ کا سلور جوبلی نمبر ۱۹۵۴ء

روزنامہ ہند کا سنہ اجراء ۱۹۲۹ء ہے۔ ۱۹۵۴ء میں جب اس کے مدیر

غلام سرور نگار نے ۲۵ سال پورے ہونے پر ۲۴۰ صفحات پر مذکورہ نمبر شائع کیا تھا۔
اس خاص شمارے میں کئی نامی گرامی اہل قلم کی تخلیقات ہیں۔

(۴) آزاد ہند کلکتہ ملیح آبادی نمبر

دنیائے صحافت میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا نام کون نہیں جانتا۔ اُن کے لائق بیٹے احمد سعید ملیح آبادی جو آج کل "آزاد ہند" کے مدیر ہیں نے جون ۱۹۶۰ء میں یہ خاص نمبر اپنے والد مرحوم کی یادگار کے طور پر نکالا۔ اس کے صفحات ۲۲۰ ہیں اور سرورق پر ملیح آبادی مرحوم کی ایک حسین تصویر ہے۔ اس شمارے میں ملیح آبادی مرحوم کی زندگی، صحافتی اور ادبی خدمات پر مختلف حضرات کے مضامین کے علاوہ مرحوم ملیح آبادی کی تخلیقات بھی شامل ہیں۔

مستقبل میں بنگال کی تاریخ صحافت پر قلم اٹھانے والے حضرات کے لئے روزانہ ہند کا سلور جوبلی نمبر اور آزاد ھند کا ملیح آبادی نمبر کا مطالعہ ضروری ہے۔

(۵) "عصر جدید" کا عید نمبر ۱۹۵۵ء

میں کسی عید نمبر کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ ہر اخبار کا ہر سال عید نمبر نکلتا ہے لیکن ۱۹۵۵ء کا یہ نمبر عام عید نمبروں سے جداگانہ ہے۔ یہ رسالہ سائز کے ۱۰۴ صفحات پر ہے۔ اس میں چند مضامین ایسے ہیں جن کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً "آغا حشر کے ڈرامے" جسے سید محمود طرزی نے لکھا ہے۔ طرزی سے آغا حشر کے تعلقات نہایت گہرے تھے۔ اور اس لحاظ سے طرزی کی باتوں پر کان دینا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اس میں جرم محمد آبادی، ناظر الحسینی، محترمہ صغریٰ سبزواری، اشک امرتسری، کرشن چندر، خواجہ عبدالرؤف عشرت اور عبدالمجید سالک جیسے کئی اہل قلم کی گراں قدر تخلیقات ہیں۔

ہفت روزہ جریدوں کے خاص نمبر

(۱) فلم ویکلی کا اشک امرتسری نمبر

اُن دنوں راقم الحروف فلم ویکلی کلکتہ کا مدیر تھا۔ ۱۹۵۶ء کے آخر میں کلکتہ کے نامور عوامی شاعر اشک امرتسری مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر ۱۱۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو یہ خاص نمبر شائع ہوا جس میں اشک سے قریبی تعلق رکھنے والے سب اہلِ قلم کے مضامین شامل ہیں۔ اس سلسلے میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ انجمن ترقی اردو (شاخ مغربی بنگال) نے ۱۹۶۵ء میں "سیلِ اشک" کے نام سے اشک کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ شائع کیا ہے۔

(۲) "کندن" کلکتہ کا سوز نمبر ۱۹۶۲ء

ہفتہ وار "کندن" کا سنہ اجراء ۱۹۵۵ء ہے اور یہ فروری ۱۹۶۳ء میں مدیر یونس نظری کے علیل ہونے پر بند ہو گیا۔ (نظری ۱۲۔ جنوری ۱۹۶۴ء کو آخر کار چل بسے) یہ خاص نمبر کلکتے کے ایک نوجوان شاعر سوز سکندر پوری شاگرد جرم محمد آبادی کے متعلق ہے۔ اس میں اردو کے صفحات ۶۰، اور ہندی کے صفحات ۱۸ ہیں۔

(۳) "اسپورٹس اور فلم کا فٹ بال نمبر" ۱۹۶۳ء

یہ رسالہ کبھی ہفتہ وار اور کبھی پندرہ روزہ کے طور پر نکلا۔ ہے اور جب فٹ بال نمبر نکلا اُن دنوں یہ پندرہ روزہ تھا۔ انگلستان میں فٹ بال صدی کے موقع پر کلکتے سے یہ نمبر نکلا جس میں فٹ بال کی تاریخ اور نامور کھلاڑیوں پر مضامین ہیں۔

ماہناموں کے خاص نمبر

(۱) "سوز" کا غزل سوز سکندر پوری کلکتے سے ایک ماہنامہ "سوز" نکالتے

رہے ہیں جو سنہ ۱۹۶۲ء تا سنہ ۱۹۶۹ء نکلتا رہا ہے۔ جنوری سنہ ۶۲ء میں اس کا غزل نمبر نکلا جس کے صفحات ۱۲۸ ہیں۔ اس میں بنگال کے تقریباً تمام اہم شعراء کے کلام کے علاوہ بنگال سے باہر کے چند شعراء کا کلام بھی ہے اور ہر شاعر یا شاعرہ کے کلام کے نیچے مختصر طور پر تعارف بھی شامل ہے۔

(۲) "شہود کا" اقبال نمبر

ماہنامہ "شہود" کا پہلا شمارہ دسمبر سنہ ۱۹۷۲ء میں نکلا اور صرف تین چار شماروں کے بعد یہ بند ہو گیا۔ اس نے صرف ایک نمبر "اقبال نمبر" ہی پیش کیا ہے جو مارچ و اپریل سنہ ۱۹۷۳ء کا مشترکہ شمارہ ہے۔ اس رسالے کے مدیر نوجوان شاعر شہود عالم آفاقی رہے ہیں، جو ملکچھیا، کلکتہ کے باشندے ہیں۔

(۳) "بزم ہند" آسنسول کا ہند و پاک نمبر سنہ ۱۹۶۳ء

"بزم ہند" کے نام سے نومبر سنہ ۱۹۶۰ء میں ایک ماہنامہ "آسنسول" مغربی بنگال سے جاری ہوا تھا۔ جو تین سال تک نکلنے کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے ایڈیٹر بلیغ آسنسولوی تھے۔ اس نے جنوری سنہ ۶۳ء میں یہ خاص نمبر نکالا تھا جس کے صفحات ۲۰۴ ہیں۔ اس میں ہند و پاک کے کئی لکھنے والوں کی تخلیقات شامل ہیں۔

چند خاص سُوونیر

عموماً کسی مشاعرے کے موقع پر ادارے منتظمین سوونیر نکال لیتی ہیں تاکہ اشتہارات حاصل کر کے مشاعرے کا کچھ خرچ پورا کیا جائے۔ اس لئے سیکڑوں سوونیر نکلتے ہیں۔ میرے کتب خانے میں بنگال کے کم از کم دو تین سو سوونیر ہوں گے لیکن چند ایسے بھی ہیں جن کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ذیل میں صرف چند اہم سوونیر جو سنہ ۱۹۶۰ء کے بعد نکلے ہیں کا ذکر کرتا ہوں۔

(۱) بزم غواص ہوڑہ

بزم غواص ہوڑہ کے زیرِ اہتمام ۵، ۶ اور ۷ رجون ۱۹۷۰ء کو ہوڑہ میں سہ روزہ اُردو ادبی کانفرنس ہوئی تھی۔ اور یہ اسی کی یادگار ہے۔ اس کے صفحات ۱۴۲ (علاوہ اشتہارات کے) ہیں۔ اِس سُوونیر میں ہوڑہ میں اُردو کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چند خاص مضامین ہیں۔ (۱) بزم غواص ہوڑہ، از حاتمی گورکھپوری (۲) ہوڑہ کا شعری ماحول' از ابرؔ احسنی (۳) ہوڑہ میں اُردو زبان و ادب' چند گوشے۔ از حازق انصاری (۴) ہوڑہ کی اُردو ادبی مجلسیں اور مشاعرے' از عزم حمیدی (۵) غواص قریشی کی شاعری از اعزاز افضل (۶) ہوڑہ کے ادبی چراغ' از ساکت لکھنوی (۷) ہوڑہ میں اُردو کے مسائل' از سید الابرار' اور (۸) ہوڑہ کے موجودہ اُردو شعراء ادباء — از زکی غواصی۔ اس کے علاوہ ہوڑہ کے کئی شعراء کا کلام اور افسانے اس سُوونیر میں شامل ہیں۔

(۲) جشن زریں۔ بزم احباب کلکتہ ۱۹۷۰ء

کلکتے کی ادبی محفلوں میں بزم احباب کو ایک تاریخی مقام حاصل ہے۔ اِس بزم سے بنگال کے کئی نامور اہلِ قلم کا تعلق رہا ہے اور اب بھی ہے۔ مختلف دور میں اِس بزم کے صدر اور سکریٹریوں میں حافظ عبدالحفیظ حافظ مرحوم، حکیم سید محمد صادق مرحوم، حکیم ناطق لکھنوی مرحوم، مولانا رضا علی وحشت کلکتوی مرحوم، مرزا ابو جعفر کشفی، پروفیسر عبدالرحیم مرحوم، پروفیسر عباس علی خاں بیخود مرحوم، محمود طرزی مرحوم، محمد سلیمان واصف بنارسی مرحوم، پروفیسر قمر صدیقی مرحوم، پروفیسر احسن احمد اشک سید امیر رضا کاظمی، اور حضرت ل۔ احمد اکبر آبادی جیسے لوگ رہے ہیں۔ اس بزم کا قیام ۱۹۲۰ء میں عمل میں آیا تھا اور دسمبر ۱۹۷۰ء میں اس نے جشن زریں منایا۔ یہ سُوونیر اسی جشن زریں کی یادگار ہے جس میں اس بزم کی کہانی کہی گئی ہے۔

نئی کتابیں ——— تبصرے

رسائل کے تازہ شمارے

(دو نسخے روانہ کیے جائیں)

جریدہ غالب کے شمارے میں نئی کتابوں اور رسائل کے تازہ شماروں پر ممتاز اہل قلم کے لکھے ہوئے تبصرے شامل ہوتے ہیں۔ یہ امتیاز صرف غالب کو حاصل ہے کہ تبصرے کے بعد تمام کتابیں اور رسائل غالب لائبریری میں محفوظ کر دیئے جاتے ہیں اور رسائل کے شائع کردہ مضامین کے زیڈ کس کارڈ بنوا دیئے جاتے ہیں۔ ان خزانوں سے محققین، معلمین، متعلمین اور لائبریری کے دیگر ناظرین خاطر خواہ استفادہ کرتے ہیں۔

بدلتا ہے رنگ آسماں

افسانہ نگار آغا سہیل

تبصرہ نگار ڈاکٹر معین الدین عقیل

۳۱۹ صفحات، ساڑھے دس روپے
ناشر اقبال بک کارنر گلبرگ نمبر ۲ لاہور

موجودہ افسانہ کے بارے میں ایک رجائی احساس رکھنے کے باوجود راقم کا خیال ہے کہ آج کے افسانہ نگار، افسانوں کی بہتات کے باوجود، خیالات اور مشاہدات کے چند مخصوص دائروں میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ انہیں ان دائروں سے نکل کر افسانہ نگاری کے نئے افق دریافت کرنے کی ضرورت کا احساس نہیں ہے یا وہ محنت، ریاضت، جذباتی گہرائی، تجربات کی رنگا رنگ اور حیات آخرین کی مشقت اٹھانا نہیں چاہتے اور یوں ابہام اور سہل پسندی کے چکر میں فطرت نگاری اور حقیقت پسندی کے رنگ افسانوں سے آہستہ آہستہ مدہم ہوتے جا رہے ہیں۔ موجودہ افسانے کے بارے میں ایک عام تاثر تو پیدا ہوتا ہے لیکن غنیمت ہے کہ آج بھی افسانہ نگاروں کی طویل قطار میں چند افسانہ نگار صحت مند اور زندگی آمیز انداز نظر کو جزو فن بنائے ہوئے ہیں۔ اپنی ان صلاحیتوں کے سبب آغا سہیل ہے۔ افسانہ نگاروں کی صف میں استنے نمایاں نظر آتے ہیں کہ انہیں بلاشبہ کہنا مشق اور حیات آخرین افسانہ نگاروں کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان کے معاصر افسانہ نگاروں میں چند ہی

افسانہ نگار ان صفات کے حامل ہیں۔

زیرِ نظر کتاب آغا سہیل کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں ان کے چوبیس افسانے شامل ہیں۔ ان میں موضوعات کا خاصہ تنوع ہے۔ اور بیشتر افسانوں کی پوری فضا زندگی کے نمائندہ کرداروں کو ہمارے سامنے لاتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے ان کرداروں کو اپنے گرد و پیش کی فضا سے ابھارا ہے۔ ان میں زندگی کی توانائی بھی ہے اور معاشرے کی قباحتیں اور تاریکیاں بھی۔ "پتنگا"، "رشتہ"، "مالکن"، "پان"، "کنجی"، "ٹھکانہ کہیں نہیں" ایسے افسانے ہیں جو بڑی حد تک کسی ایک بنیادی کردار کے گرد گھومتے ہیں۔ ان کے کرداروں میں حرکت و عمل اور حقائقِ حیات کی دلکشی و رنگینی اپنا بھرپور اظہار کرتی ہے۔ "بازی گر"، "موئے آتش دیدہ"، "بدلتا ہے رنگ آسماں"، "محل سرا" ایسے افسانے ہیں جو حال اور زندگی کی آویزش اور پلاٹ کی خوبصورت بندش کی وجہ سے بڑی دلآویز صورت اختیار کر گئے ہیں۔ ان میں زندگی کی وسعتوں اور رنگارنگی کا احساس ہوتا ہے۔ "شگاف در"، "پان"، "قوم"، "کنجی"، ہمارے عہد کے سیاسی، تہذیبی اور قومی مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ "پتنگا"، "موئے آتش دیدہ"، "بدلتا ہے رنگ آسماں"، "محل سرا" زوال پذیر تہذیب اور بالائی طبقوں کے کھوکھلے پن کی عمدہ تصویر کشی کرتے ہیں۔

اس مجموعے کے اعتبار سے آغا سہیل ایک حقیقت نگار ہیں اور اردو افسانے کی جاندار روایت کے عین مطابق ایک متوازن اور دلپذیر تجزیہ ان کے فن کی نمایاں خوبی ہے۔ ان کے افسانوں میں کردار اور واقعات عام زندگی سے اخذ کیے گئے ہیں۔ جو بالعموم غیر معمولی نفسیاتی الجھنیں اور جذباتی کشاکش لے کر نمودار نہیں ہوتے بلکہ ایسی کیفیات اور احساسات کا مظاہرہ کرتے ہیں جن سے روزمرہ زندگی میں ہم بھی دوچار ہوتے رہتے ہیں۔

افسانہ نگاری میں آغا سہیل کے ہاں بنیادی موضوعات کی کمی نہیں۔ اگر وہ اسی انہماک سے لکھتے رہے تو ایک دن یقیناً زیادہ بڑے افسانہ نگاروں میں ان کا شمار ہو سکتا ہے

شاعر: اسلم عمادی
تبصرہ نگار
ڈاکٹر معین الدین عقیل

نیا جزیرہ

۱۰۳ صفحات، قیمت ۷ روپے
ناشر شالیمار پبلی کیشنز نیا ملک
حیدر آباد دکن۔ بھارت

اسلم عمادی حیدر آباد (بھارت) کے نوجوان شاعر ہیں۔ "نیا جزیرہ" ان کے کلام کا پہلا انتخاب ہے۔ اس سے قبل ان کی نظمیں اور غزلیں متعدد رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ زیر نظر مجموعے میں ان کی غزلیں اور آزاد نظمیں شامل ہیں۔ موضوعات اور عنوانات میں خاصہ تنوع ہے اور یقیناً یہ ان کے مزاج کا آئینہ دار ہے۔ جامعہ عثمانیہ سے انجینئرنگ میں فارغ التحصیل ہیں اور وہیں ایک ادارے سے بحیثیت انجینئر وابستہ ہیں۔ ان کی شخصیت کا یہ تنوع ان کے کلام میں بھی متعدد مقامات پر اپنا اظہار کرتا ہے جس ماحول میں رہتے ہیں ان کے کلام کو دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہیں رومان کے علاوہ جو ان کا عادی رجحان ہے، محرومی، افلاس، دوری، اضطراب، خود غرضیوں اور بے رحمیوں سے براہ راست واسطہ پڑتا ہے۔ اور یہی چیزیں ان کے کلام میں متعدد مرتبہ بیان ہوئی ہیں۔ واحد متکلم کا صیغہ ان کے کلام میں بار بار آتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا کلام ان کی ذات و شخصیت کو مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے لا رہا ہے۔ یہ ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہے اور ان کی اپنی زندگی کی کہانی۔ یہاں تک کہ وہ اکثر نظمیں "میں" کے ساتھ اپنے اظہار میں کہتے ہیں۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ شاعر جو کچھ کہہ رہا ہے وہ اسے شدت کے ساتھ محسوس کر کے کہہ رہا ہے

درد ملتا ہے تو مٹھی میں چھپا لیتا ہوں	شعلے اٹھتے ہیں تو آنکھوں میں چرا لیتا ہوں
اتنے گہرے ساگر ہیں مدتوں سے پیاسا ہوں	بے پناہ سازش ہوں دل فریب دھوکا ہوں
یہی محسوس اب ہوتا ہے اسلم	ہم اپنے قتل کے عادی رہے ہیں
میں آتش گیر مٹی کا نمونہ	جیسے موسم بمشکل سہہ رہے ہیں
وہ سکہ ہوں کہ شہر میں جس کا رواج ہے	لیکن جو راہگزر سے اٹھایا نہیں گیا

اسلم عمادی کے کلام میں یہ بات دیکھ کر تقویت ہوتی ہے کہ وہ ان لفظوں اور شعروں کی جستجو اور تلاش میں مصروف ہیں، جن کو وہ ابھی تک پا نہیں سکے ہیں ؎

دست دعا مسافر ہیں آنکھیں مائل پرواز   اک تلاش اک گردش کون ہوں میں اور کیا ہوں

اور یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے کو پڑھتے وقت بار بار قدیم و معاصر شعراء کی آرزوؤں، لہجے اور بندش و تراکیب کے گہرے اثرات کا احساس ہوتا ہے۔ اس سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب یہ سب آوازیں مل جل کر ایک دوسرے میں تحلیل ہو جائیں گی تو ان کے امتزاج سے وہ ان غم کی گھڑیوں کی کہانی سنا سکے گا، جس کو سنانے کے لئے وہ اب تک بے قرار ہیں۔ یہ بات اسلم عمادی کے ہاں ذہنی صحت مندی کی علامت ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بار بار کھٹکتی بھی ہے کہ وہ لفظوں کا بڑی فراخ دلی اور آزادہ روی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ نیز یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے شعروں کے ساتھ فن کاروں کی سی محنت نہیں کرتے ورنہ ان کی شاعری کی شکل مزید نکھری ہوئی ہوتی اور ان کے شعر اس جلا سے اور پُر اثر ہوتے۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر آزاد نظم ان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی۔ انہیں بہت جلد اپنے مزاج کے لحاظ سے اظہار کی فطری راہ منتخب کر لینی چاہیئے اپنے خیالات اور ان کی ندرت، جدت طبع اور اپج کے اعتبار سے ان کے کلام میں بڑی توانا اور صحتمند مثالیں ملتی ہیں جو ہمیں اس تشنئے جزیرے کی طرف کھینچتی ہیں۔

میں کیا ہوں ایک قطرۂ بحر کمال شوق   ہوں آج موجزن تو یہ قدرت اسی کی ہے
مجھ سے تمام شہر میں ہے گرمیٔ حیات   میرے بدن میں ساری حرارت اسی کی ہے
سنگ کھلائے مجھے ذوق شرارہ سازی   میں تو بارود ہوں میں سب کا مزا لیتا ہوں
بچانا چاہے تو اس کو نظر بچانے دو   بدن کو آئینے کے سامنے تو آنے دو
اکیلے دیکھ۔ یہ کوئی کھٹکھٹا رہا ہے ابھی   کہ اک گمان سا اندر چھپا ہوا ہے ابھی
دل کی دھڑکن سے لگتا ہے کہ بہت نزدیک ہے   رات بے آواز ہے انداز بے تحریک ہے
مجھ کو بوجھ ہے مجھے وہ بھی نہیں ملا   [illegible]

شاعر		۱۰۴ صفحات، قیمت ۱۰ روپے
محسن بھوپالی		ناشر
تبصرہ نگار	**نظمانے**	عوامی دارالاشاعت (۸۷) ڈی
ڈاکٹر معین الدین عقیل		نرسری پی.ای.سی.ایچ سوسائٹی کراچی

محسن بھوپالی موجودہ عہد کے معروف اور مقبول شاعر ہیں۔ بعض ادبی حلقوں میں تو ان کی ادبی مقبولیت اس حد تک ہے کہ ان کے بعض مصرعے، اشعار اور قطعات زبان زد عام و خاص ہیں، لیکن طرفہ تماشا یہ بھی ہے کہ انہیں موقع بہ موقع اپنی باتوں سے ادا کرتے وقت بہت سے یہ نہیں جانتے کہ یہ محسن کے ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے "شکست شب" اور "جستہ جستہ" اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ ان مجموعوں کے ذریعے سے وہ اب تک ہمارے سامنے ایک ایسے شاعر کی حیثیت سے ابھرے ہیں جو اپنے ماحول کی عام اور سیاسی زندگی کا بغور مطالعہ کرتا ہے اور پھر ان میں وہ ماحول کی کلفتوں اور زندگی کی دقتوں کو بڑی حوصلہ مندی اور کدوکاوش سے برتتا ہے۔

اپنی شاعری میں محسن نے کرب ذات کی مصنوعی واردات طاری نہیں کی ہیں بلکہ بیان کی دلکشی اور نت نئے مضامین کی تلاش ان کے ہاں زندگی کے نشیب و فراز کے توسط سے آئی ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری کا بیانیہ انداز اور اس میں واقعات کی اثر پذیری اسی سبب سے ہے۔ زیر نظر مجموعہ ان کے ایک اور شعری تجربے اور واقعات کی مزید اثر پذیری کا اظہار کرتا ہے۔ محسن نے قطعات اس سے قبل بھی لکھے ہیں، بلکہ "جستہ جستہ" ان کے قطعات ہی کا مجموعہ ہے۔ اب وہ اس سے بڑھ کر "نظمانے" کے ذریعے اشاروں اور علامتوں کی مدد سے مختصر مختصر کہانیاں یا منظوم افسانے سنانے آئے ہیں۔

محسن کے ان نظمانوں میں اسلوب بیان اور شعری محاسن کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ پُر اثر اور توجہ کے قابل ان کا طنز و تنقید کا انداز ہے۔ اپنے نظمانوں کے تناظر میں محسن زندگی کے تنوع کی متعدد جھلکیاں بڑی خوبی سے سموئی ہیں۔ ان نظمانوں

یں سے بیشتر ہمارے اطراف کی سماجی اور تہذیبی اور سیاسی زندگی کا اظہار ہیں بعض نظمانے ہمارے عہد کے متنوع واقعات اور ان کے تاثرات پر مشتمل ہیں۔

دست شناسی

دندناتی بس،
لہو میں تر بتر ـــــ اک جواں لاش
سڑک پر چھوڑ کر
تیزی سے آگے بڑھ گئی
محوِ حیرت رہ گیا میں دیکھ کر
لاش کی ٹھنڈی کلائی کے قریب،
ہنس رہی تھی عمر کی لمبی لکیر!

شدتِ احساس محسن کے بیشتر نظمانوں میں ہے۔ ان کے اکثر نظمانے کہانی کا انداز لئے ہوئے ہیں۔ ان میں پیش کئے جانے والے سارے موضوعات ہماری مانوس زندگی کی مختلف تصویریں پیش کرتے ہیں، جو کہیں تو چونکا دیتی ہیں اور کہیں یاس کی کیفیت کو مزید گہرا کر دیتی ہیں۔ ان تصویروں میں ہمیں اپنے ہی ماحول کی متعدد صورتیں نظر آتی ہیں۔ جن سے ہم پہلے سے واقف ہیں لیکن یہ ہمیں بعد کی کیفیات میں گم کر دیتی ہیں اور ذہن اس مسئلے پر سوچنے لگتا ہے۔ "پھیری والا" اس کیفیت کی ایک عمدہ مثال ہے۔

بیگم پچھلے ہفتے سے۔
شام کے پھیری والوں میں۔
"لے لو سانچی پان ہرے" کی۔
گم ہے اک آواز!
اس آواز کو اپنے کان اب ترسیں گے۔

میں بتانا بھول گئی
اس کا بیٹا —— باقی پیسے کل ہی لینے آیا تھا!

نظمانوں کے مطالعے سے یہ ایک تاثر عام ہوتا ہے کہ محسن نے ان میں اپنے ماحول کی زندگی کے زیادہ تر وہ مناظر پیش کئے ہیں جن کے پس پشت ایک نہایت تاریک اور منفی پس منظر ہوتا ہے۔ ان کے ذریعے غالباً محسن نے معاشرے کے تاریک پہلوؤں کو اجاگر کرنا چاہا ہے تاکہ ہم زندگی کی بعض تلخ حقیقتوں کو ان کے اصل تناظر میں دیکھیں۔

کالج الیکشن

اس کے معصوم دل کو
خبر ہی کہاں تھی
کہ اس کے مخالف کے ڈورے
ہیں کس ہاتھ میں!
ایک دھچکا لگا
ذہن چکرا گیا
دوسرے روز جب
جیتنے والے ساتھی کے نام
سربراہ جماعت کا تار آگیا

زبان اور اسلوب کے لحاظ سے بھی نظمانے بعض خوبصورت اور مفید تجربات کے زیر اثر ہیں۔ محسن نے نظمانوں کے لئے عام بول چال کی وہ زبان اختیار کی ہے جو مروجہ ہے۔ شعری تراکیب اور اضافتیں جو عام شاعری کا خاصہ ہیں ان میں نظر نہیں آتیں۔ بلکہ ان میں محسن نے ایک نہایت کامیاب تجربہ یہ کیا ہے کہ انہوں نے نظمانوں میں عام بول چال کی زبان سے شعریت پیدا کی ہے۔ یہ ان نظمانوں کا ایک خاص وصف ہے۔ اپنے موضوعات، اسلوب بیان اور گرد و پیش کی زندگی کی متنوع تصویروں کے لحاظ سے "نظمانے" ایک تجربے کے ساتھ ساتھ شاعری کی نئی جہات کا ایک امکان بھی ہے۔

مصنف
کیپٹن صولت رضا

تبصرہ نگار
ڈاکٹر معین الدین عقیل

کاکولیات

۷۰ صفحات، قیمت ۹ روپے

ناشر
ادارہ مطبوعات سلیمانی
اردو بازار۔ لاہور

زیرِ نظر تصنیف پاکستان ملٹری اکیڈمی، کاکول میں زیر تربیت ایک "جنٹلمین کیڈٹ" کی آپ بیتی ہے۔ اردو کے وسیع اور عریض میدان ادب میں کیپٹن صولت رضا اپنی آپ بیتی کے توسط سے ایک دلچسپ اضافہ ہیں۔ ان سے قبل فوج سے مستقبل وابستہ بعض معروف اور مقبول ادیب و شاعر اپنی اپنی تخلیقات کے ذریعے اردو ادب کی تاریخ میں نہ صرف اپنے ناموں کے اضافے کا موجب ہوئے ہیں بلکہ انہوں نے موضوعات کے تنوع میں بھی خاصہ حسین اور دلچسپ اضافہ کیا ہے۔ دلچسپ اس اعتبار سے کہ ان فوجی ادیبوں اور شاعروں نے بالخصوص اردو کے فکاہیہ اور مزاحیہ ادب میں اپنی تخلیقات پیش کی ہیں جو پُر لطف بھی ہیں اور نہایت مقبول بھی۔ اس کی وجہ درحقیقت نفسیاتی ہے۔ وہ اپنے پیش نظر "وسیع میدانوں" میں رہتے ہوئے اپنے "محدود" ماحول کی یک رنگی میں میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنے تصورات اور تخیلات کی ایک رنگا رنگ دنیا تخلیق کرتے رہتے ہیں۔ اس میں کھوئے رہنے سے انہیں وہ تمام کیف و انبساط حاصل ہو جاتا ہے، جو عام حالتوں میں انہیں میسر نہیں اس اعتبار سے ضمیر جعفری کی ہلکی پھلکی نثر اور ظریفانہ شاعری ہمیں متعدد سرسبز "جزیروں" کی سیر اتی ہے شفیق الرحمٰن کے مزاح کی "لہریں" پڑھنے والوں کو نت نئے "مدوجزر" سے دوچار کرتی رہتی ہیں۔ کرنل محمد خاں بھی ہمیشہ مزاح کا ایک خاص انداز لئے ہوئے ہیں میجر صدیق سالک کچھ ہی دن پہلے اپنی دلچسپ سرگزشت کے ساتھ وارد ہوئے ہیں۔ اب اس فہرست میں، جس میں مزید ناموں کی نشاندہی ہو سکتی ہے، صولت رضا اپنی پُر لطف آپ بیتی کے ساتھ شامل ہو رہے ہیں۔

اس آپ بیتی کا آغاز پنجاب یونیورسٹی کے زمانۂ طالب علمی سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام سیالکوٹ کے محاذ کی ایک میس میں۔ مصنف کے ذہن میں اس آپ بیتی کی تخلیق کا خیال اس وقت پیدا ہوا تھا جب وہ سیکنڈ لیفٹیننٹ تھے۔ لیکن لکھا انہوں نے اس وقت جب وہ لیفٹیننٹ بن چکے تھے اور اس کی تکمیل اس وقت عمل میں آئی ہے جب وہ کیپٹن ہیں۔ یہ آپ بیتی کئی اعتبار سے اہم اور دلچسپ ہے۔ مصنف نے ہمیں نہایت شگفتہ و شائستہ طریقے سے اس میں "دورِ نگاہ" دنیا کی سیر کرائی ہے۔ "کاکول" نوارد فوجیوں کی تربیت گاہ ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے جو مراحل طے کرنے ہوتے ہیں انہیں مصنف نے نہایت دلکش اور پُرلطف انداز میں بیان کیا ہے وہاں کی زیرِ تربیت زندگی تمام ضروری جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ قاری کے پیش نظر آجاتی ہے۔ کہیں کہیں تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں لیکن دراصل خود مصنف کا اندازِ تحریر، طرزِ بیان اور مشاہدہ کسی طرح بھی تصویر کشی سے کم نہیں۔ وہاں کی زندگی بظاہر جتنی مشینی، اصولی اور بندھی ٹکی ہے، وہ اس سرگذشت میں اتنی ہی دلکش، دلچسپ اور پُرلطف ہو جاتی ہے یہ فی الحقیقت مصنف کا کمالِ تحریر اور طرزِ بیان ہے۔

اسلوبِ تحریر اور زبان و بیان کی خوبیاں اس تصنیف کا نمایاں اور امتیازی وصف ہے۔ اپنے مشاہدات اور محسوسات کو بیان کرنے کے لئے مصنف نے نہایت پُرکشش زبان استعمال کی ہے۔ متعدد مقامات پر دلکش تراکیب اور پُرمزاح بندشِ الفاظ سے بھی کام لیا گیا ہے "بصراط کیشن"، "دل شکن اوقات"، "خاموش گو"، ایسی اختراعی کوششوں میں سے چند ہیں۔ مصنف کا مذاق بھی خاصہ ستھرا اور شائستہ ہے۔ یہ کتاب میں متعدد جگہوں پر بے ساختہ اندازِ بیان، اشعار کے استعمال اور برمحل جملوں میں خاص طور پر جھلکتا ہے۔

اپنی مجموعی خوبیوں کے سبب "کاکولیات" مزاحیہ اسلوب نگارش میں ایک دلچسپ اضافہ ہے۔

مرتبہ: ڈاکٹر فرمان فتحپوری | ۱۰۱ صفحات، قیمت ۶ روپے

تبصرہ نگار | # ارمغانِ گوکل پرشاد | انجمن ترقی اردو

ڈاکٹر معین الدین عقیل | | پاکستان - کراچی

زیرِ نظر تذکرہ اردو شعراء کا ایک منفرد تذکرہ ہے جو اپنے موضوع، انداز اور ترتیب کے اعتبار سے دیگر تذکروں کے مقابلے میں علیحدہ حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے قبل ایک اور تذکرہ "سراپا سخن" اسی انداز کا تحریر ہوا تھا جسے سید محسن علی محسن نے ترتیب دیا تھا اور یہ حال ہی میں ڈاکٹر اقتدار حسن کی کوششوں سے دوبارہ منظرِ عام پر آیا تھا۔ یہ مجموعی طور پر مختلف اعضائے جسمانی کے تحت سات سو سے زیادہ شعراء کے کلام اور تراجم پر مشتمل تھا۔ اس میں متعدد خوبیوں کے باوجود بعض ایسے عیب تھے جو اس سے استفادے میں رکاوٹ کا باعث بنتے تھے۔ اس میں شاعروں کا احوال و انتخاب کلام موضوعات کے تحت پیش کیا گیا تھا اور بعض مقامات پر ایک ایک موضوع پر مشتمل متعدد اشعار یکجا مل جاتے تھے، لیکن کسی شاعر کا احوال یا کلام دیکھنے کے لئے پورے تذکرے کا مطالعہ ناگزیر تھا۔ اس لحاظ سے زیرِ نظر تذکرہ زیادہ جامع اور بعض دوسری خصوصیات کا حامل ہے۔ اغلب ہے کہ یہ ۱۸۷۷ء - ۱۸۷۸ء میں تصنیف ہوا۔ اور یہ دو حصوں میں مطبع مطلع نور منشی بہاری لال واقع کانپور سے شائع ہوا تھا۔ لیکن ایک طویل عرصے سے اس حد تک ناپید تھا کہ محققین محض اس کے نام سے واقف تھے کسی نے نہ اس کا مطالعہ کیا تھا نہ کہیں حوالہ دیا تھا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے مرتبہ "نگار" کے تذکروں کا تذکرہ نمبر، کے بعد جنوری ۱۹۶۶ء کے "نگار" میں پہلی مرتبہ حاجی محمد یعقوب خاں خورجوی کے ایک تعارفی مضمون کے ذریعے اس تذکرے کی دستیابی کی خبر عام ہوئی۔ پھر ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے بالتفصیل اس کا تعارف اپنی مؤقر تصنیف "اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" میں کرایا اور اب اسی مطبوعہ نسخے کی مدد سے ڈاکٹر صاحب نے اسے مزید ضروری تعارف، تصحیح اور ترتیب کے بعد علمی دنیا تک

پہنچایا ہے۔

گوکل پرشاد رسا نے جو اس تذکرے کے مصنف ہیں اسے دیگر تذکروں کے مقابلے میں منفرد انداز میں ترتیب دیا تھا۔ اور مجموعی طور پر اسے دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ پہلا حصہ شعراء کے تراجم پر مبنی تھا اور دوسرا حصہ شعرائے مذکور کے منتخب اشعار پر مشتمل تھا۔ اس لحاظ سے یہ فی الواقعی "سراپا سخن" کی طرح نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس میں شعراء کے تراجم کی تعداد اور پھر ان کی تفصیلات زیادہ ہیں اور عنوانات کی کثرت کے اعتبار سے بھی یہ بلند تر ہے۔ زیر نظر اشاعت میں اس کے دوسرے حصے کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہی حصہ تحقیقی اعتبار سے اہم، مفید اور ضروری ہے اور اس میں مطبوعہ نسخے کا مکمل نثری متن اور دیباچہ و تقاریظ مرتب ہو گئی ہیں موجود ترتیب مطبوعہ نسخے کی ترتیب کے مطابق ہی ہے۔ حواشی میں بعض باتوں کی صراحت و تصحیح افسر امروہوی کی کوششوں کے نتیجے میں ہے۔ اپنی ترتیب و تصحیح کے لحاظ سے اس اہم تذکرے کی حالیہ اشاعت اردو کے تحقیقی ادب میں ایک مفید اضافہ ہے۔

یادوں کی خرافات

مصنف: سید مشتاق علی
۱۱۲ صفحات، قیمت ۶ روپے
تبصرہ نگار
مرزا ظفر الحسن
علی پبلشنگ ہاؤس
۱۹ بہادر شاہ ظفر مارکیٹ، کراچی

مصنف بقول ابن انشاء "ایک باکمال معالج" ہیں اور یہ کتاب "جوش صاحب قبلہ کی یادوں کی برات کے ردِ عمل کے طور پر وجود میں آئی ہے"۔ ابن انشاء کے علاوہ کتاب کا تعارف ابراہیم جلیس نے بھی کرایا ہے جس کے آخر میں وہ لکھتے ہیں "ڈاکٹر صاحب کی زیر نظر تحریر ایک محدب آئینہ ہے جس میں عہد حاضر کی ایک بڑی ادبی شخصیت اپنے قد سے کہیں زیادہ بڑی نظر آتی ہے لیکن ایسی بڑائی جو اصلی قد کے آگے بھی کبڑی بونی نظر آئے"۔

اس پس منظر کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کیا تو اس میں یادوں کی برات کا کوئی راست

دیکھیے صفحہ ۲۳۱ سطر ۱ تا ۵

جہاں تک "یادوں کی ظرافات" کا تعلق ہے ہمیں ابنِ انشاء سے اتفاق ہے کہ "یہ داستان بڑے گہرے سوزِ دل اور طبقاتی احساس سے لکھی ہے"۔

مصنف: محمد علی صدیقی

تبصرہ نگار
مرزا ظفر الحسن

توازن

۲۷۲ صفحات، قیمت ۲۰ روپے
ناشر: ادارہ عصرِ نو، ۴۲
ہمایوں کالونی۔ کراچی،

کئی معمّر ادیبوں کو اردو اور انگریزی دونوں پر قدرت ہے۔ پروفیسر احمد علی، فیض احمد فیض، سید سبطِ حسن، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، پروفیسر ممتاز حسین اور دوسرے جو کم عمر ہیں ان میں اس قبیل کے بہت کم نام ملتے ہیں۔ زہیر صدیقی، مختار زمن وغیرہ۔ نوعمروں میں صرف محمد علی صدیقی نظر آتے ہیں۔ زود نویس، زیادہ نویس اور خوش نویس۔ ان کے اردو مضامین کا مجموعہ "توازن" اس وقت زیرِ تبصرہ ہے جس کے مشمولات منتشر حالت میں ملک کے معتبر اور مؤقر جرائد میں پڑھ چکا ہوں۔ اب جو یہ گل ہائے رنگ رنگ گلدستے کی صورت میں ہاتھ لگے ہیں تو معاً خیال آیا کہ محمد علی صدیقی پر "ایریل" اور "ایم آر صدیقی" کا اثر کچھ زیادہ ہی ہے۔ مروت کی مار میں شاید دوسرے انھیں نہ بتائیں مگر میں اپنی ذاتی دوستی اور ادبی ناتے کی بناء پر ان سے کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انگریزی جاننے اور انگریزی ادب پڑھنے سے ان کی بصیرت میں بلاشبہ اضافہ ہوا ہے اور اس سے دوسروں کو مستفید کرنا مستحسن بھی ہے مگر انگریزی زبان اور فکرِ مغرب کے بار بار کے حوالوں، تقابل اور تجزیوں سے گمان ہو سکتا ہے کہ مصنف مرعوب کرنا چاہتا ہے۔ بات خسرو کی ہو یا

دیکھیے صفحہ ۲۳۱ سطر چھ سے

یا بلا واسطہ جواب نہیں ملا البتہ قلمی نقشے سہیمے بھیے" بجا کا دکھیو ابھارا" اور" برات کے دولہا" جیسے اشاروں سے سراغ لگا کر مصنف بہت کچھ لکھنا چاہتے تھے جو نہ جانے کیوں نہ لکھ سکے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب سے اختلاف ہے جہاں وہ یادوں کی برات کے متعلق لکھتے ہیں "ممدوح کی یہ پوتھی ترقی پسندی کی منہ بولتی، جیتی جاگتی، ان مٹ نقوش کا ایک عظیم شاہکار ہے" ایسی کتابوں ہی سے ترقی پسند تحریک و تنظیم کو نقصان پہنچا ہے۔

غالب کی "تذکرہ انجم اعظمی کا ہو یا اطہر نفیس کا، ذکر مسعود اشعر کا ہو یا قمر عباس ندیم کا انگریزی کے پانچ سات الفاظ" ایریل" انہیں تھما دیتا ہے۔ گفتگو کا موضوع جمالیاتی اضافیت ہو یا اردو شاعری میں نیچر پرستی، ایم اے صدیقی کا فکا کیٹس وغیرہ کو حاضر کر دیتے ہیں۔ اگر اس مجموعے میں اشاریہ شامل کیا جاتا یا اب بھی میری تردید یا توثیق کے خیال سے یا محض تجربتاً تیار کیا جائے تو پتہ چل جائے گا کہ صاحبِ کتاب کی ملاقاتیں میر و سودا سے کتنی ہوئی ہیں اور کہاں کہاں پاؤنڈ ایلیٹ وغیرہ در آئے ہیں۔ انگریزی اصطلاحات اس لئے بھی زیادہ کھٹکتی ہیں کہ ان کے مترادفات بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر سمجھوتے کے ساتھ کامپرومائز خلط ملط کے ساتھ ہیزی، نتائج کے ساتھ پریگ میٹک۔

اردو کی دنیائے تنقید میں احتشام حسین، کلیم الدین احمد، فراق گورکھپوری، اثر لکھنوی، آل احمد سرور، ممتاز حسین، وزیر آغا، افتخار جالب وغیرہ اپنے اپنے درجات کے مطابق بڑے اور اہم ہیں۔ یہ لوگ اپنے تنقیدی مضامین میں دیارِ مغرب کی فکر و فکر کے کتنے حوالے دیتے ہیں؟

"فکری چھینا جھپٹی" "تاریخ مورخ سے بالاتر" "ذات کا عریاں اظہار" "کل سے اجزاء کی طرف سفر" جیسی زبان لکھنے والے کو انگریزی اصطلاحات اور الفاظ کی کوئی مجبوری یا معذوری نہیں ہے۔ میرا اشارہ استعمال کی طرف نہیں بلکہ کثرتِ استعمال کی جانب ہے۔

صاحبِ کتاب کی فکر اور اس کے اظہار کے طریقوں میں جو توازن ہے اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ بہ یک وقت پروفیسر مجنوں گورکھپوری، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور

ڈاکٹر وزیر آغا ان کی قلمی کاوشوں کو پسند کرتے ہیں حالانکہ ان چاروں کے علمی و ادبی نظریات مختلف اور کہیں ایک دوسرے سے متصادم ملتے ہیں۔

قدرت نے محمد علی صدیقی کو محروم بھی رکھا ہے، مقرر نہیں ہیں، انجمن باز نہیں ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ شاعری سے تائب ہیں ورنہ جلسوں، انجمنوں اور مشاعروں کی صلیبیں اٹھائے اٹھائے پھرتے۔ "توازن" سے محروم رہتے دوسروں کو محروم رکھتے۔

نظری تنقید، تنقید و تاریخ شاعری اور افسانے کے عنوان سے چار ابواب ہیں۔ تین میں بڑا تنوع ہے۔ مثلاً اگر امیر خسرو کی شاعری کو عہد خسرو کے سیاسی و سماجی پس منظر میں پیش کرتے ہیں تو احمد ندیم قاسمی کی شاعری کا فکری پس منظر بیان کرتے ہیں۔ ان کے قلم کی زد میں یاسیت آتی ہے تو ادب میں سیاست کے عمل دخل پر بھی گفتگو کی ہے۔

ہر چند کہ مضامین کی ترتیب بہ اعتبار موضوع ہے اور اسی باعث ایسے تین مضامین بھی شامل ہو گئے ہیں جو علی الترتیب پندرہ، آٹھ اور سات سال پہلے لکھے گئے تھے۔ ہمارا ادب اور قومی دماغ (۱۹۶۱ء)، جمالیاتی اضافیت (۱۹۶۸ء) اور غالب کی جمالیات (۱۹۶۹ء) مگر باقی بائیس مضامین ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۶ء کی درمیانی مدت کی تخلیقات ہیں۔ علمی و ادبی اور بعض بالکل اچھوتے موضوعات پر لاتنے اور ایسے اچھے مضامین ایک کارنامہ اور انہیں اپنے خرچ سے چھپوانا ادبی ایثار ہے جو آج کل ہمارے خوشحال اکابر ادب بھی نہیں کرتے۔ ۱۹۷۵ء بڑا زرخیز سال تھا جس میں سات مضامین لکھے۔

محمد علی صدیقی محنتی، مخلص اور لائق ادیب ہیں۔ انہوں نے اپنی دو اور کتابوں کی اشاعت کا مژدہ سنایا ہے۔ ہم چشم براہ ہیں۔ اس کے عملی جامہ پہننے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ آپ "توازن" خرید کر پڑھیں، پڑھنے کے بعد مفت مطالعہ کے لئے تقسیم نہ کریں بلکہ اس کے لئے خریدار فراہم کریں۔

میں اس مجموعے کو ۱۹۷۶ء کے لئے جو ہم سے رخصت ہونے کو ہے امام ضامن اور ۱۹۷۷ء کے لئے جس کی آمد آمد ہے تحفۂ سالِ نو قرار دیتا ہوں۔

مدیر ڈاکٹر فرمان فتحپوری

ڈاکٹر محمود حسین نمبر

۴۵۲ صفحات ۔ پندرہ روپے
۱۸۱ ۔ گارڈن آفیسرز
نشتر روڈ، کراچی نمبر ۳

نگار، کراچی

تبصرہ نگار م خلج

ڈاکٹر محمود حسین اپنی وفاقی وزارت کے ابتدائی دنوں میں دورے پر حیدرآباد سندھ آئے ۔ میرے ہمدم دیرینہ محمد یحییٰ صدیقی ان کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے جن سے ملنے میں گورنمنٹ ریسٹ ہاؤس گیا ۔ شام کا وقت تھا ۔ ڈاکٹر صاحب کمپاؤنڈ میں بیٹھے مطالعہ میں مصروف تھے ۔ سمجھے میں کوئی اہل غرض ہوں ۔ اخلاق سے ملے اور بیٹھنے کو کہا ۔ میں نے عرض کیا یحییٰ صاحب سے ملنے آیا ہوں ۔ وزیر تھے ۔ مجھ سے کہہ سکتے تھے اندر جا کر ان کا کمرہ تلاش کر لو یا چپراسی کے آنے تک برانڈے میں انتظار کرو ۔ یا بیٹھے بیٹھے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری یا چپراسی کو آواز دے سکتے تھے ۔ مگر نہیں ۔ مجھے خود عمارت کے اندر لے گئے ، دو تین کمروں سے گذار کر یحییٰ کے کمرے تک پہنچایا ، دروازہ کھٹکھٹایا ، یحییٰ نے اندر سے "یس" کہا تو دروازہ کھولا اور یحییٰ سے فرمایا "آپ کے دوست تشریف لائے ہیں" پاکستان کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہمیں ڈاکٹر محمود حسین کی طرح خلیق اور ہمدرد وزیر نہیں ملے ۔ یا بہت کم ملے ۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے بڑی محنت اور خلوص سے ایک قابل قدر دستاویزی نمبر شائع کیا ہے ۔ سولہ عنوانات کے تحت ایک سو سے زائد نثری اور منظوم نگارشات ہیں جن سے مرحوم کی شخصیت ، کردار اور کارناموں پر روشنی پڑتی ہے ۔ مرحوم کی ذات میں اتنی صفات اور ان کے فکر و عمل کی اتنی جہات تھیں کہ سب کا احاطہ ایک سے زیادہ نمبروں ہی میں ممکن ہے ۔

اس خاص نمبر کی صرف دو امتیازی خصوصیات کا ذکر کروں گا ۔ طویل مضامین دو ایک ہیں باقی تاثرات ، مشاہدات اور مختصر تجزیے ہیں جن سے تنوع پیدا ہو گیا اور بہت سی نئی باتیں طبع ہو کر بصورت دستاویز محفوظ ہو گئی ہیں ۔ دوسری خصوصیت

یہ ہے کہ یہ نمبر دوسرے جرائد کی طرح برسں دو برس کی تیاری اور بار بار کے اعلانات کے بعد نہیں نکالا گیا۔ انتقال اپریل ۱۹۷۵ء میں ہوا اور چار ماہ بعد ڈاکٹر محمود حسین نمبر شائع ہو گیا۔ اس باب میں ایک طرح سے نگار کا ہم پلہ جریدہ غالب ہے کہ زیڈ۔ اے۔ بخاری کا انتقال جولائی ۱۹۷۵ء میں ہوا اور چار ماہ میں بخاری نمبر بازار میں آگیا (ستمبر ۱۹۷۵ء)۔

زیر تبصرہ نمبر میں جمیل الدین عالی کی ایک مختصر تحریر شامل ہے (ص ۶۰۔۶۱) جس میں موصوف نے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں مرحوم کے انتظار کا واقعہ لکھا ہے جو عبرتناک بھی ہے اور شرمناک بھی۔ وہیں ڈاکٹر صاحب کا یہ زریں قول بھی شامل ہے "یا تو اعزازی کام اپنے ذمے نہ لیجئے۔ لے لئے تو پھر جیسے سب اہل غرض ویسے ہی آپ"۔

اس پر مجھے یاد آیا ڈھائی تین سال پہلے عالی نے جو بلاشبہ غالب لائبریری کے محسن بھی ہیں ایک مرتبہ مجھ سے کہا "مرزا صاحب یہ کیا آپ ایک ایک کے آگے دست سوال دراز کرتے ہیں ایک بجٹ کمیٹی و کمیٹی قسم کی کوئی چیز بنائیے اس میں ابن انشا کو رکھئے، جی چاہے تو مجھے بھی شامل کر لیجئے۔ ہم دونوں مہینے میں ایک دو بار اسلام آباد جاتے ہیں، وزارت تعلیم سے لائیں گے روپیہ غالب لائبریری کے لئے۔ بینکنگ کونسل سے آپ کو اتنی امداد دلوا دیں گے کہ ادارے کے تمام عوارض ایک مرتبہ میں دور ہو جائیں"۔

میں نے اسی ہفتے عالی اور انشا پر مشتمل ایک بجٹ کمیٹی بنائی دونوں کو تحریری اطلاع دی، اطلاع کے ساتھ ادارے کی ایک سال کی رپورٹ اور نئے مالی سال کے لئے بجٹ تخمینے کی نقل منسلک کی اور دونوں کے لئے الگ الگ فائل بنا کر بھیجی تاکہ لائبریری کے کاغذات دوسرے کاغذات میں مل کر گم نہ ہو جائیں۔

ابن انشا نے تو فوراً وہ فائل ایک بیگ کے اندر کے ہاتھ تھما دی تاکہ انہیں بار بار یاد نہ آئے کہ لائبریری مفلس ہے۔ جمیل الدین عالی نے کیا کیا معلوم نہیں کیونکہ میری کسی یاد دہانی کا جواب نہ آیا۔ دونوں کئی بار اسلام آباد آئے گئے۔ میرے علم میں ہے کہ وزارت تعلیم بھی گئے مگر غالب کا مقصد نہ تھا۔ ڈاکٹر محمود حسین نے کیا پتے کی بات کہی تھی اور عالی نے کیسے موقع پر نقل کی کہ "یا تو اعزازی کام اپنے ذمے نہ لیجئے لے لئے

تو پھر جیسے سب اہل غرض ایسے ہی آپ ؟ اسی باعث میں ایک ایک کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہوں جس سے عاتی نے مجھے روکا تھا۔ خود کو دوسرے اہل غرض کی طرح سمجھتا ہوں، کسی سے ناراض نہیں ہوتا۔ نہ عاتی سے نہ انشا سے۔

ڈاکٹر محمود حسین نمبر ایک مثالی نمبر ہے اس سے زیادہ ضخیم نمبر نہ تو معیاری ہو سکتے ہیں نہ بار بار نکالے جا سکتے ہیں اور نہ ہر ایک خرید کر پڑھ سکتا ہے۔ بڑے نام اچھوتے

مدیر: ڈاکٹر فرمان فتحپوری ۴۷۳ صفحات، قیمت ۱۵ روپے

تبصرہ نگار **حسرت موہانی نمبر** (۶۰) درلی روڈ

م۔ ظ۔ ح نگار پاکستان گارڈن اسٹیٹ، کراچی ۳

مولانا حسرت موہانی سے بڑے شاعر تو پیدا ہو سکتے ہیں مگر ان جیسا انسان مشکل سے نصیب ہوگا۔ قریباً ربع صدی قبل نگار لکھنؤ نے حسرت نمبر نکالا تھا (جلد ۶۱، شمارہ ایک، دو جنوری فروری ۱۹۵۲ء صفحات ۱۴۲) یہ شمارہ بلاشبہ کمیاب نہیں نایاب ہے ؟ محترم زیڈ اے بخاری مرحوم کو جو حسرت کے عاشق تھے ریڈیو پاکستان کے لئے حسرت پر ایک فیچر لکھنا اور اس کے لئے اس نمبر کی ضرورت تھی۔ جگہ جگہ تلاش کیا ایک ایک سے پوچھا نہ ملا تو غالب لائبریری تشریف لائے جہاں انہیں مل گیا اور وہ اپنا فیچر مکمل کر سکے (مشمولہ بخاری نمبر، غالب، ص ۱۰۵)

عموماً تبصرے میں ایسا ہوتا نہیں مگر متذکرہ نایابی کے پیش نظر مندرجات نگار لکھنؤ کی فہرست دے رہا ہوں تاکہ محققین حسرت بوقت ضرورت اس محفوظہ غالب لائبریری سے استفادہ کر سکیں۔ وہ مضامین چھوڑ دیے ہیں جو نگار کراچی کے حسرت نمبر میں نقل کئے گئے ہیں مضمون نگار کے نام کے بعد صفحات کی تعداد الفاظ میں لکھی گئی ہے تاکہ مضمون کی ضخامت کا علم ہو سکے۔

(۱) حسرت کی علمی و عملی زندگی، شیخ ممتاز حسین جونپوری دو صفحات (۲) حسرت کا تغزل، عبادت بریلوی سولہ (۳) حسرت موہانی مرحوم کی شاعری پر ایک سرسری نظر، مرزا جعفر علی خان اثر تین (۴) حسرت کی انفرادیت، خواجہ احمد فاروقی دو (۵) کلام حسرت کی توقیت، اڈیٹر دو (۶) حسرت کی خصوصیات شاعری، ایڈیٹر، بارہ (۷) اصطلاحات حسرت، شفیق صدیقی جونپوری، دو (۸) حسرت ایک تاثر، آل احمد سرور پانچ (۹) حسرت کا عزم امور، عبدالمالک آروی، چار (۱۰) حسرت اور ان کا عشق، سید محمد عقیل چھ (۱۱) حسرت کی شاعری کا جمالیاتی پہلو، محمد حنیف فوق، تین۔

جو مقالے نگار کراچی میں منقول ہیں ان میں سے ایک کی بابت یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اصل اور منقولہ کے عنوان میں فرق ہے۔ لکھنو والے شمارے میں فراق گورکھپوری کے مضمون کا عنوان "حسرت موہانی" اور کراچی کے نمبر میں "حسرت موہانی کا تغزل" ہے۔

زیر تبصرہ نمبر میں تین موضوعات کے تحت حسرت کی زندگی اور شخصیت شاعری اور فن اور ان کی تنقید مستند کرنے کا ذکر ہے۔ شاعری اور فن پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے علاوہ ڈاکٹر وزیر آغا، سجاد باقر رضوی، اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے مضامین بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں۔ مولانا کی بیگم پر ایک مضمون اور بیگم کے تعلق سے مولانا کی ایک نادر تحریر بھی ایک مضمون ہے۔ حسرت کی خود نوشت "مشاہداتِ زنداں" بھی ایک نایاب تحریر ہے۔ اس کی شمولیت سے ان لوگوں کو سہولت ہوگی جو حبسیات پر کام کرنا چاہتے ہیں فیض کا خیال ہے "ہمارے ہاں بہت سے لوگوں کے لئے قید و بند کوئی غیر متوقع سانحہ یا حادثہ نہیں بلکہ معمولاتِ زندگی میں داخل ہے اس لئے بہت ممکن ہے کہ ہمارے شعبۂ عمرانیات میں حبسیات، بجائے خود ایک موضوع تحقیق ٹھہرے"؛ جہاں تک ہمارے علم میں ہے اس موضوع پر کوئی چونکا دینے والا تحقیقی اور تنقیدی کام نہیں ہوا ہے اور ہونا چاہیئے۔

نگار لکھنو اور نگار کراچی کے حسرت نمبروں میں وقیع اور پر مغز مقالے ہیں ضرورت ہے کہ ان کا انتخاب کتابی صورت میں شائع کیا جائے کچھ مدت بعد رسائل ضائع ہو جاتے ہیں۔ لائبریریوں میں انہیں حفاظت سے رکھنے کا کہیں کوئی معقول انتظام نہیں ہے اور مزید کام کرنے والوں کو تلاش میں بے حد تکلیف ہوتی ہے۔

گفتگو

مدیر سردار جعفری — ۲۴۴ صفحات۔ آٹھ روپے
مدیر مہتمم روشن لال وڈیرا — جنرل انشورنس بلڈنگ
تبصرہ نگار م ظ ح — ۲۳۲ ڈاکٹر ڈی این روڈ، بمبئی ۱۰۰۰۱م

عصمت چغتائی بمبئی سے آتے ہوئے ہمارے حصے کا پرچہ دستخطی سردار جعفری ساتھ لائیں تو مل بھی گیا ورنہ آج کل جو ڈاک میں گڑبڑ ہو رہی ہے اس میں گفتگو کے اس شمارے کے بھی ضائع ہو جانے کا احتمال تھا۔ سہ ماہی غالب کے فیض نمبر ہندوستانی احباب کو بھیجے مگر نہیں پہنچے۔ کیا معلوم کہاں رکے، کیوں رکے؟

عام طور پر محسوس کیا جا رہا ہے، خصوصاً پاکستان میں کہ شاعر حضرات کی ادارت میں نکلنے والے جرائد میں غزلوں اور نظموں کا حصہ نمایاں طور پر زیادہ ہوتا ہے۔ جب زیادہ ہوگا تو معیار بھی قائم نہ رہ سکے گا۔ زیر تبصرہ شمارے میں ساٹھ سے زیادہ نظمیں اور غزلیں ہیں۔ مانا کہ اس میں راشد، فیض، تاباں، اختر الایمان کے اور خود سردار جیسے بڑے نام ہیں مگر ۶۵ صفحات ذرا زیادہ ہیں جب کہ یہ پرچہ ۳۶۵ دن کی تاخیر سے نکلا ہے۔

سردار جعفری نے اس کی تلافی قابل قدر مضامین اور مقالوں کی اشاعت سے کر دی ہے۔ بلند معیار کی اتنی زیادہ تحریریں کم ہی اس طرح یکجا کی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے ترقی پسند مصنفین کی تحریک و تنظیم کی چالیسویں سالگرہ پر ہونے والے دو روزہ اجلاس کی روداد قلم بند کر کے اس تحریک کے اگلے مورخ کے لئے کافی خام مواد ایک جگہ کر دیا ہے۔ مہنگی طباعت اور دوسری مشکلات کے باوجود افسانے، ڈرامے، طنز و مزاح، تاثرات

اور دوسرے موضوعات پر جو مقالے اور مضامین اجلاس میں پڑھے گئے ہیں انہیں شائع کرنا چاہیئے۔ کم از کم ان کی نقلیں ہی محفوظ کر لینا چاہیئے۔ پاکستان میں غالب لائبریری ایسی جگہ ہے جہاں مقالے محفوظ کیئے جا رہے ہیں۔ اگر مقالہ نگار یا انجمن کے نئے صدر سفر جعفری یہ مقالے بھجوا سکیں تو شکریہ۔

ڈاکٹر وحید اختر نے سرخ سویرا سے بساط رقص تک کی مخدوم کی شاعری اور شخصیت کا تجزیاتی کا مطالعہ چون صفحات کے مفصل مقالے میں پیش کیا ہے جو اس لحاظ سے بھی معتبر اور موقر ہے کہ مخدوم کی شاعری اور شخصیت کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان میں وہ انصاف نہیں کیا گیا جو مخدوم کا حق تھا۔ سکندر علی وجد نے میرے نام اپنے ایک مکتوب میں بالکل درست لکھا ہے "ایسا مضمون شاید ہی کسی موجودہ شاعر پر لکھا گیا ہو"۔

شہزاد منظر نے سجاد ظہیر پر محنت سے ایک مضمون لکھا ہے۔ شہزاد منظر نوجوان ادیب اور صحافی ہیں اور مجھے علم ہے کہ اس مضمون کی تیاری میں انہوں نے غالب لائبریری میں کیا کیا جتن کئے اور کس محنت سے مواد یکجا کیا۔ بنے بھائی پر اب تک جو کچھ لکھا ہے اس میں یقیناً یہ ایک اضافہ ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون "فکر تونسوی۔ دھرتی کا باسی" میں ان کے فن کے چار پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ کہ کیا فکر محض ایک طنز نگار ہیں؟ کیا فکر بے تعلق رہ کر اپنا طنزیہ اور مزاحیہ ادب تخلیق کرتے ہیں؟ کیا ان میں غور و فکر کا مادہ ہے؟ ہر فنکار کا اپنا ایک چور دروازہ ہوتا ہے۔ فکر تونسوی کا چور راستہ کون سا؟ ان کے جوابات دینے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں اور درست لکھتے ہیں کہ فکر تونسوی "دھرتی کے باسی ہیں۔ ان کا مزاج عام انسان کے لئے ہے، راست، سیدھا، توانا اور بیباک۔ ان کے نزدیک ہمارے ہمارے سماج کی پرتیں پیاز کے چھلکوں کی طرح ہیں۔ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی۔ وہ پیاز کے چھلکے برابر اتارتے رہتے ہیں۔ ان کی زبان بھی عوام کی زبان سے قریب تر ہے صاف تیز اور تیکھی لیکن قہقہوں اور شگفتگی کے پھولوں میں بسی ہوئی اور یہی ان کی مقبولیت کا راز ہے"۔

ظ۔ انصاری کا محبوب موضوع پشکن ہے۔ اس میں مضمون نگار نے دلکش اور جاذب توجہ انداز میں بتایا ہے کہ پشکن محض ایک بڑا شاعر نہیں، بڑا اہل قلم، افسانہ نگار، مورخ، تنقید نگار نہیں ایک زندہ مہمان آتا ہے جو روسی تہذیب اور اس کی معرفت عالمی تہذیب کے بدن میں دنیا کے چند بڑے فنکاروں کی طرح سما گئی ہے اور سمائی رہے گی۔

"چاندنی میں سانس ہے جب تک کسی شاعر کا فن"

ساحل احمد نے اپنے مضمون الہ آباد کی تقریباً تین سو سالہ ادبی تاریخ کا ایک مختصر مگر نہایت مفید خاکہ تحریر کیا ہے جس میں نظم و نثر اردو صحافت اور ادبی اداروں کا ذکر ہے۔ یہ بنیادی اور اہم کام ہے جس کی روشنی میں مزید تحقیق و تلاش کے ذریعہ ادبستان الہ آباد کو بقعۂ نور بنایا جا سکتا ہے اور بنایا جانا چاہیئے۔ جہاں خلا رہ گئے ہیں پُر کیئے جا سکتے ہیں۔ جہاں ضرورت ہے اضافے کیئے جا سکتے ہیں، کوئی سہو ہو گیا ہو تو مضمون نگار کو متوجہ کیا جا سکتا ہے۔ اردو میں تحقیق و تلاش کی کمی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس قسم کے بنیادی خاکے تک نہیں لکھے جاتے۔ میں لاہوریوں، ملتانیوں، پشاوریوں، حیدرآبادیوں، بجنوریوں، امروہیوں، مرادآبادیوں، لکھنویوں، دہلویوں وغیرہ سے کئی سال سے کہہ رہا ہوں کہ اپنے اپنے شہروں کی ادبی سرگرمیوں وغیرہ کے کم از کم ایسے خاکے ہی مرتب کر دیں۔ ساحل احمد کو ان کے اس کام پر مبارک باد دیتا ہوں اور دوسروں کو دوبارہ متوجہ کرتا ہوں۔

عصمت چغتائی نے غالب لائبریری کی ایک ادبی تقریب میں بتایا کہ سردار جعفری گفتگو کے لئے بہت محنت کرتے ہیں۔ اتنی مشقت کہ پرچہ نکلنے کے بعد نڈھال اور بیمار ہو کر پھر بستر پر لیٹ جاتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے پرچہ "لیٹ" ہو جاتا ہے۔ بمبئی بڑا شہر ہے بڑے ادیبوں کا شہر ہے۔ کیا کوئی سردار کا ہاتھ نہیں بٹا سکتا؟

علم و آگہی

مرتبین:- ابوسلمان شاہجہاں پوری
امیرالاسلام صدیقی
تبصرہ نگار:- م۔ ظ۔ ح

۵۲۸ صفحات، قیمت درج نہیں
گورنمنٹ نیشنل
کالج۔ کراچی

ادارہ نمبر۔ جلد دوم

کراچی کے اس ممتاز کالج نے علم و آگہی کا پہلا نمبر گذشتہ سال نکالا تھا جس پر ہم جریدۂ غالب میں تبصرہ کر چکے ہیں۔ (جلد ایک، شمارہ دو، ص ۲۴۸) زیر تبصرہ نمبر اسی سلسلے کی دوسری کڑی یا تکملہ ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت آنے والے اداروں کا ذکر ہے۔ تاریخ و آثار قدیمہ کے ادارے، اصلاحی تعلیم، تبلیغی، علمی و ادبی، دینی، لسانی، ثقافتی، شخصیاتی اور علاقائی ادب کے ادارے۔ تذکرہ یا تاریخ بڑی بات ہے چار سو اداروں کی فہرست بھی ایک جگہ نہیں ملتی۔ اس تعداد کے علاوہ دو تین سو نام ان انجمنوں اور اداروں کے ہیں جن کی کوئی تفصیل مرتبین کو نہ مل سکی اور وہ کبھی موجود تھے۔ عام ناظرین اندازہ نہیں لگا سکتے کہ سوا پانچ سو صفحات کے لئے مواد جمع کرنے میں مرتبین کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ مراسلت، ملاقاتیں، مطالعہ، تحقیق و تلاش اور پھر تدوین و ترتیب۔ ایسا بھی نہیں کہ ابوسلمان شاہجہاں پوری اور امیرالاسلام صدیقی کے ذمے صرف یہی کام تھا۔ درس و تدریس اپنی دیگر علمی و ادبی سرگرمیوں کے لئے مطالعہ، گھریلو و نجی مصروفیات کے باوصف ایسی دستاویز کی تیاری یقیناً بہت بڑا کام ہے۔ دنیا کا کوئی بڑا کام ایسا نہیں جس کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔ اس شمارے میں بھی کچھ کوتاہیاں ہیں۔ مثلاً مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر کا ذکر دو جگہ آ گیا ہے یا ادارہ یادگار غالب کے بانی فیض احمد فیض ہیں جب کہ ان کے ساتھ کچھ اور نام شامل کر دیئے گئے ہیں۔ یا ۱۹۶۹ء میں منائی جانے والی صد سالہ تقریبات کو "یوم غالب" لکھا گیا ہے۔ بعض اصحاب اور اداروں کی ضرورت سے زیادہ تعریف کی گئی ہے۔ حالانکہ ان کی کارکردگی اور کارنامے کڑی تنقید بلکہ احتساب کے مستحق تھے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس قسم کے تیار مال، پر نکتہ چینی آسان اور مال تیار کرنا بہت مشکل کام ہے اور ہر ایک نہیں کر سکتا مگر یہ نکتہ

متعلق مدیر لکھتے ہیں "سارے مضامین غیر مطبوعہ ہیں" شاباش۔ دس شعراء کے منظوم نذرانے اور خسرو کی فارسی اور اردو شاعری پر الگ الگ مضامین چار تحقیقی مقالے ہیں۔ تصوف اور موسیقی کے عنوانات پر بھی خیال آرائی کی گئی ہے۔ ملک کے دوسرے جرائد نے بھی خسرو نمبر نکالے ہیں اور تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ان ہی عنوانات پر ان نمبروں میں بھی مضامین ہیں۔ مگر ہم سخن کی ایک امتیازی خصوصیت مخطوطات خسرو کا اشاریہ ہے جو کوئی پچاس صفحات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ نگارستان خسرو۔ اس میں مثنویات دواوین، کلیات اور مجموعوں، غزلیات، قصائد، رباعیات وقطعات اور لغت کی تفصیلات درج ہیں۔ ایک تو ہمارے ہاں اشاریوں کی کوئی روایت نہیں جو ایک المیہ ہے، دوسرے محدود دلچسپی کی بناء پر مطبوعہ اشاریے عام کتابوں کی طرح فروخت نہیں ہوتے۔ رسائل انہیں قسط وار بھی نہیں چھاپتے تیسرے یہ بڑا کٹھن کام ہے ہر ایک نہیں کر سکتا۔ فروغ علم کے لئے اشاریے بہت ضروری ہیں۔ ابو سلمان شاہجہاں پوری بہ حیثیت اشاریہ نگار ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ مدت سے یہ کام کر رہے ہیں اور بڑے خلوص ولگن سے۔ زیر بحث اشاریہ خسرو ان ہی کی کاوش کا نتیجہ ہے اور جہاں تک ہمیں علم ہے پاکستان میں ابو سلمان صاحب سے پہلے یا ان کے بعد بھی کسی نے نہیں نے اس لئے اٹھایا ہے کہ یہ نمبر ادب کی تاریخ میں جگہ پائے گا اور ادب اور تاریخ کے معاملے میں مروت کا عمل دخل نہیں ہونا چاہیئے اور بڑی احتیاط کرنا چاہیئے۔ مجموعی طور سے علم وآگہی کے دونوں ادارہ نمبر اور خصوصاً جلد دوم ایک قابل فخر کارنامہ ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ ابو سلمان شاہجہاں پوری اور امیر الاسلام صدیقی آئندہ بھی کوئی ایسا ہی انوکھا نمبر نکالیں گے۔ مشورے کی اجازت ہو تو عرض کروں کہ اب لائبریری نمبر نکالیں۔

ہم سخن ــــ خسرو نمبر

مدیر شہاب احمد — ۴۸۰ صفحات۔ قیمت درج نہیں
تبصرہ نگار:۔ م۔ ظ۔ ح — جناح گورنمنٹ کالج (کراچی)

مدیر اعلیٰ:۔ پروفیسر عصمت اللہ خاں، تین معاونین اور ۹ اراکین مجلہ

نو متنوع موضوعات کے تحت تیس سے زائد مقالے اور مضامین ہیں جن کے

اشاریہ خسرو مرتب نہیں کیا۔ ہم سخن کے خسرو نمبر ہیں اور کچھ نہ ہوتا صرف نگارستانِ خسرو، ہوتا تب بھی اس کی قدر کی جاتی۔ جناح گورنمنٹ کالج کے طلباء اور اساتذہ اور بطورِ خاص مدیران اور ان کے معاون تحسین بلکہ مداحین خسرو کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

غالب لائبریری اور رسائل

تمام رسائل جو تبادلے میں آتے ہیں یا تبصرے کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ غالب لائبریری میں محفوظ کرلئے جاتے ہیں۔ ان کے تمام مضامین کے انڈیکس کارڈ بھی بنوا لئے جاتے ہیں۔

نامے مرے نام آتے ہیں

"میں ناظرین سے معذرت خواہ ہوں کہ مختلف وجوہ کی بنا پر فیض نمبر سے اس وقت تک کے شمارے وقت پر شائع نہیں ہو سکے اور خطوط کی اشاعت میں بھی سابقہ ترتیب برقرار نہ رہ سکی۔ غیر حاضری اور دیر حاضری اور ان کی وجہ سے بے ترتیبی اور بے نظمی ادبی جرائد کا مقدر بن چکا ہے جس سے آپ سب واقف ہیں۔ اسلئے اُمید ہے کہ اس تھوڑے کو کافی جانیں گے۔" م۔ظ۔ح

۸ر جنوری ۷۶ء

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی — ایم جی ایم ریسرچ سنٹر

بمبئی ۴۰۰۰۰۲

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ فیض پر میرا مضمون ضائع نہ ہوا بلکہ آپ تک پہنچ چکا ہے۔ سردار جعفری سے ذاتی طور پر مل نہ سکا البتہ فون پر بات چیت ہو گئی ہے۔ وہ بھی اس ڈر سے کہ ان کا مضمون آپ تک پہنچ نہیں پائے گا' اب تک کچھ لکھ نہ سکے تھے۔ میرے اطمینان دلانے پر لکھنے کا وعدہ کیا۔ وعدہ پورا ہوگا۔ میں نے اپنے ایک باذوق دوست ایوب واقف سے سردار جعفری پر مضمون لکھنے کی درخواست کی ہے۔ وہ لکھ رہے ہیں۔

دوسرا خط

۱۷ر فروری ۷۶ء

آج ہی میں نے سردار جعفری کو فون کیا۔ ظ صاحب سے بھی ملاقات کی۔ دونوں وعدے کر رہے ہیں۔ دیکھئے کب ان کے وعدے پورے ہوتے ہیں۔ ایوب واقف صاحب نے سردار جعفری کی شاعری پر اپنا مضمون تقریباً پورا کر لیا ہے۔ بہت جلد وہ بھی میرے حوالے سے آپ تک پہنچ جائے گا اور ان کا پتا آپ کو مل جائے گا۔

تیسرا خط

۲۱ر اگست ۷۶ء

جعفری صاحب کا گفتگو مکمل ہو گیا ہے۔ دورِ جدید کے تین شمارے اب تک شائع ہو چکے

ہیں۔ سارے کے سارے بلند پایہ اور اچھے ہیں۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ انتخابِ کلام فیض شائع کر رہے ہیں۔ فیض صاحب سے آپ کا یہ لگاؤ قابلِ رشک ہے اور فیض بھی قابلِ رشک ہیں۔ ان سے قریب ہونے کے بعد یہ احساس اور شدید ہو جاتا ہے

کرشن کانت کا شائع کیا ہوا "ورق ورق" (کلامِ فیض) ہماری لائبریری میں بھی ہے انتخاب بہت عمدہ ہے۔ ہم لوگ فیض کے مجموعوں کی نایابی کی وجہ سے اس سے کام چلاتے تھے۔ آپ کو جس کسی خدمت کی ضرورت ہو بلا تکلف لکھئے۔ مجھے آپ کا کام کر کے خوشی ہوگی۔

۲۱ر جنوری ۷۶ء حرمت الاکرام رام باغ مرزاپور

۲۳۱۰۰۱ - یو۔پی۔ ہند۔

جلوۂ نمو میں پیش لفظ، دیباچہ یا رائے کی قسم کی کوئی نثری تحریر نہیں دی گئی ہے۔ تضیع اوقات کے علاوہ اس کا کوئی حاصل سمجھ میں نہیں آتا۔ گروہ بندی کی لعنت نے ادب کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے جس کی تلافی شاید ہی ہو سکے۔ متوازن تنقید یا اظہارِ خیال تقریباً مفقود ہے۔ اس کی جگہ تحسین اور تنقیص نے لے رکھی ہے۔ رسائل آپ کے پاس جاتے ہوں گے لہٰذا صورت حال کا اندازہ آپ کو بھی ہوگا ...... مرزاپور میں جرات پر کام کرنے والے آدمی بھی نہیں ملتے۔ مرزاپور اتنا چھوٹا نہیں جتنا پسماندہ ہے۔ کسی ادبی ماحول کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ جونپور اور اعظم گڑھ وغیرہ جو مرزاپور سے چھوٹے شہر ہیں بعض امور میں خاصے آگے اور بہتر ہیں۔

دوسرا خط

۸ر ستمبر ۱۹۷۶ء

کاش آپ کی زیرِ قلم تصنیف "فیض اور مخدوم" جلد چھپ جائے اور آپ جلد ہندوستان آئیں۔ قیام کس جگہ ہوگا اور کہاں کہاں جائیں گے۔ ملاقات کی کوئی صورت ہو سکتی ہے کہ نہیں؟ کتاب کا موضوع اچھا ہے۔ اس پر کافی لکھا جا سکتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ دو شاعروں میں مماثلت خواہ کتنی ہی مغایرت بھی زبردست ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ مخدوم نے اپنے آخری دور

میں جس نے انہیں زیادہ مقبولیت دی فیض کے لہجے کو اپنانے پر زیادہ توجہ صرف کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اس کا ثبوت خاص طور پر ان کی غزلیہ شاعری ہے۔ ساہوکار ہونا دیوالیہ ہونے سے بہر حال بہتر ہے۔ ساہوکار صرف اپنی پونجی چھپاتا ہے مگر پونجی والا ہوتا ہے۔ کتاب کا اعلان کر دینا اور محض تفریحی یا نمائشی طور پر دیوالیہ پن کی دلیل ہے۔ یہ دور بھی عجیب ہے۔ شاعری اور نثری مواد کی بات ہی اور ہے کتابوں کے نام تک چرائے جاتے ہیں شمس الرحمٰن فاروقی نے (شبخون میں) میرا تعارف کراتے ہوئے "شہپر" کے زیر ترتیب مسودے کا ذکر کر دیا۔ پھر کیا تھا الہ آباد کے ایک صاحب نے "شہپر" کے نام سے ایک رسالہ نکال دیا۔ ایک غیر معروف خاتون نے اسی نام سے ایک ناول لکھ مارا۔ بتائیے یہ دیوالیہ پن نہیں تو اور کیا ہے۔ کیا کتابوں اور رسالوں کے لئے نام نہیں مل سکتے اور جو اپنی کتاب یا اپنے رسالے کے لئے کوئی (نیا) نام نہیں تجویز کر سکتا اس سے کوئی اچھی توقع کیا رکھی جا سکتی ہے۔ "نادرات غالب لائبریری" کا ذکر آپ نے پہلے نہیں کیا تھا۔ اس کی اہمیت نام ہی سے ظاہر ہے ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ اس قسم کے بلند پایہ کاموں میں مصروف ہیں۔

لطیف الزماں خاں

یکم اگست ۱۹۷۶ء ۱۴۹ بی گلگشت، ملتان

غالب سہ ماہی کا فیض نمبر مل گیا۔ اس کو واقعی ادبی تحفہ کہا جا سکتا ہے۔ فیض جیسے شاعر اور انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ میں نے فیض نمبر کا بیشتر حصہ پڑھ لیا۔ تنقیدی حصہ بہ اعتبار مقدار اور کیفیت کم ہے۔ سلیم اختر کا مضمون اچھا ہے کہ انھوں نے فیض کی زمانہ طالب علمی کو تلاش کر لیا ہے۔ فیض کے ذوق مطالعہ کو پڑھ کر میں حیران ہوا۔ ہمارے بیشتر شعراء ہر قسم کے مطالعہ سے بھاگتے ہیں لیکن جیل میں فیض کا ذوقِ مطالعہ" اس بات پر شاہد ہے کہ بغیر مطالعہ، مشاہدہ اور کیفیت دل کے مصرعہ تر کی صورت نہیں ہو سکتی۔

غالب کے لئے فیض کی حیات، شاعری اور کارناموں کو آپ جس قدر سمیٹ سکیں سمیٹ

لہجے ۔فیض صاحب کو قابو کر لینا کچھ آپ ہی کو آتا ہے ۔میرا خیال ہے کہ ہر شخص کیا کوئی بھی فیض صاحب کو قابو نہیں کر سکتا۔اپنی تمام ترنرم گفتاری اور شیریں لہجے کے باوجود ان میں عجیب قسم کی انفرادیت ہے ۔مدت سے ان سے یاد اللہ ہے۔پاس بیٹھ کر گفتگو سننے کا موقع ملا ہے مشاعروں میں شعر پڑھنے اور ہلکی سی مسکراہٹ سے لوگوں کے قلوب کو فتح کرتے بھی دیکھا ہے۔ تاہم فیض صاحب واحد انسان ہیں جن کے چہرے سے ان کے جذبات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

پاکستان ابھی نہیں بنا تھا۔بمبئی سے ایک ہفت روزہ نظام چھپتا تھا۔قدوس صہبائی اس کے مدیر تھے ۔سب سے پہلے مخدوم محی الدین کے بارے میں اس ہفت روزہ سے معلومات حاصل ہوئیں۔سردار جعفری نے جب ایک طویل مضمون لکھا تو میں نے اُسے نقل کر لیا تھا۔وہ آج بھی میرے پاس موجود ہے۔پھر "نئے ادب کے معمار" کے نام سے کتابچے شائع ہوئے۔یہ کتابچہ بھی میرے پاس ہے۔مخدوم سے کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن مخدوم کی شاعری اس کی شخصیت اور اس کے حالات سے آج بھی دلچسپی ہے آپ ضرور کتاب لکھئے لیکن جس طرح "ذکرِ یار چلے" نہ مل سکی یہ بھی نہیں ملے گی

یہ قدیم شہر (ملتان) جو تہذیب کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے ۔یہاں ایک بھی کتاب کی ایسی دوکان نہیں جہاں کام کی کتاب مل جائے ۔لاہور کے کتب فروش کراچی کی کتابیں نہیں منگاتے اس لئے کہ شاید کراچی کے کتب فروش بھی لاہور والوں سے ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ہم اچھی کتابوں سے محروم رہتے ہیں۔

میں یہ عرض کروں گا کہ سب سے پہلے غالب لائبریری میں موجود غالب پر موجود کتب کی فہرست شائع کیجئے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہاں کیا کچھ ہے اور کس کتاب کی ضرورت ہے۔کراچی میں کئی ایسے اصحاب موجود ہوں گے جن کے ذخیرۂ کتب میں غالبیات کا بڑا حصہ ہوگا اگر یہ سلسلہ چل نکلے تو اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ غالب پر کام کرنے والوں کو یہ معلوم ہو سکے گا کہ کس کس کے پاس کیا تحریر موجود ہے۔کونسی کتاب اور کونسا غالب نمبر کہاں موجود ہے ۔

ادا جعفری

پرنسپلز ہاؤس پاکستان
ایڈمنسٹریٹیو کالج لاہور

۱۹ر اگست ۱۹۷۶ء

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں ۔ یہ خط اطلاعًا اور بڑی عجلت میں تحریر کر رہی ہوں ۔ جعفری صاحب کا تبادلہ پرنسپل ایڈمنسٹریٹیو اسٹاف کالج کے عہدے پر لاہور ہو گیا ہے ۔ نیا پتا اوپر درج ہے ۔ میں ابھی ایک دو ماہ کے لئے واشنگٹن اپنی بچی کے پاس جا رہی ہوں واپسی پر انشا اللہ ملاقات ہو گی ۔ غالب کے شمارے ملتے رہے ہیں شکرگزار ہوں ۔ اگر واشنگٹن میں کوئی کام ہو تو جعفری صاحب کی معرفت بے تکلف تحریر فرمایئے ۔

پیر حسام الدین راشدی

سنٹرل کلینیکل ہسپتال ماسکو

۹ر ستمبر ۱۹۷۶ء

میں ۱۴ر اگست سے ماسکو کے ہسپتال میں پڑا ہوں ۔ گلے میں غدود نکلا تھا کراچی میں ۳ر اگست کو آپریشن کرایا ۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ ممکن ہے یہ کینسر کا شاخانہ ہو لہٰذا ماسکو جاتے ہو تو تحقیق کرا لینا ۔ اس تحقیق میں آج تک کئی دن گزر گئے اور ابھی سلسلہ جاری ہے ۔ طوالت تنگ کرنے والی ہے لیکن درحقیقت انصاف یہ ہے کہ بیمار ہو کر آدمی علاج کے لئے یہاں آئے ۔ حد کر دی ہے میڈیکل سائنس میں عقل دنگ ہے ۔ پچاس طریقوں سے تو خون کی تحقیق کی ہے ۔ شاید گلے کا دوسرا آپریشن بھی ہو ۔ دعا کریں ۔ ابھی فیض صاحب دانشوروں کے جلسے میں تاشقند آئے تھے ۔ جو پیغام پڑھا وہ ۱۱ر ستمبر کے "ماسکو نیوز" میں چھپا ہے ۔ تراشہ ارسال ہے آپ کو فیض صاحب کے سلسلۂ سوانح میں کام آئے ۔ ضیائی صاحب کا پتا یہاں نہیں ہے ۔ خدا ان کو جیتا رکھے ۔ ایسے مخلص دوست کہاں روز روز پیدا ہوتے ہیں ۔

مس شاہین مفتی

گورنمنٹ کالج برائے خواتین
گجرات

۱۴ ستمبر ۱۹۷۶ء

میں آجکل فیض صاحب اور مصحفی کی کلر اسکیم کے بارے میں مواد جمع کر رہی ہوں کہ

نہیں تھا کہ آپ کو یاد رہتا۔ آپ سے ایک اور تعلق ہے میرا۔ میں بیکل مرحوم کا ہم زلف ہوں۔ یہ رشتہ ان کی موت کے بعد ہوا۔ ان کے کلام کو ترتیب دے رہا ہوں۔ کلیات کا ایک حصہ "سیخانہ" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ آپ کو ضرور بھیجوں گا۔ اپنی کتاب (آئینہ در آئینہ) نظموں کا مجموعہ اور ناولٹ "دوسرے کنارے تک" بھیجوں گا اگر آپ "گرین سگنل" دیں۔

اکبر علی خاں عرشی زادہ

تاریخ درج نہیں

لائبریری رام پور یوپی۔ ہند

مجھے برابر آپ کی کاوشوں کی فکر ہے اور جی چاہتا ہے کہ آپ کی لائبریری میں ہندوستان میں شائع شدہ مسالہ بھی جمع ہوتا رہے۔ بیس پچیس کتابیں، کتابچے اور رسالے حاضر خدمت کر رہا ہوں ممکن ہے ان میں سے کچھ غیر اہم معلوم ہوں مگر آج نہیں تو کل ان کی تاریخی اہمیت ہوگی۔ میں ان تحائف کی جلدیں تیار کر کے بھیجنا چاہتا تھا مگر اتنا وقت نہیں تھا۔ نقش ناتمام از سحر رامپوری میں نے جلد بندی میں دے دی تھی وہ بھی جلد ساز سے واپس نہ آئی البتہ ان کی کتاب تشنگی ارسال خدمت کرتا ہوں۔ ایک بات خصوصیت سے عرض کر دوں۔ آپ اپنی لائبریری میں وقتی اہمیت کے لٹریچر (پمفلٹ وغیرہ) کو ضرور محفوظ کریں جس کی طرف کو توجہ نہیں کرتا۔ ان کی اہمیت لوگ جانتے نہیں مگر ہوتی بہت زیادہ ہے۔ ابا محترم بخیر ہیں اور آپ کو سلام لکھواتے ہیں۔

یوسف ناظم

تاریخ درج نہیں

پتا ندارد۔ بمبئی

حضرت وجد نے شاید آپ کو میری نئی کتاب سائے اور ہمسائے بھیج دی تھی۔ اشفاق، مخدوم، ادیب، ڈاکٹر زور اور امجد حیدر آبادی سے متعلق خاکے اور مضامین آپ کو پسند آئے ہوں گے۔ اگر پسند نہیں آتے ہیں تو ہم دونوں میں سے کسی ایک میں اندرونی نقص ہے۔

اصل بات تو میں کہنا بھول گیا۔ یہ میرے دوست ہیں۔ ایوب اولیا ان کا نام ہے۔ گوجرانوالہ کے رہنے والے ہیں۔ لندن میں مقیم ہیں اور ہندوستان میں انھوں نے خود کو پایا ہے۔ اس لئے آپ تصفیہ کیجئے کہ یہ کیا ہیں اور بقول فیض ان کا "اچھا سا نام" تجویز کیجئے۔ لبھک ہیں۔ حافظ اخفیں کی طرح تندرست ہے۔ دوستوں کا حلقہ دنیا کی طرح وسیع ہے۔

دونوں "حواسی" شاعر ہیں۔ اگر معیاری مضمون ہوگیا تو آپ کو تین ماہ کے اندر ارسال کردوں گی۔ کیا آپ اس موضوع پر کسی مضمون یا کتاب کی نشاندہی کرسکیں گے؟ نیز مجھے فیض صاحب سے پوچھ کر یہ لکھئے گا کہ وہ بیرونی ممالک کی کن شخصیتوں اور غیر ملکی انسانوں کے کن کلاسیکس سے متاثر ہیں اور عہد اسیری میں روس کا کون سا ادیب یا شاعر خاص طور پر ان کے زیر مطالعہ رہا۔ فیض احمد فیض ہمارے وہ خوش قسمت شاعر ہیں جنھیں اقبال کے بعد اپنی حیات ہی میں بے پناہ مقبولیت اور تحسین حاصل ہوئی۔ خاص طور پر ادب کے امپیریل طبقے کی ستائش حیران کن ہے کہ وہ اپنے سوا کسی کو کم ہی مانتے ہیں۔

زہرہ جمال

تاریخ درج نہیں

یونی ٹی کمپاؤنڈ، جوہو بیچ
سانتا کروز بمبئی ۴۹

آپ مجھے کیوں یاد دلا رہے ہیں۔ مجھے آپ سب اچھی طرح یاد ہیں۔ کتنے ہی انقلابات گزرے کتنی ہی دوریاں ہوئیں، کتنی یادیں اب بھی زندہ ہیں۔ غالب مجھے پسند آیا۔ آپ بڑی خدمت کررہے ہیں ادب کی ..... فیض صاحب میرے محبوب ترین شاعر ہیں لیکن ان کی دید نصیب نہیں ہوئی۔ باقی سب ادیبوں اور شاعروں سے رابطہ رہا۔ اتفاق سے وہ جب بھی بمبئی تشریف لائے میں یہاں نہیں تھی۔ آپ لاہور جائیں تو انھیں میرا سلام ضرور پہنچا دیں۔

عزیز قیسی

تاریخ درج نہیں

فلیٹ نمبر پانچ مون کرافٹ، اپارٹمنٹس
آف کارٹر روڈ، باندرہ بمبئی ۵۰

یوسف ناظم سے غالب کا دوسرا شمارہ مانگ کر لے آیا تو ایک دیرینہ مرض "تازہ" ہوگیا۔ آپ کے مضمون "لذت سے الاپچی کے پان تک" کو پڑھنے کے بعد مجھے حمایت علی شاعر بے حد ستا رہے ہیں ...... حیدرآباد مرحوم و مغفور کو آپ بہت یاد کرتے ہیں۔ مرحوم و مغفور بھی آپ کو بہت یاد کرتے ہیں ..... حیدرآباد کے لوگوں تک آپ پہنچ چکے ہیں جس کا آپ کے رسالے سے پتہ چلتا ہے۔ آپ سے میں تو نیاز حاصل کرچکا ہوں ہو سکتا ہے میری اس وقت کی کم عمری کی وجہ سے اس لائق

آپ سے ملنا چاہتے ہیں اس لئے ملنے میں تکلف نہ کیجئے۔

رفیع الدین ہاشمی

تاریخ درج نہیں

۲۲ ر اے سیٹلائٹ ٹاؤن
سرگودھا۔

بہت دن ہوئے برادرم ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب کے ہاں آپ کا اشاریہ ذکر غالب ذکر عبدالحق" دیکھا۔ اس ضمن میں میری ایک تجویز ہے کہ ہر مضمون کے ساتھ اس کی ضخامت درج کی جائے یعنی یہ کہ از صفحہ فلاں تا صفحہ فلاں ۔۔۔۔ اس طرح اندازہ ہو سکے گا کہ مضمون سرسری اور مختصر ہے یا مفصل اور جامع۔ آئندہ آپ جس قدر اشاریے مرتب کرائیں ان میں اس چیز کا خیال رکھیں تو بہت اچھا ہے۔

مرزا بنام مرزا

سنا ہے مرزا جی تم نے "غالب کتاب گھر" کے عنوان سے کوئی نیا شوشہ چھوڑا ہے۔ یہ کہ جو ادیب، خود اپنا خرچ کر کے کتابیں شائع کرنا چاہتے ہیں تم ان سے کہتے ہو خرچ ہونے والا مال اور چھپنے والا مسالہ ادارہ "یادگار غالب" وہ کتاب چھپ جائے گی۔

کچھ لوگ جو کام چوری چھپے کرتے ہیں تم ڈنکے کی چوٹ کرنا چاہتے ہو۔ اسی سال میں دو ایک کتابیں ایسی شائع ہوئی ہیں۔ جن کا تمام خرچ مصنفوں نے برداشت کیا۔ کاتب کے گھر کے پچاسوں پھیرے کئے جس نے برقت کتابت کے جھوٹے وعدوں سے آٹھ آٹھ آنسو رلایا۔ پروف پڑھے غلطیاں درست کرانے کے لئے پھر اس کاتب کے گھر کے چکر کاٹے۔ کاپیاں جوڑنے کی منزل آئی تو ہوٹل میں اسے بار بار چائے پلا کر، کھانا کھلا کر کاپیاں جڑوائیں۔ بھاگم بھاگ ایک پریس گئے۔ وہاں انکار ہوا تو دوسرے پریس گئے۔ تیسرے پریس گئے خوشامد کی کہ بھیا چھاپ دو اور فلاں تاریخ تک دے اور دیکھنا چکر نہ کٹوانا۔ ہم باز آئے ایسی تصنیف و طباعت سے۔ پریس کے مالک نے وعدہ کر لیا مگر وفا نہ کیا۔ کبھی یہ بہانہ کہ بجلی غائب ہو گئی تھی۔ کبھی یہ عذر کہ مشین مین بیمار ہے کبھی یہ جھوٹ کہ اچانک مشین خراب ہو گئی۔ کتاب چھپ گئی تو جلد ساز کا روگ لپٹا۔ پیشگی رقم لے کر جو غائب ہوا تو پندرہ دن سے پہلے پکڑا نہ گیا۔ آج بیوی بیمار ہے، کل بچہ بھاگ گیا تھا، پرسوں سسر کا سر پھٹ گیا تھا۔ اللہ اللہ کر کے جلد بندی ختم ہوئی تو یہ فکر کہ فروخت کا کیا انتظام کیا جائے۔ کتاب لکھنا، کتاب چھاپنا اور کتاب بیچنا تینوں الگ الگ کام ہیں۔ ادیب کتاب نہیں بیچ سکتے۔ تو پھر؟

مرزا جی مانا کہ تم جریدہ غالب نکالتے ہو، تمہارے پاس کاتبوں کی چھوٹی سی ایک پلٹن ہے۔ دو ایک مطابع سے تمہارا پکا معاملہ اور معاہدہ ہے۔ مختلف شہروں کے کتب فروشوں تمہاری مراسلت ہے مگر تم ادارے کا رسالہ اور کتابیں فروخت کر کے کونسے مالا مال ہو گئے جو ان کتابوں کی نکاسی کا خاطر خواہ بندوبست کر سکو گے؟ ہاں یہ ہم تسلیم کرتے ہیں۔ صاحب کتاب انفرادی طور پر جتنی کتابیں بیچ سکے گا تم اس سے بہت زیادہ فروخت کر دو گے۔ یہ بھی منظور کہ کاتب سے لے کر کتب فروش تک کے نازوں اور الٹے سیدھے دھندوں کی جس مصیبت

سے ادیب دو چار ہوتا ہے۔ اس سے ادیب کو چھٹکارا مل جائے گا۔ اگر وہ تمہاری اسکیم مان لے۔
مرزا جی بالکل ایمانداری سے بتاؤ کہ کیا واقعی تم صاحب کتاب کے مفاد کو ادارۂ یادگار
غالب کی مالی منفعت پر ترجیح دوگے؟ شیخ صاحب ملے تھے، کہہ رہے تھے مرزا پر غالب کا ایسا
بھوت سوار ہے کہ وہ نہ جانے کس کس کو پھنسا کر چڑھاوے۔ البتہ خاں صاحب نے تمہاری وکالت
کرتے ہوئے کہا کہ تم ایک مشاورتی کمیٹی بناؤ گے جس میں ان ادیبوں کے نمائندوں کی اکثریت ہو
گی جن کی کتابیں اشاعت کے لئے قبول کر لی جائیں اور یہ کمیٹی انتظامی اور مالی امور کا فیصلہ کثرت
رائے سے کرے گی۔

ایسا ہے تو ہم داد دیتے ہیں۔ مگر مصنفوں سے یہ ضرور کہہ دینا کہ بھائی میں ہر ممکن کوشش
کروں گا اور اپنی جان لڑا دوں گا کہ زیادہ سے زیادہ کتابیں فروخت ہو جائیں۔ پر کوئی قطعی ضمانت
نہیں دے سکتا۔

اشکوں سے منور

آخری کاپی چھپنے جا رہی تھی کہ کرشن چندر کے انتقال پُر ملال کی اندوہناک خبر
ملی۔ چند ہی دن پہلے ان کا خط آیا تھا جس میں انہوں نے اپنے صحت یاب ہونے کی
اطلاع دی تھی مگر افسوس کہ وہ آخری سنبھالا ثابت ہوا۔ ابن انشا نے بی بی سی
کے اردو پروگرام میں بالکل درست کہا کہ کرشن چندر کے ساتھ ایک پورا دور ختم ہو گیا
اگر وہ تو تخلیقات کی بجائے صرف ان داتا ہی لکھ کر جدا ہو گئے ہوتے تب بھی اردو
ادب میں ان کا نام زندہ اور تابندہ رہتا۔ آج ہر ادیب غمگین ہے اور ایک دوسرے کو
پرسہ دے رہا ہے کہ اب زبان و ادب کو ایسا کرشن کنہیا نہیں ملے گا۔

مرزا ظفر الحسن

ادارہ یادگار غالب کا اشاعتی منصوبہ

حسب ذیل چار کتابیں اس وقت تالیف و ترتیب کے مرحلے میں ہیں۔

نادرات غالب لائبریری

آٹھ ہزار کتابوں کے خزینے میں اردو فارسی عربی سندھی کی کوئی آٹھ سو کتابیں ایسی ہیں جن کا شمار نادر، نایاب اور کمیاب کتابوں میں ہو سکتا ہے۔ ان کتابوں کا مختصر تعارف متعلقہ محققین کے لیے یقیناً سودمند ہوگا۔

اشاریۂ غالب لائبریری

بیس بائیس ہزار شماروں اور پندرہ سو خاص نمبروں میں غالب اور اقبال پر اندازاً دو تین ہزار سے زائد مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ان مضامین کا اشاریہ دو الگ الگ جلدوں میں بعنوان (۱) اشاریۂ غالب لائبریری جلد اوّل غالب (۲) اشاریۂ غالب لائبریری جلد دوم اقبال زیر تالیف ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ غالب اور اقبال پر کام کرنے والے ادیبوں کے لیئے یہ دونوں اشاریئے مفید ہوں گے۔

اشاریہ کلام فیض

جہاں تک ہمیں علم ہے آج تک کسی شاعر کے کلام کا کوئی اشاریہ شائع نہیں ہوا ہے۔ کلام فیض کا یہ اشاریہ محققین فیض کے لیے ہر قسم کے حوالوں کے تعلق سے سہولت بخش ثابت ہوگا۔